ماہنامہ
الرشید

دار التالیف والترجمہ کی تصانیف

عبادت و خدمت

مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہ

اس رسالہ میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور عام انسانوں کی خدمت بھی عبادت ہے، اور اس پر اسی طرح اجر و ثواب ملتا ہے جس طرح فرض عبادات پر ملتا ہے۔ اگر فرض عبادات کے اہتمام کے ساتھ ہمارے اندر عام انسانوں کی خدمت کا جذبہ بھی پیدا ہو جائے تو نفرت و حقارت کے بہت دبیز پردے ہٹ جائیں گے اور اسلام سے عام انسانوں کے دلوں میں ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ سائز ۲۲ + ۱۸، صفحات ۵۶، قیمت ۵؍

دینی مدارس اور ان کی ذمہ داریاں

محترم مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد کی ان تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ ہے جو وہ طلبہ، اساتذہ، منتظمین مدرسہ اور عربی مدارس کے ذمہ داروں کے سامنے کرتے رہے ہیں۔ یہ تقریریں اور تحریریں دردو اثر میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ان میں بعض تقریروں کو محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ نے اپنے تائیدی نوٹ کے ساتھ الفرقان میں شائع فرمایا اور شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب مدظلہ العالی نے ایک بڑے مجمع میں پڑھوا کر سنوایا اور فرمایا کہ اسے ہر استاذ اور طالب علم کو پڑھنا چاہئے۔ سائز ۲۲ + ۱۸، صفحات ۱۰۰، قیمت للعہ

اسلامی تعلیم

حصہ اول، دوم، سوم، چہارم

بچوں کو اسلامی مسائل ذہن نشین کرانے کے لئے اردو زبان میں درجنوں رسالے لکھے گئے ہیں، مگر اس رسالہ کا انداز بیان اتنا دلچسپ ہے اور مسائل ایسے آسان طریقہ سے سمجھایا گیا ہے کہ بچے اسے قصہ کہانی کی کتاب کی طرح دلچسپی و شوق سے پڑھتے ہیں۔ چار حصوں میں تمام ضروری مسائل آ گئے ہیں۔ سائز ۲۰ + ۳۰ / ۱۶ قیمت حصہ اول ۸؍، دوم ۸؍، سوم ۸؍، چہارم ۸؍

تبع تابعین حصہ اول

مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہ

کتاب میں ۱۱۱ اکابر تبع تابعین کا مفصل تذکرہ ہے۔ شروع میں مصنف کے قلم سے ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے جس سے اسلام کی ابتدائی دو صدی کے دینی، تہذیبی اور سیاسی تاریخ کا [illegible]

مولانا مجیب اللہ ندوی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے [illegible] پریس [illegible] میں چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد [illegible] سے شائع کیا

جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان

ماہنامہ

الرشاد

سالانہ چندہ
ہندوستان =/24
چندہ ششماہی =/12
قیمت فی پرچہ 2/50

سالانہ چندہ
ممالک غیر سے
بارہ ڈالر امریکی
=/12

جلد نمبر ۳ | بابت جنوری، فروری ۱۹۸۳ء مطابق ربیع الثانی وجمادی الاولیٰ ۱۴۰۳ھ | شمارہ نمبر ۲۴، ۲۵

فہرست مضامین

مجلس ادارت

پرچہ کی توسیع اشاعت کے ذمہ دار مولوی عقیل احمد صاحب ٹانڈوی ہیں

نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد

رشحات

ہندوستان کے مشہور صحافیوں میں، ایک مسٹر کلدیپ نائر بھی ہیں، انہوں نے فرقہ وارانہ صورت حال پر ایک طویل مضمون لکھا ہے جو انگریزی، ہندی اور اردو اخبارات میں چھپ چکا ہے، اس میں انہوں نے ہندو فرقہ پرستوں کے بہت سے توہمات کا جواب دیا ہے، انہوں نے ہندو فرقہ پرستی کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> " ابھی تک ہندو دھرم کا مزاج تحمل و بردباری اور دوسرے دھرموں کے آدر (عزت) کا رہا ہے، مگر اب اسے برباد کرنے کی کوشش ہو رہی ہے ...... ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے جب یہ رواج تھا کہ زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکالی جائے جس سے غیر ہندوؤں کے جذبات مجروح ہوں ..... لیکن اب یہ لحاظ ختم ہوتا جا رہا ہے ..... ہندوؤں میں فرقہ پرستوں کو بہت برا سمجھا جاتا تھا اور انہیں سچا ہندو بھی تسلیم نہیں کیا جاتا تھا، ان سے نفرت کی جاتی تھی، لیکن اب انہیں نہ صرف برداشت کیا جا رہا ہے، بلکہ حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے ..... ابھی چند سال پہلے حکومت ایسے کاموں سے اجتناب کرتی تھی جو غیر سیکولر نظر آتے ہوں لیکن اب ہر ہفتہ دھرمیندر برہم چاری ٹیلی ویژن پر ہندو دیوی دیوتاؤں کے بارے میں بتاتے ہیں وہ یوگا کا سبق دیتے ہیں (اب تو یوپی کے اسکولوں میں یہ ضروری مضمون ہو گیا ہے) پبلک جلسوں میں منسٹر صاحبان کی پیشانی پر تلک لگانے کا رواج عام ہو گیا ہے۔ ہمارے ملک کے سیکولرزم کے ڈھانچے میں یہ سب چیزیں کیسے فٹ بیٹھتی ہیں؟

راقم الحروف نے اکتوبر نومبر کے شمارے میں لکھا تھا کہ ہندو، ہندی، ہندوستان کا نعرہ آر ایس ایس کے لوگ لگاتے ہیں، مگر اس کا نفاذ ہماری سرکار کرتی ہے۔ اور حکومت چاہے کانگریس

کی ہویا جنتا پارٹی کی یا سوشلسٹوں کی مگر سکہ ہر جگہ آر، ایس، ایس ہی کا چلتا ہے، کہا جاتا ہے کہ فساد آر. ایس آیس والے کرتے ہیں، مگر اس کی تکمیل سیکولر حکومت کی پولیس اور پی اے سی کرتی ہے. کلدیپ نائر صاحب کے اس مضمون سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔

اس وقت ہندوستان کے فرقہ پرست اخبارات ایک نیا فلسفہ یہ پیش کر رہے ہیں کہ یہ کہنا غلط ہے کہ ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں، اور ہندو اکثریت میں۔ ہندوؤں میں مختلف خیالات مسلک اور طریقوں کے ماننے والے ہیں، اگر ان سب کو الگ کر دیا جائے تو ہندوؤں کی اکثریت باقی نہیں رہ جاتی۔

یہ فلسفہ اس لئے گڑھا جا رہا ہے کہ مسلمان جو اپنے کو اقلیت میں کہکر اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے. وہ اقلیت میں ہیں کب کہ ان کو اقلیت کے حقوق دیئے جائیں. یعنی اقلیت کے نام پر مسلمانوں کو اگر کوئی سہولت مل سکتی ہو تو وہ نہ مل سکے. معلوم نہیں کہ آزادی کے بعد وہ کون سے حقوق ہیں جو مسلمانوں کو مل گئے ہیں جو فرقہ پرستوں کی نگاہ میں کھٹک رہے ہیں، جن کے لئے اتنا لمبا چوڑا فلسفہ گڑھ کر ان سے وہ مسلمانوں کو محروم کرنا چاہتے ہیں. ہندوستان کے مسلمان تو یہ دہائی دے رہے ہیں کہ غلامی کے دور میں ہندوستان میں ان کو جو مذہبی تعلیمی اور معاشرتی حقوق حاصل تھے وہ آزادی کے بعد ایک ایک کرکے کیوں چھینے جا رہے ہیں؟ وہ اقلیت کی حیثیت سے نہیں بلکہ آپ کے سیکولر دستور کی بنا پر ایسا کہہ رہے ہیں کہ آپ کسی خاص فرقہ کی جانبداری نہ کریں ورنہ اس سے آپ کا دستور مجروح ہوگا. اور دنیا آپ کے دستوری حقوق کو فریب سے تعبیر کرے گی. اس فلسفہ کے ایجاد کرنے والوں کے بارے میں بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ

خرد کا نام جنوں رکھدیا جنوں کا خرد ؛ جو چاہے آپکا حسن کرشمہ ساز کرے

عرب ملکوں میں دولت کی فراوانی اور مغربی طرز تعلیم کی وجہ سے مغربی تہذیب کی برائیاں جس تیزی سے پھیل رہی ہیں، اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو براہ راست عربوں سے واسطہ پڑا ہے، ان کے اس طرز عمل کی وجہ سے نہ صرف اسلامی معاشرہ کی بدنامی ہو رہی ہے بلکہ یہ

چیز اسلام کی راہ میں زبردست رکاوٹ بن رہی ہے۔ خاص طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کی دینداری اس سے خاصی مجروح ہو رہی ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ متحدہ امارات میں حکومت ابوظبی نے اس سلسلہ میں کچھ اخلاقی اصلاحات کا پروگرام بنایا ہے۔ اور شراب اور رقص و سرور پر پابندی عائد کر دی ہے۔ اور نئے سال کے موقع پر مغربی تہذیب کی جو بدتمیزیاں ہوتی تھیں ان سب کو موقوف کر دیا ہے۔ دوسری عرب حکومتوں کو بھی یہ ضرور سوچنا چاہئے کہ چونکہ وہ اسلام کے اولین مخاطب ہیں اور دوسروں تک اسلام کی روشنی ان کے واسطہ ہی سے پہونچی ہے، اس لئے ان کی کسی بھی غلطی کے برے اثرات نہ صرف مسلم معاشرہ پر پڑتے ہیں، بلکہ وہ اسلام کے دائرے کے وسیع ہونے میں بھی رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔

ہندوستان کے فرقہ پرست تو یہ پروپگنڈہ کر رہے ہیں کہ پٹرو ڈالر کے سہارے مسلمان ہندوستان کے غریب طبقے اور ہریجنوں میں اپنا دائرہ وسیع کر رہے ہیں، اور ہمارا احساس یہ ہے کہ اس کی وجہ سے ہمارا دائرہ وسیع ہونے کے بجائے سمٹ رہا ہے، اور ہماری بہت سی بنیادی اسلامی قدریں روز بروز مجروح ہوتی جا رہی ہیں۔ اسلام کبھی دولت و حکومت کے ذریعہ نہ تو پھیلا ہے اور نہ آج پھیل سکتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنی اخلاقی قوت سے پھیلا ہے، اور آج بھی اگر وہ پھیل رہا ہے تو اسی کے سہارے پھیل رہا ہے۔ جاپان، یورپ اور امریکہ کے مختلف حصوں میں آج اسلام کو جو مقبولیت حاصل ہو رہی ہے تو وہاں کون سی غربت ہے جس کی وجہ سے لوگ پٹرو ڈالر کی لالچ میں اسلام قبول کر رہے ہیں؟ ہندو فرقہ پرستوں کو مسلمانوں پر الزام تراشی کے بجائے خود اپنے معاشرہ کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہئے اور صدیوں سے ایک طبقہ پر ہندوؤں کا اونچا معاشرہ جو ظلم کرتا رہا ہے اسے دور کر کے انہیں اپنے گلے سے لگانا چاہئے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے یا نہیں کر پاتے ہیں تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ نہ تو فرقہ وارانہ ذہن پیدا کر کے ان کو ہندو معاشرہ سے نکلنے سے روکا جا سکتا ہے، اور نہ پٹرو ڈالر کی بے جا الزام تراشی اور فسادات کی آگ بڑھا کر اس میں کوئی رکاوٹ پیدا کی جا سکتی ہے۔ کاش اس پہلو سے ہندوؤں کا سنجیدہ طبقہ سوچنے کی کوشش کرتا۔

جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ فاروق عبداللہ اس سے پہلے کئی بار فرقہ پرور جماعتوں پر پابندی عائد کرنے کی بات کہہ چکے تھے۔ اب انہوں نے اس کے لئے آرڈی نینس بھی پاس کرالیا ہے، کہا تو یہ جارہا ہے کہ یہ آرڈی نینس فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے پاس کیا گیا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ وہ اپنے حریفوں کو زک پہونچانا چاہتے ہیں۔ فرقہ وارانہ جماعتوں کے سلسلہ میں عام طور پر آر۔ ایس۔ ایس کے ساتھ جماعت اسلامی کا نام بھی لیا جاتا ہے، مگر عملاً ہوگا یہ کہ آر۔ ایس ایس اور اس کی پروردہ بھارتیہ جنتا پارٹی کو وزیر اعلیٰ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ وہ اپنا کام کرتی رہے گی، البتہ اس کی ساری زد بے چاری جماعت اسلامی اور جمعیۃ الطلبہ پر پڑے گی۔ جماعت اسلامی سے بعض باتوں میں اختلاف کے باوجود اس کے بارے میں یہ کہنا ہم انتہائی غلط سمجھتے ہیں کہ وہ فرقہ وارانہ جماعت ہے، یعنی آر۔ ایس۔ ایس کی طرح وہ کسی طبقہ سے نفرت پیدا کرتی ہے۔ یا وہ کسی طبقہ کی جان و مال یا عزت و آبرو سے کھیلنا چاہتی ہے۔ ۳۵ برس کے اندر ہندوستان میں ہزاروں فسادات ہوچکے ہیں، اور ان میں آر۔ ایس۔ ایس ہی کے لوگ نہیں بلکہ حکمراں جماعت کے افراد اور اس کی پولیس اور پی اے سی سب کا دامن مظلوموں کے خون سے داغدار رہا ہے۔ مگر ان کو کبھی فرقہ پرست قرار دینے کی ہمت نہیں پڑی۔ اور اگر کسی کمیشن نے ان کو فساد میں ملوث قرار دیا بھی تو ان کے خلاف کسی صوبہ کی حکومت کوئی قانونی قدم نہیں اٹھا سکی۔ اس کے برخلاف جماعت اسلامی جس کا دامن ان جرائم سے ہمیشہ پاک رہا ہے، وہ انسان کشی کے بجائے ہمیشہ انسان دوستی اور کردار سازی کا نہ صرف اعلان کرتی رہی ہے بلکہ عملاً اس کا ثبوت دیتی رہی ہے۔ لیکن چونکہ اس کا تعلق مسلمان اقلیت سے ہے، اس لئے اس کو کمزور سمجھ کر ہمیشہ اس کی گردن زنی کی کوشش کی جاتی ہے۔ فاروق عبداللہ صاحب کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ظالموں اور مظلوموں دونوں کو وہ ایک صف میں نہ کھڑا کریں، ورنہ ان کے اوپر بھی ایک ہستی ہے جو ظالموں کے بجائے مظلوموں کا ساتھ دیتی ہے۔ خود ان کے والد کی زندگی اس کا ایک کھلا ہوا ثبوت ہے۔

بقیہ نئی کتابیں

انکی آپ بیتی میں نہ صرف یہ کہ ان کے کارناموں کی پوری تفصیل آگئی ہے۔ بلکہ زندگی کے نشیب و فراز کے بہت سے پہلو بھی سامنے آگئے ہیں۔ اسکے پڑھنے والے کو یہی نہیں کہ اکتاہٹ نہیں ہوتی بلکہ سنجیدہ ناول جیسی لذت بھی ملتی ہے۔ اس سے پہلے مختلف شخصیتوں پر الفرقان کے کئی نمبر شائع ہوچکے ہیں، اس نمبر سے ان میں ایک نیا اضافہ ہوا ہے۔ اب شخصیات کے بجائے مختلف موضوعات پر الفرقان کے خصوصی نمبر شائع ہوتے تو یہ شاید زیادہ مفید خدمت ہوتی۔

(مجیب اللہ ندوی)

نماز، روزہ اور زکوٰۃ تینوں عبادتیں فرض ہیں اور اپنی اپنی اہمیت اور عبادت اور فرض ہونے کی حیثیت سے تینوں میں کوئی فرق نہیں ہے، مگر بعض دوسری حیثیتوں سے ان میں کچھ فرق و امتیاز ضرور ہے۔

(۱) پہلا فرق تو یہ ہے کہ نماز روزہ جسمانی عبادتیں ہیں اور زکوٰۃ مالی عبادت ہے، یعنی نماز و روزہ کے تمام ارکان آدمی اپنے جسم و اعضاء سے ادا کرتا ہے، اور زکوٰۃ کا تعلق اس کے مال سے ہے یعنی یہ فرض اس وقت ادا ہوتا ہے، جب آدمی اپنے مال کا ایک متعین حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کردے۔

(۲) دوسرا فرق یہ ہے کہ نماز اور روزہ ہر مسلمان پر فرض ہیں، چاہے وہ امیر ہوں یا غریب، اس کے گھر میں کھانے کو ہو یا نہ ہو، وہ جھونپڑی میں رہتا ہو یا کوٹھی میں۔ اور زکوٰۃ صرف ان لوگوں پر فرض ہے جو کھانے پینے سے مطمئن ہوں اور جن کے پاس روزہ مرہ کی ضروریات میں خرچ کرنے کے بعد بھی کچھ روپیہ پیسہ بچ گیا ہو۔

(۳) تیسرا فرق یہ ہے کہ نماز اور روزہ صرف خدا کا حق ہیں، اور زکوٰۃ میں خدا کے حق کے ساتھ بندوں کا حق بھی ہے۔ یعنی نماز اور روزہ کے ذریعہ آدمی اپنا وہ حق ادا کرتا ہے جو اس پر خدا کا بندہ ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے۔ اس سے خدا کے دوسرے بندے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، اور اگر پہنچتا ہے تو خود نماز پڑھنے والوں ہی کو جسمانی اور روحانی فائدہ پہنچتا ہے۔ لیکن زکوٰۃ اس حیثیت سے تو خدا کا حق ہے کہ بندہ اپنے مال کو خدا کی امانت سمجھتا ہے، اور جہاں اس سے خرچ کرنے کے لئے کہا جاتا ہے خرچ کر دیتا ہے۔ لیکن وہ جو کچھ خرچ کرے گا وہ خدا کے بندوں ہی پر خرچ کرے گا، اس حیثیت سے وہ بندوں کا حق بھی ہوا، اب اگر کوئی شخص زکوٰۃ نہ دے تو پھر ایک طرف اس نے خدا کے حق پر ڈاکہ

ڈالا اور دوسری طرف نہ جانے اس نے کتنے بندگان خدا کا حق مارا۔

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت جسمانی عبادات میں جس طرح نماز اور روزہ کی قرآن وحدیث میں بار بار تاکید آئی ہے، اسی طرح مالی عبادات میں زکوٰۃ کی بار بار تاکید آئی ہے، قرآن میں بیسیوں جگہ ذکر ہے کہ

اقیموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ — نماز قائم کرو، اور زکوٰۃ دیا کرو۔

قرآن میں ہے کہ جو لوگ خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال اس دانے کی ہے جس میں سات بالیاں نکلیں اور ہر ایک میں سو سو دانے ہوں، گویا زکوٰۃ کے ایک پیسہ کے بدلے سات سو نیکیاں ملتی ہیں۔ جو لوگ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اور بخل سے کام لیتے ہیں ان کے بارے میں سخت عذاب کی خبر دی گئی ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَ الْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (سورۃ توبہ)	جو لوگ حرص سے سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ایسے لوگوں کو ایک بڑے دردناک عذاب کی خبر دے دیجئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی زکوٰۃ ادا کرنے کی بے حد تاکید فرمائی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب اوپر والی آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ نے یہ سمجھا کہ ان کو مال جمع کرنے سے بالکل ہی روک دیا گیا ہے اس لئے جو کچھ ان کے پاس ہے وہ سب خدا کی راہ میں خرچ کر دینا چاہئے، حالانکہ وہ اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا چکے تھے، مگر یہ بات ان کے اوپر شاق گذری اور وہ گھبرائے کہ اگر ایسا کرنا فرض ہے تو دقت ہوگی، حضرت عمرؓ نے جب یہ عام گھبراہٹ دیکھی، تو خدمت نبویؐ میں اس کی تفسیر پوچھنے گئے اور صحابہؓ کی پریشانی کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ:

ان اللہ لم یفرض الزکوٰۃ الا لیطیب ما بقی من اموالکم وانما فرض المواریث (ابوداؤد)	خدا نے زکوٰۃ صرف اس لئے فرض کی ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد تمہارے پاس جو مال بچ جائے وہ اس کو پاک کر دے، اور جو کچھ باقی رہ جائے اس میں وراثت جاری کی

ہے۔ یعنی اگر سارا مال خرچ کرا دینا مقصود ہوتا تو اللہ تعالیٰ وراثت نہ جاری کرتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ ادا کر دینے کے بعد آدمی کا تمام مال پاک صاف ہو جاتا ہے آپؐ فرماتے تھے کہ میرے پاس اُحد پہاڑ کے برابر سونا ہو تو میں چاہوں گا کہ تین دن میں سب خیرات کر دوں آپؐ نے ایک مرتبہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ " اے بلال خرچ کرو، عرش کے مالک سے کمی کا اندیشہ نہ کرو، یعنی خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے کمی نہیں ہوتی۔ بلکہ تم جس کی راہ میں خرچ کر رہے ہو وہ زمین و آسمان کا مالک ہے"۔ جن لوگوں پر زکوٰۃ فرض ہے اور وہ ادا نہیں کرتے ان کے بارے میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ جس کے پاس مال ہو اور وہ اس کی زکوٰۃ نہ دیتا ہو تو قیامت کے دن اس کے لئے آگ کی تختیاں بنائی جائیں گی اور دوزخ کی آگ میں ان کو گرم کر کے پھر اس کے دونوں پہلو، پیٹھ اور پیشانی کو داغا جائے گا، اور جب یہ ٹھنڈی ہو جائے گی تو پھر ان کو گرم کر کے داغا جائے گا۔ (مشکوٰۃ)

آپؐ نے فرمایا ہے کہ جن لوگوں کو خدا نے مال دیا ہے اور وہ اس کی زکوٰۃ نہیں دیتے۔ تو قیامت کے دن ان کا یہ مال ایک بہت ہی زہریلے اور گنجے سانپ کی شکل میں نمودار ہو گا، اور ان کی گردن میں لپٹ جائے گا، اور ان کے دونوں جبڑوں کو نوچے گا، اور کہے گا

انا مالك، انا كنزك (بخاری) میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں،

ایک مرتبہ آپؐ کی خدمت میں دو عورتیں آئیں جن کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن پڑے ہوئے تھے، آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا کہ ان کی زکوٰۃ دی ہے؟ بولیں نہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم لوگوں کو یہ پسند ہے کہ اس کے بدلے تمہیں آگ کے کنگن پہنائے جائیں؟ بولیں نہیں یا رسول اللہ! آپؐ نے فرمایا کہ اس کی زکوٰۃ دیا کرو۔ (ترمذی)

عورتوں کو زیورات سے بڑی محبت ہوتی ہے ان کو اس حدیث پر غور کرنا چاہئے۔

جو لوگ مال رکھتے ہوئے زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ہیں، وہ قیامت میں اپنے لئے کتنا بڑا عذاب تیار کر رہے ہیں۔ دنیا میں تو اسی مال کی وجہ سے آدمی چین و آرام کرتا ہے، اور بیماری و مصیبت کی تکلیفوں سے بچتا ہے، لیکن اگر اس نے زکوٰۃ نہ ادا کی تو یہی مال آخرت میں اس کے لئے آرام

وراحت کے بجائے نہ جانے کتنی مدت کے لئے آگ کا بستر اور تکلیف پہنچانے کا سبب ہوجائیگا۔
زکوٰۃ کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ آپ کی وفات کے بعد کچھ نئے دیہاتی مسلمانوں نے اس کی اہمیت کو سمجھا نہیں اور اس کو ادا کرنے سے انکار کر دیا، جب اس کی اطلاع حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہوئی تو آپ نے ان کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو وہ آپ کی خدمت میں آئے اور کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمہ گو مسلمان کے بارے میں فرمایا ہے۔ کہ ان سے جنگ نہیں کی جاسکتی۔ حضرت صدیق رضؓ نے فرمایا کہ ہاں یہ صحیح ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرط بھی لگا دی ہے کہ اِلاَّ بِحَقِّہَا مگر جب کوئی کلمہ گو کلمہ کا حق ادا نہ کرے۔ تو اس سے جنگ کی جائے گی، اور زکوٰۃ بھی اسی کلمہ کا ایک حق ہے جس سے یہ انکار کر رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ ایسا حق ہے کہ اس کے لئے جہاد بھی کیا جاسکتا ہے۔
اخروی فائدے کے علاوہ زکوٰۃ کے بیشمار دنیاوی فائدے بھی ہیں، اس سے غریبوں کی مدد ہوتی ہے، ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، مال کی محبت کم ہوتی ہے، اور مال کی محبت کم ہوتی ہے تو آدمی میں اخلاق، شرافت اور خاکساری پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو اس سے دنیا کے غریبوں اور کم آمدنی رکھنے والے لوگوں کو کتنا فائدہ ہوسکتا ہے اس کا اندازہ کیجئے کہ ہندوستان کی پوری آمدنی کا اندازہ دس کھرب سے زیادہ اور پاکستان کی آمدنی کا اندازہ دو کھرب سے زیادہ ہے، اگر ان دونوں جگہوں پر زکوٰۃ کا نظام جاری ہو جائے تو ہندوستان میں ہر سال دس ارب روپئے اور پاکستان میں تقریباً پانچ ارب روپئے اس مد میں نکلیں گے۔ اس رقم سے دونوں ملکوں کے کتنے غریبوں کو کسی نہ کسی کام سے لگایا جاسکتا ہے، اور ان کو ضرورت کے وقت قرض بھی دیا جاسکتا ہے، اور اس پر نہ اس سے سود لیا جائے گا، اور نہ ہی ادا کرنے کی صورت میں ان کی جائداد ہی قرق کی جائے گی۔ [1]

زکوٰۃ کے معنی اور اس کی تعریف عربی زبان میں زکوٰۃ کے معنی پاک ہونے اور بڑھنے کے ہیں، اور شریعت میں خالص خدا کی خوشنودی کے لئے شارع کے حکم کے مطابق ایک مقررہ اور متعین مال کسی مستحق مسلمان کو دے دینے کا نام زکوٰۃ

---

[1] یہ بات محض تفہیم کے طور پر لکھی گئی ہے، اس بات کو اعداد و شمار اور باشندوں کے مسلم اور غیر مسلم ہونے کے تناسب سے نہ جانچا جائے

نے لئے اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ اس کے عوض میں زکوٰۃ دینے والا زکوٰۃ پانے والے سے کوئی فائدہ نہ اٹھائے۔ اگر وہ کسی طرح کا فائدہ اٹھائے گا یا اس کی امید رکھے گا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ شریعت میں اس مالی عبادت کو زکوٰۃ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس سے آدمی کا بقیہ مال پاک ہو جاتا ہے، اور اس کے ذریعہ اس کی نیکیوں میں زیادتی ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ آخرت میں عذاب دوزخ سے بچتا ہے۔

زکوٰۃ کا حکم ہر سال اس عاقل بالغ مسلمان پر زکوٰۃ فرض ہے جو صاحب نصاب ہو، اور اس مال پر پورا سال گذر گیا ہو۔ اس کی فرضیت کا انکار کرنے والا کافر، اور فرض ہوتے ہوئے اس کا نہ ادا کرنے والا فاسق اور سخت گنہگار ہوگا۔ اور اسلامی حکومت میں اس کو سخت سزا دی جائے گی۔[1]

صاحب نصاب ہونے کا مطلب سونا، چاندی یا مال اسباب کی وہ مقدار جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، اس کو شریعت میں نصاب کہتے ہیں۔ اور جس کے پاس یہ مقدار ہوتی ہے، اس کو صاحب نصاب کہتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی کے پاس ساڑھے چھتیس تولے (۴۲۰ گرام) چاندی یا سوا پانچ تولے (۶۰ گرام) سونا ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اس کو اس کا چالیسواں حصہ نکالنا ہوگا۔ اب چاندی اور سونے کی اس مقدار کو زکوٰۃ کا نصاب اور جس کے پاس وہ ہے اسے صاحب نصاب کہیں گے۔[2]

---

[1] درمختار باب الزکوٰۃ ج ۲۔ [2] سونے اور چاندی کے نصاب کے بارے میں علماء کی تحقیق میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ اور یہ اختلاف اس لئے ہے کہ حدیث میں درہم اور مثقال کے الفاظ آئے ہیں۔ اور ان دونوں سکوں کو ہندوستانی تولہ و ماشہ سے وزن کرنے میں تھوڑا بہت فرق ہو گیا ہے۔ راقم نے مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی اور مولانا عبدالحئی صاحب فرنگی محلی رح کی تحقیق کو دو وجہ سے ترجیح دی ہے۔ ایک اس لئے کہ ان کا طریقہ حساب بہت واضح ہے، دوسرے زکوٰۃ وغیرہ میں وہ صورت اختیار کرنی بہتر ہے جس میں غریبوں کا فائدہ زیادہ ہو، اور اس مقدار میں ان کا فائدہ زیادہ ہے۔ سابق ریاست حیدرآباد میں بھی اسی پر عمل درآمد تھا، دوسرے علماء نے ۵۲ ½ تولے چاندی اور ۷ ½ تولے سونے کو نصاب قرار دیا ہے۔ جو لوگ دوسرے علماء کی تحقیق کے مطابق زکوٰۃ ادا کرنا چاہیں وہ اسی کے مطابق ادا کریں انشاءاللہ ان کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ اس بارے میں کسی تو تو میں میں یا بحث کی ضرورت نہیں ہے۔

کن چیزوں پر زکوٰۃ فرض ہے

وہ چیزیں جن پر زکوٰۃ فرض ہے، وہ پانچ قسم کی ہیں:
(۱) چاندی، سونا اور ان کی بنی ہوئی تمام چیزیں، مثلاً زیورات برتن، سکے وغیرہ۔ (۲) ہر قسم کا مال تجارت (۳) نقد روپئے، خواہ روپئے کی شکل میں ہو یا نوٹ پاؤنڈ، ڈالر، سیونگ سرٹیفکٹ بانڈ اور سرکاری سند کی شکل میں (۴) زمین کی پیداوار خواہ غلہ ہو یا پھل یا ترکاری وغیرہ (۵) مویشی جو تجارت کی غرض سے یا نسل بڑھانے یا دودھ حاصل کرنے کی غرض سے رکھے گئے ہوں، اگر وہ نصاب کے مقدار کو پہنچ جائیں۔ تو ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اب ان میں سے ہر ایک کا بیان اور ادا کرنے کا طریقہ الگ الگ لکھا جاتا ہے

(۱) چاندی اور سونے کی زکوٰۃ

سونے، چاندی کی زکوٰۃ میں چالیسواں حصہ دینا فرض ہے۔ اگر کسی کے پاس دو سو درہم ہیں یعنی ۵۲½ تولے چاندی یا اس کے زیورات موجود ہوں تو اس کو اس کا چالیسواں حصہ $\frac{1}{40}$ یعنی دس ماشے ساڑھے سات رتی زکوٰۃ دینی چاہئے۔ اگر اس سے کم ہے تو اس کے اوپر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔

اسی طرح جس کے پاس بیس مثقال یعنی پانچ تولہ ڈھائی ماشہ سونا (۷½) یا اس کے زیورات موجود ہوں، اس کو اس کا چالیسواں حصہ یعنی ایک ماشہ ساڑھے چار رتی زکوٰۃ دینی چاہئے، اس سے کم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں یہ مسائل ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

(۱) سونا اور چاندی کا نصاب الگ الگ ہے، یعنی دونوں میں سے جو چیز بھی نصاب کو پہنچ جائے اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ (۲) سونے اور چاندی کی زکوٰۃ ایک سال گذر جانے کے بعد واجب ہوتی ہے، یعنی چاندی اور سونا یا ان کے زیورات جو ان کے پاس ہیں ان کو اس کے پاس آئے ہوئے ایک سال ہوگیا ہو۔ (۳) سونے اور چاندی کی زکوٰۃ باقاعدہ سنار سے وزن کرا کے یا خود وزن کر کے دینا چاہئے۔ زکوٰۃ میں دو چار روپیے فاضل نکل جائیں تو بہتر ہے، اگر کم ہوگا تو گناہ ہوگا۔ (۴) سونے اور چاندی کی بنی ہوئی جتنی چیزیں ہوں ان سب کا حکم سونے اور چاندی کا ہے۔ مثلاً زیورات ہوں یا چاندی کے برتن ہوں، یا سچا گوٹہ لچکا یا سونے چاندی کے تار کا کام کپڑوں پر ہو، خواہ وہ چیز میں استعمال کی جاتی ہوں یا نہ کی جاتی ہوں، اگر بقدر نصاب ہیں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے (۵) اگر سونے چاندی میں یا اس کی بنی ہوئی چیزوں میں کچھ ملاوٹ ہو تو اگر یہ ملاوٹ چاندی یا سونے سے کم

ہو تو اس کا حکم چاندی اور سونے ہی کا ہے۔ اگر زیادہ ہو تو جو چیز ملی ہوئی ہے وہ اسی کے حکم میں ہے
مثلاً کسی کے پاس چالیس تولے چاندی کے زیورات ہیں جس میں دس تولے رانگے یا تانبے کی ملاوٹ
ہے تو اس کا حکم چاندی کا ہے۔ لیکن اگر چالیس تولے میں اکیس تولے رانگا یا تانبا ہے تو اس کا حکم تانبے
یا رانگے کا ہے۔ اسی طرح سونے کو بھی سمجھ لینا چاہئے۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۴۰)
اسی طرح کہیں سونے اور چاندی کے سکے چلتے ہوں تو ان کا حکم بھی یہی ہے کہ اگر ان میں ملاوٹ
کم ہے تو ان کا حکم سونے اور چاندی کا ہے۔ لیکن اگر ان میں برائے نام سونا یا چاندی یا بالکل نہیں ہے
تو ان کا حکم آگے آتا ہے۔ (۶) کسی کے پاس نہ تو نصاب کے برابر چاندی ہے اور نہ سونا بلکہ تھوڑی
تھوڑی دونوں چیزیں ہیں تو دونوں کی قیمتوں کا اندازہ کرنا چاہئے۔ اگر دونوں کی قیمت نصاب کے بقدر
ہو جاتی ہے تو پھر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ مثلاً کسی کے پاس پچیس تولے چاندی کا زیور ہے اور بارہ آنہ
بھر سونے کا آکرن یا کوئی اور زیور ہے تو بارہ آنہ بھر سونے کی قیمت اس زمانے میں دو ہزار روپئے
ہے اور اتنے روپئے کی چاندی فرض کیجئے ۵۴ تولے ملتی ہے تو اب وہ ۵۴ تولے چاندی کے زیورات
میں بارہ آنے بھر سونے کی قیمت ملانے کے بعد وہ صاحب نصاب ہو جائے گا، اور اس کو ۴۰ تولے
چاندی کی زکوٰۃ دینی چاہئے۔ اگر سونے یا چاندی کا بھاؤ کم یا زیادہ ہو جائے تو اسی حساب سے دینا
چاہئے، اگر دونوں کے ملانے کے بعد بھی نصاب کی مقدار پوری نہ ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔
(۷) سونے اور چاندی کی زکوٰۃ میں سونا اور چاندی دے، یا اس کی قیمت دونوں صورتیں
جائز ہیں۔

سکوں کی قیمتیں اور ان کی زکوٰۃ

(۲) سکے خواہ کسی صورت میں ہوں ان پر زکوٰۃ واجب ہے مثلاً روپئے ہوں، ریزگاری ہو، نوٹ ہوں، یا بانڈ ہو، اگر
ان کا نصاب پورا ہو جائے تو ان پر زکوٰۃ دینی واجب ہے، موجودہ زمانے میں سکے کئی طرح کے
ہوتے ہیں۔ ایک تو سونے اور چاندی کے سکے مثلاً ڈالر، پونڈ، یا سعودی عرب کے ریال اور
دینار وغیرہ، دوسرے کاغذی سکے، مثلاً نوٹ اور بانڈ وغیرہ، تیسرے دوسری دھاتوں کے سکے
مثلاً موجودہ دور میں ہندوستان و پاکستان کے سکے، نوٹ، روپئے، ریزگاریاں وغیرہ ہیں، سونے
چاندی کے سکوں کا حکم تو وہی ہے جو چاندی اور سونے کا ہے، کاغذی، یا دوسرے دھاتوں کے

سکوں کی مختلف صورتیں ہیں، لیکن اس کی جو صورت بھی ہو اگر وہ اتنی مقدار میں ہو کہ ان کا نصاب پورا ہو جائے تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے۔

مختلف دھاتوں یا کاغذی سکوں کا نصاب اگر نوٹ، بانڈ سیونگ سرٹیفکٹ یا چاندی، سونے کے علاوہ کسی اور چیز کے سکے اتنی تعداد میں کسی کے پاس جمع ہو جائیں۔ جتنے میں چار سو چالیس گرام ۔ ۔ ۔ ۔ چاندی ملتی ہے تو ان کا چالیسواں حصہ ۱/۴۰ زکوٰۃ میں نکال دینا واجب ہے، مثلاً فرض کیجئے کہ موجودہ سکے کے اعتبار سے ہندوستانی روپے بھر کی ایک تولہ چاندی ملتی ہے تو ۴۴۰ گرام کی چاندی کی قیمت چار سو روپے سے زیادہ ہوگی — تو اگر کسی کے پاس ۴۰۰ روپے ضرورت سے زائد موجود ہوں اور ان پر سال گذر جائے تو سال کے آخر میں اس کا ۱/۴۰ تقریباً ۱۰ روپئے نکال دینا چاہئے۔ اسی طرح اب اس سے جتنا زائد ہوگا اس میں ۱/۴۰ نکالا جائے گا، مثلاً سو میں ڈھائی روپئے، ہزار میں پچیس روپئے، دو ہزار میں پچاس روپئے دس ہزار میں دو سو پچاس روپئے۔

روپیوں کی اور سونے چاندی کی زکوٰۃ میں دو باتیں بہت ضروری ہیں:

(۱) یہ کہ وہ ضرورت سے زائد ہوں (۲) یہ کہ اس روپئے کو اس کے پاس آئے ہوئے ایک سال ہو چکا ہو

ضرورت سے زائد ہونے کا مطلب ضروریات دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک بنیادی ضرورتیں جیسے کھانا، کپڑا، مکان، علاج، پیشہ ور کے اوزار وغیرہ مثلاً کسی کے پاس چار سو روپئے ایک سال سے رکھے ہوئے ہیں، لیکن اس کا مکان بارش میں گر گیا ہے اور اس کو سخت تکلیف ہے اور اس کی مرمت میں سب روپئے خرچ ہو جائیں گے، تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے یا اس کا مکان بہت تنگ ہے، اور لڑکی، بہو وغیرہ بہت سے ہیں اور ان کو سونے بیٹھنے کی تکلیف ہوتی ہے، اس لئے اس کو مکان بنانے کی ضرورت ہے اور مکان بنانے میں یہ روپئے صرف ہو جائیں گے تو ایسے روپئے پر بھی زکوٰۃ نہیں ہے۔ اسی طرح اگر وہ کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہے، اور اس کے پاس اتنا روپیہ ہے کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، لیکن وہ ان روپیوں کو اپنے علاج میں خرچ کرنا چاہتا ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، یا اس کے پاس پانچ سو روپئے ہیں مگر اس کی تنخواہ کم ہے اور ہر مہینہ میں اس میں سے دو چار روپئے کھانے کپڑے میں خرچ کرتا رہتا ہے اور سال کے آخر میں

اس کے پاس اتنا نہیں رہ جاتا جتنے پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔
اسی طرح کسی مسلمان بڑھئی کے پاس ۵۰ روپئے ہیں مگر اس کو اپنے پیشے کے لئے اتنے ہی کا یا اس سے کچھ کم کا اوزار خریدنا ہے تو اس روپئے پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہے لہ

دوسری غیر بنیادی یا کم اہم ضرورتیں، مثلاً عیش و آرام یا شادی بیاہ، ختنہ، عقیقہ یا کسی اور تقریب میں دھوم دھام کرنے کے لئے روپیہ رکھا ہے، تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اسی طرح کسی نے اپنے بچے کی اعلیٰ تعلیم کے لئے روپئے رکھے ہیں تو ان روپیوں کی زکوٰۃ دینی بھی واجب ہے۔

لیکن اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ وہ ضرورت جائز بھی ہو اور بروقت موجود ہو، اگر یہ ضرورت جائز تو ہو مگر بروقت موجود نہ ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی، مثلاً کوئی شخص اس خیال سے روپیہ جمع کرتا ہے کہ ہم بوڑھے ہونے کے بعد اس کو خرچ کریں گے، یا لڑکی کی شادی کریں گے یا پختہ مکان بنوائیں گے، یا تجارت کریں گے، یا اپنے عیش و آرام کا سامان خریدیں گے، تو ان تمام صورتوں میں اس کو زکوٰۃ دینی واجب ہے، کیونکہ یہ ضرورت جائز تو ہے مگر اس وقت موجود نہیں ہے۔

اسی طرح کوئی حج کرنے کے لئے روپیہ جمع کرے، کتابیں خریدنے کے لئے روپئے جمع کرے، بچے کو دنیاوی یا دینی تعلیم دلانے یا اور کسی جائز کام کے لئے روپئے جمع کرے تو اس صورت میں اس کو روپیوں کی زکوٰۃ واجب ہے۔

سال گذرنیکا مطلب سال گذرنے کا مطلب یہ ہے کہ پورے سال بھر اس کے پاس اتنا روپیہ جمع رہا ہو جتنے روپیہ میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں چند ضروری باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔

(۱) اگر کسی کے پاس شروع سال میں اتنا روپیہ تھا جتنے پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ لیکن سال پورا ہونے سے پہلے وہ خرچ ہو گیا یا چوری ہو گیا تو اس روپئے پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

(۲) اگر کسی کے پاس شروع سال اور آخر سال میں تو زکوٰۃ کے بقدر روپیہ تھا مگر بیچ میں کسی

لہ صاحب درمختار کے اس جملہ "و فارغ عن حاجتہ الاصلیۃ" کی تشریح میں علامہ شامی نے ردالمحتار میں جو تفصیل کی ہے، یہ بیان اسی سے ماخوذ ہے متن میں جہاں اس مسئلہ کا ذکر ہے اس سے آگے چند صفحے کے بعد علامہ شامی نے اس کی تفصیل کی ہے۔

وجہ سے اس کے پاس روپیہ کم ہوگیا تھا، تو شروع اور آخر میں جتنا روپیہ اس کے پاس تھا اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی، مثلاً کسی کے پاس محرم کے مہینے میں ۵۰۰ روپئے تھے اور رمضان میں اس میں سے ۲۰۰ روپئے خرچ یا چوری ہوگئے اور پھر وہ ذوالحجہ میں ۵۰۰ روپئے اس کے پورے ہوگئے تو ان چند مہینوں کے نہ ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوگی، بلکہ اس کو پورے ۵۰۰ روپئے کی زکوٰۃ دینی واجب ہے غرض یہ کہ اعتبار شروع سال اور آخر سال کا کیا جائے گا، درمیان کا نہیں [۱]

(۳) اگر شروع سال میں کسی کے پاس ۵۰۰ روپئے تھے اور آخر سال تک ۶۰۰ سو روپئے ہوگئے تو پورے ۶ سو روپئے کی زکوٰۃ اس کو دینی چاہئے۔ اسی طرح آخر سال میں جتنا روپیہ بڑھے گا سب پر زکوٰۃ دینی واجب ہوگی۔ اس صورت میں شروع سال میں جتنا روپیہ تھا اس کو اصل قرار دیا جائے گا، اور جتنا بڑھتا جائے گا زکوٰۃ بڑھتی جائے گی، اب اگر شروع سال میں اس کے پاس صرف ۲۰۰ روپئے تھے اور آخر سال میں ۵۰۰ ہوگئے تو جب سے ۵۰۰ ہوئے ہیں اس وقت سے سال کی ابتدا سمجھی جائے گی۔ یعنی جب سے وہ صاحب نصاب ہوا ہے اس کے بعد سے جتنی مقدار سال بھر میں بڑھے گی پوری تعداد پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

اگر کوئی روپیہ کسی مشترک تجارت یا کسی کارخانہ میں لگا ہوا ہو اور سال بہ سال اس کا منافع ملتا ہو تو اصل سرمایہ اور منافع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

تجارتی و صنعتی سامان کی زکوٰۃ

اگر کسی کے پاس تجارتی یا صنعتی سامان ہو تو اس کی زکوٰۃ دینی بھی واجب ہے، کپڑا، بساطے کا سامان، کتابیں، کاغذ، میوہ، مسالہ، غلہ، لکڑی، لوہا، تانبا، پیتل، ایلومونیم، پلاسٹک یا کسی چیز کی دوکان یا کارخانہ ہے یا اس میں کوئی سامان تیار ہوتا ہے تو ان تمام چیزوں پر زکوٰۃ واجب ہے [۲] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضی کو سامان تجارت کی زکوٰۃ نکالنے کی تاکید فرماتے تھے۔ مگر اس کے لئے دو شرطیں ہیں (۱) ایک یہ کہ ان پر پورا سال گذر جائے۔ سال گذرنے کا مطلب وہی ہے جس کی تفصیل اوپر کی گئی ہے یعنی اگر وہ شروع سال میں صاحب نصاب تھا تو پھر اس میں جتنا اضافہ درمیان سال میں ہوگا آخر میں ان سب پر زکوٰۃ واجب ہوگی

---

[۱] والشرط تمام النصاب فی طرفی الحول ج ۲ ص ۱۴ رد المحتار۔ [۲] الجوہرۃ النیرۃ ص ۱۲۹ ان کانت للتجارۃ فیہا زکوٰۃ التجارۃ بالاتفاق۔

(۲) دوسرے یہ کہ ان سامانوں میں تجارت کی نیت ہو، اگر یہ چیزیں اپنے استعمال کے لئے یا آرائش کے لئے جتنی بھی جمع کر لی جائیں، اگرچہ بلا ضرورت زیادہ سے زیادہ سامان جمع کرنا بجائے خود ناپسندیدہ ہے لیکن ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، مثلاً آپ کے گھر میں بڑی بڑی دیگیں، تانبے کے پتیلے اور پتیلیاں، فرنیچر، اونی اور سوتی قیمتی کپڑے یا غلہ اگر موجود ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے خواہ وہ کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں۔

مشینوں اور اوزار کے احکام

اگر کسی کے پاس کارخانہ ہے اور اس میں کوئی چیز تیار ہوتی ہو تو اس نے جتنا مال فروخت کیا اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ اور جو اس نے اسٹاک کیا ہے اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے، البتہ جو مشینیں[1] اس کارخانہ میں لگی ہوئی ہیں یا سامان تیار کرنے کے اور دوسرے جو آلات ہیں ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اسی طرح جو شخص کوئی پیشہ کرتا ہے اس کے استعمالی اوزار پر چاہے وہ کتنے ہی قیمتی ہوں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ البتہ اگر وہ اوزار تجارت کے لئے رکھتا ہے یا بنا کر بیچتا ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، مثلاً گھڑی ساز، بڑھئی، لوہار، موٹروں اور سائیکلوں کی مرمت کرنے والے یا دوسرے پیشہ وروں کے استعمالی اوزار سب کا یہی حکم ہے، یعنی ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

سامان تجارت کا نصاب

سامان تجارت کا نصاب بھی وہی ہے جو روپئے پیسے کا ہے یعنی اگر تجارتی سامان کی قیمت ______ ۶۱۲ گرام، چاندی کی قیمت کے برابر پہنچ جائے تو زکوٰۃ واجب ہو جائے گی، اور اس کے بعد جتنا مال بڑھتا جائے گا اس کا حساب کر کے سب کا ۱/۴۰ زکوٰۃ دینی پڑے گی۔ گویا اصل معیار اس میں چاندی اور سونا ہے۔ ان میں سے کسی ایک کی قیمت کے مطابق زکوٰۃ دی جائے گی۔

اگر کوئی روپئے پیسے میں یا سامان تجارت میں چاندی کے بجائے سونے کی قیمت لگائے تو اس کے لئے ایسا کرنا جائز ہوگا، لیکن مناسب یہی ہے کہ چاندی کی قیمت لگائی جائے کیونکہ اس

---

[1] راقم کو اس سلسلہ میں علماء کی تصریحات نہیں ملیں مگر حدیث لا صدقۃ فی العوامل کی روشنی میں یہ حکم لکھا گیا ہے، نیز علماء پیشہ وروں کے اوزار کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کرتے ہیں، یہ مشینیں بھی چیزیں تیار کرنے کا آلہ ہیں، اس لئے ان کے اوپر ان کو قیاس کر لینا بھی صحیح ہے۔ منہ

صورت میں زکوٰۃ پانے والوں کا فائدہ ہے، اور سونے کی قیمت لگانے میں اپنا فائدہ۔ اور زکوٰۃ میں اپنے فائدے کے بجائے ان لوگوں کا فائدہ پیش نظر رکھنا چاہیئے جن کو زکوٰۃ دی جا رہی ہے اور زکوٰۃ کا مقصد یہی ہے کہ آپ میں زیادہ سے زیادہ جذبۂ ہمدردی پیدا ہو اور غریبوں کا بھلا ہو۔

۴۔ زمین کی پیداوار کی زکوٰۃ

زمین کی پیداوار کی جو زکوٰۃ دی جاتی ہے، اس کو شریعت میں عُشر کہتے ہیں، اس کے احکام روپئے پیسے اور سامان تجارت سے جدا ہیں، اور قرآن و حدیث میں ان کا الگ الگ ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن میں دو جگہ اس کا ذکر ہے۔ ایک جگہ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ (آل عمران)

اے ایمان والو خدا کی راہ میں خرچ کرو، اچھی چیزیں اپنی کمائی کی اور جو کچھ ہم نے تم کو زمین کے ذریعہ پیداوار دی ہے۔

اور دوسری جگہ فرمایا:

وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَ جَنَّاتٍ مَعْرُوشَاتٍ وَغَيْرَ مَعْرُوشَاتٍ وَالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا أُكُلُهُ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ۝

(الانعام)

وہی اللہ ہے جس نے باغات اگائے، اس چیز کے باغ بھی جس کی بیلیں ٹٹیوں وغیرہ پر چڑھائی جاتی ہیں (مثلاً انگور) اور وہ بھی جن کی بیلیں نہیں ہوتیں (آم اور امرود وغیرہ) اور کھجور کے درخت اور کھیتیاں جن میں مختلف قسم کے کھانے کی چیزیں ہوتی ہیں۔ اور زیتون اور انار اور یہ سب آپس میں ملتے جلتے بھی ہیں اور ملتے جلتے نہیں بھی تو ان میں جب پھل آجائیں تو خود بھی کھاؤ اور کاٹنے اور توڑنے کے وقت ان میں جو شرعی حق (عُشر) ہو اس کو دے دو اور اسراف نہ کرو (نہ کھانے میں نہ دینے میں)۔ ۞

۞ بیشک اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضی اللہ عنہم سے غلہ اور پھل حتیٰ کہ شہد وغیرہ کا عشر
بھی نکلواتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ "جو کچھ زمین سے اُگے اس میں صدقہ ہے کل ما اخرجت الارض فیہ صدقۃ

عشر کن لوگوں پر فرض ہے ہر مسلمان پر خواہ مرد ہو یا عورت، بالغ ہو یا نابالغ، عاقل ہو یا
پاگل، عشر فرض ہے۔

زمین کی پیداوار میں کیا چیز شامل زمین کی پیداوار میں ہر وہ چیز شامل ہے جو زمین سے اُگتی ہے
اور اس سے آدمی فائدہ حاصل کرتا ہے، ہر قسم کے غلے مثلاً جو، گیہوں، چنا، مٹر، مسور، ارہر، باجرہ
جوار وغیرہ اور ہر قسم کے پھل آم، امرود، سنترے، بیر، کٹھل، شریفہ، سیب، انار، انگور اور ہر قسم
کے میوے، مثلاً چھوہارا، بادام، کشمش، منقی، اخروٹ، گری، چرونجی وغیرہ، ہر قسم کی ترکاریاں
ککڑیاں، خربوزہ، تربوز، لوکی، آلو، بیگن، بنڈا، شکرقند اسی طرح گنا، چری وغیرہ سب میں عشر
واجب ہے۔

عشر کے نصاب اور دوسری زکوٰتوں میں فرق ہے سونے، چاندی، روپئے پیسے، سامان
تجارت اور عشر میں چند باتوں میں فرق ہے، وہ یہ ہیں:

(۱) عشر کے لئے کوئی نصاب مقرر نہیں ہے بلکہ جو کچھ پیداوار ہو اور جتنا ہو[1] اس میں سے عشر نکالنا
چاہئے، اس میں سال گذرنا بھی شرط نہیں ہے بلکہ جوں ہی کوئی چیز پیدا ہو اس کا استعمال شروع کرنے
سے پہلے اس کا عشر نکال دیا جائے، کسی کھیت میں اگر دوبارہ پیداوار ہو تو دوبارہ نکالنا ضروری ہے۔

---

[1] یہ مسلک امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ ترکاریوں کے بارے میں ایک حدیث میں ہے کہ اس میں
عشر نہیں ہے، اس بنا پر امام ابوحنیفہ رح کے دو ممتاز شاگرد امام ابو یوسف رح اور امام محمد رح کی رائے ہے کہ
ترکاری میں زکوٰۃ نہ لی جائے دوسرے ائمہ کی بھی یہی رائے ہے۔ راقم کے نزدیک بھی یہی رائے زیادہ صحیح ہے،
لیکن عام فقہاء امام صاحب کی رائے کو اس حدیث کی بنا پر ترجیح دیتے ہیں جس میں ہے کہ "جو کچھ زمین سے
پیدا ہو اس میں صدقہ ہے" چونکہ یہ مطلق حکم ہے اس لئے امام صاحب کہتے ہیں اس کو ترجیح ہونی چاہیے،
لیکن دوسرے ائمہ کہتے ہیں کہ یہ استدلال اس لئے صحیح نہیں ہے کہ آپ نے عام حکم کے بعد اس میں ترکاریوں کو مستثنیٰ
کر دیا ہے۔ لیکن ان کی زکوٰۃ بھی دینا غریبوں کے نقطۂ نظر سے زیادہ مفید ہے، اس لئے راقم نے اسی صورت
کو اختیار کیا، مگر اس میں اصرار کرنا اور نہ کرنے والے کو ملامت کرنا صحیح نہیں، اس لئے بہرحال یہ فصل (باقی اگلے

اگر اس سے زیادہ ہو تو اس سے زیادہ (۳) اس میں یہ بھی شرط نہیں ہے کہ یہ چیزیں[ف] ایک سال[ل] باقی رہ سکیں۔ مثلاً ترکاری وغیرہ چند دنوں سے زیادہ باقی نہیں رہ سکتیں۔ مگر ان میں عشر ہے۔ (۴) اس میں عاقل۔ بالغ ہونے کی بھی شرط نہیں ہے۔ اگر کوئی پاگل یا بچہ ہو اور اس کے کھیت میں یا باغ سے کوئی چیز پیدا ہو تو اس میں سے بھی زکوٰۃ لی جائے گی۔ (۵) زمین کا مالک ہونا بھی شرط نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص دوسرے کا کھیت لگان پر لے کر جوتتا ہے۔ یا کسی قسم کے پھل اور میوہ کے باغ کو پھل اور میوے کے زمانہ تک کے لئے خرید اہے تو ان دو صورتوں میں اسے عشر دینا ہوگا۔ جیسے اگر کوئی مسلمان آم یا امرود یا بیر کا باغ خریدے تو اس پر آم توڑتے وقت عشر دینا ضروری ہے۔ اسکا بیان آگے آتا ہے۔

بٹائی کا حکم | البتہ اگر کوئی بٹائی پر کھیتی کرے تو ہر حصہ دار کو اپنے اپنے حصہ کا عشر الگ الگ دینا چاہیئے۔ اور اگر اکٹھا ہی پورے غلہ کا عشر نکال کر بقیہ غلہ تقسیم کریں[ہ] تو یہ بھی جائز ہے۔

عشر کی مقدار | پیداوار میں جو عشر دیا جاتا ہے اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت میں کل پیداوار کا دسواں دینا ضروری ہے۔ اور ایک صورت میں کل پیدار کا بیسواں (نصف عشر) دینا ضروری ہے۔

عشر | اگر یہ پیداوار بغیر آبپاشی کے بارش کے پانی یا بغیر پانی ہی کے ہوئی ہے، مثلاً دھان۔ یا باجرہ، جوار، ارہر اور خریف کی دوسری فصلیں، یا دریا کے کنارے اور ترائی کی ربیع کی پیداوار یا باغات کے پھل وغیرہ مثلاً آم، امرود، بیر، کھجور، ناریل وغیرہ تو ان تمام چیزوں میں دسواں (عشر) نکالنا فرض ہے۔ یعنی دس من میں ایک من دس سیر میں ایک سیر یا دس پھل میں ایک پھل ہے۔

بقیہ حاشیہ صہ ... بھی سنت کے خلاف نہیں ہے۔ [ل] یہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کا مسلک ہے۔ امام صاحب کے دونوں شاگرد امام ابو یوسف اور امام محمد اور امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ وغیرہ کا مسلک یہ ہے کہ پانچ وسق سے کم پیداوار ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ لیکن امام صاحب کے مسلک میں احتیاط زیادہ ہے۔ اس لئے فقہانے اسی کو اختیار کیا ہے۔ پانچ وسق کا وزن ہمارے سیر یعنی اسی تولے والے سیر سے ۲۵ من پونے ۴ سیر ہوتا ہے۔

حاشیہ صفحہ ھذا: [ف] صاحبین کے مسالک کے مطابق ان ہی چیزوں میں عشر ہے جو ایک سال باقی رہ سکتی ہوں اور پانچ وسق سے زیادہ ہوں (درمختار باب العشر) [ہ] شرح التنویر ج صفحہ ۸۸۔ درمختار، علم الفقہ ج ۴ صفحہ ۲۹۔

نصف عشر | اگر یہ پیداوار سینچائی کے ذریعہ ہوئی ہے، مثلاً اس میں کنوئیں یا رہٹ چلا کر یا تالاب سے ڈونْ دَوری چلا کر یا ٹیوب ویل اور نہر سے قیمتاً پانی لے کر کھیت یا باغ کی سینچائی کی گئی ہے تو ان تمام صورتوں میں بیسواں یعنی نصف عشر دینا فرض ہے۔ یعنی بیس مَن میں ایک مَن، یا بیس سیر میں ایک سیر۔ مثلاً جہاں ربیع کی فصل جو، گیہوں، مٹر وغیرہ سینچائی کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے۔ یا جو پھل ترکاری، میوے سینچائی کے ذریعہ پیدا ہوتے ہیں۔ ان سب میں بیسواں ہے۔ لیکن اگر پانی پہنچانے کے لئے پُل گھڑا وغیرہ چلانا نہ پڑے، بلکہ تالاب پوکھرے، چشمہ یا ندی وغیرہ سے کاٹ کر کھیت میں پہنچا دیا جائے تو اس میں دسواں دینا ہوگا۔ بیسواں نہیں [1]

جہاں دونوں صورتیں جمع ہوں، یعنی اگر کوئی فصل ایسی ہو جس میں سینچائی بھی کی گئی ہو اور بارش کے پانی سے بھی فائدہ پہنچا ہو تو ان کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ اگر اس فصل کا زیادہ حصہ سینچائی کی وجہ سے ہوا ہے تو بیسواں دینا ہوگا۔ مثلاً ربیع کی فصل جہاں سینچی جاتی ہے وہاں سینچنے کے بعد اگر بارش ہو جائے تو بارش کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ اور بیسواں ہی دینا پڑے گا۔ البتہ اگر ابھی سینچا نہیں تھا کہ بارش ہو گئی اور پھر اسی بارش کے پانی سے وہ تیار ہو گئی تو بیسواں کے بجائے دسواں دینا ہوگا۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ زیادہ حصہ بارش سے یا بغیر بارش کے ہوا ہو، آخر فصل میں یا شروع فصل میں اس میں ایک آدھ بار پانی چلا دیا گیا ہو تو پھر اس میں دسواں دینا ہوگا۔ مثلاً خریف کی فصل پانی دے کر بوئی گئی اور بارش کے پانی سے ہو گئی، یا بارش کے پانی سے وہ بڑھی اور تیار ہوئی، مگر آخر میں ایک آدھ بار پانی دے دینا پڑا، جیسا کہ دھان وغیرہ میں ہوتا ہے تو ان دونوں صورتوں میں دسواں دینا ہوگا۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ خریف کی فصل جو جمی اور بڑھی تو ہے بارش کے پانی سے، لیکن آخر میں دو تین بار پانی دینا پڑا تو اس صورت میں دسواں کے بجائے بیسواں دینا پڑے گا [2]

ضروری ہدایات | (۱) جس قدر پیداوار ہوگی پوری پیداوار پر عشر یا نصف عشر واجب ہے

---

[1] درمختار، باب العشر ج ۲ صفحہ ... علم الفقہ ج ۴ صفحہ ۳۷ [2] درمختار ج ۲ صفحہ ...

ہل، بیل، سینچائی، مزدوری اور بیج وغیرہ کا خرچ وضع نہیں کیا جائے گا، مثلاً اگر کسی کھیت میں دس من پیداوار ہوئی تو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ پانچ من تو ہل، بیل، مزدوری اور بیج کے خرچ نکال لیا جائے اور پانچ من کا عشر دیا جائے بلکہ دس من میں عشر دینا ضروری ہے [۱]

(۲) جس پیداوار میں عشر دینا واجب ہے اس کو استعمال کرنے سے پہلے عشر نکال دینا ضروری ہے، اگر بغیر عشر نکالے استعمال کرے گا تو یہ اس کے لئے ناجائز ہوگا، البتہ اگر نکالنے کا ارادہ ہو تو پھر اس کا استعمال ناجائز نہیں ہے [۲] اگر اسلامی حکومت ہوگی تو اس سے جرمانہ یعنی عشر کے بقدر غلہ یا اس کی قیمت لے گی

(۳) اگر کوئی شخص بغیر عشر ادا کئے مرجائے تو اگر اسلامی حکومت ہوگی تو اس کے چھوڑے ہوئے مال سے عشر وصول کرے گی، اگر ورثہ دے دیں تو سب سے بہتر ہے۔

(۴) اگر کوئی شخص کھیتی باڑی کرسکتا یا کراسکتا تھا، لیکن اس نے اپنی زمین قصداً پرتی رکھا تو اس کو بھی اندازے سے عشر دینا پڑے گا۔ یعنی اس زمین میں جتنا غلہ عموماً پیدا ہوتا ہے اسکا عشر یا نصف عشر ادا کرنا ہوگا۔

(۵) اگر کوئی اپنی فصل کو کاٹنے سے پہلے یا باغ کے پھل توڑنے سے پہلے اسے بیچ دے تو اس کی دو صورتیں ہیں (۱) ایک یہ کہ اگر اس نے فصل کو یا پھل کو ان کے پکنے سے پہلے بیچا ہے تو عشر خریدار پر ہوگا، (۲) دوسری صورت یہ ہے کہ فصل یا پھل پک کر تیار ہو گیا تھا، اس وقت بیچا تو عشر بیچنے والے پر ہوگا [۳]

(۶) جو چیز پیدا ہوئی ہے عشر میں چاہے وہی دی جائے یا اسکی قیمت دی جائے دونوں صورتیں جائز ہیں۔

(۷) اگر کسی نے اپنے گھر کے اندر کوئی درخت لگایا ہے اور وہ پھلتا ہے یا گھر کے صحن میں ترکاری وغیرہ لگائی ہے تو اس میں عشر نہیں ہے۔

(۸) پیداوار جیسی ہو ویسے ہی عشر میں دینا چاہئے۔ یہ نہیں کہ جس کھیت میں اچھا دانہ یا جس درخت میں اچھا پھل یا میوہ ہو، اسے تو گھر کے استعمال کے لئے رکھ لے اور خراب عشر میں دیدے، حتی الامکان اچھا ہی دینا چاہئے۔ اور نہیں تو اچھا اور خراب ملا جلا کر دینا چاہیے۔ ..

---

[۱] در مختار ج ۲ ص۵۳ بلا رفع مؤن [۲] جوہرالنیرہ الا اذا کان المالک عازماً علی اداء العشر [۳] در مختار ج ۲ ص

ذکر و دعا کے سلسلہ میں کچھ اور باتیں

(مجیب اللہ ندوی)

دعا کے مقبول اوقات جون ۱۹۹۱ء اور مئی ۱۹۹۲ء کے پرچوں میں ذکر و دعا کے بارے میں بہت سی باتیں عرض کی جا چکی ہیں اور اس سلسلہ کی کچھ مزید باتیں عرض کی جا رہی ہیں۔ جن اوقات میں دعا مقبول ہوتی ہے وہ یہ ہیں :

(۱) فرض نمازوں کے بعد[1] (۲) پچھلے پہر یعنی تہجد کے وقت (۳) سفر کی حالت میں (۴) اذان

---

[1] حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کس وقت کی دعا بارگاہ خداوندی سے رد نہیں کی جاتی ہے آپ نے فرمایا کہ جوف اللیل الآخر و دبر الصلوٰت المکتوبات (ترمذی) رات کے پچھلے پہر کی دعا اور فرض نمازوں کے بعد ——— کچھ حضرات فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا یہی نہیں کہ اہتمام نہیں کرتے بلکہ اس اہتمام پر نکیر کرتے ہیں۔ فرض نمازوں کے بعد دعا جب مقبول ہوتی ہے تو پھر اس سعادت کو حاصل کرنے کے بجائے اس سے محروم رہنے کی کوشش کرنا سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اتباع سنت کی کونسی قسم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ کا فرض نمازوں کے بعد دعا کے لئے دائیں بائیں مڑنا ثابت ہے۔ ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے اور منہ پر مل لینے کا آپ نے حکم فرمایا ہے عام طور پر آپ دعا میں سینے کے برابر ہاتھ اٹھاتے تھے، مگر کبھی کبھی اتنا زیادہ ہاتھ اٹھاتے تھے کہ صحابہ فرماتے ہیں کہ آپ کے بغل کی سفیدی نظر آجاتی تھی، اگر اسے استسقاء کی نماز پر بھی محمول کیا جائے تو بھی نماز کے بعد دعا کا ثبوت تو موجود ہی ہے۔ ان سب سے صریح حدیث یہ ہے جسے امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔

عن الفضل بن عباس رض قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الصلوٰۃ مثنیٰ مثنیٰ

حضرت فضل بن عباس سے روایت ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، نماز دو دو رکعت

(باقی اگلے صفحہ پر)

واقامت کے درمیان (۵) جمعہ کے دن عصر کے بعد سے مغرب تک (۶) حج کے مختلف اوقات اور مقامات میں۔

دعا ہاتھ اٹھا کر کرنا چاہئے اور دعا کرنے کے بعد دونوں ہاتھوں کو منہ پر مل لینا چاہئے، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا پروردگار بڑا صاحب حیا اور کریم ہے، جب کوئی بندہ اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے تو اسے خالی واپس کرتے ہوئے حیا معلوم ہوتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں وارد ہے کہ دعا کے بعد اپنے چہرۂ مبارک پر ہاتھ مل لیا کرتے تھے، اور یہ حکم بھی فرمایا کہ فاذا فرغتم فامسحوا بها وجوهكم جب دعا سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے ہاتھوں کو اپنے چہروں پر پھیر لیا کرو

جہاں تک ممکن ہو ایسی دعائیں کرنی چاہئیں جو دنیا و آخرت دونوں کی بھلائیوں کو جامع ہوں یعنی ان کے الفاظ کم ہوں اور معانی زیادہ ہوں، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

یستحب جوامع من الدعا (ابوداود) آپؐ جامع دعائیں پسند فرماتے تھے۔

امام کو صرف اپنی ذات کے لئے یعنی صیغہ واحد سے دعا نہ کرنی چاہئے بلکہ ہمیشہ دعائیں جمع کا

تشہد فی رکعتین وتخشع وتضرع وتمسکن وتقنع یدیك یقول ترفعهما الى ربك مستقبلا ببطونها وجهك وتقول یارب ومن لم یفعل ذالك فهو كذا وكذا قال ابو عیسیٰ وقال غیر ابن المبارك فی هذا الحدیث من لم یفعل ذالك فهو خداج (جامع الترمذی باب ماجاء فی التخشع فی الصلوٰة صفحہ ۵)

ہے ہر دو رکعت میں تشہد ہے اور خشوع اور عاجزی اور مسکینی ہے اور دونوں ہاتھوں کا اپنے رب کی طرف اٹھانا اس حالت میں کہ ان ہاتھوں کی ہتھیلیاں اپنے منہ کی طرف ہوں اور کہے تو اے میرے رب اے میرے رب اور جس نے اس طرح نہیں کیا وہ ایسا ویسا ہے۔ ابو عیسیٰ ترمذی نے کہا کہ عبداللہ ابن مبارک کے علاوہ بعض لوگوں نے اس کے متعلق کہا ہے جس نے اسطرح نہیں کیا تو وہ نماز ناقص ہے۔

مجلس البحوث الاسلامیہ سعودی عربیہ کے علما کی اکثریت نے ۱۳۹۰ھ میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ: بشمول احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ فرض نماز کے بعد دعا کرنی چاہئے۔ اور یہ کہ امت میں متواتر نماز کے بعد دعا کرنے کا تعامل چلا آرہا ہے اس لیے اس سے انحراف صحیح نہیں ہے ...

۲ے حکیم الاسلام علامہ اقبالؒ نے تو یہ کہا ہے کہ اس کے بغیر کچھ ہاتھ نہیں آتا ؎

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو ؛ کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحرگاہی

خود قرآن اور بیشمار حدیثوں میں اس کی تاکید آئی ہے

صیغہ استعمال کرنا چاہئے۔

دعا حال اور مستقبل دونوں کی مصیبتوں اور تکلیفوں کے لئے کرنی چاہئے۔ حال کی مصیبت میں اس سے صبر پیدا ہوتا ہے۔ اور مستقبل کی مصیبت کے دور ہو جانے کا امکان ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے

ان الدعاء ینفع مما نزل	دعا حال و مستقبل دونوں کی فرودہ تو ں
ومما لم ینزل فعلیکم عباد اللّٰہ بالدعاء (ترمذی)	اور مصیبتوں میں مفید ہوتی ہے تو اللہ کے بندو

کن لوگوں کی دعا مقبول ہوتی ہے مذکورہ بالا شرائط اور آداب کے ساتھ جو شخص بھی دعا کرے گا، انشاء اللہ اس کی دعا کی مقبولیت میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن خاص طور پر مندرجہ ذیل آدمیوں کی دعا کی مقبولیت کی خبر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دی ہے۔

(۱) وہ شخص جس نے اپنی خوشحالی، فارغ البالی، صحت اور آرام وسکون کے زمانہ میں خدا کو یاد رکھا ہو، اور اس کے سامنے اپنا دست سوال دراز کیا ہو۔ وہ جب بدحالی اور تکلیف میں دعا کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا ضرور قبول فرماتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

من سرہ ان یستجیب اللہ	جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ مصیبتوں اور
لہ عند الشدائد فلیکثر	تکلیفوں میں اس کی دعا اللہ تعالیٰ قبول کرے
الدعاء عند الرخاء (ترمذی)	تو اسے خوش حالی میں کثرت سے دعا کرنی چاہیئے

(۲) والدین کی دعا اپنی اولاد کے حق میں (۳) مسافر کی دعا (۴) امام عادل کی دعا (۵) مظلوم کی دعا جب تک وہ انتقام نہ لے (۶) حاجی کی دعا جب تک وہ گھر واپس نہ ہو جائے (۷) مجاہد کی دعا (۸) مریض کی دعا (۹) اپنے کسی مسلمان بھائی کے لئے غائبانہ دعا۔ ان تمام لوگوں کا ذکر کرنے کے بعد آپؐ نے فرمایا:

واسرع ھذہ الدعوات	ان میں سب سے جلد قبول ہونے والی دعا
اجابۃ دعوۃ الاخ بظھر	وہ ہے جو کوئی بھائی اپنے بھائی کیلئے
الغیب (بیہقی)	غائبانہ دعا کرے

دعا سے پہلے خدا کی حمد و ثنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیج کر دعا کرنی چاہئے خود آپؐ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس کی تلقین فرمائی تھی۔ ایک شخص نے یوں ہی دعا کرنی شروع

ثلث اما ان یعجل لہ دعوتہ	یا تو جلد سے جلد اس کی وہ طلب ہی پوری
و اما ان یدخرھا لہ	کر دیتا ہے، یا پھر اس دعا کو ذخیرۂ آخرت
فی الاخرۃ و اما ان یصرف	بنا دیتا ہے یا اس سے اس کی طلب کے
عنہ من السوء مثلھا	بقدر کسی برائی اور ناخوشگواری کو دور
(احمد)	کر دیتا ہے۔

یہ خوشخبری سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بول اٹھے۔ کہ پھر تو ہم خوب کثرت سے دعائیں کریں گے۔ آپؐ نے فرمایا اللّٰہُ اَکْثَرُ تم جتنی بھی دعائیں کرو خدا کا فضل اور اس کا دامن رحمت اس سے زیادہ وسیع ہو گا۔ (مسند امام احمد)

بددعا نہ کرنی چاہیئے جہاں تک ممکن ہو کسی پر لعن طعن یا کسی کو برا بھلا نہ کہنا چاہیئے، اور نہ حتی الامکان کسی کے حق میں بددعا کرنی چاہیئے۔ یہود آپؐ کی مجلس میں آتے تھے تو السام علیکم، تم پر موت ہو، کہتے تھے۔ حضرت عائشہ رضؓ نے سنا تو بڑی برہم ہوئیں اور ان کو سخت وسست کہنا شروع کیا۔ آپؐ نے ان کو اس سے روکا۔ آپؐ نے انتہائی مجبوری میں دشمنان اسلام کے حق میں بددعائیں ضرور کی ہیں۔ مگر اس میں اپنے کسی ذاتی انتقام، غصہ، یا نفسانی جذبہ کا کوئی شائبہ بھی نہیں آنے پایا ہے۔ والدین کی دعا جہاں بچہ کے لئے فال نیک ہے، وہیں ان کی بددعا ان کے مستقبل کے لئے برا شگون بھی ہے، لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر اپنے اور بال بچوں کے حق میں بددعا کے الفاظ نکال دیتے ہیں، مثلاً خدا موت بھی نہیں دیتا، خدا غارت کرے، کم بخت مر بھی نہیں جاتا، خدا کسی کو ایسی اولاد نہ دے۔ یہ الفاظ خاص طور سے عورتوں کی زبان سے زیادہ نکلتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا تدعوا علی انفسکم ولا تدعوا	نہ تم اپنے حق میں بددعا کرو، اور نہ اپنی
علی اولادکم ولا تدعوا	اولاد کو بددعا دو، اور نہ اپنے مال و متاع
علی اموالکم ؏ (مسلم)	اور ماتحتوں کے بارے میں برے الفاظ نکالو،

یہ فرمانے کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ تم کو کیا معلوم کہ تم جس وقت بددعا کر رہے ہو، وہ قبولیت دعا کا وقت ہو اور تمہاری بددعا سن لی جائے (اور غصہ ٹھنڈا ہو جانے کے بعد تم کو پشیمانی ہو)

؏ اموالکم سے مراد مال و متاع اور غلام دونوں ہیں اس لئے ترجمہ میں دونوں کا ذکر کر دیا گیا ہے

کردی تو آپؐ نے فرمایا کہ تم نے جلدی کی، پھر فرمایا کہ:

ایها المصلی اذا صلیت فقعدت فاحمد الله	اے نمازی جب دعا کرو تو پہلے خدا کی حمد
بما هو اهله وصل علیّ ثم ادعه[1]	و ثنا کرو پھر مجھ پر درود پڑھو۔ پھر دعا کرو

دوسرے سے دعا کی درخواست کرنا اپنے چھوٹے یا بڑے سے دعا کی درخواست کرنا مسنون ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عمرہ کرنے کی اجازت چاہی تو آپؐ نے اجازت دیتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ:

اشرکنا یا اخی فی دعائک	اے میرے بھائی اپنی دعا میں ہم کو بھی
ولا تنسانا[2]	شریک کرنا اور ہم کو اس وقت بھولنا نہیں

زبان سعادت نواز سے یہ کلمہ سن کر حضرت عمرؓ مسرت میں ڈوب گئے اور بے اختیار زبان سے نکل گیا۔

کلمة ما یسرنی ان لی بها	میرے لئے زبان مبارک سے ایسی بات
الدنیا	نکلی ہے کہ اگر ساری دنیا بھی اس کے بدلہ
(ابوداؤد، ترمذی)	مل جائے تو مجھے کوئی خوشی نہ ہوگی۔

جائز دعا مقبول ہو یا نہ ہو فائدہ سے خالی نہیں پروردگار عالم کے دربار میں انسان کی دعا و طلب قبول ہو یا نہ ہو وہ فائدہ سے خالی نہیں ہوتی۔ اگر اس نے اپنے آقا سے کوئی جائز مادی چیز طلب کی اور نہ ملی، جب بھی یہ فائدہ کیا کم ہے کہ اسے اپنی بے چارگی اور عبدیت کے اظہار کا موقع ملا۔ لیکن اس سے زیادہ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے کوئی اور مصیبت دور کردی جاتی ہے، یا وہ اس کے لئے ذخیرۂ آخرت کردی جاتی ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ:

ما من مسلم یدعو بدعوة	مسلمان کی ہر دعا جس میں معصیت یا قطع
لیس فیها اثم ولا قطیعة رحم	رحم نہ ہو، اللہ تین صورتوں میں سے کسی
الا اعطاه الله بها احدی	نہ کسی صورت میں اسے ضرور پوری کرتا ہے

٭ یعنی شرعی معصیت نہ ہو اور وہ چیز ناجائز نہ ہو

---

[1] ترمذی، ابوداؤد، نسائی۔ [2] ابوداؤد، ترمذی۔

ذکر و دعا میں کس کو زیادہ فضیلت ہے اوپر جو باتیں ذکر کی گئی ہیں، ان میں کچھ باتیں تو دعا کے لئے مخصوص ہیں، مگر زیادہ تر باتوں کا تعلق ذکر و دعا دونوں سے ہے، ذکر و دعا ہو یا تسبیح و تہلیل سب کا مقصد اپنی عبدیت کا اظہار اور رضا و قرب الٰہی ہے۔ لیکن راقم اپنے مطالعہ کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ دعا کے مقابلہ میں ذکر و تسبیح کا درجہ بعض حیثیتوں سے کچھ بلند ہے، دعا میں ذل و افتقار کی کیفیت ضرور زیادہ ہوتی ہے، لیکن اس کے ساتھ اس کے اخلاص میں مطلب برآری اور ذاتی غرض و حاجت روائی کی آمیزش بھی ہوتی ہے۔ برخلاف ذکر کے کہ اس میں خوف و رجا کا بے غرضانہ جذبہ شامل ہوتا ہے۔ عشق و محبت کا بے غل و غش اظہار ہوتا ہے۔ اس سے غیر معمولی روحانی حظ و سکون بھی حاصل ہوتا ہے اور وہ قرب خداوندی کا قریب تر راستہ بھی ہے۔ اس سے دل میں سوز و گداز کی کیفیت بھی آسانی سے پیدا ہوتی ہے، اور وہ لذت آشنائی بھی ملتی ہے جس کے بارے میں شاعر نے کہا ہے ؎

دو عالم سے بیگانہ کرتی ہے دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر بڑی لمبی بحث کی ہے کہ دعا و ذکر میں کون زیادہ افضل ہے وہ کہتے ہیں کہ:

الذکر افضل من الدعاء الذکر ثناء علی اللہ عزوجل بجمیع اوصافہ وآلائہ والدعاء سوال العبد حاجتہ فاین ھذا من ھذا ولھذا جاء فی الحدیث من شغلہ ذکری عن مسئلتی اعطیتہ افضل ما اعطی السائلین ولھذا کان المستحب فی الدعاء ان یبدأ الداعی بحمد اللہ تعالی

والثناء علیہ بین یدی حاجتہ (الوابل الصیب)

خالص ذکر دعا سے افضل ہے، ذکر اللہ تعالیٰ کی تمام صفتوں اور نعمتوں کی تعریف کا نام ہے اور دعا میں بندہ اپنی حاجت کا سوال کرتا ہے تو دونوں کا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے اسی بنا پر حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص میرے ذکر کی وجہ سے دعا نہ کر سکے تو اس کو ہم مانگنے والوں سے بھی زیادہ دیں گے۔ اور یہی بنا پر دعا کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ اس کی ابتداء اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا سے کی جائے۔

پھر بے شمار حدیثوں کی روشنی میں یہ بتایا ہے کہ کوئی دعا بغیر ذکر کے مقبول نہیں ہوتی۔ اس لئے دعا کے مقابلے میں ذکر افضل ہے۔

ذکر، حلقۂ ذکر اور مجلس ذکر خدا کی یاد جس صورت، جس طریقہ اور نہج سے بھی ہو سکے، مومن کے قلب میں تازہ رہنی چاہئے۔ اس لئے کہ ایک مومن کا سب سے بڑا اسلحہ، اس کی سب سے بڑی قوت اور اس کے جسم وجان کی اصلی غذا یہی ہے۔ شریعت نے ذکر الٰہی کی کچھ انفرادی و اجتماعی صورتیں، طریقے اور اوقات مقرر بھی کر دیئے ہیں۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ لیکن ان کے علاوہ ذکر تسبیح، تحمید وتہلیل کی بے شمار ایسی انفرادی و اجتماعی صورتیں ہیں جن کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا۔

بسیار شیوہاست بتاں را کہ نام نیست

وعظ و پند کی مجلس بھی ذکر ہے اور دینی تعلیم و تدریس کا مشغلہ بھی ذکر ہے۔ دینی تعلیم کی ترویج و ترقی بھی ذکر ہے اور اقامت دین و اشاعت دین کی کوششیں بھی ذکر میں داخل ہیں۔ اس کی تعریف میں صوفیہ کے مروجہ حلقہائے ذکر بھی شامل ہیں۔ اور مدرسہ و خانقاہ کی زندگی بھی ذکر کی ایک صورت ہے، بشرطیکہ ان میں اخلاص اور رضائے الٰہی اور للٰہیت کی پوری روح موجود ہو محض رسمی پابندی نہ ہو۔ ذیل میں چند احادیث نبوی نقل کی جاتی ہیں، جن سے ذکر کے وسیع مفہوم کی توضیح ہوتی ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ایک بار کسی مسجد میں تشریف لے گئے، وہاں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے خدا کو یاد دلانے والی اور نیک باتیں کر رہے تھے، انہوں نے دیکھا تو دریافت کیا کہ آپ لوگ یہاں کیسے بیٹھے ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ نذکر اللہ اللہ کی یاد کر رہے ہیں، انہوں نے تاکیداً پوچھا کہ یہ اجتماع محض اسی مقصد سے ہوا ہے۔ لوگ بولے۔ ہاں محض یہی مقصد ہے۔ اس کے بعد انہوں نے یہ حدیث نبوی بیان فرمائی۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرج علی حلقۃ من اصحابہ فقال ما اجلسکم ھھنا قالوا جلسنا نذکر اللہ ونحمدہ علی ما ھدانا للاسلام ومنّ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن صحابہ کی ایک مجلس سے گذرے۔ آپ نے شرکاء سے دریافت فرمایا، کس مقصد سے تم جمع ہوئے ہو، بولے خدا کی یاد کے لئے، اور اس کے سامنے اس بات کا شکریہ پیش کرنے کے

به علينا الله ما اجلسكم الا ذلك قالوا الله ما اجلسنا الا ذلك قال اما انى لم استحلفكم تهمة لكم ولكنه اتانى جبرئيل فاخبرنى ان الله عز وجل يباهى بكم الملئكة

(مسلم)

لئے کہ اس نے ہمیں اسلام کی ہدایت دی اور اس نے اس کے ذریعہ ہم پر احسان کیا، آپؐ نے قسم دے کر پوچھا کہ کیا واقعی تم محض اس مقصد سے جمع ہوئے ہو۔ بولے خدا کی قسم اس کے علاوہ دوسرا کوئی مقصد نہیں ہے آپؐ نے فرمایا میں نے تم سے قسم کسی بدظنی کی وجہ سے نہیں لی، بلکہ تمہاری زبان سے اس کی تصدیق چاہتا تھا، ابھی ابھی جبرئیل میرے پاس آئے اور یہ خوشخبری دی کہ خدائے قدوس فرشتوں کے سامنے تمہارے اس عمل کو فخر کے انداز میں بیان فرما رہا ہے۔

اس واقعہ میں اس مذاکرہ کا ذکر کیا گیا ہے جو صحابۂ کرام اسلام کی ہدایت پا جانے کے سلسلہ میں کر رہے تھے۔" حضرت ابوسعید خدری رضؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

لا يقعد قوم يذكرون الله الا حفتهم الملئكة وغشيتهم الرحمة ونزلت عليهم السكينة وذكرهم الله فيمن عنده

(مسلم)

کوئی گروہ جب بھی خدا کی یاد کے لئے بیٹھتا ہے تو فرشتے اس کو گھیر لیتے ہیں، اور رحمت خداوندی اس کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے اور طمانیت و سکینت کا نزول ہوتا ہے اور اللہ تعالٰی کے حضور میں جو فرشتے ہوتے ہیں ان سے اللہ تعالٰی اس کا ذکر فرماتا ہے۔

آخری ٹکڑے میں آپؐ نے ایک ایسی سعادت بخشی کی بات یعنی خدا تعالٰی کا بندوں کو یاد کرنے کا ذکر کیا ہے کہ جس سے بڑھ کر ایک مومن کے لئے دوسری سعادت نہیں ہو سکتی۔ ان دونوں حدیثوں کے علاوہ ایک اور حدیث ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ ذکر کا مقصد اور مراد کیا ہے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک لمبی روایت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ، اللہ نے کچھ

[illegible] بات کا ذکر [illegible] کے ذکر میں شامل ہے۔

فرشتے اس لئے مقرر فرما رکھے ہیں کہ ہر وقت ذکر کی مجلسوں کی تلاش میں رہتے ہیں، جہاں بھی ذکر کی کوئی محفل ہوتی ہے وہ بھی اس میں شریک ہو جاتے ہیں اور تمام شرکاء مجلس کو اپنے پروں سے ڈھانک لیتے ہیں. جب وہ مجلس برخاست ہوتی ہے اور وہ بارگاہ قدس میں جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے علم کے باوجود ان سے دریافت فرماتاہے، کہ کہاں سے آئے ؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ خدایا ہم تیری زمین میں تیرے ان بندوں کے پاس سے آرہے ہیں جو تیری تسبیح وتہلیل اور تکبیر وتحمید کر رہے ہیں. خدائے قدوس دریافت کرتاہے کہ وہ کیا مانگ رہے تھے ؟ وہ کہتے ہیں کہ تجھ سے تیری جنت کے طلبگار تھے اللہ تعالیٰ پھر دریافت فرماتاہے کہ کیا انہوں نے میری جنت دیکھی ہے ؟ وہ کہتے ہیں کہ دیکھی تو نہیں ہے، تو اللہ رب العزت فرماتاہے. اگر وہ دیکھ لیں تو ان کی کیفیت کیا ہوگی ؟ فرشتے کہتے ہیں کہ پھر تو وہ اور زیادہ حریص ہو جائیں گے. پھر فرشتے کہتے ہیں کہ اے پروردگار وہ تیری پناہ ڈھونڈ رہے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتاہے کہ کس چیز سے پناہ مانگ رہے تھے ؟ کہتے ہیں کہ تیری دوزخ سے، پروردگار عالم پوچھتاہے کہ انہوں نے دوزخ کی ہولناکی دیکھی ہے وہ کہتے ہیں کہ نہیں. ارشاد ہوتاہے کہ اگر وہ دیکھ لیتے تو ان کی کیا کیفیت ہوتی. فرشتے عرض کرتے ہیں، پھر تو وہ اور زیادہ اس سے پناہ مانگتے. پھر وہ کہتے ہیں کہ وہ لوگ تجھ سے استغفار بھی کر رہے تھے، رحمت خداوندی جوش میں آتی ہے، اور حکم ہوتاہے کہ میں نے ان سب کو بخش دیا اور جو مانگا وہ دیا، اور ان کو دوزخ سے پناہ دی. فرشتے کہتے ہیں کہ ان میں ایک ایسا آدمی بھی تھا جو بڑا خطا کار تھا. اتفاق سے اس طرف سے گذر رہا تھا اور ان کے ساتھ بیٹھ گیا، بارگاہ قدس سے اعلان ہوتاہے کہ:

له غفرت لهم هم القوم لا يشقى بهم جليسهم (بخاری ومسلم)	میں نے اس کو بھی کو بخش دیا، یہ ایسے لوگوں کا ہم نشیں تھا جن کا ہمنشیں محروم نہیں ہو سکتا

امام نووی رحمۃ اللہ ان احادیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اعلم ان فضيلة الذكر غير منحصرة فى التسبيح والتهليل والتحميد والتكبير ونحوها بل كل عامل لله تعالى بطاعة فهو ذاكر الله تعالى	جان لو! ذکر کی فضیلت تسبیح وتہلیل اور تکبیر وتحمید تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ جو بھی کوئی نیک کام خدا کے لئے کرے گا وہ ذاکر کہا جائے گا۔ (کتاب الاذکار)

اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ ذکر کی جتنی قسمیں ہیں ان میں کوئی ذکر ہمیشہ افضل نہیں ہوتا بلکہ موقع محل کے لحاظ سے کوئی ذکر افضل اور کوئی مفضول ہوجاتا ہے۔ مثلاً قرآن کی تلاوت افضل ذکر ہے۔ مگر آپ اگر رکوع یا سجدے میں تسبیحات کے بجائے قرآن کی تلاوت کریں تو یہ مکروہ ہے، اسی طرح نماز سے باہر قرآن کی تلاوت یا نماز میں قیام کی صورت میں قرآن کی تلاوت تسبیح و تہلیل سے زیادہ افضل ہے۔

لیکن ان غیر موقت اجتماعی اذکار کے علاوہ کچھ موقت انفرادی اذکار بھی ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنا وظیفہ زندگی بنالیا تھا۔ اور یہاں ان ہی کی نشاندہی مقصود ہے۔ ان اذکار کا تعلق زندگی کے ہر گوشہ اور ہر موقع سے ہے، اگر ان اذکار او رادعیہ کو اپنی زندگی کا معمول بنالینے کا اہتمام کیا جائے تو اس سے ایمان و عمل میں پختگی بھی پیدا ہوگی۔ اور انشاء اللہ قربت خداوندی اور آخرت میں فلاح کا سبب بھی بنیں گے۔ اور مذکورہ بالا اجتماعی اذکار میں بھی غیر معمولی مدد ملے گی۔

ذکر شعور کے ساتھ کرنا چاہیے ذکر خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی شعور و تدبر کے ساتھ ہونا چاہیے محض سبحہ گردانی نہ ہو۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ ذکر میں فکر و شعور مطلوب ہے۔ فالتدبر فی الذکر مطلوب۔

انفرادی اذکار کو کب چھوڑ دینا بہتر ہے بسا اوقات بہت سے دینی اور اجتماعی کام ایسے بھی پیش آجاتے ہیں جن میں انفرادی اذکار کا ترک کردینا زیادہ بہتر ہے۔ اور کبھی اس کا چھوڑ دینا واجب ہوجاتا ہے۔ ایسے مواقع پر جو لوگ ذکر و تسبیح کو نہیں ترک کرتے وہ بُرا کرتے ہیں اور بسا اوقات یہ چیز معصیت میں داخل ہوجاتی ہے۔ بہت سے ذکر کرنے والے لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ ضروری سے ضروری کام بلکہ فرض نماز کی پہلی تکبیر تک تسبیح کی تعداد پوری کرنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسا قطعی نہ کرنا چاہیئے۔ اگر کسی کے گھر میں آگ لگ جائے، ایک بوڑھے کو ٹھوکر کھانے کا اندیشہ ہو، کوئی زخمی تڑپ رہا ہو تو ایسی صورت میں ذکر و دعا یہی ہے کہ آگ بجھائی جائے، اندھے کو راستہ بتایا جائے اور زخمی کی مرہم پٹی کی جائے۔ امام نووی کتاب الاذکار میں تحریر فرماتے ہیں:

فی احوال تعرض للذاکر   کچھ حالتیں اور صورتیں ایسی ہیں جو ذاکر کو

یستحب قطع الذکر بسببها ثم یعود بعد زوالها منها اذا سلم علیه رد السلام ثم عاد الی الذکر وکذا اذا عطس عنده عاطس شمته وکذا اسمع المؤذن اجابه وکذا اذا رأی منکرا ازاله او معروفا ارشده الیه او مسترشدا اجابه ثم عاد الی الذکر
(کتاب الاذکار ص)

کو پیش آتی ہیں جن کے پیش آنے کے بعد ذکر منقطع کردینا بہتر ہے، اور پھر وہ صورت اور حالت باقی نہ رہے، تو ذکر کرنا چاہئے مثلاً ذکر کی حالت میں کوئی سلام کرے تو اس کو ذکر چھوڑ کر پہلے جواب دینا چاہئے، پھر ذکر کرنا چاہئے، اسی طرح کوئی شخص چھینکنے کے بعد الحمد للہ کہے تو اس کا جواب دینا چاہئے، اگر مؤذن اذان دے تو پہلے اسکا جواب دینا چاہئے، اسی طرح اگر کوئی برائی دیکھے تو پہلے اسے دور کرنا چاہئے یا کوئی اچھی بات کی ہدایت کرنی ہو تو ہدایت کرنی چاہئے یا اس سے کوئی بات دریافت کیجائے تو پہلے جواب دینا چاہئے، پھر ذکر کرنا چاہئے

ناظرین الرشاد کی خدمت میں

قارئین و ناظرین "الرشاد" کی خدمت میں گذارش ہے کہ

(۱) خط لکھتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

(۲) دوسرے یہ کہ بحمد اللہ پرچہ اب آٹھ سو کی تعداد میں چھپنے لگا ہے مگر ابتک ہر ماہ اسے تین چار سو روپے کا گھاٹا آتا ہے، اس لئے براہ کرم اعزازی پرچہ کے لئے اصرار نہ کریں۔

(۳) اگر آپ حضرات کو پرچہ مفید معلوم ہوتا ہے تو براہ کرم اپنے اپنے دائرۂ اثر میں اس کی توسیع اشاعت کیلئے تھوڑی سی کوشش کردیں، امید ہے کہ پرچہ گھاٹے سے بچ جائے گا۔

الرد علی المنطقیین

(امام ابن تیمیہ کی ایک اہم کتاب)

(مجیب اللہ ندوی)

امام ابن تیمیہ کی اہم اور نادر کتابوں میں ایک کتاب "الرد علی المنطقیین" بھی ہے، یہ کتاب اب تک چھپی نہیں تھی۔ خوشی کی بات ہے، کہ بمبئی کے مشہور تاجر کتب عبدالصمد شرف الدین الکتبی نے اپنے اہتمام میں اس کو طبع کرا دیا ہے۔ جس کے اخراجات حکومت حجاز نے ادا کئے ہیں، اس لئے عبدالصمد صاحب اور حکومت حجاز دونوں اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں، کہ انہوں نے ان کے لئے ایک قیمتی ذخیرۂ علم فراہم کر دیا۔

اس کتاب کے قلمی نسخے دنیا کے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں، ایک نسخہ دار المصنفین کے کتب خانہ میں بھی ہے۔ جو ندوۃ العلماء کے خزانۃ الکتب کے نسخہ کی نقل ہے، لیکن اس کا سب سے قدیم نسخہ حیدرآباد کے کتب خانۂ آصفیہ میں ہے، یہ نسخہ امام ابن تیمیہ کے ایک شاگرد محمد بن احمد بن حسن الشافعی کا لکھا ہوا ہے، جس کو کتابت کے بعد شاگرد نے تصحیح کی غرض سے استاذ کے سامنے پیش کیا تھا۔ چنانچہ جا بجا اس کے حواشی پر اور کہیں کہیں بین السطور میں خود امام ابن تیمیہ کے اپنے قلم سے ترمیم و تصحیح ہے، اور متعدد مقامات پر بعض مباحث کا اضافہ بھی کیا ہے۔

اس وقت دنیا میں اس کتاب کے جتنے نسخے موجود ہیں۔ ان میں ان خصوصیات کا حامل صرف حیدرآبادی ہی نسخہ ہے، مطبوعہ نسخہ اسی کی نقل ہے، اسی لئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ مکمل صورت میں طبع ہوا ہے۔ طابع نے کتاب کے شروع میں خود امام ابن تیمیہ کے قلم سے لکھی ہوئی بعض تحریروں

کا فوٹو بھی دیا ہے، جس سے ان کے شان خط اور کسی حد تک ان کے طریقہ تصنیف پر بھی روشنی پڑتی ہے، اگر اس کتاب کا مکمل انڈکس بھی دے دیا گیا ہوتا، تو اس کی افادیت بہت بڑھ جاتی ناشر نے اس کی کوشش کی تھی، مگر کسی وجہ سے اس کی تکمیل نہیں ہوسکی۔

البتہ یہ بات قابل افسوس ہے کہ اس کی طباعت میں تصحیح کا بہت زیادہ اہتمام نہیں کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے اغلاط کی ایک لمبی فہرست شائع کرنی پڑی۔

کتاب کے شروع میں حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک مختصر مگر گرانقدر مقدمہ بھی ہے، جس میں ایجاز کے ساتھ مسلمانوں میں یونانی علوم کی اشاعت کی تاریخ، اس کے نتائج، اور متکلمین اسلام کی اس سلسلہ میں مفید و مضر کوششوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور یہ بتلایا گیا ہے کہ امام ابن تیمیہ نے منطق کے جن مسائل، مثلاً حد، جنس، فصل، قیاس، علت وغیرہ میں اہل یونان سے اختلاف کیا تھا، اور ان کے بارے میں جو رائے دی تھی، قریب قریب وہی باتیں آج یورپ کے فلاسفہ بھی اپنی تصانیف میں دہرا رہے ہیں۔ جس سے امام ابن تیمیہ کی دقت نظر کا پتہ چلتا ہے۔

امام ابن تیمیہ نے یونانی علوم کی تنقید و تردید میں بہت کچھ لکھا ہے، مگر دو کتابیں انہوں نے خاص طور سے اسی موضوع پر لکھی ہیں۔ ایک "العقل والنقل" دوسری یہ زیر تبصرہ کتاب، اس کتاب کو ہر زمانہ کے اہل علم میں بڑا حسن قبول حاصل رہا ہے۔ امام سیوطی نے اس کا خلاصہ بھی کیا ہے جس کا نام "جھد القریحہ فی تجرید النصیحہ" ہے، یہ کتاب کئی برس ہوئے مصر میں چھپ گئی ہے۔ صاحب کشف الظنون نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔

کتاب کے مباحث پر کچھ لکھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یونانی علوم کے عربی میں منتقل ہونے اور اس کے ساتھ مسلمانوں کے شغف و انہماک سے جو نظری یا عملی، مضر یا مفید نتائج برآمد ہوئے ہیں، اس پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لی جائے، تاکہ اس سلسلہ میں امام ابن تیمیہ کے تجدیدی کام کا پورا پورا اندازہ لگایا جاسکے۔

تقریباً پہلی صدی ہجری کے نصف آخر تک مسلمانوں میں انہی علوم کا چرچا رہا، جن کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت سے ان کی دینی یا دنیاوی زندگی سے تھا، ان کے علاوہ خالص تمدنی علوم کا چرچا نہ اب تک ہوا تھا۔ اور نہ وہ مباحث وافکار فروغ پاسکے تھے۔ جن کا فائدہ ذہنی بازیگری اور نظری

بحث آرائیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا، مگر پہلی صدی کے آخر میں جب وہ قومیں اسلام کی حلقہ بگوش یا مفتوح ہوئیں جن کے پاس ایسے علوم کا ذخیرہ تھا، جن کا تعلق زندگی کے عملی مسائل سے تو بہت ہی کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا، البتہ ان سے ذہنی تفریح اور فکری و عملی گمراہی کا سامان فراہم ہو جاتا تھا ان سے جب مسلمانوں کا اختلاط ہوا تو یہ علوم ان میں بھی رواج پا گئے، جس سے دین میں رخنہ پیدا ہونے لگا، اسی خطرہ کے پیش نظر حضرت عمر بن عبد العزیز رح ایک طب کی کتاب تک کو منظر عام پر لانے میں بہت دنوں تک متامل رہے، حالانکہ اس میں بظاہر فتنہ کا کوئی شبہ نہیں تھا۔

اس سے میری مراد ان یونانی علوم و فنون سے ہے جو خاص شرک و بت پرستی کے بطن سے پیدا ہوئے اور یہودیت و نصرانیت یا ثنویت کی آغوش میں جن کا نشو و نما ہوا

ظہور اسلام کے وقت ان علوم کے بڑے بڑے مراکز اور مدارس نصیبین۔ جندیسابور، اسکندریہ انطاکیہ اور حران وغیرہ میں قائم تھے، اور اس وقت تک ان علوم کی محافظ دو زبانیں یونانی اور سریانی زندہ تھیں، خصوصاً سریانی زبان میں جو دجلہ و فرات کے تمام درمیانی علاقوں کی علمی زبان تھی، یونانی علوم کا سب سے بڑا سرمایہ تھا، چنانچہ عربی زبان میں یونانی علوم کی بیشتر کتابیں سریانی ہی سے ترجمہ ہو کر آئی ہیں۔

ان تمام علاقوں کا بیشتر حصہ جن میں یونانی علوم رائج تھے، اور سریانی زبان بولی جاتی تھی، ظہور اسلام کے وقت نصرانیت کے زیر اثر اور ایک قلیل حصہ یہودیت و ثنویت کے ماتحت تھا، مسلمانوں نے جب ان علاقوں کو فتح کیا، تو ان پر اسلامی تمدن و معاشرت اور عربی زبان و ادب کا بہت گہرا اثر پڑا، جس کی وجہ سے یونانی علوم و ثقافت اور سریانی زبان پر ایک صدی تک اضمحلال طاری رہا، مگر پہلی صدی کے آخر میں بعض سیاسی و تمدنی اسباب کی بنا پر مسلمانوں کی توجہ یونانی علوم و فنون کی طرف مبذول ہونے لگی، اور انہوں نے اس کو عربی میں منتقل کرنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ یعنی دوسری صدی کے نصف آخر تک مسلمانوں کا ایک اچھا خاصہ طبقہ ان علوم کے آگے سپر انداز ہو گیا۔

اموی دور تک نقل و ترجمہ کا کام زیادہ تر انفرادی کوششوں تک محدود رہا، خود حکومت نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی تھی، لیکن عباسی دور میں انفرادی کوششوں کے ساتھ ساتھ حکومت

کی سرپرستی بھی اس کو حاصل ہوگئی۔ جس سے ممالک اسلامیہ میں ان علوم کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوگئی، اور لوگ اس سے متاثر ہونے لگے۔ مگر اس وقت بھی ایوان حکومت سے باہر عوام و خواص کے بڑے طبقہ میں خالص دینی علوم ہی کی قدر و منزلت تھی، اور عقلی و تمدنی علوم کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ خصوصیت سے علما و محدثین کا ایک بڑا گروہ نہ تو خود یونانی علوم و فنون سے شغف رکھنا پسند کرتا تھا، اور نہ ان علوم سے شغف رکھنے والوں کے بارے میں کوئی اچھی رائے رکھتا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ مسلمانوں میں اہل علم کے دو متقابل گروہ بن گئے۔ ایک گروہ نے جس کو حکومت کی سرپرستی بھی حاصل تھی، یونانی علوم و فنون کو اپنایا اور دوسرے گروہ نے جس کی پشت پر عوام و خواص کی ایک بڑی طاقت تھی، خالص دینی علوم کی مسند سنبھالی۔ علما و محدثین کا جو گروہ معقولات کے حاملین کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا تھا، ممکن ہے کہ ارباب عقل اس کو قدامت پرستی سے تعبیر کریں، مگر ان کا یہ ریب و شک بالکل درست تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ علوم خالص شرک و بت پرستی کے ماحول ہی میں پیدا ہوئے تھے، اور نصرانیت اور یہودیت وغیرہ کی آغوش میں ان کی پرورش ہوئی تھی، اس لئے یہ چیزیں ان علوم کے رگ و ریشہ میں اس طرح جاری و ساری ہوگئی تھیں، کہ کیمیائی تحلیل سے بھی ان کا الگ کرنا دشوار تھا۔ اس لئے جب ان علوم کا چرچا ہوا تو ان کے خالص مادی و مفکرانہ توہمات اور اسلام کے بعض دینی تصورات میں تصادم شروع ہوگیا، اور مسلمانوں میں نئے نئے مسائل و مباحث پیدا ہونے شروع ہوگئے۔ کہیں ذات و صفات کا مسئلہ چھڑا، کہیں قضا و قدر پر بحثیں شروع ہوئیں، کہیں توحید کے مفہوم اور اس کی تعبیر میں اختلاف رونما ہوا، بعض وہ مسائل جن کو قرآن نے انسانی زندگی کے لئے غیر ضروری سمجھ کر ان کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے، یا اجمالی اشارات پر اکتفا کیا ہے، مثلاً آسمان کی گردش، وحی کی حقیقت، فرشتوں کی ماہیت وغیرہ کے بارے میں بحث و مباحثہ شروع ہوگیا۔

گو ان میں سے بعض تصورات کی ابتدا عہد نبوی ہی میں ہوگئی تھی۔ مگر اس عہد مبارک اور اس کے بعد تقریباً ایک صدی تک مسلمانوں کے سامنے زندگی کے دوسرے اہم ترین کام موجود تھے ان کی دینی روح بیدار اور قوت عمل زندہ تھی پھر ان میں سمع و طاعت بھی موجود تھی، اس لئے اگر کسی کے دل میں اس قسم کے سوالات پیدا بھی ہوتے تھے۔ تو یہ کہہ کر ان کی توجہ پھیر دی جاتی تھی کہ ان مسائل میں غور و خوض کرنا نہ چاہئے۔ اس لئے کہ یہ ہماری زندگی کے لئے کوئی مفید پہلو نہیں رکھتے ہیں

لیکن جب مسلمانوں کی دینی روح سرد اور قوت عمل کمزور ہونے لگی، اور اس قسم کے خیالات بہت زیادہ پھیلنے لگے، تو اس وقت فقہا و محدثین نے اس فتنے کے انسداد کی تدبیریں شروع کیں، مگر نہ تو انکے ہاتھ میں زمام اقتدار تھی جس کی قوت کو وہ اس فتنہ کے مقابلہ میں کام لاتے۔ اور نہ وہ اپنی دینی سادگی سے ہٹ کر ان یونانی علوم کا علمی طور سے مقابلہ ہی کرنا پسند کرتے تھے۔ اس لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ ایسے علوم و خیالات سے جو نہ مسلمانوں کی دنیاوی زندگی کے لئے مفید ہو سکتے تھے، اور نہ دینی زندگی کے لئے خود گریز کریں اور دوسروں کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی ان سے ایسے مسائل کے بارے میں سوال کیا گیا، تو انہوں نے ان پر گفتگو کرنے سے گریز کیا اگر کبھی مجبوراً اس کے اظہار کا موقع آگیا، تو انہوں نے ہمیشہ اپنی راہ عقلی اور فلسفیانہ موشگافیوں سے علیحدہ رکھی۔ امام مالک کا یہ تاریخی جملہ اب تک تذکروں میں محفوظ ہے، کہ جب ان سے استواء علی العرش کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ

الاستواء معلوم والکیف مجہول	استوا معلوم ہے، اس کی کیفیت مجہول ہے
والایمان بہ واجب والسوال	اس پر ایمان لانا واجب اور اس کے
عنہ بدعۃ	بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔

اس سلسلہ میں بعض عباسی خلفا کی طرف سے ان فقہاء و محدثین پر سختیاں بھی کی گئیں۔ مگر انہوں نے ہر طرح کی سختیاں جھیلیں، لیکن انہوں نے یونانی علوم سے پیدا شدہ تمام مسائل کے جواب میں یا تو سکوت اختیار کیا، یا پھر جواب دیا بھی تو ارباب عقل کے مزعومات سے ہٹ کر خالص کتاب و سنت کی روشنی میں۔

اس طرح دوسری صدی کے وسط میں معقولین اور منقولین کے دو متقابل گروہ پیدا ہو گئے، اور ان میں اختلافات کی خلیج دن بدن بڑھتی ہی جا رہی تھی، اہل نقل نے معقولین کو ملاحدہ و زنادقہ کا لقب دے رکھا تھا۔ اور معقولین اہل نقل کو عقلی حقائق سے ناآشنا تصور کرتے تھے، مگر عقل پرستی کا یہ سیلاب صرف مذہبی تلقین سے نہیں رک سکتا تھا، اس لئے علما کے طبقہ میں ایک گروہ ایسا پیدا ہوا جس نے عقل پرستوں ہی کے اسلحہ سے ان کا مقابلہ شروع کیا، یعنی عقلی علوم ہی کے ذریعہ ان کے اعتراضات کے جوابات دیئے، یا ان میں تطبیق پیدا کی، اس گروہ کو متکلمین اسلام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور

اسی صنف میں مؤلفین رسائل اخوان الصفا[1] کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔

متکلمین اسلام نے یقیناً وقت کا ایک بہت بڑا کام یہ انجام دیا، کہ انہوں نے بہت سے اسلامی مسائل کی عقل کی روشنی میں وضاحت کی، اور بعض اسلامی مسائل پر جو عقلی اعتراضات کئے جاتے تھے، ان کے جواب دیئے، جس سے بہتوں کا ایمان سلامت رہ گیا، مگر عقلی علوم کی مرعوبیت بہر حال ان کے ذہن و دماغ پر بھی کسی نہ کسی حد تک مستولی تھی، اس لئے انہوں نے بہت سے فلسفیانہ اصولوں اور منطقیانہ بحثوں کو مسلمات کے طور پر تسلیم کر لیا، جس کی وجہ سے بعض اسلامی مسائل میں ان کے سوچنے کا انداز صحیح نہ ہو سکا، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

مؤلفین اخوان الصفا کسی وجہ سے دین سے اپنا رشتہ توڑنا نہیں چاہتے تھے، مگر ان کی ذہنی تربیت خالص فلسفیانہ ماحول میں ہوئی تھی، اور ان کے ذہن و دماغ پر عقلی علوم ہی کا غلبہ تھا اس پر مزید یہ کہ وہ باطنیت کا شکار تھے، اس لئے انہوں نے فلسفہ اور دین کے جزئی مسائل میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی، اس سے امت کو فائدہ تو کچھ نہیں ہوا، مگر اس سے جو نقصان پہنچا، اس کی تلافی آج تک نہ ہو سکی۔

اس کے بعد امام غزالی کا زمانہ آیا، اس وقت اہل فلسفہ کے ساتھ باطنی تحریک جو اسی فلسفہ کی پیداوار تھی، پورے شباب پر تھی، ایک طرف یونانی علوم کا چرچا تھا، دوسری طرف باطنیوں کا خفیہ لٹریچر گھر گھر پہنچ رہا تھا، جس سے اسلامی ممالک میں ریب و شک کا ایک طوفان برپا ہو گیا تھا اور نہ جانے کتنے اہل ایمان کے دلوں میں تذبذب اور ذہنوں میں تزلزل آ گیا تھا، یہی وقت تھا جب امام غزالی اس طوفان کو روکنے کے لئے میدان میں آ گئے، وہ منقولات کے ساتھ یونانی علوم کے بھی دانائے راز تھے، اس لئے جن طریقوں اور اسلحوں سے یہ فتنے اٹھائے جا رہے تھے، ان سے امام صاحب ان فتنہ گروں سے کچھ زیادہ ہی واقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے ان دونوں تحریکوں کا پورا پورا علمی مقابلہ کیا، ایک طرف یونانی علوم پر تنقید کی، دوسری طرف باطنیوں کی ایک ایک بدباطنی کو ظاہر کیا، اور پھر ان کے نزدیک اہل فلسفہ کا جو بانس صحیح معلوم ہوئیں، اسلامی اصولوں سے ان کا توافق دکھلایا یا ان میں تطبیق دی۔

---

[1] یہ باطنیوں کی ایک جماعت تھی مگر اس کے ذریعہ کچھ مفید علمی کام بھی انجام پائے۔

امام غزالی کی فلسفیانہ تنقیدات سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ یونانی علوم سے عام مرعوبیت اور باطنی تحریک کی تشکیک پسندی کا زور بہت کم ہو گیا، مگر جہاں انہوں نے فلسفیانہ اصولوں پر تنقید کی ہے، وہاں اس کے بہت سے اصولوں کو صحیح سمجھ کر اسلامی اصولوں سے خلط ملط کر کے دونوں کو مساوی حیثیت دے دی، حالانکہ اس سے پہلے علما، ان اصولوں کی صحت سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے تھے امام ابن تیمیہ نے اس بات کو اپنی کتاب میں متعدد جگہ دہرایا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

ولم یکن احد من نظار المسلمین یلتفت الی طریقتهم بل المعتزلة والاشعریة والکرامیة والشیعة وسائر طوائف النظر کانوا یعیبونها ویبینون فسادها واول من خلط منطقهم باصول المسلمین ابو حامد الغزالی۔ (ص ۳۳۷)

مسلمان اہل نظر میں سے کوئی بھی اہل یونان کے طریقۂ فکر کی طرف متوجہ نہیں ہوا، حتیٰ کہ معتزلہ، اشعریہ، کرامیہ اور شیعہ فرقہ نے بھی اس سے گریز کیا، اور تمام اہل نظر ہمیشہ ان کے طریقۂ فکر کے عیوب عیاں اور ان کے فساد کو بیان کرتے رہے۔ امام غزالی پہلے شخص ہیں جنہوں نے اہل یونان کے منطقی اصولوں کو مسلمانوں کے اصولوں کے ساتھ مختلط کر دیا۔

حتیٰ کہ امام غزالی دینی علوم میں پختگی پیدا کرنے کے لئے بھی یونانی منطق کا جاننا ضروری تصور کرتے تھے، اپنی اصول فقہ کی کتاب المستصفیٰ کے مقدمہ میں منطقی اصولوں کی تفصیل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

انه لا یثق بعلمه الا من عرف هذا المنطق[1] (ص ۱۹۲)

علم دین میں پورا وثوق اسی شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جو یونانی منطق سے واقف ہو۔

امام غزالی کے اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونانی علوم کے اصول و مسلمات پر جیسی ضرب لگنی چاہئے تھی وہ نہ لگ سکی، اور نہ اسلامی اصول پورے طور پر نکھر کر سامنے آسکے۔

امام غزالی کے بعد کئی صدیوں تک متکلمین اسلام ان ہی کے قائم کئے ہوئے راستہ پر چلتے اور ان ہی کے نصب کردہ سنگ میل کو آخری نشان راہ سمجھتے رہے، کسی نے کوئی نئی راہ نہیں پیدا کی،

[1] عربی درسگاہوں میں یہ جملہ آج تک دہرایا جاتا ہے، اور صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ عمل سے بھی۔

اس میں اگر کوئی استثنائی مثال مل سکتی ہے، تو وہ ابو البرکات بغدادی صاحب المعتبر کی، انہوں نے البتہ ارسطو وغیرہ کی کتابوں کا براہ راست مطالعہ کیا، اور ان کی فنی خامیوں کی بڑی حد تک نشاندہی کی، مگر ان کی یہ خدمت صرف ایک سلبی تھی، وہ نہ تو اسلامی مسائل کو جو یونانی علوم کے ساتھ مختلط ہو گئے تھے، الگ کر سکے، اور نہ ان کے مقابلہ میں کوئی مثبت چیز پیش کر سکے۔

امام ابن تیمیہ

امت مسلمہ میں امام ابن تیمیہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے دوسرے علوم کی طرح یونانی علوم و فنون پر گہری نگاہ ڈالی۔ اور اس میں فکر کی ایک نئی راہ نکالی۔

انہوں نے یونانی علوم کا براہ راست ارسطو وغیرہ کی کتابوں سے مطالعہ کیا، اور ان کے ایک ایک مکتب فکر پر غائر نظر ڈالی، جب ان پر یہ بات واضح ہو گئی، (جیسا کہ کتاب کے مقدمہ میں انہوں نے تصریح کی ہے) کہ ان کے وہ اصول بھی جو بظاہر بالکل بے ضرر اور معصوم معلوم ہوتے ہیں، اپنے اندر بہت سی گمراہیاں رکھتے ہیں، اسوقت انہوں نے ان کے بنیادی اصول اور مسلمات ہی پر ضرب نہیں لگائی بلکہ ان کے ایک ایک تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا، اور ان اسلامی مسائل کو جن کے اثبات کے لئے یونانی طرز فکر کا سہارا لیا گیا تھا، یا دونوں میں توافق و تطابق دکھایا گیا تھا، ایک ایک کر کے علاحدہ کیا، اور بتایا کہ ان دونوں کے طرز فکر میں بنیادی اختلاف اور ان کی آمیزش توحید و شرک کی آمیزش کے مرادف ہے۔ چنانچہ وہ اس کتاب میں جا بجا اس ماحول اور پس منظر کو بھی پیش کرتے گئے ہیں، جس میں یونانی علوم پیدا ہوئے، اور جس میں ان کا نشو و نما ہوا۔

انہوں نے اس کی بھی مخالفت کی ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور حکماء کے اقوال کو متقابل طور پر ایک ساتھ پیش کیا جائے، جس سے یہ معلوم ہو کہ انبیاء کرام کے ذریعۂ علم کے علاوہ بھی انسان کی رہنمائی کے لئے کوئی دوسرا صحیح ذریعۂ علم ہو سکتا ہے۔

پھر ان کی یہ خدمت صرف سلبی یعنی یونانی اصولوں پر تنقید ہی تک محدود نہیں تھی، بلکہ انہوں نے ان کے مقابلہ میں قرآن کے اصول فکر اور طرز استدلال کی بھی پوری پوری وضاحت کی ہے، جس سے کہنا چاہئے کہ قرآن کے طریقۂ تفکر کی دوبارہ تجدید ہوئی۔

اجمالی بحث

اس تمہید کے بعد اب ہم کتاب کے اصل مباحث کا کچھ خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ امام ابن تیمیہ نے اس کتاب میں اہل منطق کے طرز فکر و استدلال پر تنقید کر کے اس کے مقابلہ

یں قرآن کے طریقۂ تفکر اور اسلوب استدلال پر جو بحثیں کی ہیں، وہ کئی سو صفحوں میں پھیلی ہوئی ہیں، مختصر الفاظ میں ان سب کا خلاصہ یہ ہے، کہ اہل منطق نے اپنے فکر و استدلال کی بنیاد نظری اور غیر بدیہی اصولوں اور مسلمات پر رکھی ہے، اور پھر وہ ان ہی کے ذریعہ بدیہات اور مشاہدات تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ طریقۂ فکر و استدلال بالکل غیر فطری اور غیر مفید ہے اس لئے کہ نظری چیزیں تو خود بیان و تفصیل کی محتاج ہوتی ہیں۔ ان پر کسی فکر و استدلال کی بنیاد رکھنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ اور اس سے عام آدمی کیا فائدہ حاصل کر سکتا ہے؟

اس کے برخلاف قرآن اپنے طرز فکر اور طریقۂ استدلال کی ساری بنیاد بدیہات اور مشاہدات پر قائم کرتا ہے۔ اور پھر ان کے ذریعہ نظری اور غیر بدیہی امور پر استدلال کرتا ہے، یہ طریقۂ فکر بالکل فطری اور سہل الحصول ہے۔ اس سے ہر خاص و عام بقدر استعداد فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

یہ کتاب چار مباحث پر مشتمل ہے، اور ہر بحث میں متعدد ذیلی ابواب ہیں، پہلی بحث میں منطقیوں کے اس نظریہ کی تردید ہے، کہ تصورات غیر بدیہیہ بغیر حد کے نہیں معلوم ہو سکتے، دوسری بحث میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے، کہ حد سے اشیاء کا تصور ممکن نہیں ہے، تیسری بحث میں اس استدلال کی تردید ہے کہ تصدیقات کا علم بغیر قیاس کے ممکن نہیں ہے، چوتھی بحث میں ارباب منطق کے اس خیال کی تردید کی گئی ہے، کہ قیاس سے تصدیقات کا علم حاصل ہوتا ہے۔

شروع کتاب میں ایک مختصر مقدمہ بھی ہے، جس میں انہوں نے اہل منطق کے اصول و مسلمات کے بارے میں اپنے خیالات اور علمی تجربات بیان کئے ہیں، اور ان پر مجمل طور سے تنقید کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

"یہ بات تو میں ہمیشہ سے سمجھتا تھا، کہ ذہین آدمی کے لئے یونانی منطق کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور کند ذہن اور بلید آدمی اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا، مگر اس کے قضایا کے بارے میں میرا یہ خیال تھا، کہ وہ درست ہیں، پھر کچھ دنوں کے بعد مجھے اس کے قضایا میں بھی کچھ غلطیاں نظر آئیں، جن کو میں نوٹ کرتا گیا، جب مجھے اسکندریہ (جو اس وقت یونانی علوم کا مرکز تھا) میں رہنے کا اتفاق ہوا، تو وہاں یونانی علوم کے ماہرین سے ملاقات ہوئی، اور ان کے سامنے مجھ کو ان علوم کی گہرائیوں اور جہالتوں کو کچھ

بیان کرنے کا موقع ملا۔ اور جو کچھ ان سے میں بیان کرتا تھا، اس کو لکھتا جاتا تھا۔ ابتک میں نے جو کچھ تنقید کی تھی، اس کا تعلق شعبۂ الٰہیات سے تھا، ان کے منطقی اصولوں کے بارے میں میں نے کچھ نہیں لکھا تھا۔ مگر یہاں پر یہ بات بھی مجھ پر واضح ہوگئی، کہ اہل یونان کے منطقی اصول (جو بظاہر معصوم معلوم ہوتے ہیں) کی بنیاد بھی ان غلط الٰہی تصورات ہی پر ہے، جو انہوں نے اپنے دل سے گھڑ لئے ہیں۔ اسی لئے یہ بھی فساد سے خالی نہیں ہے، چنانچہ میں نے اس پر لکھنے کے لئے بھی قلم اٹھایا۔ اور یہ خیال تھا کہ اس سے معرفت حق کا ایک نیا باب کھلے گا۔"

اس تمہید کے بعد انہوں نے دو صفحے میں پورے منطقی مباحث کا خلاصہ دیا ہے جس کے چند جملے یہ ہیں:

"اہل منطق اس فن کی ابتدا حد (تعریف) اور اس کے انواع قیاس برہانی اور اس کے انواع سے کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ علم یا تو تصور ہوگا یا تصدیق، اور ان میں سے ہر ایک یا تو بدیہی ہوگا، یا نظری۔ اس لئے کہ نہ تو تمام علوم نظری ہو سکتے ہیں، اور نہ تمام بدیہی۔ کیونکہ اس سے دور قبلی اور تسلسل فی العلل لازم آئے گا۔ اس لئے یہ ظاہر ہے کہ جو تصورات و تصدیقات نظری ہیں، ان تک پہنچنے کے لئے کسی نہ کسی سبب اور ذریعہ کا ہونا ضروری ہے تو تصور نظری کا علم جس ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اس کو ارباب منطق حد کہتے ہیں۔ اور تصدیق نظری کا علم جس طریقہ سے ہوتا ہے، اس کو قیاس کہتے ہیں۔"

اس کے بعد انہوں نے حد اور اس کے اقسام گنائے ہیں، پھر کلیات خمسہ کی جن سے حد کی، پھر قضایا جن سے قیاس کی ترکیب ہوتی ہے، تفصیل بیان کی ہے، اس کے بعد ہر موضوع پر الگ الگ بحث کی ہے۔

پہلی بحث یہ بحث حدود و تصورات کے سلبی پہلو سے متعلق ہے، یعنی یہ کہ غیر بدیہی تصورات بغیر حد کے نہیں معلوم کئے جا سکتے، اس کی تردید میں امام نے گیارہ دلیلیں دی ہیں، ان میں سے بعض دلیلوں کا خلاصہ یہ ہے

(۱) کوئی قضیہ خواہ سلبی ہو یا ایجابی، جب تک وہ بدیہی نہ ہو اس کے لئے دلیل و برہان کی ضرورت

ہوتی ہے، خصوصیت سے قضیۂ سالبہ کے بارے میں بغیر دلیل کے کچھ کہنا، ایسا ہی ہے جیسے بغیر علم کے کوئی بات کہہ دی جائے تو اہل منطق کا یہ بنیادی اصول

ان التصورات غیر البدیھیۃ لا تنال الا بالحد — غیر بدیہی تصورات بغیر حد کے نہیں معلوم کئے جا سکتے۔

قضیۂ سالبہ غیر بدیہیہ ہے، مگر انہوں نے اپنے اس سلبی اصول کے لئے کوئی دلیل نہیں دی ہے اور ان کے پاس دلیل موجود بھی نہیں ہے، اس سے ظاہر ہے کہ جب ان کے ابتدائی اور بنیادی اصول کی بنیاد دلیل و برہان کے بغیر رکھی گئی ہے تو پھر فن منطق علم و عرفان کا ذریعہ اور آلہ کیسے بن سکتا ہے حالانکہ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ

الۃ قانونیۃ تعصم مراعاتھا الذھن ان یزل فی فکرہ — ذہن کو غور و فکر کی غلطی سے محفوظ رکھتا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، کہ ارباب منطق کے اصولوں کی بنیاد صرف قیاس و گمان پر ہے، اس میں دلیل و علم کو کوئی دخل نہیں ہے۔

۲۔ دنیا میں انسانوں کے جتنے گروہ ہیں، خواہ وہ ارباب علم کی جماعت ہو یا تاجروں اور صناعوں کی، سب اپنے اپنے فن اور پیشہ کی ضرورت کے لحاظ سے کچھ اصول اور قوانین بنالیتے ہیں، جن کو وہ پورے علم و تحقیق سے جانتے ہیں۔ اور انہی کی مدد سے اپنا سارا کام انجام دیتے ہیں مگر ان میں سے کسی کو بھی نہ تو کہیں اصطلاحی منطق جاننے کی ضرورت ہوتی ہے، اور نہ اس کے اصول و فروع کی۔

بڑے بڑے ائمہ فقہ و حدیث اور مشاہیر اہل فن جنہوں نے اپنے اپنے فن میں غیر معمولی مہارت دکھلائی ہے، اور بڑے ہی مجتہدانہ کام انجام دیئے ہیں، ان میں سے شاید ہی کوئی فن منطق یا اس کے مبادی سے بھی واقف رہا ہو، وہ اپنے اپنے فن کے تمام مفردات علم (تصورات)، اور مرکبات علم (تصدیقات)، سے پورے طور پر واقف تھے، مگر نہ تو انہیں کہیں منطقی حد کی ضرورت ہوئی اور نہ اس کے شرائط و قیود کی،

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے کسی طبقہ کو بھی اپنی علمی یا عملی زندگی میں منطقی اصولوں کی ضرورت

پیش نہیں آتی ۔ اور وہ ان اصولوں کی مدد کے بغیر اپنے اپنے فن اور پیشہ کے مفردات و مرکبات علم سے واقف ہوتے ہیں، اور ان کے ذریعہ متعلقہ کاموں کو انجام دیتے ہیں۔

۳۔ ارباب منطق کے اس دعوی میں "حد" کے بغیر کسی چیز کا تصور نہیں کیا جاسکتا، اگر غور کیا جائے، تو فنی اعتبار سے بھی بہت خامیاں ہیں، چنانچہ اہل منطق نے جتنی چیزوں کی "حد" یعنی تعریف بیان کی ہے ان سب میں شدید اختلاف و تضاد ہے، مثلاً انسان کی تعریف (حد) وہ حیوان ناطق ہے، کرتے ہیں، اس پر متعدد اعتراضات کئے گئے ہیں، اسی طرح اسم وغیرہ کی جو تعریفیں اہل منطق نے کی ہے، ان پر بھی سخت اعتراضات کئے گئے ہیں۔

بعد کے فقہاء، اطباء، نحوی اور دوسرے اہل فن جو یونانی علوم سے متاثر تھے، انہوں نے بھی جب اپنے فن سے متعلق بعض چیزوں کی حد بیان کی تو وہ اسی اختلاف و تضاد میں مبتلا ہوگئے۔ اس کے بعد امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

فلو کان تصور الاشیاء موقوفاً علی الحد لم یکن الی الساعة قد تصور الناس من هذا الامور (ص ۸)	اگر اشیاء کا تصور حد ہی پر موقوف ہے تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ اب تک انسان کو کسی چیز کا صحیح تصور حاصل نہیں ہوا کیونکہ کسی چیز کی حد تو اب تک صحیح طور سے بیان نہیں کی گئی۔

اور چونکہ تصدیق کا دارومدار تصور ہی پر ہے اس لئے جب تصور یعنی مفردات کا علم حاصل نہ ہو تو پھر تصدیق یعنی مرکبات کا علم کیسے حاصل ہو سکتا ہے، اور سارے علوم و فنون اور انسانی معلومات کا دارومدار تصور و تصدیق پر ہے، اس لئے اہل علم منطق کے قول کے مطابق اب تک نہ تو بنی آدم کو صحیح علم ہو سکا ہے، اور نہ وہ کبھی ذرائع علم سے واقف ہو سکتے ہیں۔ اس کے بارے میں امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ:

هذا من اعظم السفسطة	یہ اہل منطق کا بہت بڑا فریب ہے،

۴۔ موجودات میں جن چیزوں کا تصور ممکن ہے، ان کی دو حیثیتیں ہیں، یا تو ان کا تصور حواس ظاہری کے ذریعہ ہوتا ہے، مثلاً لذت، رنگ، ہوا وغیرہ یا پھر حواس باطنی کے ذریعہ

اس میں وہ تمام باطنی احساسات داخل ہیں، مثلاً بھوک، اور سیری، محبت اور بغض، خوشی اور رنج، علم اور جہل وغیرہ۔

اب ان دونوں طرح کے امور متصورہ کو انسان کبھی معین طور سے تصور کرتا ہے، اور کبھی مطلقاً مگر کسی موقع پر اسے منطقی حد کی ضرورت پیش نہیں آتی، بلکہ وہ تصورات حد سے مستغنی ہی رہتے ہیں۔

یہ چند دلائل کا خلاصہ نمونۃً نقل کیا گیا ہے، ورنہ اس کتاب میں اور بھی بہت سے دلائل ہیں۔

دوسری بحث ایجابی پہلو اب تک حدود اور تصورات کے سلسلہ میں ارباب منطق کے نظریہ پر سلبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے، اب اس کے ایجابی پہلو پر امام نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے

ارباب منطق کا ایجابی دعویٰ یہ ہے کہ "حد" کے ذریعہ تصورات کا علم حاصل ہو جاتا ہے، امام ابن تیمیہ نے ان کے اس ایجابی دعویٰ کی بھی تردید کی ہے، اور اس بحث کو تقریباً اسی صفحات میں پھیلایا ہے، اور اس کی سرخی یہ قائم کی ہے۔

"کیا اشیاء کا تصور حد کے ذریعہ ممکن ہے"

اس بات میں انہوں نے تقریباً بیس صفحات میں "حد" کے بارے میں متکلمین اسلام اور منطقیوں کے طریقۂ فکر پر بحث کی ہے۔ پھر امام غزالی کی کتاب "معیار العلم" کا ایک لمبا اقتباس دے کر اس کی تردید کی ہے، اس کے بعد مذکورہ بالا نظریہ پر منطقیانہ نقطۂ نظر سے تنقید کی ہے، اس ضمن میں ایک اہم بحث حدود شرعیہ کی بھی آگئی ہے، ان تمام بحثوں کا بہت ہی مختصر خلاصہ یہ ہے۔

عام اہل منطق ارسطو کے اتباع میں یہ کہتے ہیں کہ "حد" کے ذریعہ "محدود" کا تصور اور اس کی حقیقت کا علم ہو جاتا ہے، اس اصول کو بعض علمائے اسلام نے بھی تسلیم کیا ہے، خصوصیت سے امام غزالیؒ نے اپنی اصول فقہ کی کتاب "المستصفی" تک میں لکھ دیا ہے، کہ بغیر "حد" اور "برہان" کے کسی شئی کی حقیقت کا علم ناممکن ہے۔[۵]

---

[۵] المصنف اس کتاب میں امام غزالی کے منطقی استدلات پر متعدد جگہ تنقید کی ہے، اس بیان کے ضمن میں لکھتے ہیں

باقی اگلے صفحہ پر

امام ابن تیمیہ نے اس اصول کی پر زور تردید کی ہے، بحث کے آخر میں لکھتے ہیں، کہ حد کا فائدہ
زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے محدود " یعنی جس کی حد بیان کی جارہی ہے، اس کے اور غیر کے
درمیان ایک امتیاز پیدا ہو جائے، جس طرح اسم سے مسمیٰ کی تمیز ہو جاتی ہے، یہی مسلک تمام محقق
علمائے اسلام اور متکلمین کا ہے، مثلاً ابوالحسن اشعری، قاضی ابوبکر، ابن فورک، قاضی ابویعلیٰ، امام
الحرمین وغیرہ حتیٰ کہ اس میں معتزلہ اور شیعہ فرقہ کے محققین کا بھی اختلاف نہیں ہے اور اس بارے میں
سب کے سب متفق اللفظ ہیں، کہ

ان حد الشیئ وحقیقته خاصته — کسی شئ کی حقیقت اور تعریف نام ہے اس
التی تمیزہ — خاصہ کا جو اس کو دوسروں سے ممتاز کر دے۔

امام غزالی جنہوں نے اس سلسلہ میں اہل یونان کی تائید کی ہے وہ بھی منطقی حد کی پوری تعریف
نہ کر سکے، اور آخر میں انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ "حد" کے ذریعہ اشیاء کی حقیقت کا تصور کرنا انسانی قوت
سے باہر ہے، یوں شاذ و نادر کچھ لوگوں کو اس کے ذریعہ کسی چیز کی حقیقت کا علم ہو جائے تو یہ اور بات ہے
(ص ۱۹) اس بارے میں " حد " کی ان خاص چار شرطوں کا عام انسانی ذہن کی گرفت میں آنا بھی
بہت ہی مشکل ہے، وہ چار شرطیں جو جنس و فصل کی ذاتی اور لازم کی تقسیم سے پیدا ہوتی ہیں، آخر میں انہوں
نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ:

" جب اس کی تعریف مشکل ہوئی تو متکلمین نے صرف تمیز پر اکتفا کیا، یعنی انہوں نے
کہا کہ حد ایک جامع اور مانع ہے، جس سے ایک تمیز پیدا ہوتی ہے۔" (ص ۲۱)

اس کے بعد امام ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ امام غزالی نے یہ تو اعتراف کر لیا کہ " حد " اپنے تمام
شروط کے ساتھ بھی کسی شئ کی حقیقت جاننے کا ذریعہ نہیں بن سکتی، مگر اس سلسلہ میں انہوں نے صفات
ذاتیہ مقومہ داخل فی الماہیت اور صفات خارجہ لازمہ کی جو تقسیم کی ہے وہ بھی ایک غلط چیز ہے
جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس لئے قدیم متکلمین نے اس طرح کی تقسیم سے گریز کیا ہے، کیونکہ
جب حد کا مقصود ایک امتیاز پیدا کرنا ہے تو پھر اس کے لئے اس قدر موشگافی اور یونانی منطق

بقیہ حاشیہ گذشتہ: کہ تعجب یہ ہے کہ انہوں نے اپنی کتابوں کا نام معیار العلم اور محک النظر اور ایک کتاب کا نام
انہوں نے القسطاس المستقیم تک رکھ دیا ہے۔ اور اس کی تعلیمات کو انبیاء سے نسبت دینے کی کوشش کی ہے۔

کی بھول بھلیاں میں انسانی ذہن کو پھنسانے کی کیا ضرورت ہے۔
امام غزالی کے ان خیالات پر کئی صفحوں میں تنقید کرنے کے بعد تو عقلی اور فنی دلیلیں اہل یونان کے مذکورہ نظریہ کے خلاف دی ہیں اور ان کے اس نظریہ کے سارے تار و پود بکھر کر رکھدیئے ہیں۔
مثال کے لئے انسان کو لیجئے، کہ اس کی تعریف ارباب منطق " حیوان ناطق " یا حیوان ضاحک سے کرتے ہیں۔ یہ ایک مجرد قضیہ خبریہ ہے، دوسرے الفاظ میں یوں کہیئے کہ حیوان ناطق یا ضاحک جملہ خبریہ ہے۔
اگر کسی کے سامنے انسان کی تعریف ان الفاظ میں کی جائے تو اس کے دو پہلو ہیں، یا تو وہ پہلے سے انسان کو بغیر کسی حد اور تعریف کے جانتا ہوگا، یا نہ جانتا ہوگا۔ اگر جانتا ہے تو اس تعریف سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اور اگر وہ نہیں جانتا تھا تو وہ بغیر کسی ذاتی علم کے اس کہنے والے کی تصدیق کرے گا مگر ظاہر ہے کہ صرف کسی خبر کو مان لینے یا محض اس کی تصدیق کر دینے سے تو اس کی حقیقت کے بارے میں علم و یقین حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ یہ ایک خبر ہے، اور خبر میں صدق و کذب دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ بہر حال دونوں صورتوں میں " حد " سے محدود کی حقیقت اور معرفت حاصل نہیں ہوتی، زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ جس کی تعریف کی جاتی ہے وہ دوسروں سے ممتاز ہو جاتا ہے جس طرح اسم سے مسمیٰ ممیز ہو جاتا ہے۔ اور اس کو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں۔
ممکن ہے کہ یہاں پر یہ کہا جائے کہ یہ " حد " جملہ خبریہ نہیں بلکہ مفرد ہے، تو اس پر بھی اعتراض ہوتا ہے کہ تم نے مرکب و مفرد کی جو اصطلاح بنائی ہے، اس اعتبار سے تو انسان کی حد حیوان ناطق یا حیوان ضاحک جملہ خبریہ ہے، جیسا کہ امام غزالی نے لکھا ہے، اور اگر اس تعریف کو قول مجرد مان کر مفرد قرار دو تو تم کو بہت سی تاویلیں کرنی پڑیں گی۔ یہ جیسا کہ اعتراض سے بچنے کے لئے تم نے اس ترکیب کا نام " ترکیب تنقیدی " رکھا ہے مگر بہر حال دونوں صورتوں میں اعتراض و تاویل سے مفر نہیں ہے۔
پہلی صورت یعنی مرکب ماننے کی صورت میں تو وہی اعتراض ہوگا، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، اور اگر اس کو مفرد مانوگے تو پھر

التکلم بالمفرد لا یفید و لا	صرف لفظ کا بولنا نہ تو مفید ہو سکتا ہے،
یکون جوابا للسائل سواءً	اور نہ اس سے کسی سائل کا جواب ہی ممکن ہے

کان مرکبا ترکیبا تقییدیًا — خواہ اس کو مرکب تقییدی قرار دیا جائے۔
او لم یکن کذالک ص۴۲ — یا نہ دیا جائے۔

غرض جو صورت بھی اختیار کی جائے، ارباب منطق کا یہ دعویٰ محض فریب معلوم ہوتا ہے، کہ منطقی "حد" کے ذریعہ کسی شیٔ کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔

اس بحث کو انہوں نے تقریبًا ۶۲ صفحے میں پھیلایا ہے، اس ضمن میں انہوں نے بہت سے ایسے مباحث بھی چھیڑ دیئے ہیں، جو ان کی دوسری کتابوں میں نہیں ملتے، اور بعض ایسے مسائل بھی زیر بحث آ گئے ہیں، جن کا تعلق اصل موضوع سے تو کم ہی ہے مگر ان سے قرآن وسنت کے طرز استدلال اور طریقۂ فکر کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔ اس لئے مختصرًا ان کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے۔

اوپر حد کے مفرد ہونے کی جو بحث گذری ہے، اس کے ضمن میں انہوں نے لکھا ہے کہ دنیا میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہے جو مفرد الفاظ کے تکلم کو مفید قرار دیتا ہو، خود اسلامی شریعت کا بھی فیصلہ یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن صوفیوں نے محض اسم ذات یعنی "اللہ" کے ذکر کو اختیار کیا ہے، ان کے اس فعل کو بدعت قرار دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جتنے اذکار احادیث کی کتابوں میں مذکور ہیں، ان میں کہیں مجرد اسم ذات کا ذکر نہیں ہے، بلکہ پورا جملہ مذکور ہے مثلاً افضل الذکر لا الٰہ الا اللہ، افضل الدعاء الحمد للہ یا سبحان اللہ، اللہ اکبر، لاحول ولا قوۃ الا باللہ وغیرہ (ص۳۵)

بعض صوفیوں نے یہی نہیں کیا ہے کہ اس مبتدعیانہ طریقہ کو اختیار کیا ہے، بلکہ ان کا قول ہے کہ خواص کے حق میں لا الٰہ الا اللہ یعنی پورے کلمہ کو کے ورد سے بہتر اسم ذات کا ورد ہے، اور بعضوں نے تو اس سلسلہ میں اتنا غلو کیا ہے کہ اسم مضمر یعنی ہُوْ، ہو، وغیرہ کو اسم مظہر بتایا ہے، یعنی اللہ کے لفظ کے بجائے صرف ضمیر کے اشاروں سے اس کا ذکر کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے، امام ابن تیمیہ نے لکھا ہے، ان ہی تصورات کی وجہ سے "وحدۃ الوجود" وغیرہ کے گمراہ کن مسائل پیدا ہوئے۔ (محققین صوفیاء ان چیزوں کو تسلیم نہیں کرتے)

ان لوگوں نے اپنے اس غلط طریقۂ فکر کے استدلال میں قرآن کی اس آیت کو بھی استعمال کرنے کی کوشش کی ہے، قل اللہ ثم ذرھم انہوں نے اس آیت سے یہ سمجھا ہے کہ اس میں لفظ اللہ کے ذکر کا حکم دیا جا رہا ہے، مگر قرآن کی اس آیت کے سیاق وسباق اور موقع ومحل میں ادنیٰ تامل سے یہ

بات واضح ہو جائے گی کہ یہ ایک سوال کا جواب ہے، اور وہ سوال شروع ہوتا ہے وما قدروا اللہ حق قدرہٖ سے، پھر اس کے بعد دوسرا سوال اللہ تعالیٰ ان سوال کرنے والوں سے کرتا ہے قل من انزل الکتاب الذی جاء بہٖ موسیٰ، اس سوال کا جواب مذکورہ بالا آیت میں دیا گیا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے۔ گویا یہاں ایک پورا جملہ پوشیدہ ہے یعنی

قل اللہ ای اللہ الذی انزل الکتاب الذی جاء بہ موسیٰ (۳۶) — کہدو کہ اللہ تعالیٰ ہی نے یہ کتاب نازل کی جسے موسیٰ لے کر آئے۔

قرآن میں اس طرح کی بہت سی مثالیں ملیں گی۔

اس سلسلہ میں ایک اہم بحث حدود شرعیہ کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے

امام نے اس بحث کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے

معرفۃ الحدود الشرعیۃ من الدین — حدود شرعیہ کی معرفت دین کا ایک جزء ہے

اس کتاب وسنت میں جو الفاظ آئے ہیں ظاہر ہے کہ ان کے مفہوم ومعانی کا علم اور ان کی معرفت دین کی اہم ضرورت ہے۔ ہاں اتنا فرق ہے اور بعض مواقع پر یہ ضرورت فرض عین کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے، اور بعض مواقع پر اس کی حیثیت فرض کفایہ ہی کی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے دین کے حدود کے پاس ولحاظ کرنے کی تاکید کی ہے، اور جو لوگ اس کا پاس ولحاظ نہیں کرتے ان کی مذمت کی ہے۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ کُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّ	دیہاتی باشندے کفر ونفاق میں بہت
اَجْدَرُ اَنْ لَّا یَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَا	سخت ہوتے ہیں، اور ان کو ایسا ہی ہونا
اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ ۵	چاہیے کہ وہ ان حدود اللہ کو نہ جانیں
(توبہ)	جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر نازل کیا

قرآن میں جو الفاظ وارد ہوئے ہیں، وہ دو طرح کے ہیں، ایک وہ جو سننے والے کے لئے غریب واجنبی معلوم ہوتے ہیں، مثلاً ضیزیٰ (غلط اور بے ڈھنگی) قسورۃ (شیر) عسعس (رات آئی)

[۱] چونکہ یہ جاہل ہوتے ہیں، اور جہالت حدود الٰہی کی معرفت اور اس کے لحاظ و پاس میں سب سے بڑا مانع ہوتی ہے اس لئے خاص طور سے ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

وغیرہ (مصنف نے یہاں حدیث سے کوئی مثال نہیں دی، اگر تفحص کیا جائے تو حدیث میں بھی بہت سے غریب الفاظ مل سکتے ہیں)

دوسرے وہ الفاظ جو عام طور پر مشہور ہوتے ہیں، اور سامع ان کے اجمالی معانی سے واقف بھی ہوتا ہے، مگر ان کے مفہوم و معانی کی وسعت و ہمہ گیری کے پورے حدود کا اس کو علم نہیں ہوتا، یعنی ان کے سادہ مفہوم کو تو وہ جانتا ہے، مگر اس کو اس بات کا پورا علم نہیں ہوتا کہ ان الفاظ و اسماء کے مصداق و مسمیٰ میں کون کون سی چیزیں داخل ہیں، اور کون کون سی ان سے خارج ہیں۔ مثلاً صلوٰۃ زکوٰۃ وغیرہ کو لیجئے۔ ان الفاظ کے اجمالی معنی کو قرآن کا ہر مخاطب جانتا ہے، مگر اسکے مصداق کا پورا علم اور اس کے مسمیات کی پوری تحدید رسول خدا ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے، اس کے لئے دوسرا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ مثلاً حدیث میں ہے کہ

مفتاح الصلوٰۃ الطھور نماز کی کنجی طہارت ہے۔

اب صلوٰۃ کے مجمل معنی کا علم ہر مسلمان کو ہے، مگر صلوٰۃ کے لئے "طہور" کی جو شرط لگائی گئی ہے، وہی شرط صلوٰۃ جنازہ، سجدۂ سہو، اور سجدہ تلاوت وغیرہ میں لگائی جائے گی یا نہیں؟ اور یہ چیزیں "صلوٰۃ" کے مفہوم میں داخل ہے یا نہیں؟ اس بات کا علم صرف شارع علیہ السلام ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔

اسی طرح لفظ خمر (شراب)، اور میسر (جوا) کو لیجئے، ان کے بعض مسمیات کا علم ہر شخص کو ہے مگر اس کی پوری تحدید و تعریف بغیر کسی خارجی دلیل کے ممکن نہیں ہے۔ مثلاً خمر کا اطلاق کن کن مسکرات پر ہوتا ہے، میسر میں گھوڑ دوڑ، شطرنج جیسی چیزیں بھی داخل ہیں یا نہیں؟

یا ربوا کے ضمن میں تبادلہ اشیاء کی کون کون صورتیں آتی ہیں۔ ان تمام سوالات کے جواب کے لئے کسی شرعی یا غیر شرعی دلیل کی ضرورت پڑے گی۔ بغیر اس کے ان الفاظ کے وسیع مفہوم کو سمجھنا مشکل ہے۔

مزید تفصیل کے لئے غیبت کے لفظ پر غور کیجئے۔ اس کا مجمل مفہوم ہر عربی داں جانتا ہے مگر باوجود عربی دانی کے صحابہ کرام بھی اس کے صحیح مصداق و مراد کو نہ پا سکے۔ اور ان کو اس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنا پڑا، جب آپؐ نے غیبت کی تعریف فرمائی۔

ذکرک اخاک بمایکرہ اپنے بھائی کا ذکر اس طرح کرنا کہ اسکو برا معلوم ہو
تو انہوں نے پھر دوبارہ سوال کیا، "اگرچہ وہ عیب میرے بھائی میں موجود ہو" آپ نے
فرمایا کہ "ہاں اس کے اندر عیب موجود ہے جب ہی تو وہ غیبت ہے، ورنہ پھر بہتان ہو جاتا"
اس سے معلوم ہوا کہ غیبت کے مفہوم کا اجمالی علم تو پہلے سے تھا مگر اس کی کوئی جامع
تعریف ان کے سامنے موجود نہیں تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کے بعد ان کو
اس کا علم ہوا۔

یہ تو وہ صورتیں تھیں جن میں الفاظ کی تعریف و تحدید، افہام و تفہیم کے ذریعہ ہوتی ہے
لیکن کبھی الفاظ کے معنی و مراد کی تعیین و تبیین کے لئے دوسری صورتیں بھی اختیار کرنی پڑتی ہیں۔

اس کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی لفظ کے معنیٰ یا کسی اسم کے مسمّیٰ کو بتانے کے لئے اسکا
دوسرا مرادف لفظ استعمال کر دیا جائے، اس کے ذریعہ بہت آسانی سے اس لفظ کے مفہوم کو
مخاطب کے ذہن نشین کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً قسورۃ (شیر) کے لئے اسد، شہاب کیلئے
عذاب یا قیمت کے لئے ثمن یا طاقت کے لئے قوت کا استعمال۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی لفظ کی تشریح ایسے لفظ یا جملہ سے کی جائے جو مرادف تو نہیں
مگر اپنی بعض دوسری خصوصیات کی وجہ سے اس کا بدل بن جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی یہ سوال کرے
کہ "صراط مستقیم" کیا ہے؟ تو اس کے جواب کے لئے "اسلام" اتباع قرآن یا طاعت
خدا و رسول وغیرہ الفاظ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک کے ذریعہ سائل
کے ذہن میں صراط مستقیم کا مفہوم بٹھایا جاسکتا ہے۔

کسی لفظ کی تعریف و توضیح کے لئے تیسری شکل مثالوں کے استعمال کی ہے۔ یعنی کسی مفہوم
کو ذہن نشین کرنے کے لئے زبانی افہام و تفہیم کے بجائے اس کی کوئی عملی مثال مخاطب کے سامنے
پیش کر دی جائے۔ مثلاً کوئی شخص یہ سوال کرے کہ روٹی کیسی ہوتی ہے۔ اس کے سامنے ایک روٹی
پیش کر دی جائے تو وہ فوراً اس کو سمجھ لے گا۔

لے اس وقت جدید طریقہ تعلیم یہی ہے کہ بچوں کو الفاظ کے معانی بتانے کے بجائے صورت امثال کرکے
مفہوم ان کے ذہن نشین کرایا جائے۔ اس کو انگریزی میں "ڈائرکٹ متھڈ" (Direct Method) کہتے ہیں

اسی طرح اگر کوئی پوچھے کہ قرآن میں مقتصد، سابق اور ظالم کے جو الفاظ آتے ہیں، اور ان کے معانی کیا ہیں؟ تو اس کے جواب میں اگر یہ کہیں کہ جو نماز وقت کے ساتھ پڑھ لے، وہ مقتصد ہے، اور جو وقت کا لحاظ نہ کرے وہ ظالم ہے۔ اور جو اول وقت نماز ادا کرلے وہ سابق ہے، تو ظاہر ہے کہ اس مثال سے ان الفاظ کے معانی بہت آسانی سے مخاطب کے ذہن میں اتر جائیں گے، اور وہ اس کی روشنی میں یہ بھی سمجھ لے گا کہ ان میں تین طرح کے آدمیوں کے اخلاق وکردار کو پیش کیا گیا ہے۔

یہاں پر ایک غلط فہمی اور دور کرنے کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ الفاظ کے معانی کا تعلق صرف زبان وتعلق سے ہے، اور کسی لفظ کے معنی معلوم کرنے یا کسی زبان کے جاننے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ آدمی کو اس کے ملحقات کا علم ہو جائے، یا وہ لغت کی کتابوں کا مطالعہ کرے، مگر یہ بات کم از کم شریعت کی زبان کے بارے میں درست نہیں ہے، اور یہ جو مثالیں دی گئی ہیں، ان سے اس بات کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔ کتاب وسنت میں کچھ الفاظ ایسے ضرور ملیں گے، جو محض لغت کے ذریعہ معلوم کئے جا سکتے ہیں، مگر ان کی تعداد ان الفاظ کے مقابلہ میں بہت کم ہے، جو لغت کے علاوہ کچھ دوسرے خارجی دلائل سے معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ کتاب وسنت میں جو الفاظ وارد ہوئے ان کی تین قسمیں ہیں، یا یوں کہئے کہ ان کے معانی معلوم کرنے کے تین ذرائع ہیں۔

(الف) ما یعرف حدہ باللغۃ کالشمس والقمر والکوکب۔ — وہ الفاظ جن کی تعریف وتحدید لغت کے ذریعہ ہو جاتی ہے، جیسے سورج، چاند، ستارہ وغیرہ۔

(ب) ما لا یعرف الا بالشرع کاسماء الواجبات والمحرمات الشرعیۃ — وہ الفاظ جن کی پوری تعریف شریعت کی مدد کے بغیر نہیں معلوم کی جا سکتی جیسے محرمات اور واجبات شرعیہ (مثلاً صلوٰۃ، حج، صوم، ربٰو، قمار وغیرہ۔

(ج) ما یعرف بالعرف العادی — وہ الفاظ جو عرف عادت کے ذریعہ معلوم کئے جا سکتے ہیں، مثلاً نکاح، طلاق، بیع، شرا وغیرہ

کتاب وسنت کے الفاظ کے معانی معلوم کرنے اور ان کے اسمار کے مسمیات کے جاننے کی یہ تو وہ صورتیں تھیں جن کو کسی نہ کسی خارجی ذریعہ سے معلوم کیا جاسکتا تھا مگر ان کے علاوہ بعض اسمأ والفاظ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے اندر ظاہر کے علاوہ کچھ پوشیدہ اور غیر ظاہر مفہوم ومعانی بھی ہوتے ہیں. ایسے الفاظ کے معانی معلوم کرنے یا ان کے پنہاں مفہوم کو عیاں کرنے کے لئے غور وفکر کی ضرورت ہوتی ہے. اس کو فقہ کی اصطلاح میں اجتہاد اور شارع اسلام علیہ السلام کی زبان میں تاویل کہا جاتا ہے، مثلاً قبول شہادت کے لئے "دو عدل" کی شرط لگائی گئی ہے، نماز کے لئے "استقبال قبلہ" کی ضرورت ہے، عورت کو نفقہ واجبہ. بالمعروف" ملنا چاہئے، ان باتوں کا علم صرف الفاظ کے ذریعہ نہیں ہوسکتا، بلکہ جب اس کا موقع آئے گا، تو اس وقت غور کرنا پڑے گا کہ وہ شرط پوری ہو رہی ہے یا نہیں، اگر کوئی شاہد بن کر آئے تو اس کے بارے میں یہ غور کرنا پڑے گا کہ آیا اس کے اندر دو عدل کی صفات موجود ہیں یا نہیں. یا اگر کوئی نماز پڑھ رہا ہو، تو دیکھنا ہوگا کہ وہ استقبال کئے ہوئے ہیں یا نہیں ؟ اسی طرح اگر کسی عورت کو نفقہ واجبہ ملاہے، تو اس میں یہ بھی دیکھا جائے گا کہ وہ بالمعروف ہے یا نہیں ؟

کبھی یہ غور وخوض اور تاویل واجتہاد اس بارے میں بھی کرنا پڑتا ہے کہ مسمیٰ کے اندر فلاں چیز بھی داخل ہے یا نہیں، مثلاً قرآن میں حکم ہے کہ صعید طیب (پاک مٹی) سے تیمم کرو، اب زمین سے جو چیز نکلتی ہے، مثلاً چونا، کنکر، پتھر، لوہا، ان کے بارے میں سوچنا پڑے گا کہ یہ بھی اس حکم میں داخل ہیں یا نہیں ؟

اسی طرح قرآن میں ہے کہ اپنے چہروں اور ہاتھوں کا تیمم کرو اور اپنے چہروں کو دھوؤ، اب چہرہ میں کان، کن پٹی، اور ہاتھ میں کلائی داخل ہے یا نہیں، اس بارے میں غور کرنا پڑے گا یا قرآن میں ہے کہ تمہاری مائیں اور تمہاری لڑکیاں تمہارے اوپر حرام کردی گئی ہیں، اب ماں کے حکم میں دادی، نانی، اور بیٹی کے حکم میں پوتی داخل ہے یا نہیں، اسمیں اجتہاد کرنا پڑے گا۔

غرض یہ ہے کہ کتاب وسنت میں بہت سے الفاظ اور اسمار ایسے بھی ہیں، جن کے مصداق کے متعین کرنے اور ان کی پوری تعریف وتحدید کرنے کے لئے اجتہاد وقیاس اور شارع کے منشا کے جاننے کی ضرورت ہوتی ہے. صرف زبان دانی کافی نہیں ہے۔

تیسری بحث | یہ بات تصدیق و قیاس سے متعلق ہے، اس پر بھی انہوں نے دو حیثیتوں سے بحث کی ہے، ایک سلبی اور دوسری ایجابی۔

سلبی پہلو | اس میں منطقیوں کے اس اصول کی تردید کی گئی ہے کہ

انه لا یعلم شیء من التصدیقات الا بالقیاس (ص ۸۸) — کسی تصدیق (یعنی مرکبات) کا علم بغیر قیاس کے ممکن نہیں۔

اس بحث کو انہوں نے تقریباً ڈیڑھ سو صفحات میں پھیلایا ہے، اور ضمناً بہت سے دوسرے اسلامی مسائل کے ساتھ قرآن کے طرز استدلال اور طریق فکر پر بھی متعدد جگہ بحث کی ہے، اس سلسلہ میں ابن سینا پر تنقید کرتے ہوئے بتایا ہے، کہ اس نے الٰہیات، اور معاد و شرائع پر جو کچھ بحث کی ہے، اس کا ماخذ باطنیت اور اسماعیلیت ہے، اس وجہ سے ان مسائل میں اس نے ٹھوکر کھائی ہے، اسی ضمن میں اہل منطق کے اس اصول پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے کہ متواترات اور مجربات کسی دوسرے کے لئے حجت نہیں بن سکتے، اپنے اس دعوٰی پر کہ " قیاس کے ذریعہ تصدیقات کا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے متعدد دلیلیں دی ہیں۔ اور قیاس کے تمام انواع و اقسام پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، یہاں صرف ایک دلیل کا ذکر کیا جاتا ہے۔ منطقیوں کا یہ قول کہ "کسی تصدیق کا بجز قیاس علم حاصل نہیں ہو سکتا" ایک قضیہ سالبہ ہے، جو بدیہی نہیں ہے، اور انہوں نے اس کی کوئی دلیل بھی نہیں دی ہے، حالانکہ غیر بدیہی یا دوسرے لفظوں میں نظری باتوں کے لئے ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے، جب انہوں نے کوئی دلیل نہیں دی تو پھر اس کے اوپر ایک دوسرے نظری اصول کو کہ کوئی شخص بجز قیاس شمول کے نظری تصدیقات کا علم حاصل نہیں ہو سکتا"، کی بنیاد رکھنے کا کیا حق حاصل ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ تمام اہل منطق تسلیم کرتے ہیں کہ بعض تصدیقات بدیہی ہیں، اور بعض نظری کیونکہ تمام تصدیقات نظری اس لئے نہیں ہو سکتے کہ نظری بدیہی کا محتاج ہوتا ہے، اور جب یہ صورت ہے تو نظری اور بدیہی میں نسبتی اور اضافی فرق ہوا۔ اس لئے ایک ہی علم بعض اشخاص کے لئے بالکل بدیہی ہوتا ہے، بعض اس کو کم یا زیادہ نظر و فکر سے حاصل کر لیتے ہیں۔ اور بعض اشخاص کو نظر و فکر سے بھی حاصل نہیں ہوتا

جب یہ ایک اضافی چیز ٹھہری، تو ایک ہی بات کسی کے لئے بدیہی ہو سکتی ہے، اور دوسرے

کے لئے غیر بدیہی اور نظری بن سکتی ہے۔ اس لئے ایسے اضافی اور غیر متعین اصول کو فکر واستدلال کی بنیاد یا وصول الی الصواب کا ذریعہ بنانا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

ارباب منطق کا دعویٰ ہے کہ "مجربات متواترات" اور "حدسیات" کی افادیت اس شخص خاص کے لئے ہوتی ہے جس نے ان ذرائع سے حاصل کی ہوئی معلومات کو دوسروں کے لئے دلیل نہیں بنا جا سکتا۔ بخلاف حسیات کے جو اپنے لئے بھی دلیل بن سکتے ہیں۔ اور دوسروں کے سامنے بطور دلیل پیش بھی کئے جا سکتے ہیں۔ امام نے ان کے اس دعویٰ کے بعض اجزار کو تسلیم کرتے ہوئے اس پر بہت تنقید کی ہے۔ ان کا پہلا جملہ یہ ہے کہ "یہ تقسیم و تفریق سرے سے غلط اور فاسد ہے"۔ اس لئے کہ نہ تو حسی اشیار کے بارے میں سب لوگوں کا علم یکساں ہوتا ہے اور نہ تواتر اور تجربہ سے حاصل کی ہوئی معلومات ہی سب کے لئے یکساں مفید بن سکتے ہیں۔

مثلاً "حسیات" خواہ ظاہری ہوں یا باطنی، ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک خاص، دوسری عام یعنی بعض حسیات ایسی ہوتی ہیں جن کے احساس میں ہر شخص یکساں شریک نہیں ہو سکتا، بلکہ اس میں تفاوت ہوتا ہے، مثلاً حامد کوئی چیز دیکھے، چھوئے، چکھے یا سونگھے تو اس کے لمس و رویت اور ذوق و شم میں خالد بھی اس کے برابر کا شریک ہو، یہ صحیح نہیں ہے، اسی طرح اگر کسی کو بھوک پیاس لگی ہے، یا وہ رنج و الم میں مبتلا ہے تو یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ دوسرا بھی اس کے اس احساس میں اس کا یکساں شریک ہو، یا دونوں کا احساس ان چیزوں کے بارے میں ایک ہو۔

ہاں بعض ایسے حسیات ضرور موجود ہیں جن میں سارے مسلمان برابر کے شریک ہوتے ہیں، الّا یہ کہ ان کے ماخذ احساس میں فرق آگیا ہو، یا کوئی دوسرا عذر مانع ہو، مثلاً سورج، چاند اور ستارے کی رویت یا کسی شہر یا بستی میں کوئی مخصوص چیز مثلاً پہاڑ، چشمہ وغیرہ موجود ہو تو اس کے دیکھنے میں سارے لوگ شریک ہوتے ہیں۔

عام حسیات کی طرح تواتر اور تجربہ سے جو چیزیں معلوم ہوتی ہیں، ان میں بھی عام انسانی افراد شریک ہوتے ہیں۔ جس طرح کہ یا دنیا کے دوسرے مشہور شہروں کو ہر شخص نے دیکھا نہیں ہے، مگر یہ بات سب کو معلوم ہے کہ یہ مقامات اس پر پردۂ زمین پر موجود ہیں، اسی طرح سمندر کو کتنے لوگوں نے دیکھا ہے مگر کیا دنیا کا کوئی فرد بھی نہ دیکھنے کے باوجود اس کے وجود سے انکار کر سکتا ہے؟ اسی طرح انبیار کرام

کی بعثت اور ان کے ناموں سے دنیا کا ہر متمدن شخص واقف ہے، اور جو لوگ واقف نہیں ہیں، وہ کسی ویرانہ میں رہتے ہوں گے، تو کیا جو لوگ ان سے واقفیت رکھتے ہیں، ان سب نے ان کو بچشم خود دیکھا ہے؟

اسی طرح ہزاروں باتوں اور سیکڑوں چیزوں کی خاصیتوں کا علم آدمی کو دوسروں کے تجربات کی بنا پر حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً دواؤں کی خاصیتیں وغیرہ اسی قسم میں شمار ہیں۔ یعنی ان میں بھی کسی ایک شخص کے تجربہ سے ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو فائدہ ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو معلومات ان متواترات اور تجربات سے حاصل ہوتی ہیں وہ اسی شخص تک محدود نہیں رہتی ہیں جس نے انہیں حاصل کیا ہے، بلکہ ان کی افادی یا معلوماتی حیثیت میں دوسرے بھی اسکے شریک ہیں، تو پھر اہل منطق کا یہ دعویٰ بالکل ایک فریب کے سوا اور کیا ہے کہ حسیاتی معلومات میں تو سب انسان یکساں شریک ہوتے ہیں۔ اور تواتر و تجربہ سے حاصل کی ہوئی معلومات کی افادیت مخصوص اشخاص تک محدود رہتی ہے

اس سلسلہ میں یہ بات البتہ قابل لحاظ ہے کہ جس طرح حسیات کے معلوم کرنے کے لئے کچھ ذرائع و اسباب ہوتے ہیں، اسی طرح تواتر و تجربہ کے لئے بھی کچھ ذرائع و وسائل ہیں۔ جب ان کو استعمال کیا جائے گا تب ہی ان سے وہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں جو ہماری زندگی کیلئے مفید ہوں۔

تواتر اور تجربہ پر اصولی حیثیت سے بحث کرنے کے بعد دینی حیثیت سے اس پر روشنی ڈالی ہے، اور سب سے پہلے انہوں نے یہ بتایا ہے کہ

انکار التواتر هو من اصول الکفر والالحاد (ص ۹۸)	تواتر کا انکار کفر و الحاد کی بنیاد ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء کرام سے جو معجزات صادر ہوئے، یا ان کی جو تعلیمات دنیا میں موجود ہیں۔ ان سب کا دارومدار تواتر و روایت ہی پر تو ہے[1] اس لئے اسکا انکار یا اس کو قابل اعتماد نہ

---

[1] انبیاء کی تعلیمات ہی پر کیا موقوف ہے اسوقت ماضی کا جو سرمایہ بھی دنیا کے پاس موجود ہے، اس کا سارا دارومدار تواتر اور روایت پر ہے، اس کا انکار دنیا کی پوری تاریخ پر خط نسخ پھیر دیتا ہے۔

علم نہ سمجھنا سارے دینی سرمایہ ہی کو ناقابلِ اعتماد بنانے کے مرادف ہے۔)

اگر کوئی شخص کسی گذشتہ واقعہ کے بارے میں یہ کہے کہ تمہارے نزدیک یہ صحیح ہے مگر میں تو اس کو صحیح نہیں سمجھتا تو اس سے کہا جائے گا کہ جس طرح دوسرے لوگوں نے اس کو سننے اور معلوم کرنے کی کوشش کی ہے، اگر تم بھی اسی طریقہ سے اس کو جاننے کی کوشش کرو، تو تم کو اس کی صحت کا یقین ہو جائے گا۔ مثلاً ایک شخص چاند دیکھتا ہے اور دوسرے شخص سے کہتا ہے کہ وہ چاند نظر آگیا، دوسرا شخص اس کی اس بات کا یقین نہیں کرتا۔ تو اس سے کہا جائے گا، کہ جس طرح اور جہاں اس نے چاند دیکھا ہے۔ تم بھی وہیں دیکھو تو تم کو بھی وہ نظر آجائے گا، اب اگر وہ چاند دیکھنے کی کوشش کرے گا، تو اسکو چاند ضرور نظر آجائے گا، اگرچہ اس کو اس چاند کی خبر دینے والے کی صداقت پر یقین کامل بالکل نہ رہا ہو، دینی امور کے بارے میں عموماً فلاسفہ یہ کہدیا کرتے ہیں کہ

هذه غير معلومة لنا (ص۱۰۰) یہ ہمارے لئے غیر معلوم چیزیں ہیں[1]

یہ بات ان کو اس لئے کہنی پڑتی ہے کہ جن وسائل کے ذریعہ وہ دینی حقائق تک پہنچ سکتے ہیں، ان کو وہ کبھی کام میں نہیں لاتے اور نہ ان کو کوئی جستجو ہوتی ہے پھر جب وہ اپنی جہالت اور کوتاہی کی وجہ سے ان حقائق تک پہنچ نہیں پاتے تو ان حقائق کے وجود ہی سے انکار کر بیٹھتے ہیں۔ مگر

عدم العلم ليس علما بالعدم وعدم الوجدان لا يستلزم عدم الوجود (ص۱۰۱) — کسی چیز کا نہ جاننا اس کے نہ ہونے پر دلیل نہیں بن سکتا، اور نہ کسی چیز کے وجود کا عدم علم اس کے غیر موجود ہونے کا ثبوت ہو سکتا ہے۔

اس لئے فلاسفہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم کو اس بات کا علم نہیں ہے مگر ان کو یہ کہنے کا حق تو کسی طرح نہیں پہنچتا کہ یہ چیز معدوم ہے یا اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، قرآن نے ایسے ہی لوگوں کے لئے کہا ہے۔

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ — جو چیز ان کے احاطۂ علم میں نہ آسکی اور

---

[1] اسی دور کے بہت سے ملاحدہ، فلاسفہ اور سائنس داں بھی یہی فقرہ دہراتے رہتے ہیں۔

وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ (یونس) — اس کی حقیقت ان کی سمجھ میں آئی تو انکار کر بیٹھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تواتر کا انکار عقلی اور اصولی حیثیت سے بھی ایک غیر معقول بات ہے اور دینی نقطۂ نظر سے بھی تو انتہائی مہلک بات ہے۔

اس کے بعد امام نے فلاسفۂ یونان کے مشرکانہ تصورات کی بحث چھیڑی ہے۔ اس بحث کا آغاز اس جملہ سے کیا ہے۔

شرک الفلاسفۃ اشنع من شرک الجاھلیۃ — فلاسفہ کے مشرکانہ تصورات مشرکین جاہلیت کے خیالات سے بھی زیادہ بدترین

اس کی وجہ یہ ہے، کہ عام مشرکین کم از کم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے اور اس کی مشیت و قدرت سے زمین و آسمان اور اس کائنات کے دوسرے بڑے امور انجام پاتے ہیں، وہ اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ مخلوقات میں کوئی چیز اس کی ہمسر نہیں ہے۔ اور نہ کسی مخلوق کو دوام حاصل ہے، وہ بتوں کی پوجا ان کو خدا سمجھ کر نہیں بلکہ اس تصور کے ماتحت کرتے ہیں کہ یہ خدا کے قرب و شفاعت کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ مشرکین عرب ملائکہ کو خدا کا شریک ٹھہراتے تھے، مگر اسی کے ساتھ ان کو مخلوق بھی سمجھتے تھے۔

خدا کے بارے میں یہ تصورات بھی بالکل باطل اور غلط ہیں، مگر ان میں کم از کم خلق و قدرت کو اس کی ذات کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ لیکن فلاسفہ کے یہاں خدا کا تصور بالکل یہ ہے

الواحد لا یصدر الا الواحد — ایک سے ایک ہی چیز صادر ہو سکتی ہے

اب سوال یہ ہے کہ اس کائنات ارضی و سماوی کو کس نے بنایا تو اس کے لئے انہوں نے ایک نیا سلسلۂ الٰہیہ قائم کیا، یعنی ”عقول عشرہ“، کی ایک نئی اصطلاح گھڑھی۔ ان کا گمان یہ ہے کہ خدا نے عقل اول کو پیدا کیا، اور جب اس کا کام ختم ہوگیا، تو عقل اول نے عقل دوم کو، اسی طرح دس عقلوں تک یہ سلسلہ چلا، دسویں عقل نے ساری ارضی و سماوی مخلوق کو پیدا کیا، اس تصور میں خدا کو عقل عاشر سے بھی کم اختیارات دیئے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دنیا کے مشرکین کے کسی گروہ نے بھی خدا کو اس سے زیادہ بے اختیار نہیں بتایا ہے، جتنا انہوں

نے اس کو بے اختیار ہی نہیں بلکہ مسلوب الاختیار بنا دیا ہے۔ امام ابن تیمیہ نے ان کی کتابوں کے حوالہ سے ان کے یہ خیالات نقل کئے ہیں کہ:

ان الرب لا یفعل بمشیته و قدرته ولیس عالما بالجزئیات ولا یقدر ان یغیر العالم بل العالم فیض فاض بغیر مشیته و قدرته وعلمه (ص ۱۰۳)	اللہ تعالیٰ اپنی مشیت اور قدرت سے کچھ نہیں کرتا اور نہ وہ جزئیات کا عالم ہے، وہ اس بات کی قدرت نہیں رکھتا کہ عالم میں تغیر پیدا کرے۔ یہ دنیا ایک فیض دینے والے کا ایک فیض ہے بغیر اسکی مشیت اور قدرت اور علم کے یہ کارخانہ چل رہا ہے۔

یہ خیالات تو مشرکین فلاسفہ کے ہیں۔ مگر ان میں جو فلاسفہ وحی اور نبوت کے قائل ہوئے، انہوں نے یہ احسان کیا کہ ملائکہ کو عقول عشرہ کی جگہ لا بٹھایا[1]

مختصر یہ کہ خدا کو انہوں نے انگلستان کے بادشاہ سے بھی بے اختیار بنایا ہے۔ ان مباحث کے علاوہ بہت بہت سے مباحث ایسے ہیں جن کا کچھ نہ کچھ خلاصہ یہاں دینا چاہئے۔ گر مضمون کے طویل ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اس لئے صرف بقیہ مباحث کی سرخیوں کا ترجمہ یہاں دے دیا جاتا ہے جن سے ان مباحث کی نوعیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

(۱) قضایا کلیہ قیاس تمثیل سے معلوم کئے جا سکتے ہیں (۲) قیاس شمول کی حقیقت (۳) فلاسفہ کے یہاں علوم کی تین قسمیں ہیں (۴) ان کے تصورات خدا نہ تو خالق کے لئے مفید ہیں نہ مخلوق کے لئے (۵) نفس کو کمال مجرد معرفت الٰہی سے حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے لئے معرفت کے ساتھ عمل صالح کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس پر انہوں نے بڑی لمبی بحث کی ہے۔ (۶) انبیاء کا طریقہ استدلال (۷) قرآن اپنے طریقۂ استدلال میں قیاس اولیٰ یعنی آیات اللہ کو استعمال کرتا ہے

[1] قرآن پاک اسی لئے بار بار یہ حقیقت واضح کرتا رہتا ہے کہ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ یعنی خالق بھی وہی اور کائنات کے سارے امور وہ اپنے علم و قدرت سے انجام دیتا ہے، حی و قیوم کی صفت بھی اسی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے (ادارہ)

قیاس شمول یا قیاس تمثیل سے وہ گریز کرتا ہے، اس بحث میں انہوں نے آیات اللہ اور قیاس کے فرق کو بھی واضح کیا ہے (۸) ان کے اس قول کی قباحت کہ خدا کا علم بھی قیاس کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے (۹) دلیل و قیاس کے بارے میں فلاسفہ کے خیالات کی تردید (۱۰) ان کے اس خیال کی تردید کہ استدلال کے لئے دو مقدموں کا ہونا ضروری ہے (۱۱) علم منطق صرف ایک اصطلاحی فن ہے، جس کو ایک یونانی شخص نے وضع کیا (۱۲) انبیاء کے بارے میں صوفیوں اور فلسفیوں کے گمراہ کن خیالات (۱۳) امام غزالی اور علم منطق۔ اس بحث میں خاص طور سے انہوں نے ان پر تنقید کی ہے۔

تیسری بحث میں انہوں نے ۲۰۰ صفحات سے زیادہ چوتھے مبحث پر سیاہ کئے ہیں جس کی چند سرخیاں یہ ہیں:

(۱) گذشتہ مباحث پر تبصرہ (۲) منطقی قیاس کی عدم تاثیر (۳) غیر فطری طریقۂ فکر انسانی ذہن کے لئے ایک عذاب ہے، جس میں منفعت کا کوئی پہلو نہیں ہے (۴) عقل و نقل کا تعارض (۵) رسول سے کوئی غیر معقول بات ثابت نہیں ہے (۶) ملائکہ اور "عقول" فلاسفہ کی حقیقت (۷) ارسطو اور یونان کے مشرکین (۸) شرک کی ابتداء قبروں کی تعظیم اور ستارہ پرستی سے ہوئی ہے (۹) حران صابیین کا مرکز ہے۔ اس میں بتایا ہے کہ صابئہ کی دو قسمیں ہیں، موحدین اور مشرکین (۱۰) تمام انبیاء علیہم السلام مسلم تھے (۱۱) قیاس منطقی کی صحت اگر تسلیم بھی کرلی جائے تو اس سے موجودات کا علم حاصل نہیں ہو سکتا (۱۲) جواہر خمسہ میں موجودات کا حصر صحیح نہیں ہے (۱۳) متکلمین اور فلاسفہ کی غلطیاں (۱۴) معاد کے اثبات میں قرآن کا طریقۂ بیان (۱۵) انبیاء کی تعلیمات ادلۂ عقلیہ اور سمعیہ دونوں کی جامع ہیں (۱۶) فلاسفہ کے آپس میں اختلافات وغیرہ وغیرہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص قرآن پڑھے اور اس کو حفظ کرے، اور اسکے حلال کو حلال سمجھے اور اسکے حرام کو حرام جانے تو اللہ تعالیٰ اسکو جنت میں داخل فرمائے گا اور اس کی سفارش اس کے گھر والوں کے دس ایسے آدمیوں کے حق میں قبول کرے گا جن کے لئے دوزخ لازم ہو چکی ہو (احمد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ)

نئی کتابیں

(۱) دعوۃ القرآن تفسیر پارہ عم
(۲) جواھر الحدیث

از جناب شمس پیرزادہ صاحب صفحات بہ ترتیب ۲۴۰، ۱۹۰
کتابت و طباعت اعلیٰ۔ پتہ: دعوۃ القرآن ۵۹ محمد علی روڈ
دونوں ا بمبئی ۳ دونوں کی قیمت ۷ روپئے۔

(۱) شمس پیرزادہ صاحب اس سے پہلے کئی کتابیں ترجمہ و تالیف کر چکے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں بھی انہی کی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ انہوں نے کچھ دنوں سے آسان زبان میں قرآن پاک تفسیر کا کام شروع کیا ہے۔ دعوۃ القرآن اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اس میں قرآن پاک کے آخری پارہ کی مختصر تفسیر سلجھے ہوئے انداز میں بیان کی گئی ہے متوسط درجہ کے تعلیم یافتہ حضرات کے لئے یہ مفید چیز ہے۔ یہ ادارہ دعوۃ القرآن کیطرف سے پیش کی گئی ہے۔

(۲) دوسری کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اردو زبان میں حدیث کا مختصر مجموعہ ہے جسمیں حدیث کے اصل عربی متن کے ساتھ اسکا ترجمہ اور پھر اس کی مختصر تشریح کی گئی ہے۔ زندگی کا مشکل ہی سے کوئی پہلو چھوٹا ہوگا جس کے بارے میں اس مجموعہ میں کوئی نہ کوئی حدیث موجود نہ ہو۔ ادارہ دعوۃ القرآن نے یہ بھی ایک مفید دینی خدمت انجام دی ہے۔ امید ہے کہ یہ دونوں کتابیں مقبول ہوں گی۔

ماہنامہ الفرقان کا خصوصی شیخ الحدیث
حضرت مولانا محمد زکریا رح نمبر

صفحات ۴۳۰۔ کتابت و طباعت معیاری۔ پتہ: دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی نظیر آباد۔ لکھنؤ قیمت ۸ روپئے

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مدت سے مدینہ منورہ میں مقیم تھے، اور وہاں سرزمین پاک میں انکی وفات شعبان ۱۴۰۲ھ میں ہوئی۔ اس دور میں انہوں نے عربی و اردو زبان میں تصنیف و تالیف اور اسکے ساتھ اصلاح و تزکیہ کا تنہا جتنا کام کیا وہ ایک جماعت بھی مشکل سے کر سکتی ہے۔ ان کی فضائل کی کتابیں جتنی چھپتی اور پڑھی جاتی ہیں اتنی شاید کوئی دوسری کتاب پڑھی جاتی ہوگی۔ اس خصوصی نمبر میں ان کی زندگی کے تقریباً ہر پہلو پر مختلف حضرات نے روشنی ڈالی ہے۔ یوں تو سبھی مضمون معیاری ہیں، مگر انکی آپ بیتی کا انتخاب" شیخ الحدیث کے اجداد" اور شیخ الحدیث اور علم حدیث" والے مضامین اس میں خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔ شیخ الحدیث کی زندگی کے کچھ اہم پہلو اور ایک عظیم شخصیت والے" مضامین میں بھی بعض نئے گوشوں کیطرف اشارہ ہے۔ مجموعی حیثیت سے اس نمبر سے شیخ الحدیث کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی پڑ جاتی ہے۔ راقم الحروف کے خیال میں مولانا کی آپ بیتی کا پورا انتخاب تھوڑے بہت حواشی کے ساتھ شائع کر دیا جائے تو انکی سوانح حیات پر نہ کسی مستقل تصنیف کی ضرورت ہے اور نہ خصوصی نمبر وں کی۔ باقی صفحہ

...سامنے آجاتا ہے کہ اس کی روشنی میں صحیح اسلامی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن
دار المصنفین سے شائع ہوا تھا

اہل کتاب صحابہ و تابعین

مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی

اس کتاب میں ان صحابہ اور تابعین کا تذکرہ ہے، جو یہودی یا عیسائی تھے اور انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کتاب میں تقریباً سو صفحے کا ایک قیمتی مقدمہ بھی ہے جس سے عرب کے یہود و نصاریٰ کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔
اس پر مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کا دیباچہ بھی ہے۔ اس موضوع پر دنیا کی کسی زبان میں کوئی مکمل کتاب موجود نہیں ہے

خطبۂ نکاح

نکاح کے موقع پر جو خطبہ دیا جاتا ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ اور یہ ایک اہم معاشرتی ہدایت اور اصلاح معاشرہ کا پیغام ہے۔ مگر عام طور پر اس کے الفاظ دہرا دیئے جاتے ہیں، اس کا پورا مفہوم لوگوں کے ذہن نشیں نہیں ہوپاتا ہے۔ اس کتابچہ میں اس کے ایک ایک لفظ کی ایسی موثر تشریح کی گئی ہے کہ یہ ہر نکاح کے موقع پر تقسیم کرنے کے قابل ہے۔ یہ تشریح مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی کے قلم سے ہے۔ صفحات قیمت عہ

اہل دل کی باتیں

یہ بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپگڈھی مدظلہ کے ان ملفوظات کا مجموعہ ہے جو وہ اپنی نجی مجلسوں میں اپنی پر اثر اور پرسوز زبان سے فرماتے رہے ہیں۔ اسے مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد نے مرتب کیا ہے۔ اس کا بہت سا حصہ ماہنامہ الفرقان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اب یہ جواہر پارے کتابی شکل میں دار التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد کی طرف سے شائع کئے جا رہے ہیں۔

فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل

یہ محترم ناظم جامعۃ الرشاد کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو معارف اعظم گڈھ میں شائع ہو چکے ہیں یا مختلف سیمیناروں میں پڑھے گئے ہیں جن میں جدید مسائل کے حل کیلئے وہ بنیادیں فراہم کی گئی ہیں جن کی روشنی میں جدید سے جدید مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔ یہ کتاب جامعہ ملیہ نئی دلی سے شائع ہوئی ہے اور اس پر اردو اکیڈمی نے مصنف کو انعام بھی دیا ہے۔ قیمت للعہ

ملنے کا پتہ:۔ شکیل احمد منیجر مکتبہ جامعۃ الرشاد۔ رشاد نگر شہر اعظم گڈھ۔ یوپی

R. N. 38937/81
Phone:- 461
Monthly Jameatur Rashad
Azamgarh (U.P.)

شہرِ اعظم گڑھ ۵۵ سے ہو اداراز

جامعۃ الرشاد

ایک نظر میں

ادارے کے شعبے

(۱) عربی درجات (۲) درجہ حفظ و قرأت (۳) ابتدائی تعلیم کے مکاتب و جونیر ہائی اسکول (۴) کتابت و جلد سازی (۵) اسلامی نرسری اسکول (۶) الجامعۃ الشرعیہ اس کے ذریعہ نکاح و طلاق کے مسائل کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ (۷) شعبہ نشر و اشاعت جس کے تحت کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں

ان تمام شعبوں میں کئی سو طلبہ ابتدائی اور اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ڈیڑھ درجن لائق اساتذہ کام کر رہے ہیں۔

ادارے کا خرچ

ادارے کا سالانہ خرچ ڈیڑھ لاکھ روپئے سے زیادہ ہے۔

ادارہ کی اہمیت اور خصوصیت (۱) جامعۃ الرشاد میں اعلیٰ عربی تعلیم کے ساتھ انگریزی زبان جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ (۲) یہاں سے عالمیت پاس کرنے کے بعد بی۔ اے میں داخلہ مل جاتا ہے۔ (۳) سعودی عرب کی بعض یونیورسٹیوں نے ہر کلیہ میں اس کا معادلہ منظور کر کئی طلبہ داخل ہو کر فارغ ہو چکے ہیں اور اس سال بھی کئی طالب علموں کی درخواستیں بھیجی جا رہی ہیں۔ دینی تعلیم کے ساتھ بچوں کی بہترین دینی اور اخلاقی تربیت بھی کی جاتی ہے۔ جو لوگ بچوں کا داخلہ چا ان کو رمضان المبارک میں خط و کتابت کرنا چاہئے۔ مکتب کے بچوں کا داخلہ ۲۵ جون کے بعد شروع ہو جاتا

ماہنامہ

دار التالیف والترجمہ کی تصانیف

عبادت و خدمت

مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہ

اس رسالہ میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور عام انسانوں کی خدمت بھی عبادت ہے، اور اس پر اسی طرح اجر و ثواب ملتا ہے جس طرح فرض عبادات پر ملتا ہے۔ اگر فرض عبادات کے اہتمام کے ساتھ ہمارے اندر عام انسانوں کی خدمت کا جذبہ بھی پیدا ہو جائے تو نفرت و حقارت کے بہت دبیز پردے ہٹ جائیں گے اور اسلام سے عام انسانوں کے دلوں میں ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ سائز ۲۶ + ۱۸، صفحات ۵۱، قیمت ۵۰/

دینی مدارس اور ان کی ذمہ داریاں

یہ محترم مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد کی ان تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ ہے جو وہ طلبہ، اساتذہ، منتظمین مدرسہ اور عربی مدارس کے ذمہ داروں کے سامنے کرتے رہے ہیں۔ یہ تقریریں اور تحریریں درود اثر میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ان میں بعض تقریروں کو محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ نے اپنے تائیدی نوٹ کے ساتھ الفرقان میں شائع فرمایا اور شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب مدظلہ العالی نے ایک بڑے مجمع میں پڑھوا کر سنوایا اور فرمایا کہ اسے ہر استاذ اور طالب علم کو پڑھنا چاہئے۔ سائز ۲۲ + ۱۸، صفحات ۱۰۰، قیمت للعہ

اسلامی تعلیم

حصہ اول، دوم، سوم، چہارم

بچوں کو اسلامی مسائل ذہن نشین کرانے کے لئے اردو زبان میں درجنوں رسالے لکھے گئے ہیں، مگر اس رسالہ کا انداز بیان اتنا دلچسپ ہے اور مسائل ایسے آسان طریقے سے سمجھائے گئے ہیں کہ بچے اسے قصہ کہانی کی کتاب کی طرح دلچسپی و شوق سے پڑھتے ہیں۔ چار حصوں میں تمام ضروری مسائل آگئے ہیں۔

سائز $\frac{20 + 30}{16}$ قیمت حصہ اول عہ/، دوم عہ/، سوم سے/، چہارم بے/

تبع تابعین حصہ اول

مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہ

کتاب میں ۱۴۹ اکابر تبع تابعین کا مفصل تذکرہ ہے۔ شروع میں مصنف کے قلم سے ایک فاضلانہ مقدمہ بھی ہے جس سے اسلام کی ابتدائی دو صدی کے دینی، تہذیبی اور سیاسی تاریخ کا اچھا [illegible]

مولانا مجیب اللہ ندوی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے نشاط پریس ٹانڈہ میں چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد، رشاد نگر، اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کا ترجمان

ماہنامہ

الرشاد

سالانہ چندہ
ہندوستان =/24
چندہ ششماہی =/12
قیمت فی پرچہ 2,50

سالانہ چندہ
ممالک غیر سے
بارہ ڈالر امریکی
$ =/12

جلد نمبر ۳ | ماہ مارچ سنہ ۱۹۸۳ء مطابق جمادی الاخری سنہ ۱۴۰۳ھ | شمارہ نمبر ۳

فہرست مضامین

مجلس ادارت

● پرچہ کی توسیع اشاعت کے ذمہ دار مولوی عقیل احمد صاحب ندوی ہیں۔

مطبوعہ
نشاط پریس ٹانڈہ

آزادی کے بعد ایک طرف ہماری مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے نہ جانے کتنے سیاسی، معاشی، تہذیبی اور تعلیمی مسائل کھڑے کر دیئے تو دوسری طرف فرقہ وارانہ جماعتوں کو پوری آزادی دی گئی کہ وہ جب چاہیں اور جہاں چاہیں مسلمانوں کی جان و مال سے کھیل کرتی رہیں۔ چنانچہ ۳۵ برس سے مسلسل یہ کھیل ہو رہا ہے، اور اس کے ذریعہ لاکھوں مسلمانوں کی قیمتی جانیں ضائع ہو چکی ہیں، اور اربوں روپئے کی جائیداد برباد کی جا چکی ہے۔ ۱۹۸۲ء کی حکومت کی رپورٹ کے مطابق گذشتہ سال ۴۴ فساد ہوئے، اور ۱۹۸۱ء میں ۴۲۷ فساد ہوئے، یعنی پہلے کے مقابلے میں یہ تناسب گھٹنے کے بجائے بڑھا ہے[1]۔

مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں کی جان و مال کو اتنا بے قیمت سمجھ لیا گیا ہے کہ نہ تو ان کے ساتھ کسی خاص ہمدردی اور دلجوئی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور نہ ان کے جان و مال کے نقصان کی خاطر خواہ تلافی ہوتی ہے، اگر چند ہریجن قتل کر دیئے جاتے ہیں تو پوری حکومت حرکت میں آجاتی ہے، ایک خاندان کا اجتماعی قتل ہو جاتا ہے تو چیف منسٹر صاحب بہ نفس نفیس ہمدردی کے لئے پہونچ جاتے ہیں، مگر ہزاروں مسلمان مرد، عورت، معصوم بچے فسادات میں قتل ہو جاتے ہیں، لیکن ان کے ساتھ حکومت اور ملک کے عام لوگ اتنی اخلاقی ہمدردی بھی نہیں کرتے جو کسی مظلوم اور ستم رسیدہ کو دیکھ کر ایک سخت سے سخت انسان کے دل میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ دلی میں انگریزوں کے زمانہ کی بنائی ہوئی کوتوالی کی عمارت کا سکھ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ان کے گردوارے کے حوالہ کر دی جائے تو اس مطالبہ کو منظور کرنے میں ایک لمحہ کی تاخیر نہیں کی جاتی۔ مگر مسلمانوں کی ہزاروں مسجدیں مسمار ہو گئیں، اور ہزاروں مسجدیں لوگوں کے تصرف میں آج بھی اپنا نوحہ کر رہی ہیں، خود دلی میں ایسی سیکڑوں مسجدیں ہیں مگر بار بار مطالبہ کے باوجود ان میں سے ایک بھی واگذار نہیں ہو سکی۔

---

[1] قومی آواز ۲۰ مارچ ۱۹۸۳ء

اس صورت حال میں اگر انفرادی طور پر کچھ مسلمانوں کی معاشی حالت اچھی ہو گئی ہے، کچھ لوگوں کے شاندار مکانات بن گئے ہیں، کچھ لوگ بڑی بڑی تجارتوں کے مالک ہو گئے ہیں، اور کچھ لوگ سیاسی سطح سے ایم۔ ایل۔ اے اور ایم۔ پی اور وزیر اور سفیر بن گئے ہیں تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی حالت بہتر ہو گئی ہے، یا مسلمان قوم کو کوئی عزت کا مقام حاصل ہو گیا ہے؟ اور کیا چند افراد کی معاشی خوشحالی اور چند لوگوں کی سیاسی کامیابی قومی زبوں حالی کا بدل بن سکتی ہے؟ مسلمانوں کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس ملک میں بحیثیت قوم ان کی حیثیت خس و خاشاک جیسی سمجھ لی گئی ہے کہ ہر ہوا کا جھونکا ان کو جہاں چاہے پھینک دے۔ مگر کوئی قوم دوسروں کے سہارے یا کچھ دئے ہوئے حقوق کے سہارے نہیں زندہ رہتی ہے، وہ زندہ رہتی ہے اپنی اخلاقی اور مادی قوت سے۔ اگر مسلمان یہ اپنے ذہن نشین کر لیں کہ مشکلات اور خطرات کسی قوم کے لئے موت کا نہیں بلکہ زندگی کا سبب بنتے ہیں، بشرطیکہ ہم خطرہ کی حالت کا پورے طور پر احساس پیدا کریں۔

" اگر خواہی حیات اندر خطر زی "

مگر خطرات میں وہی قومیں زندہ رہتی ہیں جن کے افراد چند باتوں کو اپنی زندگی کا جز بنا لیتے ہیں سب سے پہلی چیز اپنی مشکلات اور خطرات کا حقیقی احساس، دوسرے اتحاد اور تیسرے خدا تعالےٰ کی نصرت و مدد کا اپنے کو مستحق قرار دینا۔

مسلمان ۳۵ برس سے یہاں مشکلات اور خطرات کے اندر زندگی گذار رہے ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ ان کے عوام ہی نہیں خواص کو بھی ان مشکلات اور خطرات کا حقیقی احساس نہیں پیدا ہو سکا ہے، جو زندگی کے ہر میدان میں ان کے لئے درپیش ہیں، اگر ان میں احساس پیدا ہوتا بھی ہے تو وہ عارضی ہوتا ہے۔ پھر وہ چند دنوں کے بعد ان کی طرف بے خبر ہو جاتے ہیں، ان کے لئے جو معاشی مشکلات پیدا کی جا رہی ہیں، اور ان کے جان و مال کو تباہ کرنے کی جو کوششیں کی جا رہی ہیں۔ وہ بھی کچھ کم درجہ کی چیز نہیں ہیں۔ مگر ان کے لئے سب سے بڑی مشکل اور سب سے بڑا خطرہ ان کی دینی اور تہذیبی خصوصیات کے لئے ہے، جن کے مٹانے کے لئے دن بہ دن کوشش تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہیں۔ اور سیکولرزم محض دستور کی ایک دفعہ ہو کر رہ گیا ہے، عمل میں وہ کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

اس صورت حال کی اصلاح کے لئے حکومت کی سطح سے جو کوششیں کی جا رہی ہیں، وہ بھی جاری رہنی چاہئے مگر اس صورت حال کا اصل علاج یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر زندگی کے ہر میدان میں قوت مقابلہ، اتحاد و ہم آہنگی

اور مشکلات و خطرات کا زندہ احساس اور ہوشیار و چوکنا رہنے کی پوری صلاحیت موجود ہو۔ راقم الحروف نے اس سے پہلے کئی بار یہ بات دہرائی ہے کہ مسلمانوں کے اندر جو مذہبی، مسلکی یا معاشرتی اختلافات ہیں ان سب کے پیچھے ایک تاریخ ہے۔ اس لئے ان کو یکسر ختم کرنا مشکل ہے، اس لئے ان کو انگیز کرتے ہوئے مشترکہ مسائل میں اتحاد پیدا کرلینا بڑی سے بڑی مشکل اور بڑے سے بڑے خطرہ کو دفع کر دینے کے لئے کافی ہے، اسی طرح ان ظاہری کوششوں کیساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم ان اعمال سے بچیں جن سے خدا کا غضب بھڑکتا ہے، اور وہ اعمال اختیار کریں جن سے خدا کی نصرت آتی ہے، خاص طور پر اپنے بھائیوں کی حق تلفی، آپسی لڑائی جھگڑے اور کمزوروں پر ظلم و زیادتی سے بچیں اور عدل و انصاف کا وہ راستہ اختیار کریں جس کے ذریعہ اللہ تعالے کی نصرت سب سے زیادہ آتی ہے۔ بسا اوقات ہم اپنے کسی مسلمان بھائی کے مقابلہ میں ایک چھوٹا سا نقصان برداشت نہیں کرپاتے، اور پھر ہمیں اس سے کئی گنے بڑے نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں، اسے آپ ایک مثال سے سمجھیں:

شہر اعظم گڈھ میں دو مسلمانوں کے درمیان صرف ۴-۶ فٹ زمین کے لئے ۵-۶ برس سے مقدمہ بازی ہو رہی ہے، جس پر بیسوں ہزار روپئے خرچ ہو گئے ہیں، ہر فریق اپنی ناک اونچی کرنے کی فکر میں ہے، مگر کوئی اپنی ناک کٹانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا واقعہ اسی شہر کا ہے۔ شبلی کالج کے سابق پرنسپل شوکت سلطان کے والد سلطان احمد صاحب مرحوم جب کلکٹر کی پوسٹ سے ریٹائر ہو کر آئے، تو انھوں نے اپنے مکان کے کچھ حصہ کی نئی تعمیر شروع کی، جب نیو کھودی جانے لگی تو محلہ کے کچھ غریب پڑوسیوں کو بنیاد پر اعتراض ہوا۔ ان میں کسی نے ان سے کچھ کہا نہیں، مگر ان کو جب اس کی بھنک لگی، تو انہوں نے محلہ والوں کو بلایا، اور پھر پوچھا کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ فلاں طرف کی بنیاد ایک دو فٹ چھوڑ کر کھدوائیں۔ انہوں نے اسی وقت مزدوروں کو حکم دیا کہ یہ لوگ جہاں سے کہتے ہیں اس سے ایک فٹ اور چھوڑ کر بنیاد کھودو۔ ان کے اس تھوڑے ایثار اور شریفانہ طرز عمل کی وجہ سے وہ جھگڑا ختم ہو گیا، پڑوسی نہ صرف مطمئن ہو گئے بلکہ ان کے گرویدہ ہو گئے اور بغیر کسی خرخشہ کے ان کا مکان تعمیر ہو گیا۔ اس طرح کے واقعات ہر محلہ اور ہر بستی میں پیش آتے رہتے ہیں، اگر ہم یہ طرز عمل اختیار کریں تو ہماری بہت سی قوت بلا وجہ ضائع ہونے سے بچ جائے گی۔ اس کو آپ ذاتی جھگڑے تک محدود نہ کریں، بلکہ اس کو مذہبی، سیاسی، معاشی اور بین الاقوامی مسائل تک پھیلائیں تو ہم کو نظر آئے گا کہ آج زندگی کے ہر میدان میں ہمارا طرز عمل یہی ہے۔ زیادہ تر ہماری قوت منفی کاموں میں صرف ہوتی ہے، اگر ہماری وہ قوت مثبت کاموں میں صرف ہونے لگے تو ہماری کتنی مشکلات خود بخود دفع ہو جائیں۔ ایران و عراق کی بے مقصد جنگ کیا

(باقی ص۱۳ پر)

ہندوستانی علماء کا ایک اہم علمی کارنامہ

فتاویٰ عالمگیری

(مجیب اللہ ندوی)

عرب جہاں بھی گئے، اپنے ساتھ اسلامی علوم و فنون، تہذیب و معاشرت بھی لے گئے، یہی وجہ ہے کہ ایشیا، یورپ اور افریقہ جس سرزمین میں انھوں نے قدم رکھا، وہاں کے مذہب کے ساتھ ساتھ تہذیب، معاشرت اور زبان کو بھی بدل دیا، اس کے برخلاف ترک و تاتار اور دوسری عجمی مسلمان قومیں جہاں گئیں، ان کا مذہب تو اسلام رہا، لیکن تمدن انہوں نے اپنا پھیلایا۔ اسی لئے شام، مصر اور شمالی افریقہ کے مقابلے میں ہندوستان میں عجمی نسبی تمدن اور عجمی مذاق کو زیادہ فروغ ہوا۔

ہندوستان میں اگرچہ صدیوں مسلمانوں کی حکومت قائم رہی، لیکن اس کے تمام حکمراں خانوادے اور ان کے بیشتر عمال حکومت عجمی تھے۔ اس لئے ان کے اثر سے یہاں زیادہ تر عقلی و عجمی علوم کا چرچا رہا اور ان کے مقابلہ میں خالص دینی علوم تفسیر و حدیث و رجال و طبقات کی خدمت و اشاعت کم ہوئی، تاہم ہر زمانے کے اکابر علماء اپنے طور پر اس فرض کو انجام دیتے رہے، اور دینی علوم کی خدمت میں دوسرے اسلامی ممالک سے ہندوستان کا قدم بہت پیچھے نہیں رہا، لیکن حکومت کے بیشتر قوانین اسلامی تھے، خصوصاً مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کے معاملات و معاشرتی مسائل کا تعلق فقہ سے تھا، اس لئے ہر دور میں عقلی علوم کے ساتھ فقہ کی جانب خاص توجہ رہی، اور فقہ کی کتابوں کی بیشمار شروح و حواشی لکھے گئے۔ مطولات کے مختصرات کئے گئے۔ فقہ و فتاوی کی متعدد اہم کتابیں فتاویٰ تاتارخانیہ[1]، فتاوی حمادیہ[2] اور فتاوی ابراہیمیہ[3] تالیف ہوئیں، اورنگزیب علیہ الرحمہ نے فتاوی

---

[1] مولفہ عالم بن العلا متوفی [illegible]ھ۔ [2] مولفہ ابو الفتح رکن بن حسام ناگوری۔ [3] مولفہ قاضی نظام الدین متوفی [illegible]ھ

[illegible] اول الذکر کتابیں غالباً ان کے مصنفین کے انفرادی فتووں کا مجموعہ یا ان کی تصانیف تھیں۔ مگر فتاوی عالمگیری یا فتاوی [illegible]

عالمگیری (جسے الفتاوی الہندیہ بھی کہتے ہیں) مدون کرائی جو ہندوستان کے علمائے کا قابل فخر کارنامہ ہے، اور گذشتہ
فتاوی کی کتابوں میں سب سے مقدم و ممتاز ہے، اول الذکر فتاوی افراد کی تالیف تھے، اور فتاوے
عالمگیری گیارہویں صدی ہجری کے پورے ہندوستان کے منتخب علماء کی کوششوں کا نتیجہ ہے، اسی لئے
اس میں جو جامعیت اور جزئیات کا جس قدر استقصار ہے وہ دوسرے فتاوی میں نہیں ہے، اسلئے اس کو
گذشتہ فتاووں میں خاص اہمیت حاصل ہے، لیکن تعجب ہے کہ اب تک نہ عالمگیری کے مؤلفین کے
حالات یکجا کئے گئے، اور نہ تو اس کی خصوصیات اور ماخذ پر کچھ لکھا گیا۔ اس مضمون میں اسی کمی کو پورا کرنا
مقصود ہے۔

(۱) فتاوی عالمگیری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی ایک شخص کی تالیف نہیں، بلکہ علماء کی
ایک ممتاز جماعت کی تالیف ہے، اس لئے وہ ان نقائص اور فروگذاشتوں سے پاک ہے، جن کا ایک
فرد واحد کی تالیف میں امکان رہتا ہے۔

(۲) اس میں وہی مسائل لئے گئے ہیں، جو راجح، مفتی بہ، یا ظاہر الروایت[1] کے ہیں، اگر کوئی مسئلہ
ظاہر الروایت میں نہیں ہے، تو نوادرات سے لیا گیا ہے لیکن اس تصریح کے ساتھ کہ کتاب میں اس
پر فتوی کا اشارہ موجود ہے۔

(۳) ہر مسئلہ کے ساتھ اس کے ماخذ کا مفصل حوالہ بھی دے دیا ہے، جس کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے
اگر اس میں کسی دوسری کتاب سے نقل کیا گیا ہے تو ناقلاً عن فلاں کرکے اصل ماخذ کی طرف بھی اشارہ کر دیا
گیا ہے۔

(۴) اگر کسی مسئلہ کے بارے میں دو مختلف اقوال ہیں اور دونوں میں سے کوئی قابل ترجیح نہیں ہے، تو دونوں
کو مع حوالہ نقل کر دیا گیا ہے، اگر کسی کتاب کی عبارت بلفظ نقل ہے، تو کذا لکھ دیا گیا ہے، اور اگر اس کا خلاصہ اور
مفہوم لے لیا ہے، تو ہکذا سے اشارہ کر دیا گیا ہے۔

(۵) یہ کتاب تقریباً آٹھ برس میں تیار ہوئی، اور کم و بیش دو لاکھ روپئے اس پر صرف ہوئے۔

بقیہ حاشیہ گذشتہ: ہندیہ ایک اکیڈمک تصنیف ہے۔ اس لئے الفتاوی نام دینے کے بجائے
کوئی اور نام دینا چاہئے تھا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر فقہ کی مستقل تصانیف کے لئے فتاوی کا لفظ ہندوستان
میں متداول ہوگیا تھا۔

[1] چھ کتابیں ظاہر الروایت میں شمار کی جاتی ہیں، جامع کبیر، جامع صغیر، مبسوط، زیادات، سیر کبیر،

عالمگیری کے ماخذ | فتاوی عالمگیری فقہ کی تمام اہم اور معتبر کتابوں کا خلاصہ اور عطر ہے۔ ذیل میں عالمگیری کے تمام ماخذ کی فہرست دی جاتی ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ علماء نے کس جانکاہی سے سیکڑوں خرمنوں سے خوشہ چینی کر کے فقہ و فتاوی کا یہ ذخیرہ جمع کیا ہے۔

(۱) ہدایہ ص ۳ برہان الدین المرغینانی (۲) شرح طحاوی ص ۳ غالباً امام بدرالدین العینی کی شرح مراد ہے (۳) ذخیرۃ العقبیٰ ص ۳ شرح منیۃ المصلی (۴) مضمرات ص ۳ قدوری کی شرح اس کا دوسرا نام جامع المضمرات ہے (۵) البدائع ص ۳ (۶) المغنی ص ۳ (۷) عینی شرح ہدایہ ص ۴ (۸) الخلاصہ ص ۴ (۹) فرائض الزاہدی ص ۴ ابوالرجا مختار بن محمود م ۶۵۸ھ (۱۰) ظہیریہ ص ۴ ظہیرالدین البخاری ۶۱۹ھ (۱۱) محیط ص ۴۔ اس نام کی دو کتابیں ہیں۔ ایک برہان الدین صدر الشریعہ کی تصنیف ہے جو المحیط البرہانی کے نام سے موسوم ہے، دوسری رضی الدین السرخسی کی جو محیط السرخسی کے نام سے مشہور ہے۔ ثانی الذکر کے بعض نسخے مصر وغیرہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ غالباً عالمگیر کے شاہی کتب خانہ میں بھی اس کا کوئی نسخہ موجود تھا، الفوائد البہیہ میں مولانا عبدالحیؒ نے لکھا ہے کہ اس کے بعض نسخے میری نظر سے گذرے ہیں (۱۲) طحاوی (۱۳) فتاوی قاضی خاں ص ۴ (۱۴) شرح وقایہ ص ۴ (۱۵) التبیین ص ۴ امام نسفی (۱۶) محیطین ص ۴ شاید اس سے مراد محیط برہانی اور سرخسی ہو، (۱۷) السراج الوہاج ص ۴ (۱۸) فتح القدیر ص ۴ ابن ہمام (۱۹) البحرالرائق ص ۴ (۲۰) الجامع الصغیر ص ۴ امام محمد (۲۱) الجامع الوجیز ص ۴ الکردری ۸۱۲ھ کی تصنیف ہے (۲۲) الیتیمہ ص ۴ (۲۳) تاتارخانیہ ص ۴ عالم بن العلاء (۲۴) فتاوی سراجیہ ص ۴ الاوشی الفرغانی ۵۶۹ھ میں لکھی گئی (۲۵) اختیار فی شرح المختار ص ۴ (۲۶) کفایہ شرح ہدایہ ص ۴ جلال الدین الخوارزمی (۲۷) فتاوی برہانیہ ص ۴ (۲۸) الجوہرۃ النیرہ ص ۴ قدوری کی پہلی شرح ابوبکر الحدادی العبادی متوفی ۸۰۰ھ (۲۹) قنیۃ المنیہ ص ۴ نجم الدین الزاہدی الغزمینی م ۶۵۸ھ (۳۰) محیط السرخسی ص ۴ (۳۱) النہرالفائق ص ۵ (۳۲) مبسوط ص ۷ سرخسی (۳۳) فتاوی الحجہ ص ۷ (۳۴) النہایہ ص ۷ (۳۵) تحفہ ص ۸ (۳۶) المصباح ص ۸ (۳۷) الوافی ص ۸ (۳۸) خزانۃ الفقہ ص ۹ امام ابواللیث م ۳۷۳ھ (۳۹) الملتقط ص ۱۱ (۴۰) شرح المنیہ للعجمی ص ۱۱ (۴۱) الزاد ص ۱۳ (۴۲) فتاوی غیاثیہ ص ۱۳ (۴۳) شمنی ص ۱۳ تقی الدین الشمنی م ۸۷۲ھ (۴۴) فتاوی شیخ الاسلام ص ۱۵ المعروف

بخواہرزادہ ص ۸ (۴۶) شرح المبسوط ص ۱۶ (۴۷) عتابیہ ص ۱۷ (۴۸) منیۃ المصلی ص ۱۷
(۴۹) خزانۃ المفتیین امام حسین بن محمد السمغانی ۷۴۰ھ کی تصنیف ہے (۵۰) علینی شرح کنز ص ۲۲
(۵۱) المفید والمزید (۵۲) شرح منیہ ص ۲۲ لابن امیر الحاج (۵۳) کنز الدقائق ص ۲۴ (۵۴)
خزانۃ الفتاوی ص ۲۷ احمد بن محمد الحنفی صاحب مجمع الفتاوی (۵۵) الاسرار فی الاصول والفروع
ص ۲۸ ابو زید عبید اللہ عمر الدبوسی م ۴۳۰ھ (۵۶) شرح الزیادات ص ۲۹ (۵۷) شرح النقایہ
ص ۳۵ شیخ ابو المکارم (۵۸) الصغری ص ۳۵ (۵۹) شرح المجمع ص ۳۶ لابن الملک (۶۰)
تجنیس ص ۳۶ صاحب ہدایہ (۶۱) نصاب ص ۴۲ (۶۲) الکبری ص ۴۲ (۶۳) تنویر ص ۴۲
شرح تلخیص جامع الصغیر (۶۴) عنایہ ص ۴۴ شرح ہدایہ (۶۵) فتاوی الغرائب ص ۴۴ (۶۶)
محیط السرخسی ص ۴۵ (۶۷) فتاوی عتابیہ ص ۴۷ ابو نصر عتابی م ۵۸۶ھ (۶۸) فتاوی قراخانی ناقلاً
عن الواقعات الحسامیہ ص ۴۷ (۶۹) صیرفیہ ص ۴۸، دوسرا نام فتاوی اہو ہے (۷۰) مختار الفتاوی
ص ۵۱ لابی الفضل مجد الدین الموصلی م ۶۸۳ھ (۷۱) قدوری ص ۵۱ (۷۲) شرح منیہ ناقلاً عن
الحاوی ص ۵۱ (۷۳) فتاوی التمرتاشی ص ۵۴ ابو محمد ظہیر الدین الحنفی م ۶۰۰ھ (۷۴) ینابیع
ص ۵۶ اسفرائینی کی ینابیع الاحکام مراد ہے، یا شرح القدوری (۷۵) شایان شرح الہدایہ ص ۵۶،
(۷۶) الفتاوی العتابیہ المعروف بجامع الفتاوی ص ۵۷ (۷۷) شرح مقدمہ ابی اللیث متوفی
۳۸۳ھ (۷۸) مصفی ص ۶۹ (۷۹) وقایہ ص ۷۲ (۸۰) النقایہ ص ۷۲ (۸۱) تہذیب ص ۷۸
شیخ احمد القلانسی (۸۲) خانیہ ص ۸۵ (۸۳) جامع الجوامع ص ۸۵ (۸۴) جواہر الاخلاطی
ص ۹۱ (۸۵) الحصیر ص ۹۳ (۸۶) البرجندی ص ۱۰۲ (۸۷) غایۃ البیان ص ۱۰۶ شرح ہدایہ
(۸۸) مختارات النوازل صاحب الہدایہ (۸۹) برجندی ص ۱۰۸ (۹۰) اقرار العیون ص ۱۱۰ (۹۱)
نفقات ص ۵۶۷ (۹۲) فتاوی الواجیہ ص ۵۶۹ فتاوی کی کتاب ظہیر الدین ابو بکر الحنفی متوفی
۶۰۰ھ کی تصنیف ہے (۹۳) شرح النقایہ برجندی ص ۵۶۹ (۹۴) الغایہ للسروجی ہدایہ
کی شرح ابو العباس احمد بن ابراہیم السروجی کی تصنیف ہے م ۷۱۰ھ (۹۵) المنتقی ص ۵۷۰
(۹۶) فتاوی الکبری ص ۵۷۰ حسام الدین عمر بن عبد العزیز ۵۳۶ھ (۹۷) فتاوی الصغری ص ۵۷۰
حسام الدین عمر بن عبد العزیز م ۵۳۶ھ (۹۸) الواقعات ص ۵۷۴ (۹۹) المجتبی (۱۰۰) التحریر شرح

جامع الکبیر للحصیری جمال الدین محمود بن احمد البخاری المعروف بالحصیری م ۶۳۶ھ نے دو شرحیں لکھی ہیں ایک مفصل اور ایک مختصر، یہ معلوم نہ ہوسکا کہ یہ حوالہ کس شرح کا ہے (۱۰۱) فتاوی امام کرخی ص ۵۷ ھ امام کرخی مشہور فقیہ ہیں (۱۰۲) السقال (۱۰۳) شرح تلخیص جامع الکبیر (۱۰۴) ملخص المحیط (۱۰۵) الفصول العمادیہ اجمال الدین عماد الدین الحنفی (۱۰۶) الحاوی القدسی قاضی جمال الدین احمد بن محمد المتوفی ۵۹۳ھ یا ۶۰۰ھ (۱۰۷) شرح کتاب الاستحسان شمنی کی شرح شمس الائمہ حلوانی نے کی ہے۔ یہ وہی شرح ہے۔ (۱۰۸) شرح الزیادات للعتابی۔ امام ابوالقاسم احمد بن محمد العتابی متوفی ۵۸۶ھ کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر بے نظیر ہے (۱۰۹) کتاب رزین (۱۱۰) البحر الزاخر، سراج الوہاج جو مختصر القدوری کی شرح ہے۔ یہ کتاب اسی کا خلاصہ ہے (۱۱۱) فصول الاستروشنی امام مجد الدین ابو الفتح متوفی ۶۳۲ھ کی تالیف ہے۔ (۱۱۲) فتاوی فضلی ابو عمر عثمان الفضلی متوفی ۵۰۸ھ (۱۱۳) فوائد العلامہ شیخ الاسلام برہان الدین (۱۱۴) فوائد نظام الدین (۱۱۵) فتاوی النسفی۔ نسفی مشہور فقیہ ہیں۔ (۱۱۶) فتاوی المخبدی، اپنے وقت کے تمام مشائخ کے فتاوی کو جمع کر دیا ہے (۱۱۷) نوادر ابن سماعہ (۱۱۸) الواقعات السامیہ (۱۱۹) الاسعاف برہان الدین ابراہیم بن ابی بکر الطرابلسی م ۹۴۳ھ نے اس میں اوقاف کے تمام مسائل اور جزئیات جمع کر دیئے ہیں (۱۲۰) فتاوی رشید الدین (۱۲۱) شرح ادب القاضی غالباً صدر الشہید کی شرح مراد ہے۔ (۱۲۲) فتاوی آہو، جس کا دوسرا نام فتاوی صیرفیہ بھی ہے (۱۲۳) المستصفی شرح النافع (۱۲۴) فتاوی ابی الفتح، غالباً مجد الدین ابو الفتح م ۶۳۲ھ کے فتاوے مراد ہیں۔

ماخذ کی یہ فہرست سرسری مطالعہ سے تیار کی گئی ہے۔ مزید تلاش و تفحص سے ممکن ہے کچھ اور نام نکل آئیں، تاہم اس سے اتنا اندازہ ضرور ہو گیا ہوگا کہ فتاوی کی تالیف میں کس قدر اہتمام تلاش و جستجو اور تحقیق سے کام لیا گیا ہے۔

فتاوی عالمگیری کا سنہ تصنیف فتاوی عالمگیری کے سنہ تصنیف کی یقینی تعیین کرنا تو بہت مشکل ہے۔ لیکن ذیل کے بیانوں سے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ عالمگیر نامہ کا مصنف عالمگیر کے حکومت کے گیارہویں سال کے واقعات میں لکھتا ہے:

چوں ہمگی ہمت والا نہمت شریف برائے آں خدیو دین پرور حق پژوہ مصروف است بآنکہ کافہ مسلمین در احکام دین متین بمسائلے کہ اکابر علماء و ائمہ مذہب

شریف حنفی بداں فتوی دادہ معمول بہا معمول علیہا دانستہ عمل نماید . . . . مہٰذا
مجموع آں را ایک کتاب حاوی نیست . . . . . . لاجرم بہ ضمیر مہر انوار در اسہودین
و دولت بفتوی الہام کارگذار است پرتو ایں عزیمت تافت کہ جمع از علمائے
سرایر اعلیٰ کتب معتبرہ نسخ مبسوطہ آں فن راکہ در کتاب خانہ خاصۂ شریفہ بودگان
از اطراف اکناف عالم فراہم آمدہ جلوہ گاہ انظار تتبع ساختہ از روئے تحقیق و تدقیق
و خوض و غور انیق بجمع تالیف آں مسائل پردازند و از مجموع آں نسخۂ جامعہ
مرتب سازند تا ہم گناں را استکشاف مسئلۂ مفتی بہا در ہر باب بمراجعت
آں کتاب بسہولت و آسانی دست دہد . . . . . . چوں آں کتاب مستطاب
اتمام گیرد و پیرایۂ اختتام پزیرد جہانیاں را از سائر کتب فقہی مستغنی خواہد بود[2]

مرآۃ العالم میں ہے:

چنانچہ قریب دو لکھ روپیہ صرف لوازم ایں کتاب مستطاب کہ زیادہ از
یک لکھ بیت باشد شدہ انشاء اللہ ہرگاہ آرائش تمام و پیرایہائے
اختتام یابد جہانیاں را از سائر کتب فقہی مغنی خواہد بود[3]

ان بیانات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۷۸ھ میں جو عالمگیر کی حکومت کا گیارہواں سال ہے
یا اس سے کچھ پہلے فتاوی کا کام شروع ہو چکا تھا . مگر

چوں آں کتاب صورت اتمام گیرد و پیرایۂ اختتام پزیرد سے

یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی اس کی تکمیل نہیں ہوئی تھی۔

اگر ۱۰۷۷ھ یا ۱۰۷۸ھ کو اس کی تالیف کا زمانہ قرار دے کر اسی کے ساتھ اس مشہور روایت[4]
کو بھی ملا لیا جائے کہ اس کی تالیف میں آٹھ برس کی مدت صرف ہوئی تو اس کی تکمیل کا زمانہ ۱۰۸۵ھ
یا ۱۰۸۶ھ قرار پائے گا۔

---

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر کا ذاتی کتب خانہ تھا، جو بڑی کوشش سے جمع کیا گیا تھا جس میں فقہ کی تمام
متداول کتابیں موجود تھیں۔ [2] عالمگیر نامہ ص ۱۰۸۰ [3] قلمی نسخہ دار المصنفین یہ کتاب بھی عالمگیر کی باقی مجموعہ

فتاویٰ کا فارسی ترجمہ کتاب عربی میں لکھی گئی تھی، اس لئے عام لوگ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے، ان کی آسانی کے لئے اورنگزیب نے چلپی عبداللہ اور ان کے چند شاگردوں کو اس کے فارسی ترجمہ کے لئے مامور کیا۔ مرآۃ العالم میں ہے:

> برائے سہولت ہم گناہ .... چلپی عبداللہ .... با چند تلامذہ
> بترجم نوشتن بفارسی مامور (ص ۲۷۵ قلمی نسخہ)

تبصرۃ الناظرین میں ہے:

> چلپی عبداللہ بترجمہ آں (عالمگیری) مامور بود[1] (ص، قلمی نسخہ)

فتاویٰ عالمگیری کا مترجم کون تھا؟ اوپر مرآۃ العالم اور تبصرۃ الناظرین کے بیانات نقل کئے گئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ فتاویٰ عالمگیری کے مترجم چلپی عبداللہ تھے، مگر مرآۃ العالم کے مصنف بختاور خاں نے چلپی عبداللہ کے نام کے ساتھ اتنا اور اضافہ کر دیا ہے کہ:

> چلپی عبداللہ خلف ارشد قدوۂ فضلائے نامدار مولانا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ
> با چند تلامذہ بترجم نوشتن ایں کتاب بفارسی مامور ہست (مرآۃ العالم ص ۲۷۵)

مرآۃ العالم کے اس بیان سے یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ فتاویٰ عالمگیری کے فارسی مترجم ملا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ کے صاحبزادے عبداللہ تھے۔ مگر قوی قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ فتاویٰ کے مترجم ملا عبداللہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ کے صاحبزادے نہیں بلکہ چلپی عبداللہ ترکی تھے۔ ملا عبدالحکیم کے صاحبزادے کے ساتھ چلپی کا لفظ غلط فہمی سے لگ گیا، ورنہ یہ چلپی عبداللہ نہیں بلکہ ملا عبداللہ ہیں جن کے نام کے ساتھ اپنے والد ملا عبدالحکیم کی طرح ملا کا لفظ زیادہ صحیح ہے۔

یہ غلط فہمی پیدا ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ عالمگیر کے دربار میں عبداللہ نام کے دو عالم تھے۔ ایک ملا عبداللہ اور دوسرے چلپی عبداللہ کے نام سے مشہور تھے۔ صاحب مرآۃ العالم کو غالباً نام کے اشتراک سے دھوکا ہوا اس نے چلپی عبداللہ کو ملا عبداللہ سمجھ کر مولانا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ کا لڑکا اور فتاویٰ کا مترجم قرار دے دیا، اور ان کے نام کے آگے چلپی نسبت رہنے دی۔ حالانکہ چلپی کی نسبت ملا عبدالحکیم کے صاحبزادے کی طرف کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ لفظ ترکی زبان میں کوئی لقب یا خاندانی نسبت کے طور پر استعمال ہوتا ہے،

---

[1] اقتباس از تبصرۃ الناظرین

جس کی طرف وہاں کے بہت سے علما منسوب ہیں، کشف الظنون کے مصنف بھی اسی نسبت سے چلپی مشہور ہیں، ہندوستان کے کسی عالم کی طرف اس نسبت کا کیا جانا قیاس میں نہیں آسکتا۔ بلکہ عبداللہ چلپی ترکی ہیں، اب خود مرآۃ العالم میں ایک عبارت مل گئی ہے، جس سے ہمارے اس قیاس کی تائید اور اس کے اپنے بیان کی تردید ہوتی ہے، عبارت یہ ہے۔

چلپی عبداللہ رومی۔۔۔ در زمان فرودس اشیانی از روم ہندوستان
درزی فقرا بسر می برد۔۔۔۔۔ و دریں عصر، عالمگیری، بہ رفد بانہ سرفرازی
یافتہ از تکالیف نوکری معاف و بنوشتن ترجمہ فتاوی عالمگیری شاہی
ماموراست (ص ۳۰۰ قلمی نسخہ)

بظاہر نام کے اشتراک کے علاوہ اس غلطی کی دوسری کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

فتاوی کا دوسرا فارسی ترجمہ

فتاوی عالمگیری کے پہلے فارسی ترجمہ کے وجود کا جو عالمگیر کے زمانہ میں کیا گیا تھا، ہم کو اس کا کوئی علم نہیں۔ البتہ اس کے ایک حصہ کتاب الجنایات کا ایک دوسرا فارسی ترجمہ مع مختصر شرح موجود ہے۔ جسے مولانا نجم الدین ثاقب قاضی القضاۃ (متوفی ۱۲۲۹ھ) نے لارڈ سرجان شور (۱۷۹۳ء ۱۲۰۹ھ) کے مشورہ سے کیا تھا۔ ترجمہ کلکتہ اور لکھنؤ کے مطبعوں میں کئی بار چھپ بھی چکا ہے، لیکن اس کا مطبوعہ نسخہ نظر سے نہیں گذرا۔ اس کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ میں "ترجمہ فتاوی عالمگیری"، اور خدا بخش لائبریری پٹنہ میں "کتاب الحدود والسرقہ" کے نام سے موجود ہیں۔ پٹنہ میں جو نسخہ ہے، اس کے متعلق فہرست کے مرتب نے لکھا ہے، کہ اس پر کتاب اور مصنف کا نام درج نہیں ہے، البتہ اس کی پشت پر کسی نے "کتاب الحدود" لکھ دیا ہے، لیکن مقابلہ سے یہ ترجمہ مولانا نجم الدین کے ترجمہ سے حرف بحرف مل جاتا ہے۔ اس لئے گمان ہوتا ہے کہ یہ وہی ترجمہ ہے۔

کتاب الحدود حسب ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔

(۱) باب اول در بیان تفسیر حد موافق شرع و بیان رکن حد بیان شرط حد و بیان حکم حد۔
(۲) باب دوم در بیان زنا، فصل در بیان چگونگی حدہا و اقامت حدہا۔
(۳) باب سوم در بیان وطی کہ موجب حد است۔
(۴) باب چہارم در شہادت بزنا و رجوع ازاں شہادت
(۵) باب پنجم در حد شراب۔

(۶) باب ششم در بیان قذف، فصل در بیان تعزیر۔

کتاب السرقہ کے ابواب کی تفصیل یہ ہے:

(۱) باب اول در بیان سرقہ

(۲) باب دوم در بیان آن دزدیہا کہ دست بریدہ می شود، در یں در بیان آں دزدیہا کہ دست بریدہ نمی شود، در آں فصل در بیان حرز، فصل در بیان چگونگی دست بریدن و تاب گردانیدن آں۔

(۳) باب سوم در بیان چیزے کہ پیدا کند دزد آں چیز را در مال دزدی

(۴) باب چہارم در بیان حکم قطاع الطریق

فتاوی کی تالیف کا طریقہ | فتاوی عالمگیری کے جمع و ترتیب کا طریقہ یہ تھا کہ فقہی ابواب کے لحاظ سے اس کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا، اور ہر حصہ کے لئے ایک الگ صدر، اور صدر کے لئے چند معاونین کی ایک جماعت مقرر تھی، ہر صدر اپنے اپنے حصہ کا ذمہ دار تھا، اخذ و استنباط میں اگر کوئی غلطی ہو جاتی تھی تو ملا نظام جو اس مجلس کے صدر اعلیٰ تھے، اس شعبہ کے صدر سے باز پرس کرتے تھے، اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

ذیل میں ان لوگوں کے نام درج کئے جاتے ہیں، جن پر اس کے کسی حصہ کی تکمیل کی ذمہ داری تھی۔

(۱) حصہ اول کے جمع و ترتیب کا کام شیخ جلال الدین محمد جونپوری کے سپرد تھا، مشاہیر جونپور میں ہے:

از تصنیفات و تالیفاتش فتاوی عالمگیری حصہ اول است کہ حسب الامر سلطانی جمع نمودہ (ص ۱۲۲)

یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کتنے علماء معاون کی حیثیت سے ان کے شریک کار تھے۔

(۲) ایک حصہ کی تکمیل شیخ وجیہ الدین گوپاموی کے سپرد تھی اور ان کی امداد و اعانت کے لیے دس عالم اور مقرر تھے لیکن ان کے ناموں کی تصریح نہیں مل سکی۔ مرآۃ العالم میں صرف اتنا ہے کہ

(شیخ وجیہ الدین) در ترتیب و تالیف ربعے فتاوی عالمگیری شاہی مامور شدہ، دہ کس دیگر از فضلاء بمدد و اعانت او مامور شدہ بود

بقیہ حاشیہ گذشتہ: حکومت کے ابتدائی دس گیارہ سال کے واقعات پر مشتمل ہے۔ [۱] معارف نمبر ۵ جلد ۹۰ مضمون "عالمگیر کا علمی ذوق"، سید صباح الدین عبدالرحمٰن علیگ۔ حاشیہ صفحہ ہذا [۱] قلمی نسخہ دار المصنفین۔

اگر اسی پر دوسرے حصوں کو بھی قیاس کیا جائے تو مؤلفین فتاوی کی تعداد چالیس پچاس تک پہنچ جائے گی۔

(۳) ایک حصہ کی تالیف شیخ محمد حسن جونپوری کے زیر اہتمام تھی۔ مرآۃ العالم میں ہے:

وربعے از فتاوی عالمگیری شاہی باہتمام او (محمد حسین) زینت تمام یافت (الف ۳)

ان کے معاونین کی تعداد اوران کے نام کا علم نہیں ہو سکا۔

(۴) انفاس العارفین کی اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ کسی حصہ کی تکمیل ملا حامد جونپوری کے زیر صدارت بھی ہوئی تھی۔

(ملا نظام) ملا حامد را عتاب کرد کہ ایں جلد باعتماد شما گذاشتہ بودم و تو پیش بادشاہ مرا خفیف کردید (ص ۲۴)

شاہ عبدالرحیم صاحب آپ کے معاونین میں تھے اور شرکا کی تعداد اور نام کی تفصیل نہیں معلوم ہو سکی تلاش وتفحص سے انہی چار آدمیوں کے متعلق یہ تصریح مل سکی ہے کہ کسی نہ کسی حصہ کے جمع وترتیب کی ذمہ داری ان کے سپرد تھی۔ لیکن یقینی طور سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کام چار ہی حصوں میں منقسم تھا اور یہی چار اس کے ذمہ دار تھے۔ یا اس سے زیادہ۔

اکتوبر ۴۷ء کے معارف میں برادر مکرم مولانا ابوظفر ندوی نے تاریخ برہان پور (بحوالہ مرآۃ العالم) سے جن ناموں کی فہرست دی ہے، ان میں سے دو ناموں علی اکبر سعد اللہ خانی اور محمد اکرم لاہوری کے متعلق مرآۃ العالم یا کسی دوسری کتاب میں کوئی تصریح نہیں مل سکی، کہ وہ کس حصہ کے صدر بنائے گئے تھے، بلکہ محمد اکرم لاہوری تو جامعین فتاوی میں بھی نہیں ہیں، محمد اکرم نام کے ایک دوسرے عالم جو بہار کے رہنے والے تھے، البتہ اس میں شریک تھے۔ لیکن انہیں بھی کوئی ذمہ دارانہ حیثیت حاصل نہ تھی۔

فتاوی کی تدوین میں عالمگیر کی شرکت

عالمگیر نے فتاوی کی تدوین کے لئے خزانۂ شاہی سے صرف ایک کثیر رقم کی منظوری اور علماء کی ایک جماعت کی تقرری ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ذاتی طور سے بھی وہ اس سے کافی دلچسپی لیتا تھا، اور روزانہ اس کے دو چار صفحے خود علمی وتنقیدی نگاہ سے دیکھتا تھا اور ان کی فروگذاشتوں اور خامیوں پر ملا نظام کو متوجہ کرتا رہتا تھا۔

لہ شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے والد کے حالات میں یہ کتاب لکھی ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے انفاس العارفین میں اپنے والد شاہ عبدالرحیم صاحب جو جامعین فتاوی میں تھے، ان کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، جس سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ:

> والد صاحب نے ایک روز فرمایا کہ میں فتاوی عالمگیری پر نظر ثانی کر رہا تھا کہ ایک جگہ عبارت پیچیدہ تھی۔ سمجھ میں نہیں آئی، میں نے اصل ماخذ کیطرف رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ اس باب کے جامع نے دو عبارتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، جس کی وجہ سے مسئلہ پیچیدہ ہو گیا ہے، میں نے (غصہ میں) اس کے حاشیہ پر لکھ دیا کہ

من لم یتفقہ فی الدین قد	جس نے دین میں تفقہ حاصل نہیں کیا اس نے
حنف فیہ ھذا غلط وصوابہ ھکذا	دین میں کجروی کی۔ یہ غلط ہے اور صحیح یوں ہے۔

خود ملا نظام دو چار صفحات روزانہ بادشاہ کو لے جا کر سناتے تھے۔ ایک دن حسب معمول انھوں نے ان صفحات کو عالمگیر کے سامنے پڑھا، تو جلدی میں اس حاشیہ کی عبارت کو متن سے ملا دیا، جس سے مطلب خبط ہو گیا، بادشاہ نے ٹوکا اور پوچھا کہ یہ عبارت کیسی ہے، ملا نظام اس وقت کوئی جواب نہ دے سکے اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میں نے اس عبارت کا مطالعہ نہیں کیا تھا، جواب کل دوں گا۔"

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ فقہ پر عالمگیر کی گہری نظر تھی۔ اور فتاوی کی تدوین و تصحیح میں علمی حیثیت سے بھی وہ شریک تھا۔ (باقی)

---

(۱): وقت ضائع کرنے والا یا بیکار آدمی کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب دیکھتے تو یہ کہہ کر درہ لگاتے تھے کہ

انی لاکرہ ان اری احدکم سبھللا	میں اس آدمی کو پسند نہیں کرتا کہ تم میں کوئی آدمی
لا فی الدنیا ولا فی عمل الآخرۃ	بیکار ہو نہ وہ دنیا کا کام کرے اور نہ آخرت کا۔

(۲): علم دین سے آدمی میں اگر خاکساری، پرہیزگاری اور جذبہ خدمت نہ پیدا ہو تو ایسا علم نافع نہیں
(۳): پریشانی میں دوسروں کے کام آنا، کسی کمزوری بے غرض مدد یا سفارش کرنا، خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کی تکلیف دور کرنا انسانیت کا تقاضا بھی ہے اور اسلامی فریضہ بھی ہے۔

(مولوی قاری عبدالرحمن چمپارنی استاذ شعبۂ تجوید جامعۃ الرشاد)

نزول قرآن کے وقت ملک عرب میں سات مشہور قبائل تھے، گو ان سب کی زبان عربی ہی تھی مگر بلحاظ قبائل اور صوبجات ان کے لغات و محاورات میں کچھ لسانی فروق پائے جاتے تھے، جس کی بنا پر ہر ایک لغت والے کو دوسرے کی لغت میں پڑھنا نہ صرف دشوار تھا بلکہ ایک محال امر تھا۔ وہ سات قبائل یہ ہیں:

۱۔ قریش، ۲۔ ہذیل، ۳۔ ثقیف، ۴۔ ہوازن، ۵۔ کنانہ، ۶۔ تمیم، ۷۔ یمن۔

یوں تو فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے ان ساتوں قبائل کی زبانیں معروف و مشہور تھیں۔ تاہم صوتی حلاوت پاکیزگی ساخت اور حسن ترتیب کے لحاظ سے ان سب میں زبان قریش کو فوقیت حاصل تھی اس لئے قرآن اسی زبان میں نازل ہوا۔

قرآن پاک جب قریش کی زبان اور لہجے میں نازل ہوا تو دوسرے قبیلے والے فوری طور پر اپنے مادی لہجہ اور لسانی خصوصیت کو بدلنے اور لغت قریش کے مطابق قرآن کی تلاوت کرنے میں دقت محسوس کرنے لگے۔ ان کی اس دقت کو محسوس کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بارگاہ خداوندی میں دعا کی، اور قرآن کو ان ساتوں لغت اور لہجہ پر پڑھنے کی اجازت طلب فرمائی تاکہ کسی قبیلہ کو کوئی شکایت یا پڑھنے میں دشواری نہ ہو چنانچہ آپ کی دعا اور خواہش سے قرآن کو سات مشہور لغات اور لہجوں پر پڑھنے کی اجازت مل گئی، جس کو حدیث کے الفاظ میں سبعۃ احرف سے تعبیر کیا گیا ہو۔ ارشاد نبوی ہے:

ان ھذا القرآن انزل علی سبعۃ   قرآن سات حرف پر نازل ہوا ہے ان میں

احرف فاقرؤا ما تیسر منہا[1] جو آسان ہو پڑھو

آگے بڑھنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی سہولت اور تلاوت قرآن کو آسان بنانے کے لئے قرآن کو ان ساتوں لہجوں اور لغات پر پڑھنے کی اجازت تو دے دی تھی مگر جب کوئی آیت یا سورت نازل ہوتی تھی تو لغت قریش ہی کے مطابق (جس میں اصلاً قرآن نازل ہوا تھا) کاتبین وحی سے اپنی نگرانی میں آپ اس کی کتابت کرنے کا حکم فرماتے تھے، اور عام طور پر اسی کے مطابق وہ نمازوں میں پڑھا جاتا تھا۔ پھر یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ لغات ولہجہ کا یہ اختلاف صرف لفظ کی حد تک تھا معنی میں کوئی اختلاف نہیں تھا، مختلف قبیلے ایک ہی معنی کو مختلف لہجہ اور مختلف الفاظ میں ادا کرتے تھے۔

مجمع الزوائد میں ہے کہ قرآن شریف کی کوئی آیت یا سورت نازل ہوتی تو آپ فوراً کسی کاتب وحی کو بلا کر نہ صرف لکھا دیا کرتے تھے بلکہ کاتب جب نازل شدہ وحی کو لکھ لیتا تو آپ اس سے لکھا ہوا پڑھوا کر سنتے اگر اس میں کتابت کی کوئی غلطی پاتے تو درست فرما دیتے، خود کاتبان وحی کے سرخیل حضرت زید بن ثابت رض کا بیان ہے۔ "فاذا فرغت قال اقرءہ فاقرءہ فان کان فیہ سقط اقامہ" اگر کوئی چیز لکھنے سے چھوٹ جاتی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم درست فرما دیتے ثم اخرجہ الی الناس۔ اس کے بعد عام اشاعت کا حکم دیا جاتا، جو لکھنا جانتے تھے وہ لکھ لیتے تھے اور یاد کرنے والے یاد کر لیتے تھے[2]

اس طرح پورا قرآن کھجور کے پتوں، پتھر کے ٹکڑوں، ہڈیوں، اونٹ کی پسلیوں غرض مختلف چیزوں پر لکھ لیا گیا، البتہ کتاب کی شکل میں ایک جگہ جمع نہیں ہوا۔

وصال نبوی کے بعد خلیفۂ اول حضرت ابو بکر صدیق رض کے عہد خلافت میں جب جنگ یمامہ کا واقعہ پیش آیا اور اس میں کوئی سات سو یا اس سے کچھ زائد صحابہ کرام شہید ہو گئے تو حضرت عمر رض کو ذہاب قرآن کا خدشہ لاحق ہوا اور خلیفۂ وقت کو جمع قرآن کا مشورہ دیا۔ قرآن کو کتابی شکل میں ایک جگہ جمع کرنے کی بابت جو روایتیں کتب احادیث میں بالتفصیل منقول ہیں اور اس سے متعلق حضرات صحابہ کرام میں جو بحث اور تبادلۂ خیال ہوا، یہ امور کسی اہل علم سے پوشیدہ نہیں۔ بس اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ حضرت عمر کے مشورہ کے بعد باتفاق صحابہ حضرت زید بن ثابت کا انتخاب عمل میں آیا، اور انھوں نے نہایت

---

[1] یہ عبارت بخاری شریف کی ایک حدیث کا ٹکڑا ہے۔ طوالت کے خوف سے پوری حدیث نقل نہیں کی گئی ہے۔ [2] مجمع الزوائد بحوالہ تدوین قرآن ص ۲۵۔

احتیاط و اہتمام کے ساتھ بالکل اسی رسم خط کے مطابق قرآن کو جمع فرمایا جس طرح رسول اکرم ؐ نے اپنی زیر نگرانی لکھوایا تھا۔

جمع قرآن کے بعد یہ صحیفہ حضرت ابوبکر کے پاس رہا یہاں تک کہ ان کی وفات ہوگئی، پھر حضرت عمر کے پاس ان کی زندگی تک رہا، پھر حضرت حفصہ بنت عمر کے پاس رہا فکانت الصحف عند ابی بکر حتی توفاہ الله ثم عند عمر حیاته ثم عند حفصه بنت عمر[۵]

یہ بھی ذہن میں رکھیئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ ارشاد لوگوں کی سہولت و آسانی کے لئے بطور اجازت کے تھا۔۔۔ بطور حکم کے نہیں، کیونکہ اس وقت اکثر صحابہ اور مسلمانوں کو کتابت سے ناواقف ہونے اور حفظ قرآن پر پوری طرح قادر نہ ہونے کی وجہ سے ایک ہی لفظ کے ساتھ قرآن کی تلاوت بہت ہی دشوار تھی۔ مگر بعد میں جب یہ عذر زائل ہوگیا اور لکھنے پڑھنے میں آسانی ہوگئی تو یہ اجازت بھی جاتی رہی لیکن لوگوں نے اس عارضی اجازت کو دوامی حکم یا اجازت سمجھ لیا۔ اور اپنی اپنی لغت کے موافق قرآن پڑھنے پڑھانے لگے۔ یہاں تک کہ خلیفۂ سوم حضرت عثمان رض کا زمانہ آگیا۔ آپ کے زمانۂ خلافت میں جب عجم کی فتوحات ہوئیں اور قرآن عجم میں شائع ہوا تو اسوقت لغات سبعہ کی تفرق کی وجہ سے اہل عجم میں اس قدر اختلافات و فسادات برپا ہوئے کہ اندیشہ ہوا کہ یہ لغات سبعہ جنکی اجازت فقر آسانی کے لئے دی گئی تھی کہ اب کہیں اختلاف کا ذریعہ نہ بن جائیں۔ خلیفۂ وقت نے اس خطرہ کو محسوس کیا اور اجلۂ صحابہ کی اتفاق رائے سے حضرت حفصہ ؓ سے وہ صحیفہ منگایا جو عہد صدیقی میں لغت قریش کے مطابق مرتب ہوا تھا۔ اور اس کی متعدد نقلیں کراکے ممالک اسلامیہ میں پھیلادیں، اور ہدایت کردی کہ اسی نسخہ کے مطابق قرآن پاک کی تلاوت کی جائے اور اس کے سوا جو کچھ کسی صحیفہ یا مصحف میں ہو سب جلادیا جائے۔

حضرت عثمان کے لکھوائے ہوئے مصاحف کی اشاعت سے پہلے قرآن کے سیکھنے سکھانے کا مدار زیادہ تر زبانی قرأت پر تھا۔ جب آپ نے ان مصاحف کو پورے ممالک اسلامیہ میں پھیلادیا تو لوگ کتابی قرأت کیطرف متوجہ ہوگئے، مگر اسوقت عربی رسم الخط میں اعراب، علامات اور نقطوں کا دستور نہ تھا اس لئے زبر، زیر، پیش، تشدید اور متشابہ حروف کی قرأت میں تردد ہونے لگا، مثلاً رب المشرق بغیر اعراب کے لکھا جائے تو حرف با کے متعلق یہ تردد ہوسکتا ہے کہ ضمہ کے ساتھ پڑھا جائے یا کسرہ کیساتھ

[۵] اتقان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۵۷

اسی طرح یطھرن میں طا اور ہا کو تشدید کے ساتھ پڑھیں یا بغیر تشدید کے، ملک اور لا مستم میں میم اور لام کو الف کے ساتھ پڑھا جائے یا بغیر الف کے اگر یعلمون اور یغفر لکم پر نقطے نہ ہوں تو یعلمون میں یا اور تا اور یغفر لکم میں یا اور نون کا اشتباہ ہو سکتا ہے تو اس تردد کو وہ صحابہ کرام جو قرار کے لقب سے مشہور تھے دور کر دیا کرتے تھے۔

صحابہ کرام میں جو قرار کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے، اور جنہوں نے اپنے کو خالص قرأت کیلئے مخصوص کر لیا تھا وہ جلیل القدر صحابہ کی ایک جماعت تھی، مگر ان میں بھی صرف سات ہستیاں نامور تھیں اور ان ہی کے گرد قرآن پاک کی سند گھومتی ہے۔ علامہ ذہبی طبقات القرار میں لکھتے ہیں:

فاما من حفظه كله منهم وعرض	جن لوگوں نے قرآن پاک حفظ کر لیا تھا اور
على النبي فجماعة من نجباء	اسکو انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے
اصحاب محمد انتدبوا لاقرائه	پیش کیا تھا وہ رسول اللہ کے ممتاز اصحاب کی
..... وكان سبعة اشتهر	ایک جماعت ہے۔۔ اس نے اپنے کو قرأت کیلئے
اعلام دارت عليهم اسانيد	مخصوص کر لیا تھا، ان میں سات نامور شخصیتیں تھیں
القرآن [1]	جن کے گرد قرآن کی سند گھومتی ہے۔

وہ نامور ہستیاں یہ ہیں:

حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ۔ ابیؓ بن کعب۔ زیدؓ بن ثابت۔ عبداللہؓ بن مسعود۔ ابو الدرداءؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ رضی اللہ عنہم [2]

مصاحف عثمانی پر اجماع ہو جانے کے بعد جب کبھی مخارج حروف، کیفیت ادا اور بلاغت حسن و بیان میں اختلافات ہو جاتے تھے تو دیگر صحابہ انہی حضرات کیطرف رجوع کر کے اپنے شکوک دور کر لیا کرتے تھے، اس لئے کہ ان حضرات نے براہ راست پورے قرآن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش فرمایا تھا اور اسی کے مطابق یاد کر لیا تھا۔ انہی مصاحف عثمانی کے مطابق صحابہ نے تابعین کو اور تابعین نے تبع تابعین کو پڑھایا ______ پھر ان دونوں جماعتوں میں سے بہت سے حضرات نے متعدد شیوخ سے تلمذ اختیار کیا اور ان سے کسب فیض کیا، چونکہ ان لوگوں نے براہ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرأت نہیں پڑھی تھی، اس لئے ان کے حق میں کچھ قرأتیں شاذ اور ضعیف بھی

---

[1] ماہنامہ معارف اعظم گڈھ جلد ۲۹ معارف نمبر ۴ ص ۲۵۵ مضمون جمع و تدوین قرآن از صدیق حسن مرحوم۔ [2] اتقان ج ۱ ص ۷۲ بحوالہ

ہو گئیں، چنانچہ انھوں نے صرف و نحو، عربیت اور لب و لہجہ کے موافق اور رسم عثمانی کی اتباع کرتے ہوئے مشہور وجوہ کا انتخاب کر کے اپنے لئے جدا جدا قرأتیں اختیار کر لیں۔ اور پھر اسی کے مطابق درس و تدریس شروع کر دیا

ایک عرصہ تک تعلیم قرأت کا مدار فقط سماعت اور اعتماد حفظ پر تھا، مگر مفتوحہ علاقوں کے وسیع ہونے، عرب و عجم کے مختلط ہونے اور نئے نئے فرقوں کے پیدا ہونے سے جب زبانیں حد سے زیادہ خراب ہو گئیں، لوگوں کے دلوں میں کجی آ گئی، اور ناواقف، جاہل اور جھگڑالو قوموں کی دخل اندازی سے کچھ ایسی قراتیں بھی ظہور پذیر ہو گئیں جنھیں نہ تو عربی زبان کی تائید حاصل تھی نہ صحت سند کی اور نہ ہی مصحف رسم الخط کی، تو علماء نے تمام قرأتوں کو جمع کر کے روایات کے اسناد کی تفصیل کر دی، اور صحیح، مشہور اور شاذ کے اصول وضوابط متعین کر دیئے۔

اس فن میں سب سے پہلے امام ابو عبید قاسم بن سلام (تیسری صدی ہجری کی عظیم ترین شخصیت) صاحب تصنیف ہوئے، پھر احمد بن جبیر کوفی، پھر اسمٰعیل بن اسحٰق مالکی، پھر ابو جعفر بن جریر طبری، پھر ابو بکر محمد بن احمد بن عمر الدجونی، پھر ابو بکر بن مجاہد[۱]۔ مؤخر الذکر کے علاوہ باقی سبھی حضرات نے بیس سے زائد قرأتوں میں کتابیں لکھی ہیں۔ ابو عبید قاسم اور اسمٰعیل مالکی دونوں حضرات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب میں پچیس ۲۵ پچیس قرأتیں بیان کی ہیں۔ قاری ابوالحسن اعظمی لکھتے ہیں:

> پہلے تینوں زمانوں میں بے شمار قرأت پڑھائی جاتی تھیں۔ پھر جب تیسری صدی میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا تو ہر مصنف اپنی کتاب میں وہ قرأت بیان کرتا تھا جو اس کو متصل اور صحیح سند سے پہنچی تھیں، چنانچہ ابو عبید قاسم بن سلام صاحب کتاب القرأت (تیسری صدی کی تصنیف ہے مصنف کا سن وفات معلوم نہ ہو سکا) اور قاضی اسمٰعیل صاحب کتاب القرأت (ولادت ۱۷۹ م ۲۸۲ھ) نے پچیس ۲۵ پچیس قرأت بیان کی ہیں[۲]

مگر چوتھی صدی میں لوگوں کے کسل، سستی اور ضعف حافظہ کی بناء پر اختصار کی ضرورت پیش آ گئی تو امام ابو بکر بن مجاہد نے (جو قرأت کے علم اور اپنے وقت کے سب سے بڑے امام تھے) کتاب السبعہ لکھی اور اس میں حسب ذیل سات ائمہ کی قرأتیں بیان کیں:

---

[۱] اتقان ج ۱ ص ۷۶۔ [۲] علم قرأت اور قراء سبعہ ص ۶۲۔

نافع ابن نعیم مدنی م ۱۶۹ھ (۲) عبداللہ ابن کثیر مکی م ۱۲۰ھ (۳) ابوعمرو بن العلاء بصری م ۱۵۴ھ (۴) عبداللہ بن عامر شامی م ۱۱۸ھ (۵) عاصم ابن ابی النجود کوفی م ۱۲۸ھ (۶) حمزہ ابن حبیب کوفی م ۱۵۶ھ (۷) علی ابن حمزہ کسائی م ۱۸۹ھ
ان ائمہ کی قرأتوں میں بہ نسبت دوسروں کے صحیح اور مشہور وجہیں زیادہ تھیں، جو صرف ونحو اور عربیت میں بھی قوی تر اور رسم عثمانی سے بھی زیادہ موافق تھیں۔ اس لئے امام موصوف نے ان ہی کی قرآتیں منتخب فرمائیں۔ اور اسی کے مطابق قرأت و روایات پڑھانی شروع کردیں۔

یہ پہلی کتاب ہے جس میں قرأۃ سبعہ پر اکتفا کیا گیا۔ اور یہیں سے قرأۃ سبعہ کے پڑھنے پڑھانے کا رواج بھی ہوا۔ ان قرأتوں کی صحت و تواتر میں کسی کا اختلاف نہیں بلکہ ان کی صحت و تواتر پر تمام ائمہ کا متفقہ فیصلہ ہو چکا ہے۔ اور انہی قرأتوں کی امت اسلامیہ آج تک پابند ہے۔

چونکہ یہ قرآتیں تعداد میں اس تعداد کے مطابق ہو گئی ہیں، جو حدیث میں حروف قرآن کی بابت بیان ہوئی ہے۔ اس لئے اس سے کچھ لوگ یہ شبہہ کرتے ہیں کہ سات حروف سے یہی سات قرآتیں مراد ہیں، حالانکہ یہ بات سراسر وہم اور اجماع اہل علم کے قطعی خلاف ہے۔

پچھلے سطور میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ مذکورہ قراء کی روایات قرأت میں جو کچھ اختلاف ہے وہ تو کچھ لب ولہجہ کا اختلاف ہے اور کچھ صرف ونحو کا اور یہ ظاہر ہے کہ صرف ونحو کے اختلاف کو حروف کا اختلاف نہیں کہا جا سکتا۔ نیز یہ کہ جس وقت آپ نے یہ حدیث ارشاد فرمائی تھی اسوقت یہ سات قراء پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ ان کی قرأتوں کو (جیسا کہ اوپر گذرا) سب سے پہلے چوتھی صدی میں ابوبکر ابن مجاہد نے جمع کیا اور یہیں سے ان کے پڑھنے پڑھانے کا رواج بھی ہوا، پھر سبعۃ احرف سے ان قراء کی قرآتیں کیسے مراد لی جا سکتی ہیں؟ امام اسماعیل بن ابراہیم بن محمد القراب "شافی" میں فرماتے ہیں:

> سبعۃ احرف کی حدیث سے یہ وہم نہ ہونا چاہئے کہ اس میں ان قراء سبعہ کی طرف اشارہ ہے جو تابعین کے بعد پیدا ہوئے، کیونکہ بایں صورت حدیث اس وقت تک بے فائدہ ہو جاتی ہے جبتک یہ قراء سبعہ پیدا ہو کر تعلیم نہ پائیں، قرأت اختیار نہ کریں، اور ان سے نقل نہ کی جائیں۔ نیز یہ لازم آئے گا کہ صحابہ وغیرہ کو اسوقت تک قرآن پڑھنا جائز نہ ہو جبتک وہ یہ نہ معلوم کرلیں کہ یہ قراء فلاں فلاں قرأت اختیار کریں گے۔ یہ عین جہالت ہے[1]

---

[1] علم قرأت اور قراء سبعہ ص ۵۸۔

چونکہ لوگوں کو یہ شبہ صرف اس لئے ہوا کہ انہوں نے پہلے انزل علیٰ سبعۃ احرف والی حدیث سنی پھر قراءِ سبعہ کی قرائتیں دیکھیں، اسی لئے متقدمین میں سے بہت سے علماء نے امام ابن مجاہد کے اس عمل کو جو انھوں نے صرف سات قرأتوں کے بیان پر اکتفا کیا ناپسند کیا تھا۔ چنانچہ مہروی کہتے ہیں:

بعض متاخرین نے قراءِ سبعہ کو اختصار کی غرض سے اختیار کیا، عام لوگوں نے اسے لازمی فرض سمجھ لیا اب اگر اس کے خلاف کچھ سنتے ہیں تو پڑھنے والے کو غلط کار اور کافر تک کہدیتے ہیں، حالانکہ بسا اوقات وہ وجہ نقل متواتر اور مشہور ہوتی ہے، پھر کم ہمت لوگوں نے قراءِ سبعہ میں سے بھی ہر امام کے دو دو راویوں پر بس کرلی۔[1] اگر انہیں کے کسی اور راوی کی روایت سنتے ہیں تو باطل کہدیتے ہیں خواہ ان راویوں سے مشہور تر ہو۔ سبعہ کے بیان پر بس کرنے کی وجہ سے عام لوگ دھوکے میں مبتلا ہو گئے۔ اور معلومات کی کمی نے ان کو غافل بنا دیا۔ کاش ابن مجاہد سبعہ سے کم یا زیادہ قرأت بیان کرتے تاکہ یہ شبہ نہ ہوتا۔[2]

دوسری بات یہ کہ اس وقت امت مسلمہ کے پاس ان سات قرأتوں کے علاوہ تین قرائتیں اور ہیں گو کہ ان کی اسناد کے تواتر میں تو کسی قدر اختلاف ہے مگر چونکہ ان کی اسناد بالاتفاق مشہور ہیں، اس لئے جمہور کے نزدیک یہ بھی متواتر ہیں، اور ان کو ان سات قرأتوں کے بعد کا درجہ حاصل ہے۔ علامہ احمد

---

[1] پانچویں صدی ہجری کے شروع تک یہ قراءِ سبعہ بہت سی روایات اور طرق کے ساتھ پڑھی پڑھائی جاتی تھی۔ چنانچہ علامہ ابوعمرو عثمان الدانی اندلسی (ولادت ۳۷۱ھ وفات ۴۴۴ھ) نے اپنی کتاب "جامع البیان" میں پانچسو روایات وطرق بیان کئے ہیں۔ مگر بعد کے طلبہ کے ضبط و حافظ اور شوق و ہمت میں مزید ضعف آگیا اور وہ مزید اختصار کی درخواست کرنے لگے، تو پھر علامہ موصوف نے "تیسیر" لکھی، اور اس میں ہر امام سے فقط دو دو روایتیں بیان کیں وہ رواۃ مع قراء بالترتیب یہ ہیں: (۱) نافع مدنی کیلئے قالون اور ورش (۲) ابن کثیر مکی کیلئے بزی اور قنبل (۳) ابوعمرو بصری کے لئے دوری اور سوسی (۴) ابن عامر شامی کے لئے ہشام اور ابن ذکوان۔ (۵) عاصم کوفی کے لئے شعبہ اور حفص (۶) حمزہ کوفی کیلئے خلف اور خلاد (۷) کسائی کوفی کے لئے ابوالحارث اور دوری ہیں۔ اس وقت اکثر ممالک میں امام عاصم کی قرأت بروایت حفص مروج ہے۔ فن قرأت کی اصطلاح میں جو اختلاف کسی قاری کی طرف منسوب ہو اس کو قرأت اور جو اختلاف کسی راوی کی طرف ہو اس کو روایت اور جو راوی کے اس شاگرد کی طرف منسوب ہو جس نے راوی کی روایت شائع ہوتی ہے تو اس کو طریق کہتے ہیں۔ مطلقاً ہر شاگرد کو طریق نہیں کہتے۔

[2] علم قرأت اور قراءِ سبعہ ص ۵۷، ۵۸

حسن زیات لکھتے ہیں:

ان سات قرأتوں کے علاوہ تین قرأتیں اور ہیں جو صحت و تواتر میں ان کے بعد کا درجہ رکھتی ہیں، اور وہ ابو جعفر مدنی، یعقوب بن اسحٰق حضرمی اور خلف بن ہشام کی قرأتیں ہیں۔ یہ دس قرأتیں ہیں جو بطریق تواتر ثابت ہیں، ان کے علاوہ باقی سب قرأتیں شاذ ہیں۔[1]

امام فن شیخ القراء حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب کی فوائد مکیہ میں تحریر فرماتے ہیں

علم قرأت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ قرأت جسکا پڑھنا صحیح ہے اور اس کی قرآنیت کا اعتقاد رکھنا ضروری اور لازمی ہے۔ اور ان کا رد اور استہزا گناہ اور کفر ہے، اور یہ وہ قرأت ہے جو قراء عشرہ سے بطریق تواتر اور شہرت ثابت ہوئی ہے، اور جو قرأت ان سے بطریق تواتر اور شہرت ثابت نہیں یا ان کے ماسواے مروی ہیں وہ سب شاذ ہیں۔[2]

مولانا بحر العلوم شرح مسلم میں قرآن کی ترتیب پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

..... ان دس قاریوں نے جن کی فہرست قرأت۔ اسلامی دنیا میں بالاتفاق مقبول ہیں، ایسی صحیح سندوں سے جس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ قرآن کو اسی ترتیب سے نقل کیا ہے۔[3]

غرض یہ کہ اس وقت امت مسلمہ کے پاس صرف سات ہی قرأتیں نہیں بلکہ دس قرأتیں اور ان کی دو دو روایتیں موجود ہیں۔ جو بالکل صحیح ہیں۔ تو اب اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ سبعۃ احرف سے یہی سات قرأتیں مراد ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ باقی تین قرأتیں صحیح نہیں شاذ ہیں۔ جبکہ مذکورہ بالا ارشادات سے یہ ثابت ہو چکا کہ ان کی صحت و تواتر پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ بلکہ بحمد اللہ آج تک یہ قرأتیں اپنی روایتی استناد کے ساتھ محفوظ ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حدیث سبعۃ احرف سے کسی طرح موجودہ ساتوں مروجہ قرأتیں مراد نہیں ہو سکتیں بلکہ اس سے مراد عرب کے ساتوں قبائل کی وہ زبانیں ہیں جو نزول قرآن کے زمانہ میں بولی جاتی تھیں۔ لہذا یہ خیال کہ حدیث پاک میں سبعۃ احرف سے قرأت سبعہ کی طرف اشارہ ہے صرف وہم ہی نہیں بلکہ حدیث نبوی کی یہ ایک غلط تاویل ہوگی۔

---

[1] تاریخ الادب العربی للزیات ص [2] فوائد مکیہ ص۳۳ [3] رسالہ معارف جلد نمبر ۲ ۹ معارف نمبر ۵ ص۲۲۴ مضمون جمع و ترتیب

قرآن پاک کی تلاوت اور حفظ

(مجیب اللہ ندوی)

اس عالم آب و گل میں پروردگار عالم نے انسانوں کو جو بے شمار نعمتیں دی ہیں، ان میں ایک عظیم نعمت قرآن پاک ہے، یہ عظیم نعمت بھی ہے اور عظیم بار امانت بھی، اس بار امانت کا امین اس نے ارض و سما اور دشت و جبل کو نہیں بلکہ قلب مومن کو بنایا ہے، اگر اس بار امانت کو ہمالیہ کی چوٹی پر بھی اتار دیا جاتا تو اس کی گرانباری سے اس کا جگر شق ہو جاتا۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ	اگر اس قرآن کو ہم کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو
خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (حشر)	تو تم دیکھتے کہ وہ خشیت الٰہی سے دب کر پھٹ جاتا

اس نعمت خداوندی اور نعمت الٰہی کے بیشمار تقاضے ہیں، جس میں ایک تقاضہ یہ ہے کہ اسے اپنی آنکھوں اور سینۂ دل سے لگایا جائے، اس کی روزانہ تلاوت کی جائے، اس کے حفظ و تلاوت کا پورا لطف و فائدہ اور لذت و حلاوت تو سمجھ کر پڑھنے ہی سے حاصل ہوتی ہے، لیکن اگر ہدایت و برکت کی نیت سے بے سمجھے بوجھے بھی اس کی تلاوت کی جائے تو اس سے بھی خدا سے تعلق اور دین سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے۔ ہدایت بھی ملتی ہے اور ثواب بھی۔ استقامت کی دولت بھی نصیب ہوتی ہے اور نیک عمل کی توفیق بھی۔ یہ کتاب الٰہی شفا و رحمت، ذکر و نصیحت اور ہدایت و سکینت معنوی اعتبار سے بھی ہے اور لفظی اعتبار سے بھی، خود اس نے اپنے ان اوصاف کا ذکر کیا ہے۔ ایک حدیث میں بھی اس کی ان تمام حیثیتوں کا بڑے جامع الفاظ میں ذکر آیا ہے:

هو الفصل ليس بالهزل هو	یہ ہزل نہیں ہے بلکہ حق و باطل کے درمیان

حبل اللہ المتین وھو الذکر الحکیم
وھو الصراط المستقیم (مشکوٰۃ ص ۱۸۶)

فیصلہ کرنے والی کتاب ہے، یہ اللہ کی مضبوط رسی
ہے، یہ نصیحت اور حکمت سکھاتی ہے، یہ صراط مستقیم ہے

قرآن کی تلاوت کا ایک بڑا فائدہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق یہ ہے کہ اس سے قلب کا زنگ دور ہوتا ہے۔

ان القلوب تصدأ کما یصدأ
الحدید اذا اصابہ الماء
قیل یارسول اللہ وما جلاؤھا
قال تلاوۃ القرآن وکثرۃ
ذکر الموت (بیہقی)

جس طرح پانی پڑ جانے سے لوہا زنگ آلود ہوجاتا
ہے، اسی طرح دل بھی گناہوں سے زنگ آلود
ہوجاتا ہے۔ صحابہ نے پوچھا، یارسول اللہ اس کی صفائی
کیسے ہوگی۔ فرمایا، تلاوت قرآن اور زیادہ سے
زیادہ موت کی یاد سے۔

قرآن کی تلاوت اور اس کا حفظ نہ صرف تلاوت کرنے اور اس کے یاد کرنے والے کے مرتبہ کو بلند کرتی ہے بلکہ اس کے والدین کو بھی اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں سے نوازدیتا ہے، حدیث میں آتا ہے کہ

من قرأ القرآن وعمل بما فیہ
لبس والداہ تاجا یوم القیمۃ
ضوءہ احسن من ضوء الشمس
فی بیوت الدنیا لو کانت فیکم فما
ظنکم بالذی عمل بھذا
(ابوداؤد)

جس نے قرآن پڑھا اور اس پر عمل کیا۔ اس کے
والدین کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایک تاج
پہنائے گا جس کی روشنی سورج سے بھی زیادہ
حسین ہوگی، پھر آپ نے فرمایا کہ سوچو کہ جب اس کے
والدین کا یہ مرتبہ ہے تو پھر خود اس کا مرتبہ
کیا ہوگا۔

ایک دوسری حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

من قرأ القرآن فاستظھرہ فاحل
حلالہ وحرم حرامہ ادخلہ اللہ
الجنۃ وشفعہ فی عشرۃ من
اھل بیتہ کلھم قد وجبت
لہ النار (احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

جس نے قرآن پڑھا اور اس کو یاد کیا اور اس کے
حلال کو حلال سمجھا اور اس کے حرام کو حرام جانا، تو اس کے
گھر کے دس ایسے آدمیوں کو اللہ تعالیٰ جنت میں داخل
کرے گا، اور قرآن ان کی شفاعت کریگا۔ جن
کے لئے دوزخ لازم ہوچکی ہوگی۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ قرآن کی تلاوت سے سکینت اور طمانیت کا نزول ہوتا ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ قرآن کی تلاوت خدا سے تعلق کو بڑھاتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جس کے سینے میں قرآن کا کوئی حصہ محفوظ نہ ہو تو وہ ویران گھر کے مثل ہے۔ ان الذی لیس فی جوفه شئ من القرآن کالبیت الخرب (ترمذی) آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تلاوت قرآن کی مشغولیت کی وجہ سے وہ مجھ سے دعا کرکے کچھ مانگ نہ سکا تو میں اسے مانگنے والوں سے زیادہ دیتا ہوں (ترمذی) خود اسوۂ نبوی یہ تھا کہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، رنج کی حالت ہو یا خوشی کی، سفر میں ہوں یا حضر میں، دوسرے اذکار و اوراد کے ساتھ قرآن کے خاص خاص حصے بھی آپ تلاوت فرمایا کرتے تھے، مثلاً سوتے وقت آپ معوذتین، آیۃ الکرسی اور بعض دوسری سورتیں تلاوت فرمایا کرتے تھے تہجد کیلئے اٹھتے تھے تو خاص طور پر سورۂ آل عمران کا آخری رکوع تلاوت فرماتے تھے۔ آپ کی تلاوت کا خاص موقع ومحل نماز تہجد اور دوسری نفل نمازیں ہوتی تھیں۔ آپ نفل نمازوں میں دو چار رکوع نہیں بلکہ کئی کئی پارے تلاوت فرما ڈالتے تھے۔

قرآن کا جتنا حصہ نازل ہوتا جاتا تھا آپ اسے جلد سے جلد سفینوں کے ساتھ سینۂ مبارک میں بھی محفوظ کر لیتے تھے، اور عام صحابہ رضی آپ سے سن کر یاد کر لیتے اور اسے نمازوں میں دہرانے لگتے تھے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ سال بھر میں قرآن پاک کا جتنا حصہ نازل ہو چکا ہوتا تھا، رمضان مبارک میں حضرت جبرئیل علیہ السلام سے اس کا دور فرمالیا کرتے تھے۔ جس سال آپ کی وفات ہوئی اس سال آپ نے دو بار پورے قرآن کا دور فرمایا۔ (بخاری)

قرآن پاک سے غفلت

قرآن پاک جتنی آسانی سے یاد ہو جاتا ہے اتنی آسانی سے کوئی دوسری کتاب یاد نہیں ہوتی مگر چونکہ یہ خدائے رب العلمین کا کلام ہے اس لئے جہاں اس کی تلاوت کی طرف سے ذرا بھی غفلت ہوئی یا اس کے ادب میں احترام میں فرق آیا تو کلام الٰہی کی غیرت اسے برداشت نہیں کرتی کہ اس سے بے پرواہی برتی جائے۔ اسی لئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بار بار صحابہ کی توجہ اس طرف مبذول فرمایا کرتے تھے، کئی بار مختلف انداز سے آپ نے فرمایا:

تعاهدوا القرآن فوالذی
نفسی بیده لهو اشد تفصیا
من الابل فی عقلها (بخاری ومسلم)

قرآن پاک کی تلاوت برابر کرتے رہو اور اس کا پورا خیال رکھو اگر اس کی طرف سے غفلت برتو گے تو وہ تمہارے ذہن ودماغ سے اتنی تیزی سے بھاگ جائیگا جتنی تیزی سے بندھا [illegible]

قرآن کی تلاوت کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کیفیت اور اسکا شوق

قرآن کی تلاوت کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کیا کیفیت ہوتی تھی اس کا اندازہ ان دو چار واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔

عبد اللہ ابن مسعود رضہ کی روایت ہے کہ ایک بار آپ منبر پر تشریف فرما تھے آپنے ان سے فرمایا کہ کچھ قرآن سناؤ، انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ پر قرآن کا نزول ہوتا ہے اور میں آپ کو قرآن سناؤں، آپنے فرمایا کہ مجھے دوسروں سے قرآن سننا بہت زیادہ پسند ہے، انہوں نے سورہ نساء کی تلاوت شروع کی، جب اس آیت

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ	اس وقت کیا ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک
وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰؤُلَآءِ شَهِيْدًا (نساء)	گواہ لائیں گے اور ان سب پر آپ کو گواہ بنائینگے

پر پہنچے تو آپ نے فرمایا کہ اب بس کرو۔

فالتفت اليه فاذا عيناه	میں نے آپ کے چہرۂ مبارک کیطرف دیکھا۔ تو
تذرفان (مشکوٰۃ)	آپ کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک بار آپ نے رات میں نماز پڑھنی شروع کی اور پوری رات ایک ہی آیت کی تکرار میں ختم ہوگئی اور وہ آیت یہ تھی:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ	اے اللہ! اگر تو عذاب دے تو یہ تیرے بندے
وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ	ہیں اور اگر تو ان کو معاف کر دے تو تو غالب اور
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (مائدہ)	حکمت والا ہے۔

صحابہ کرام رضہ بھی بڑے اہتمام و ادب سے تلاوت قرآن فرماتے تھے، ایک روز صحابہ کرام بیٹھے ہوئے تلاوت کر رہے تھے، آپ نے دیکھا تو فرمایا۔ خدا کا شکر ہے کہ خدا کی کتاب ایک ہے اور تم میں اس کے پڑھنے والوں میں سیاہ، سرخ، سفید اور ہر قسم کے لوگ ہیں (ابوداؤد باب ما یجزی الامی من القراۃ)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص کو تلاوت قرآن کا بے حد شوق تھا آپ نے ان کا شوق دیکھ کر فرمایا، کہ پورے مہینے میں قرآن ختم کیا کرو۔ حضرت ابن العاص نے عرض کیا مجھ میں اس سے زیادہ طاقت ہے، آپ نے فرمایا، اچھا پندرہ دن میں ختم کیا کرو، انہوں نے پھر اصرار کیا تو آپ نے دس دن میں ختم کرنے

کی اجازت دی۔ پھر [illegible] اصرار کیا تو سات دن میں قرآن ختم کرنے کا حکم دیا۔ فرمایا کہ اب اس سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے۔ (ابوداؤد کتاب الصوم)

تلاوت قرآن کے ذوق و شوق کا یہ عالم تھا کہ سخت سے سخت مصیبت میں بھی اس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، حضرت عثمانؓ کی شہادت واقع ہوئی تو آپ کلام الٰہی کی تلاوت ہی میں مصروف تھے، چنانچہ ان کے خون شہادت کے چند چھینٹے اس آیت پر پڑے تھے۔ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ جب خدمت فاروقی میں حاضر ہوتے تو آپ فرماتے کہ قرآن سنا کر ہم کو خدا کا شوق دلاؤ۔

ایک صحابی ایک بار یہ آیت رات بھر پڑھتے رہے اور دہراتے رہے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	جو لوگ برائیاں کرتے جا رہے ہیں کیا ان لوگوں کو گمان ہے کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر رکھیں گے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کئے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن سائبؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میرے پاس حضرت سعد بن وقاصؓ آئے اور بولے کہ سنا ہے کہ تم قرآن بہت اچھا پڑھتے ہو، میں نے سنا ہے کہ قرآن غم کے لئے نازل ہوا ہے، اس لئے جب پڑھو تو روؤ اگر رونے نہیں تو رونی صورت بناؤ اور اس کو خوش الحانی کے ساتھ پڑھو (ابن ماجہ کتاب الصلوٰۃ)

مصعب بن سعد کا بیان ہے کہ ایک بار میں نے قرآن لئے ہوئے بدن کھجلایا تو حضرت سعد بن وقاصؓ نے فرمایا کہ شاید تم نے اپنی شرمگاہ کا مس کیا ہے، میں نے کہا ہاں! بولے کہ جاؤ وضو کرو۔[1]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ تلاوت فرماتے تھے تو جب تک فارغ نہیں ہو جاتے تھے، اس وقت تک کسی سے بات نہیں کرتے تھے (بخاری)

حفظ قرآن کا بھی صحابہ کرام کو بہت شوق تھا، اس شوق کا اندازہ اس سے ملاحظہ فرمائیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت ہی میں یمامہ کی ایک جنگ میں ستر حفاظ صحابہ شہید ہوئے تھے، اس حادثہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جمع قرآن کا خیال پیدا ہوا اور انھوں نے حضرت صدیقؓ کو اس پر آمادہ کیا۔

تلاوت قرآن کے آداب | قرآن کی تلاوت خواہ نماز میں کی جائے یا نماز سے باہر اس کے کچھ مخصوص آداب

---

[1] موطا، غایت احتیاط اور ادب کی بنا پر ایسا فرمایا۔

ہیں، چند باتیں لکھی جاتی ہیں:

(۱) جب قرآن پڑھے باوضو پڑھے اور اس بات کا دل میں خیال رہے کہ یہ با عظمت کلام اس با عظمت ہستی کا ہے جس کے قبضۂ قدرت میں اس دنیا کا ہر ذرہ ہے، قرآن کی عظمت کا ذکر خود قرآن میں بھی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس عظمت کا ذکر فرمایا ہے۔

(۲) اس کی عظمت کا تقاضہ ہے کہ اس کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھا جائے اور اس کے معانی پر غور کیا جائے۔ قرآن نے سوچ سمجھ کر پڑھنے کی بار بار تاکید کی ہے۔ حدیث میں بھی اس کی تاکید آئی ہے۔ قرآن کے نازل کئے جانے کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ لوگ اس کو سمجھیں اور سمجھ کر اس پر عمل کریں۔ ظاہر ہے کہ جب تک کوئی سمجھے گا نہیں عمل کیسے کرے گا۔ امام غزالیؒ نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں تورات کی یہ عبارت نقل کی ہے:

"خدا تعالے فرماتا ہے کہ بندے تجھے شرم نہیں آتی کہ جب تیرے بھائی کا خط سفر میں بھی مل جاتا ہے تو ٹھہر جاتا ہے اور راستے سے الگ ہو کر اس کو پڑھنے کے لئے بیٹھ جاتا ہے اور اس کے حرف حرف کو غور سے پڑھتا ہے۔ یہ کتاب تورات میرا ایک فرمان ہے جو میں نے تجھے لکھ کر دیا ہے اور حکم کیا ہے کہ اس میں اپنی طاقت بھر غور و تأمل کر کے اس کے قوانین پر عمل کرو، تو اس سے انکار کرتا ہے اور عمل کرنے سے جی چراتا ہے، اور پڑھتا ہے تو جی لگا کر غور و تأمل سے نہیں پڑھتا۔"

لیکن جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بغیر سمجھے بوجھے قرآن کی تلاوت کرنا بے فائدہ ہے، وہ سخت غلطی پر ہیں۔ اوپر جو حدیث گزری ہے اس میں بھی تلاوت کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بہت سی حدیثوں میں سمجھنے کے بغیر تلاوت کی ترغیب دی گئی ہے۔ مثلاً:

من قرأ حرفا من كتاب الله	جس نے قرآن کا ایک حرف پڑھا اس کے لئے ایک
فله حسنة والحسنة بعشر امثالها	نیکی ہے اور نیکی دس گنے تک بڑھتی ہے میں نہیں کہتا
لا اقول الٓمٓ حرف ولكن الف	کہ الٓمٓ ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے، لام
حرف ولام حرف وميم حرف	ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔

ترمذی کی دوسری روایت ہے: جو قرآن پوری روانی سے پڑھتا ہے وہ فرشتوں کے ساتھ ہوگا اور

ومن يتتعتع فيه وهو عليه	جو قرآن اٹک اٹک کر دقت سے پڑھتا ہے

شان نزلے اجران   کو دوہرا اجرملیں گے ایک تلاوت کا ، دوسرا مشقت سے پڑھنے کا

اسی بنا پر قرآن کو حسن صوت کے ساتھ پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے کہ قلب پر اس کا بھی اثر پڑتا ہے ۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خوش آواز صحابہ رض سے قرآن پڑھوا کر سنا کرتے تھے ، اور دوسروں کے بارے میں فرمایا کہ

حسنوا القرآن باصواتکم فان   قرآن خوش الحانی کے ساتھ پڑھا کرو اس لئے کہ اچھی

الصوت الحسن یزید القرآن حسنا (دارمی)   آواز سے قرآن کا حسن بڑھتا ہے۔

(۳) قرآن اونچی جگہ رکھ کر خوش آوازی کے ساتھ پڑھنا چاہیئے اور ہر ہر لفظ کو صحیح صحیح پڑھنا چاہیئے اور ہر آیت پر جہاں ٹھہرنا ضروری ہو ٹھہر جانا چاہیئے ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام باتوں کا حکم دیا ہے ، اور خود قرآن میں بھی قرآن کو ترتیل سے یعنی ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کا حکم آیا ہے۔

(۴) قرآن کی کوئی آیت یاد کر کے بھلا دینے والے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدترین آدمی فرمایا ہے جب ایک آیت کو بھلا دینے کو آپ نے برا فرمایا تو جو لوگ پورا قرآن حفظ کر کے بھلا دیتے ہیں ان کو کتنا گناہ ہوگا۔

(۵) جب تک قرآن پڑھنے میں دل لگے اس وقت تک پڑھنا چاہئے اور جب دل نہ لگے تو بند کردے ، آپ نے بے دلی کے ساتھ قرآن پڑھنے سے منع فرمایا ہے ، لیکن کسی کا دل قرآن پڑھنے میں لگتا ہی نہ ہو تو اس کا جی لگے یا نہ لگے پڑھنا ضروری ہے۔

(۶) دن میں کسی نہ کسی وقت روزانہ تھوڑا سا قرآن تلاوت کرنا ضروری ہے ، سب سے اچھا وقت نماز فجر کے بعد ہے۔

(۷) بعض لوگ نماز کے بعد مختلف قسم کے اذکار اور وظیفے تو گھنٹے آدھ گھنٹے پڑھتے رہتے ہیں ، لیکن قرآن کی تلاوت میں دو چار منٹ بھی صرف نہیں کرتے ، ایسا کرنا بہت برا ہے۔ خدا کے کلام سے بڑھکر کون سا ذکر اور کون سا وظیفہ بہتر اور بڑا ہے ، جو اس کو چھوڑ کر دوسرا ذکر وظیفہ کیا جائے ۔ اس سے بڑھکر یہ بات تشویش کی ہے کہ بعض اہل اصلاح اپنے متوسلین کو قرآن کی تلاوت سے روک دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پہلے ان وظیفوں سے دل کی صفائی ہو جائے گی تو پھر قرآن کی تلاوت کرنا ، غور کیجئے کہ قرآن سے بڑھ کر اور کس کلام یا ذکر سے دل کی صفائی ہو سکتی ہے کہ یہ لوگ ایسا حکم دیتے ہیں ، خدائے تعالیٰ ان باتوں سے محفوظ رکھے ۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

قراءة القرآن فی الصلوٰۃ افضل   نماز کے اندر قرآن کی قرأت نماز سے باہر کی قرأت

من قراءۃ القرآن فی غیر الصلوٰۃ   سے افضل ہے اور نماز کے باہر کی قرأت

وقرأۃ القرآن فی غیر الصلوٰۃ افضل من التسبیح والتکبیر (مشکوٰۃ) تسبیح اور تکبیر سے بہتر ہے۔

قرآن پاک کا اعجاز اور اسکی خصوصیت

دنیا میں قرآن پاک جتنی تعداد میں چھپتا ہے اور جس کثرت سے وہ پڑھا جاتا ہے دنیا کی کوئی کتاب نہ تو اس مقدار میں چھپتی ہے اور نہ پڑھی جاتی، پھر قرآن پاک ہی ایک ایسی کتاب ہے جو بے سمجھے بھی پڑھی اور یاد کی جا سکتی ہے، اور جتنی تعداد میں پورے قرآن کے حافظ دنیا میں آپ کو ملیں گے، اس کی ہزارویں تعداد بھی کسی دوسری کتاب کے حافظوں کی نہیں ملے گی، پھر قرآن پاک کی اس خصوصیت میں بھی دنیا کی کوئی کتاب اس کی شریک نہیں ہے کہ اس کو جتنی بار بھی پڑھا جائے اس سے طبیعت اکتاتی نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ لا یخلق بکثرۃ الرد یہ بار بار پڑھنے سے پرانا نہیں ہوتا، اسی طرح جو لوگ اسے سمجھتے اور اس میں غور و فکر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو نئے نئے اسرار و رموز سے آگاہ فرماتا اور ان کے قلب پر نئے نئے حقائق و معانی کے دروازے کھولتا ہے، حدیث شریف میں ہے

لا یشبع منہ العلماء و لا تنقضی عجائبہ — علماء اس سے سیراب نہیں ہوتے اور اس کے معنوی عجائب و غرائب کبھی ختم نہیں ہوں گے،

افسوس ہے کہ ہمارے علماء کو قرآن پاک سے وہ شغف نہیں رہا جو اس کا حق ہے، اور نہ مدارس میں اس کے پڑھنے پڑھانے کا وہ اہتمام ہوتا ہے جو دوسرے عقلی اور ادبی علوم کا ہوتا ہے۔

بقیہ رشحات

اس کی تازہ مثال ہے، عراق نے یہ جنگ اپنا کچھ علاقہ واپس کرنے کے لئے بے موقع چھیڑی تھی، مگر اس کا کوئی نتیجہ تو نہیں نکل سکا، البتہ اس کے نتیجہ میں ملت اسلامیہ کو دو زبردست نقصان ہوئے۔ ایک طرف دونوں ملکوں کی ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں اور اربوں روپئے برباد ہوئے۔ اور دوسرا بڑا نقصان یہ ہوا کہ اسرائیل کو فلسطینیوں کا قتل عام کرنے اور لبنان پر اپنا تسلط جمانے کا موقع مل گیا۔

کاش افراد سے لیکر مسلمان جماعتوں اور حکومتوں کے ذمہ دار اس پر غور کرنے کی زحمت گوارا کرتے تو ملت کے مستقبل کے لئے بڑی خوش آئند بات ہوتی۔

حدیث نبوی کی تدوین

اور اس پر مستشرقین کے اعتراضات

(از مولوی نسیم ظہیر صاحب اصلاحی شعبۂ عربی جامعۃ الرشاد)

جن لوگوں کے دلوں میں اسلام کی طرف سے عناد کے جذبات ہوتے ہیں وہ اسلام کے اصول ومبادی میں ریب وشک کی نئی نئی صورتیں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ انہیں میں حدیث نبوی کے بارے میں بہت سے مستشرقین اور ان کے شاگرد مسلمان مستغربین کے خیالات ہیں۔ ریب وشک پیدا کرنے کی کوشش اس سے پہلے بھی ہو چکی ہے اور آج بھی ایک طبقہ نہ صرف مستشرقین کا بلکہ مسلمان مستغربین کا بھی ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جس کی کوشش یہ ہے کہ کسی طرح احادیث نبوی کو ساقط الاعتبار قرار دے دیا جائے مستشرقین کا طرز عمل حدیث نبوی کے سلسلہ میں زیادہ تر ریب وشک پیدا کرنے کیلئے ہوتا ہے۔ مگر ہمارے مسلمان مستغربین زیادہ تر اپنی اباحیت پسندی کے جواز کے لئے ذخیرۂ حدیث کو مجروح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے حدیث نبوی پر طرح طرح کے اعتراضات کئے ہیں۔ اور اسے غیر معتبر قرار دینے کے لئے انہوں نے کوئی دقیقہ باقی نہ اٹھا رکھا۔ ممکن ہے ناواقف لوگ ان کی اس کدوکاوش سے دھوکہ کھا جائیں اور ان کے ذہن کی بلند پروازیوں کے لئے انہیں داد تحسین کا مستحق بھی سمجھنے لگیں مگر اہل نظر سے ان کی دسیسہ کاری اور فتنہ پردازی مخفی نہیں رہ سکتی ہے اور انہوں نے ان کے ایک ایک اعتراض کا جواب دے دیا ہے۔ اور ریب وشک کے جتنے حجابات انہوں نے اس ذخیرۂ نور پر ڈالنے کی کوشش کی تھی وہ انہوں نے تارتار کر ڈالا ہے۔

اسلام کے ان معاندین کی جملہ دسیسہ کاریوں کا جائزہ لینے کے لئے ایک مکمل دفتر درکار ہے۔ پھر

اس اہم اور عظیم الشان کام کے لئے جو علمی لیاقت اور فنی مہارت درکار ہے وہ مجھ جیسے بے بضاعت اور بے مایہ کو میسر نہیں، مگر اس کے باوجود اس امید پر کہ شاید ان کے اعتراضات کے تار ہائے عنکبوت کو پارہ پارہ کرنے کی سعادت میں احقر بھی اپنی ایک ادنیٰ کوشش سے شریک ہو جائے۔ اس لئے چند طالبعلمانہ معروضات پیش خدمت ہیں۔

احادیث نبوی کو ماخذ نہ ماننے کے سلسلہ میں جو باتیں کہی جاتی ہیں ان میں ایک خاص بات یہ کہی جاتی ہے کہ قرآن تو اپنے بارے میں یہ کہتا ہے کہ وہ " تبیاناً لکل شئ " ہے، جب قرآن خود ہی ہر چیز کی تفصیل کر رہا ہے تو پھر کسی دوسری چیز کی ضرورت ہی کیا ہے۔

اس سلسلہ میں دو باتیں عرض ہیں، ایک تو یہ کہ قرآن نے خود آپؐ کا منصب یہ بیان کیا ہے "انا انزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم" ہم آپ پر ذکر اتارا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے اسے خوب واضح کر دیں۔ آیت بالا میں لفظ " للناس " سے واضح ہے کہ قرآن حکیم اگرچہ خود ہی ہر چیز کی تفصیل کرتا ہے۔ مگر ہر شخص اس کی تفصیل و بیان کے سمجھنے سے قاصر ہے اس لئے اس کے بیان کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے رسول کو منصب بیان و تفصیل سے نوازا گیا۔ اور یہ لوگوں کے قصور فہم کی بنا پر ہے نہ کہ کتاب کے قصور بیان کی وجہ سے۔ جو کلام جس قدر بلند پایہ ہوتا ہے اسی قدر وہ شرح و بیان کا زیادہ محتاج ہوتا ہے۔ یہاں الفاظ میں غور کیجئے "مانزل الیھم" سے پہلے ارشاد ہے "انزلنا الیک" یعنی یہ کتاب تو ہم نے بھیجی ہے انسانوں ہی کے پاس لیکن براہ راست نہیں بلکہ آپؐ کے ذریعہ سے اور اس ذریعہ کی ضرورت اس لئے تھی کہ "لتبین للناس" "تاکہ آپؐ واضح کر دیں"۔ قرآن مجید کو اگر ہر شخص سمجھ سکتا اور کسی کے سمجھانے کی ضرورت نہ ہوتی تو اس کی کیا ضرورت تھی؟ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ آگے لعلھم یتفکرون کے ذریعہ خود انسانوں کو بھی دعوت غور و فکر دی گئی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس سے پہلے جو کچھ بیان ہوا ہے اسے کیوں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ اگر احادیث کی تشریعی حیثیت کو تسلیم نہ کیا جائے تو بہت سی آیات قرآنی کا مفہوم و مطلب مبہم اور بڑی حد تک تشنہ رہ جائے گا۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) وعلی الثلاثۃ الذین خلفوا — اور ان تین شخصوں پر بھی اللہ کی مہربانی

ہوئی .. جن کا معاملہ ملتوی رکھا گیا تھا۔

(توبہ ۱۱۸)

یہاں اس تفصیل کی ضرورت ہے کہ یہ تین آدمی کون تھے، ان کا کیا معاملہ ملتوی رکھا گیا تھا، اور کیوں رکھا گیا تھا، مہربانی کا کیا مطلب ہے؟ اگر یہ تمام توضیحات حدیث نہ بیان کرتی تو کیا صرف قرآن کے بیان سے یہ سارے سوالات حل ہو سکتے ہیں؟

(۲) وَاِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ (انفال ۴۲)

اور تم میدان کے قریبی کنارے پر تھے اور وہ لوگ میدان کے دور والے کنارے پر تھے اور قافلہ تم سے نیچے کی طرف (بچا ہوا) تھا

کیا حدیث کی مدد کے بغیر اس واقعہ کی تفصیلات معلوم ہو سکتی ہیں۔ اور دور و نزدیک کے کناروں کا جغرافیہ سمجھا جا سکتا ہے؟

(۳) عَبَسَ وَتَوَلّٰى اَنْ جَاءَهُ الْاَعْمٰى

چیں بجیں ہو گئے اور منہ موڑ لیا اس بات پر کہ ان کے پاس ایک اندھا آیا۔

کیا صرف قرآن کے سیاق و سباق سے یہ پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ نابینا کون تھے۔ آپ چیں بجیں کیوں ہوئے، اس وقت آپ کن لوگوں سے مخاطب تھے؟

یہ چند آیات بطور مثال پیش کی گئی ہیں، ورنہ بے شمار ایسی آیات ہیں جن کی مراد اور صحیح تاویل کا علم بغیر بیان نبی کے ممکن نہیں۔ اب ذرا اس پر غور کیجئے کہ قرآن میں بے شمار احکام بیان ہوئے ہیں لیکن نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جیسے بنیادی احکام کی تفصیلات تک قرآن مجید میں نہیں ہیں حرام و حلال کے متعلق قرآن نے صرف یہ ایک اصول بتا دیا ہے کہ تمام طیبات حلال اور خبائث حرام ہیں لیکن نہ تو طیبات کی وضاحت کی کہ کون کون سی چیزیں طیبات میں داخل ہیں اور نہ یہی بتایا کہ کون کون سی اشیاء خبائث ہیں۔ اسی طرح قرآن نے کہا کہ پینے والی چیزوں میں وہ تمام چیزیں جو نشہ آور اور مضر صحت ہیں حرام ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ چیزیں ایسی ہیں جنھیں اگر تھوڑا سا استعمال کیا جائے تو نشہ نہیں آتا اور اگر زیادہ استعمال کیا جائے تو نشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس شئی قلیل کا کیا حکم ہوگا؟ حدیث نے بتایا کہ ایسی قلیل چیز بھی کثیر کے حکم میں داخل ہے۔

ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام

جن چیزوں کی زیادہ مقدار نشہ آور ہو وہ تھوڑی سی بھی حرام ہے

ان کے علاوہ تمام عبادات و معاملات کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جن کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے سوائے سنت رسول کے دوسرا کوئی ذریعہ نہیں۔ اس لئے حدیث کو محض تاریخ کے برابر سمجھنا اس کی سب سے بڑی توہین ہے۔ اس کی نہیں بلکہ اس کے قائل کی توہین ہے۔

عمران بن حصین سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک شخص سے فرمایا کہ تو احمق ہے کیا قرآن میں کہیں ظہر کی چار رکعتیں اور ان میں جہر نہ ہونا مذکور ہے۔ اس کے بعد فرمایا ان کتاب اللہ ابھم ھذا وان السنۃ تفسر ذالک ۔ اللہ کی کتاب نے اس کو مبہم رکھا اور سنت نے اس کی تفسیر کر دی۔

عمران بن حصین کے اس بیان سے قرآن و حدیث کا ربط بھی معلوم ہو گیا کہ قرآن کو تسلیم کر کے حدیث سے انکار ممکن نہیں، اور حدیث کا انکار کر کے قرآن کو ماننے کی کوئی صورت نہیں۔ یہاں ان دونوں میں متن و شرح کی نسبت ہے۔ پھر یہ باہم اس طرح درج ہیں کہ ایک کا اقرار و انکار دوسرے کا اقرار و انکار بن جاتا ہے کیونکہ خود ماتن ہی شارح بنا ہوا ہے مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ہ

قرآن و حدیث کے اس ربط سے واضح ہو گیا کہ حدیث کی حیثیت صرف تاریخی نہیں بلکہ تشریعی بھی ہے۔ اسلئے کہ جملہ احادیث نبویہ قرآن کریم کا بیان ہیں، اور جب قرآن کی حیثیت تشریعی ہے تو اس کے بیان کی بھی حیثیت کا تشریعی ہونا لازمی ہے۔

ابتک کی ساری گفتگو حدیث کے ماخذ اور حجت ہونے کے سلسلہ میں تھی۔ آئیے اب دیکھیں کہ اس ماخذ پر ایک "محفوظ ذخیرہ" ہونے کی حیثیت سے کیا ارباب دانش کیا ارشاد فرماتے ہیں:

" احادیث پاک پر ایک خاص اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ان کی جمع و تدوین اور نقل و کتابت کا کام عہد نبوی اور خلفائے راشدین کے بعد اموی اور عباسی دور میں ہوا۔ نیز جمع حدیث کا کام انجام دینے والے ممتاز محدثین مثلاً ابن شہاب زہری وغیرہ دربار خلافت سے وابستہ رہے ہیں، اس بنا پر ان کے مرتب کردہ مجموعۂ احادیث پر بھی اس تعلق

کا اثر ضرور پڑا ہوگا۔[۱]

پہلے ہم مستشرقین اور مسلمان مستغربین کی اس بات کا جائزہ لے رہے ہیں کہ حدیث کی بنیاد دوسری صدی کے شروع میں پڑی ہے، اور اس سے پہلے گویا حدیث کا وجود ہی نہ تھا، یا اسی طرح بعض فاتر العقل لوگ یہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں صحابی نے روایت حدیث سے روکا ہے۔ فلاں نے کتابت کی ممانعت کی ہے وغیرہ۔

یقیناً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا میں بعض مصلحتوں کے پیش نظر کتابت حدیث کے اہتمام سے صحابہ کو منع کیا تھا، اور آپ ہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آپ کے دوسرے اصحاب نے بھی منع کیا اور احتیاط برتی۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب کہ دنیا کو اپنے قلم سے زیادہ اپنے حفظ پر ناز تھا، حفظ ہی کے ذریعہ مخطوطات کی تصحیح کی جاتی تھی، پھر حدیث کا جتنا حصہ عملی تھا وہ تو ان کی آنکھوں کے سامنے ہر وقت موجود تھا، اور اس کا جو حصہ صرف اقوال سے متعلق تھا۔ وہ والہانہ محبت، بے انتہا عقیدت اور ان کی فطری ماحول کی وجہ سے کسی اہتمام کے بغیر دماغوں میں محفوظ تھا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے غیر معمولی عشق کا یہ عالم تھا کہ وہ عبادات کے علاوہ عادات میں بھی آپ کی پوری مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے، آپ ہی کی طرح نشست و برخاست، رفتار و گفتار طعام و شراب، نوم و بیداری اختیار کرنا ان کی دلی تمنا ہوتی، اگر کسی نے آپ کی قمیص کا گریبان کھلا دیکھ لیا تو وہ اسی ادا پر مرمٹا، اگر کسی نے کوئی بات کہہ کر ہنستے دیکھا تو اس نے وہ بات نقل کرکے آپ کی طرح ہنس پڑنا بھی اپنے اوپر لازم سمجھ لیا۔ جب آپ کے قول و عمل کی ہر ہر ادا اور ان کی ہر حرکت کا یہ نقشہ ہر گھر میں موجود ہو، تو اس دور میں اس کا کیا گمان ہو سکتا تھا کہ آپ کی قولی و عملی حدیثیں جمع کرنے کا کوئی سرکاری طور پر بھی باقاعدہ انتظام ہونا چاہیے۔

جس طرح ابتدائی دور میں حفاظ قرآن کی کثرت، صحابہ کرام کی یکجہتی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت کے گہرے اثرات نے اس ضرورت کا احساس نہ ہونے دیا کہ حفاظت قرآن کے لئے کسی جدید نظم و نسق کا اہتمام کیا جائے، اسی طرح حدیث کا معاملہ بھی لوگوں کے اپنے اپنے انفرادی جذبہ تحفظ کی بنا پر مزید اہتمام کے قابل نہ سمجھا گیا۔ جب جنگ یمامہ میں دفعۃً حفاظ قرآن کی ایک معتدبہ تعداد شہید

[۱] الحدیث والمحدثون ص ۲۰۲ - ۲۰۸ مقدمہ انتخاب الترغیب۔

ہوگئے، اس غیر معمولی نقصان سے لوگوں نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ اگر کہیں خدا نخواستہ ایک آدھ بار پھر اسی طرح حفاظ قرآن قتل کر دیے گئے تو قرآن مجید ضائع ہو سکتا ہے، تو حضرت عمرؓ نے خلیفۂ وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جن الفاظ میں جمع قرآن کی درخواست کی اسے اپنے ذہن میں محفوظ رکھیے۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں۔

ان القتل قد استحر یوم الیمامۃ	جنگ یمامہ میں بہت سے حفاظ قرآن شہید ہوگئے
بقراء القرآن و انی اخشی	ہیں، مجھے اندیشہ ہے کہ اگر خدا نخواستہ کہیں
ان استحر القتل بالقراء بالمواطن	آئندہ بھی وہ اسی طرح شہید ہوگئے تو قرآن کریم
فیذھب من القرآن و انی	کے بہت سے اجزاء ضائع ہو جائیں گے۔ اس
اری ان تامر بجمع القرآن	لئے میری رائے ہے کہ آپ سرکاری طور پر قرآن
	جمع کرائیں۔

اسی طرح جب تقریباً ایک صدی ہجری گذر گئی تو صحابہ کرام ایک ایک کر کے اٹھنے لگے، یعنی دیکھنے والوں کا دور ختم ہو رہا تھا۔ اور ان کی جگہ ان مشاہدات کو الفاظی لباس میں دیکھنے والوں کی باری آ رہی تھی، اب لوگوں کے دلوں میں بے چینی پیدا ہونے لگی کہ کہیں اس محبوب عالم کی ادائیں اِن کے رخ انوار کے نظارہ کرنے والوں کے ختم ہو جانے سے تاریخ کا ایک صفحہ بن کر نہ رہ جائیں، اس لئے وہ انتظام کرنا چاہیئے جو تاریخ عالم میں ایک یادگار رہ جائے۔ چنانچہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے ابو بکر بن حزم والی مدینہ کے نام یہ فرمان لکھ بھیجا

انظر ما کان من حدیث رسول	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پاک کو
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاکتبہ فانی خفت	جمع کرو مجھے علم کے کم ہونے اور علماء کے اٹھ
دروس العلم و ذھاب العلماء	جانے کا خطرہ محسوس ہوتا ہے۔

اب ذرا پیچھے پلٹ کر حضرت عمرؓ کے نوے سال پرانے قول کا عمر بن عبدالعزیزؒ کے اس قول سے موازنہ کیجئے، معلوم ہوگا کہ جس خدائی حفاظت کے وعدے نے حضرت عمر بن خطابؓ کے ارادہ میں جنبش پیدا کی تھی، وہی وعدۂ خداوندی عمر بن عبدالعزیزؒ کے اس اقدام کے لئے بھی محرک بنا ہے۔ باقی

[illegible] ماہنامہ ساختہ الد ؎

یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ اگرچہ کتابت حدیث کا کام سرکاری طور پر حضرت عمر بن عبدالعزیز سے پہلے نہیں ہوا تھا، لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ کتابت کا سلسلہ بالکل منقطع رہا، بلکہ کتابت حدیث کا کام خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی سے رائج تھا۔ خلفاء راشدین کے دور میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا، اور کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا جس میں یہ کام کلیۃً منقطع ہو گیا ہو، بلکہ احادیث نبوی کا ایک بہت بڑا حصہ ایسا ہے جو دور رسالت ہی سے آج تک تحریری شکل میں چلا آرہا ہے۔ جس طرح قرآن مجید کو لوگوں نے ہمیشہ حفظ یاد کیا تھا، لیکن تحریر کا بھی شروع ہی سے اہتمام کیا تھا۔ ٹھیک اسی درجہ میں نہ سہی، اس سے کچھ کم ہی سہی، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ دور رسالت سے آج تک (یعنی ۱۳۹۹ھ تک) کبھی بھی تحریر کی طرف سے غفلت ہوئی ہو۔ ہم یہاں ان چند مجموعوں کا تذکرہ کر رہے ہیں، جو دور رسالت میں یا دور صحابہ میں خود صحابہ کرام کے ہاتھوں جمع ہوئے۔

الصادقہ۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہ کر اس مجموعے کو مرتب کیا تھا۔ اس کی ضخامت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا بیان ہے کہ جو مثالیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہیں صرف ان کی تعداد ایک ہزار ہے۔

کتاب عمرو بن حزم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنن و فرائض اور دیت وغیرہ کے کچھ مسائل لکھوا کر حضرت عمرو بن حزم صحابیؓ کے ذریعہ اہل یمن کے پاس بھیجا تھا۔

صحیفہائے انس بن مالک حضرت انس بن مالکؓ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص خادم تھے، ان کے پاس متعدد تحریریں تھیں وہ فرماتے تھے کہ یہ روایات میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر لکھی ہیں اور لکھنے کے بعد آپ کو سنا کر تصدیق بھی کرا چکا ہوں۔

فرائض الصدقہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ کے فرائض و واجبات لکھ کر حضرت انس بن مالک کو بحرین کا عامل بنا کر بحرین بھیجتے وقت دیا تھا۔

کتب ابو ہریرہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جن کے ذریعہ امت کو تمام صحابہ کرام میں سب سے زیادہ حدیثیں پہنچی ہیں، ان کے شاگرد حضرت عمرو بن امیہ ضمری کے صاحبزادے حسن کا بیان حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں نقل کیا ہے کہ حدثت عن ابی ھریرۃ بحدیث فانکرہ فقلت انی قد سمعتہ منک فقال ان کنت سمعتہ منی فھو مکتوب عندی فاخذ بیدی الی بیتہ

فارانا كتبا كثيرة من حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم فوجد ذالك الحديث فقال قد اخبرتك ان كنت حدثتك به فهو مكتوب عندی[1]

کتبا کثیرۃ کے لفظ سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے کتب خانہ میں حدیث کی کتابوں کی ایک بڑی تعداد تھی اور اس سے زیادہ قابل توجہ ان کا یہ جملہ ہے جو انہوں نے پورے وثوق کے ساتھ کہا ہے۔ ان کنت سمعته منی فهو مکتوب عندی۔ صحیفۂ علی، صحیفۂ وائل بن علی، کتاب سعد بن عبادہ، صحیفۂ جابر، صحیفۂ سمرہ ان کے علاوہ بے شمار صحائف ہیں جن کی ایک لمبی فہرست ہے۔ پھر صحابہ کرام کے بعد تابعین اور تبع تابعین نے بھی ارشادات نبوی کو حافظ کے علاوہ تحریری طور پر محفوظ کیا تھا۔ حضرت ابو ہریرہ کے شاگردوں میں ہمام بن منبہ ہیں، یہ یمن کے ابنا میں تھے ایک عرصہ تک آپ کی خدمت میں رہے۔ اور ان کی حدیثوں کو جمع کیا جو صحیفہ ہمام بن منبہ کے نام سے مشہور ہے۔ مسند احمد میں یہ صحیفہ تمام کا تمام شامل ہے۔ برلن اور دمشق کے کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے بھی موجود ہیں بعد میں یہ صحیفہ حیدرآباد دکن سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ اس میں ایک سو اڑتیس روایات ہیں۔

مذکورہ بالا تشریح سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ یہ کہنا کہ "احادیث نبوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے ڈیڑھ سو برس بعد مدون ہوئیں اور اس سے پہلے ڈیڑھ سو سال تک ان کا کوئی وجود نہ تھا۔ اگر تھا تو صرف یادداشتوں میں رہی ہیں" بالکل لغو اور حقیقت سے بہت دور کی باتیں ہیں۔

اب یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کتابت اور تدوین حدیث کی داغ بیل پہلے ہی پڑ چکی تھی تو حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں کیا کام ہوا۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز سے پہلے کتابت و تدوین محض انفرادی اور شخصی طور پر تھی۔ اور جس کے پاس جو ذخیرہ بھی تھا وہ اس کا اپنا ذاتی تھا۔ اجتماعی طور پر باقاعدہ حکومت کی نگرانی میں ان مختلف مجموعوں کو یکجا

---

[1] ترجمہ: میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث بیان کی انہوں نے اس کا انکار کیا۔ میں نے عرض کیا کہ اس حدیث کو میں نے آپ ہی سے سنا ہے۔ تو انہوں نے کہا اگر تم نے اس کو مجھ سے سنا ہے تو وہ میرے یہاں لکھی ہوگی پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور حدیث نبوی کی بہت ساری کتابیں ہم کو دکھایا اور ان میں حدیث کو نکالا پھر کہا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ اگر میں نے تم سے اس کو بیان کیا ہوگا تو وہ میرے یہاں لکھی ہوگی۔

کرکے اس کی اشاعت کا انتظام اس وقت تک نہ تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے انہی اجزائے پریشاں کو ایک مجموعے کی شکل میں پیش کیا۔ اور حکومت کی طرف سے باقاعدہ انتظام کرکے اس کی نقلیں مملکت کے گوشے گوشے میں پھیلادی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ذریعہ اللہ تعالےٰ نے جمع و تدوین کا جو دروازہ کھولا تو آئندہ چل کر اس میں بڑی ترقی ہوئی۔ قاضی ابوبکر بن حزم اور امام زہری کے علاوہ مختلف ائمہ نے تصنیف و تالیف میں دلچسپی لی، چنانچہ دوسری ہی صدی میں حدیث کے بے شمار مجموعے تیار ہو چکے تھے جو واقعی تاریخ عالم میں ایک بے مثال یادگار بن گئے۔

اب ہم اس بدگمانی کا جائزہ لیں گے کہ جمع حدیث کا کام کرنے والے کبار خلافت سے وابستہ رہے ہیں، اس بنا پر ان کے مرتب کردہ مجموعہ احادیث پر بھی اس تعلق کا اثر ضرور پڑا ہوگا۔

سنہ ۹۹ھ میں اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے تدوین حدیث کا کام باقاعدہ شروع ہوا۔ اور عہد عباسی میں بھی اس کا سلسلہ جاری رہا۔ بنو امیہ اور بنو عباس کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ دونوں خاندان ہمیشہ ایک دوسرے کے حریف اور مدمقابل تھے اور ان کے درمیان برابر سیاسی کشمکش پائی جاتی تھی۔ اس کشمکش کی وجہ سے خلفاء بنی امیہ سیاسی اعتبار سے حضرت علیؓ کے زبردست مخالف تھے، اسی طرح خلفائے بنی عباس بھی حضرت امیر معاویہؓ کو اپنا سیاسی حریف تصور کرتے تھے۔ اس لئے اگر محدثین نے ذرہ برابر بھی خلفاء کی رضا جوئی یا ان کی پاسداری سے کام لیا ہوتا تو اموی دور میں جو ذخیرہ تیار کیا گیا تھا وہ حضرت علیؓ کے معائب و مثالب اور امیر معاویہؓ کے مناقب سے بھرا ہوا ہوتا۔ اسی طرح عباسی دور کے محدثین نے احادیث پاک کے جو مجموعے مرتب کئے ان کا بیشتر حصہ حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ اور اہل بیت کے مدح و منقبت اور حضرت امیر معاویہؓ اور خاندان بنی امیہ کی مذمت پر مشتمل ہوتا۔ لیکن ذخیرۂ احادیث پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں نہ تو مدح و منقبت میں غلو سے کام لیا گیا ہے اور نہ ہی کسی کی تنقیص و مذمت میں کوئی بے جا جانبداری برتی گئی ہے۔ مناقب صحابہ کے ضمن میں حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ دونوں ہی کے فضائل و محاسن سے متعلق روایات درج ہیں، اور اگر کسی حدیث میں بے جا حمایت اور طرفداری کا کوئی شائبہ موجود ہے تو خود محدثین کے معیار نقد و تحقیق پر پوری نہیں اتری، اس لئے انہیں موضوع، ضعیف اور ساقط الاعتبار قرار دینے میں کوئی تامل نہیں ہوا۔

محدثین کرام کی پاکیزہ اور بے داغ زندگی سے بھی اس کی شہادت ملتی ہے۔ ان کی بے نیازی، دنیا سے
اور استغنا نے انہیں نہ کبھی سلاطین و امراء کے در پر جبہ سائی کی اجازت دی اور نہ انہیں صاف گوئی
حق پسندی اور برملا اظہارِ حق سے باز رکھا۔ انہوں نے جان و مال، آل و اولاد اور عزت و آبرو کو خطرہ
میں ڈالا مگر ظالم و جابر شہنشاہوں کے رعب و دبدبہ کی وجہ سے صدائے حق بلند کرنے سے باز نہیں رہے،
ابن شہاب زہری اور امام مالک وغیرہ دربارِ خلافت سے تعلق رکھنے کے باوجود خلفاء کی رضاجوئی یا
ان کی پاسداری کا خیال بھی اپنے دل میں نہیں لاتے تھے۔

مشہور اموی خلیفہ ولید بن عبد الملک نے امام زہریؒ کو بلا کر سوال کیا کہ کیا تم تک یہ روایت نہیں
پہنچی کہ حضرت عائشہؓ پر تہمت لگانے والوں میں علیؓ بھی شامل تھے؟ امام زہری نے جواب دیا "نہیں"
بلکہ مجھ سے اس کے برخلاف خود تمہارے ہی خاندان سے تعلق رکھنے والے دو آدمیوں ابوبکر بن عبد الرحمٰن
اور ابوسلمہ بن عبد الرحمٰن نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت عائشہ نے ان سے بیان کیا کہ " علی اس الزام
سے بری تھے "۔ ایک اور روایت ہے کہ ہشام بن عبد الملک کے خیال میں وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَہٗ مِنْهُمْ
لَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ سے حضرت علی مراد ہیں۔ چنانچہ اس نے ایک بار اس کے متعلق مشہور محدث سلیمان
بن یسار سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اس سے " عبد اللہ بن ابی " مراد ہے، ہشام بولا تم جھوٹ
بولتے ہو، انہوں نے عرض کیا امیر المومنین خود ہی سمجھتے ہیں، اس کے بعد اس نے ابن شہاب زہری سے
بھی یہی سوال کیا، جب انہوں نے بھی وہی جواب دیا جو سلیمان بن یسار نے دیا تھا، تو وہ بہت جھنجلایا
اور کہا تم جھوٹ کہتے ہو اس سے علی مراد ہیں۔ یہ سن کر امام زہری بھی طیش میں آگئے اور فرمایا تیرا برا ہو،
کیا میں جھوٹ بولوں گا؟ اگر کوئی آسمان سے اتر کر یہ منادی کرے کہ جھوٹ بولنا جائز ہے تب بھی میں
جھوٹ نہیں بول سکتا۔ مجھ سے عروہ، سعید، عبد اللہ اور علقمہ نے ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت
کی ہے کہ اس آیت میں عبد اللہ بن ابی کا ذکر ہے۔

ایک بار اسی ہشام بن عبد الملک نے حضرت اعمش کو لکھا کہ حضرت عثمان کے فضائل اور حضرت
علی کے مثالب جمع کیجئے۔ انہوں نے خط پھاڑ دیا یا بکری کے منہ میں ڈال دیا اور وہ اسے چبا گئی اور قاصد
سے کہا جاؤ کہدو یہی اس کا جواب ہے، قاصد ان کے پاس دوبارہ آیا اور کہنے لگا کہ " خلیفہ نے قسم کھا
رکھی ہے کہ اگر میں جواب لے کر نہیں لوٹا تو وہ میرا سر قلم کردے گا "۔ اس طرح جب حضرت اعمش جواب

لکھنے پر مجبور ہوئے تو لکھا " اے امیر المومنین! اگر حضرت عثمان میں دنیا بھر کی خوبیاں موجود ہوں، تو ان سے تمہارا کیا بھلا ہوگا۔ اسی طرح اگر حضرت علی میں دنیا بھر کی برائیاں بھی ہوں تو ان سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تم فقط اپنا خیال رکھو۔"

حجاج بن یوسف ثقفی کا نام شقاوت اور بیداد کے لئے ضرب المثل ہے۔ ایک بار کسی نے اس کے سامنے حسین رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا تو اس نے کہا کہ وہ ذریات نبی میں داخل نہ تھے، یحییٰ بن یعمر اس مجلس میں موجود تھے، وہ بر ملا عرض پرداز ہوئے۔ اے امیر! تو جھوٹ بولتا ہے۔ حجاج نے کہا اچھا تو کوئی آیت بطور دلیل پیش کرو ورنہ تمہارا سر قلم کردوں گا انہوں نے یہ آیت تلاوت کی

وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ	انہیں کی نسل میں سے داؤد، سلیمان، ایوب موسیٰ
وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ	اور ہارون ہیں اور ہم نیک کام کرنے والوں کو
وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ وَ	ایسا ہی صلہ دیتے ہیں، اور ایسے ہی زکریا
زَكَرِيَّا وَيَحْيَىٰ وَعِيسَىٰ وَإِلْيَاسَ	یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس ہیں۔

اور عرض کیا، دیکھئے ماں کے ذریعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ذریات آدم میں داخل ہیں، اسی طرح حضرت حسین بھی ماں کے واسطے سے ذریات نبی میں داخل ہیں، حجاج نے کہا، تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن یہ بتاؤ تم نے مجھے بھری مجلس میں کیوں جھٹلایا یحییٰ بن یعمر نے یہ آیت تلاوت کی۔

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ	اور جب اللہ نے اہل کتاب سے وعدہ لیا کہ وہ
أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا	کتاب کو لوگوں کے سامنے بیان کریں گے اور اس
تَكْتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ	کو چھپائیں گے نہیں، ان لوگوں نے اس
ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا	عہد و میثاق کو پس پشت ڈال دیا۔

اور کہا اسی میثاق خداوندی کی بنا پر میں نے تمہاری تکذیب کی تھی۔ حجاج اس حق گوئی کی تاب نہ لاسکا اور انہیں خراسان جلا وطن کر دیا۔

امام اوزاعی کی کہانی خود ان کی زبانی سنیئے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ جب سفاح کا چچا عبداللہ بن علی شام آیا تو ایک مجلس منعقد کی اور اس میں مجھے بلایا، جب میں وہاں پہنچا تو مجھے میری سواری سے

اتار کر ایسی اونچی جگہ پر بٹھایا گیا جہاں سے عبداللہ مجھے دیکھ سکے، اس نے مجھ سے دریافت کیا، کیا عبدالرحمٰن بن عمر الاوزاعی تمہی ہو؟ میں نے عرض کیا ہاں اے امیر! میرا ہی یہ نام ہے۔ اس نے پھر پوچھا بنوامیہ کے ساتھ ہماری خونریزی کے سلسلہ میں تمہاری کیا رائے ہے۔ میں نے عرض کیا۔ ان سے تمہارا معاہدہ تھا اس لئے اس کا لحاظ کرنا تمہارے لئے ضروری تھا۔ وہ بولا ہمارا ان سے کوئی معاہدہ نہیں تھا، یہ سن کر میری حالت غیر ہونے لگی اور میں مضطرب ہو گیا۔ مگر جب آخرت کی غضبناکی و خوفناکی اور اس روز خدا کی قہاری و جباری کو یاد کیا تو میرا سارا اضطراب جاتا رہا، اور میں نے برملا یہ کہدیا "ان کا خون تم پر حرام تھا تم نے ان کے ساتھ ناحق ظلم کیا ہے"۔ وہ میری تلخ گوئی سن کر اسقدر غضبناک ہوا کہ آنکھیں نکل آئیں اور گردن کی رگیں پھول گئیں، اور غصہ سے بھرا ہوا بولا۔ خدا تمہارا بھلا کرے، تمہیں یہ کہنے کی جرأت کیونکر ہوئی؟ میں نے عرض کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پاک ہے کہ کسی مسلمان کا قتل اسوقت تک مباح نہیں ہو سکتا جب تک وہ تین گناہوں میں سے کسی ایک کا مرتکب نہ ہو۔ یا تو شادی کے بعد زنا کرے، یا کسی کو ناحق قتل کرے یا اسلام سے مرتد ہو جائے۔ عبداللہ نے کہا۔ ہماری حکومت کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے، کیا وہ اسلامی نہیں ہے؟ میں نے کہا۔ کیسے؟ کہنے لگا، کیا تمہیں خبر نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کے لئے وصیت کی تھی؟ میں نے کہا اگر آپؐ نے ان کے لئے وصیت کی ہوتی تو وہ جنگ صفین میں حکم کیوں تسلیم کرتے؟ یہ سن کر اس کی آتش غضب بھڑک اٹھی اور مجھے یقین ہو گیا کہ بس اب میرا سر میرے قدموں پر آیا چاہتا ہے۔ مگر اس نے اشارے سے مجھے باہر نکالنے کا حکم دیا۔ میں نے وہاں سے اٹھ کر اپنی راہ لی، اور ابھی کچھ ہی دور آیا تھا کہ ایک سپاہی کو آتے ہوئے دیکھا۔ میں نے سمجھا، شاید میرا سر قلم کرنے آرہا ہے۔ میں نے گھوڑے سے اتر کر دو رکعت نماز پڑھنا چاہا کہ سپاہی نے سلام کرنے کے بعد کہا حضرت! امیر نے آپ کو یہ دنانیر بھیجے ہیں۔

امام اوزاعی نے یہ دنانیر قبول کر لئے لیکن گھر پہنچنے سے پہلے ہی انہیں غرباء میں تقسیم کر دیا۔

صرف ان چند واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ محدثین کرام حدیث پاک کے بارے میں کسی طرح کی مداہنت اور تساہل سے کام نہیں لیتے تھے۔ جب وہ ظالم و جابر حکمرانوں کے قہر و غضب کی پرواہ نہیں کرتے تھے تو وہ آخر کس طرح ان کی خاطر حدیثیں وضع کر سکتے تھے۔ حدیثیں وضع کرنا تو درکنار ائمہ حدیث نے تو معمولی اور جزئی مسائل میں بھی کسی حکمران یا بادشاہ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے یا ان کے

غیظ وغضب سے بچنے کے لئے کبھی اپنی رائے تبدیل نہیں کی۔

امام احمد بن حنبلؒ کو "القرآن کلام اللہ غیر مخلوق" کہنے کے نتیجے میں کیسی سخت صعوبتیں اور شدید اذیتیں جھیلنی پڑیں، مگر انہوں نے اپنی رائے تبدیل نہیں کی۔ امام مالکؒ کے نزدیک "جبری طلاق واقع نہیں ہوتی" حاکم وقت منصور کو جب اس فتوے کی اطلاع ہوئی تو سخت برہم ہوا اور ان کے ساتھ انتہائی ذلت آمیز سلوک کیا، لیکن امام موصوف بے خوف وخطر اعلان فرماتے ہیں" جو مجھے جانتا ہے وہ جانتا ہے اور جو نہیں جانتا وہ بھی جان لے کہ میں انس کا بیٹا مالک ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ جبری طلاق واقع نہیں ہوتی"۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ دروں کی سزا برداشت کرتے ہیں مگر عہدۂ قضا صرف اس لئے نہیں قبول کرتے کہ مقدمات کے فیصلے قرآن وحدیث کے بجائے امراء وحکام کے ذاتی آراء کے مطابق کرنا پڑیں گے۔

غرض محدثین کرام نے زخارف دنیا کی طرف کبھی نگاہ بھی نہیں اٹھائی۔ انھوں نے فقر وفاقہ کی زندگی بسر کی، مگر امراء وخلفاء کے تحائف وہدایا مسترد کر دیئے تاکہ اس کی وجہ سے انہیں ان کی بیجا رعایت اور دین کے معاملہ میں حق پوشی سے کام نہ لینا پڑے۔

حضرت طاؤس بن کیسان یمن کے مشہور اور بڑے محدث تھے۔ ایکبار وہاں کے حاکم نے انہیں پانچ سو دینار نذر کرنا چاہا تو انھوں نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔ امام ابو حنیفہ تجارت کرکے زندگی بسر کرتے تھے اور امراء وخلفاء کے تحائف کبھی قبول نہیں کرتے تھے۔ حضرت سعید بن مسیب کے پاس پانچ سو دینار تھے، اسی سے وہ تجارت کیا کرتے تھے۔ ایک بار اموی خلیفہ نے ان کے یہاں تیس ہزار درہم بھیجا مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا "لا حاجة لی ولا لی بنی مروان حتی القی اللہ فیحکم بینی وبینهم" نہ تو مجھے ان دراہم کی ضرورت ہے اور نہ خاندان بنی مروان کی، حتیٰ کہ میں اللہ سے ملوں اور وہ ہمارے اور انکے درمیان فیصلہ کردے۔" حضرت عیسیٰ بن یونس ایک جلیل القدر محدث ہیں۔ ایکبار جعفر برمکی نے انکی خدمت میں ایک لاکھ درہم کا عطیہ پیش کیا لیکن انہوں نے یہ کہکر لینے سے انکار کر دیا کہ اہل علم کہیں گے کہ میں نے حدیث کی قیمت لے لی۔ امام محمد بن جریر طبری سے عباسی خلیفہ مکتفی باللہ نے کوئی کتاب لکھوائی اور اس کا صلہ دینا چاہا تو انہوں نے لینے سے صاف انکار کر دیا، لوگوں نے اصرار کیا، کچھ بقدر ضرورت ہی قبول کرلیں۔ فرمایا کہ میں امیر المومنین سے درخواست کروں گا کہ جمعہ کے دن سوال کرنے کی ممانعت کر دیں۔ مامون رشید نے ایک بار موسیٰ بن یونس کو دس ہزار دینار دینا چاہا مگر انہوں نے لینے سے انکار

کردیا اور فرمایا "لاشرابت ماء" ا، یعنی خدمت حدیث کے سلسلہ میں ایک گھونٹ پانی بھی نہیں پی سکتا۔ محدثین کی بے نیازی اور کمال استغنیٰ کا اندازہ اس سے ہوگا کہ عبدالملک بن مروان نے مشہور محدث اور تابعی حضرت سعید بن مسیّب کے یہاں پیغام بھیجا کہ وہ اس کے لڑکے اور ولیعہد سے اپنی صاحبزادی کا نکاح کردیں، انہوں نے انکار کردیا، عبدالملک کی بار بار کوشش کے باوجود جب وہ کسی طرح راضی نہیں ہوئے تو ایک دن سخت ترین سردی کے موسم میں اس نے کوڑوں سے انہیں پٹوایا اور ان کے جسم پر پانی بہانے کا حکم دیا۔

یہ چند واقعات تو نمونۃً پیش کئے گئے ہیں ورنہ محدثین عظام کی پوری زندگی بے نیازی، خودداری امانت ودیانت، اخلاقی بلندی، ہمت وجرأت اور حق گوئی وبے باکی سے معمور ہے، محدثین نے بایوگرافی (اسماء الرجال) جیسے عظیم الشان اور نقید المثال فن کے اندر بیشمار لوگوں کے حالات زندگی قلمبند کرکے ان کے متعلق کسی رورعایت اور مداہنت کے بغیر اپنا بے لاگ فیصلہ دیا ہے، چنانچہ کسی راوی کو ثقہ اور حجت بتایا ہے اور کسی کو کذاب اور وضاع کہا ہے، کسی کو لین الحدیث اور ضعیف قرار دیا ہے اور کسی کو صالح اور معتبر لکھا ہے۔

ایسے بے لوث اور لاگ لپیٹ نہ رکھنے والے خوددار ومحتاط، امین ودیانت دار لوگ بھلا کسطرح کوئی موضوع، ضعیف یا ناقابل اعتبار حدیثیں اور ایسی روایتیں قبول کرسکتے تھے جن میں کسی امیر خلیفہ کی بے جا رورعایت کی گئی ہو، چہ جائے کہ وہ خود ہی ان کی جبہ داری اور پاسداری میں حدیثیں وضع کرتے ۰۰

بقیہ دعوت ولیمہ

چاہیئے، اس میں تعلقات کے قرب وبعد کا خیال نہ ہونا چاہیئے البتہ اگر دونوں نے ساتھ دعوت دی ہے تو جس سے زیادہ قرب اور تعلق ہو اس کے یہاں جانا چاہیئے۔

دعوت میں بلائے بغیر چلا جانا ایک بے غیرتی اور بے حیائی کی بات ہے، اس لئے جو لوگ کسی دعوت میں بغیر بلائے جاتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی سخت مذمت کی ہے، آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص بغیر بلائے کسی دعوت میں چلا جاتا ہے۔ وہ چور بن کر جاتا ہے، اور غاصب بن کر ڈاکہ ڈال کر واپس ہوتا ہے۔ (ابوداؤد) ایسے ہی اشخاص کو طفیلی کہا جاتا ہے ۰۰

(مجیب اللہ ندوی)

نکاح کے بعد لڑکی کی طرف سے تو کسی طرح کی دعوت وغیرہ کا اہتمام کرنا غیر مسنون طریقہ ہے، البتہ جو دو چار آدمی نکاح پڑھانے کی غرض سے جائیں، ان کی خاطر مدارات کر دینی چاہیئے۔ مگر نہ تو عام لوگوں کو کھانے پر مدعو کرنا چاہیئے۔ اور نہ زیادہ بارات بلانا چاہیئے۔ البتہ نکاح کی شرکت کے لئے لوگوں کو بلایا جا سکتا ہے، مگر یہ بلاوا بھی بغیر زحمت و تکلیف کے ہونا چاہیئے، اس دستور کو اپنی سوسائٹی سے ختم کرنا بہت ہی ضروری ہے۔ اس سے غریب آدمی سخت پریشانی میں پڑ جاتا ہے۔ اگر نہ بھی پڑے تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضؓ نے ایسا نہیں کیا ہے۔ تو پھر ہم کو بھی ان کی اطاعت و محبت میں ایسا نہ کرنا چاہیئے۔

البتہ نکاح کے بعد جب لڑکی لڑکے کے گھر یعنی سسرال رخصت ہو کر آجائے تو اسی وقت یا دو لوں میں جب مباشرت ہو جائے، اس وقت اپنی حیثیت کے مطابق دعوت کرنا اور لوگوں کو بلانا صحیح ہے۔ اسی دعوت کو شریعت میں دعوت ولیمہ کہا جاتا ہے۔ دعوت ولیمہ سنت ہے، مگر یہ دعوت اسی وقت سنت رہے گی جب اپنی حیثیت کے مطابق ہو، اور اس کی وجہ سے دعوت کرنے والے یا اس کے بیوی بچوں کو تکلیف کا اندیشہ نہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد نکاح فرمائے۔ مگر صرف دو موقع پر یعنی حضرت زینب اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی شادی میں دعوت ولیمہ دی، مگر اس دعوت میں کھانا کیا تھا وہ بھی ملاحظہ کر لیجئے۔ حضرت زینب رضؓ کی شادی میں آپ نے ایک بکری ذبح کر کے اسکا گوشت پکوایا اور سب کو کھلوایا، اور حضرت صفیہ رضؓ کی نکاح میں ولیمہ کی کیفیت حضرت انس رضؓ کی زبانی سنیئے جو اس ولیمے کے داعی تھے، وہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت صفیہ رضؓ کے نکاح کے بعد آپؐ نے جو

دعوت ولیمہ دی

ماکان فیہا من خبز ولا لحم	اس میں نہ تو روٹی تھی اور نہ گوشت تھا
وما کان فیہا الا ان امر	بلکہ اس میں یہ کیا گیا کہ چمڑے کے دسترخوان
بالانطاع فبسطت فالقی علیہا	بچھا دیئے گئے اور ان پر کچھ کھجوریں کچھ پنیر[1]
التمر والاقط والسمن	اور کچھ گھی یا مسکہ رکھ دیا گیا اور لوگوں
(بخاری ومسلم)	نے اسے کھایا

اس سے معلوم ہوا کہ دعوت ولیمہ میں وہی ہونا چاہئے جو آدمی کو آسانی سے میسر ہو جائے، ایک صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی شادی ہوئی تو آپؐ نے فرمایا:

اَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاۃٍ	اگر ایک بکری ہو تو اسی کا ولیمہ کرو

مقصد یہ تھا کہ اس موقع پر اپنے عزیز و اقارب اور احباب کی ضیافت کرنا مناسب ہے لیکن جو کچھ موجود ہو بس اسی کی ضیافت ہونی چاہئے۔ اگر تمہارے پاس ایک بکری ہو تو اسی کو ذبح کرکے اس کا گوشت لوگوں کو کھلا دو۔ لیکن اس کے لئے خواہ مخواہ پریشانی اٹھانا نہ چاہئے اس وقت لوگوں کا حال یہ ہے کہ تحریری نوید میں ماحضر کی دعوت دیتے ہیں، لیکن وہ ماحضر نہیں ہوتا بلکہ سراسر ماغاب ہوتا ہے۔ یعنی ایسی چیزیں اس کھانے میں ہوتی ہیں جو اس بیچارے کو سال میں مشکل سے ایک دو دن نصیب ہوتی ہوں گی۔ اسی بنا پر آپؐ نے فرمایا ہے کہ رخصتی کے بعد پہلے دن ولیمہ سب سے بہتر ہے۔ دوسرے دن بھی کوئی مضائقہ نہیں، اور تیسرے دن کا ولیمہ صرف نام و نمود کے لئے ہے (ابوداؤد)

مقصد یہ ہے کہ آدمی جتنی جلدی کرے گا کم اہتمام کرے گا۔ اور جتنی دیر لگائے گا اتنا ہی زیادہ اہتمام کرے گا۔ اور اس کا مقصد سوائے نام و نمود کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور نام و نمود کی جو مذمت شریعت میں آئی ہے۔ اس سے ہر مسلمان واقف ہے، نام و نمود ریا اور دکھاوے سے بڑی سے بڑی عبادت ثواب کے بجائے عذاب کا سبب بن جاتی ہے۔

دعوت ولیمہ میں کن لوگوں کو بلانا چاہئے | عام طور پر لوگ شادی بیاہ میں اپنے مالدار، ممتاز اعزہ و احباب، بڑے بڑے عہدے دارو، امراء اور ممتاز لوگوں کو بلانے کی کوشش کرتے ہیں،

---

[1] پنیر اونٹ کے دودھ سے تیار کیا جاتا ہے اور اس کا مزہ نمکین ہوتا ہے۔

اور اس میں اپنا ایک غیر معمولی اعزاز محسوس کرتے ہیں۔ اور غریب اعزہ و احباب کو حتی الامکان بلاتے نہیں۔ اور اگر کسی دباؤ، ضرورت یا لحاظ کی بنا پر شریک کر لیتے ہیں۔ یا وہ خود شریک ہو جاتے ہیں، تو ان کو ایک تکدر محسوس ہوتا ہے۔ اور اپنے دامن اعزاز پر ان کی شرکت کو ایک داغ سمجھتے ہیں۔ اور جو لوگ عہدے داروں اور ممتاز لوگوں کو نہیں بلاتے یا نہیں بلا پاتے۔ ان میں بھی اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جن کے دل میں خواہش چٹکی لیتی رہتی ہے کہ کاش یہ لوگ کسی وقت غریب خانے پر آ جاتے، مگر یہ بیچارے یا تو یہ سوچ کر نہیں بلاتے کہ ان کی شایانِ شان خاطر مدارات وہ نہ کر سکیں گے یا یہ سوچتے ہیں کہ وہ آئینگے نہیں، مگر ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں، جو ان مواقع پر غیر متعلق ممتاز لوگوں کے بجائے اپنے غریب اعزہ احباب اور پڑوسیوں کو خوشی سے بلاتے ہوں اور ان کی شرکت سے ان کو خوشی بھی محسوس ہوتی ہو، ایک طرف مسلمانوں کے موجودہ طرزِ عمل کو لاحظہ کیجئے اور دوسری طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو ملاحظہ کیجئے۔ آپؐ نے فرمایا:

شر الطعام طعام الولیمہ یدعی لہا الاغنیاء ویترک الفقراء (بخاری و مسلم)	سب سے ناپسندیدہ کھانا اس دعوت ولیمہ کا ہے جس میں مالدار لوگ بلائے جائیں اور غربا و محتاج چھوڑ دیئے جائیں۔

پھر آپؐ نے فرمایا کہ اس سے بھی بڑا جرم یہ ہے:

شر الطعام الولیمۃ یمنعہا من یأتیہا ویدعی من یأباہا (مسلم)	سب سے برا کھانا وہ ہے جس میں ان لوگوں کو تو روکا جائے جو آنا چاہتے ہوں اور ان لوگوں کو بلایا جائے جو آنے میں تکلیف محسوس کرتے ہوں یا آنا نہ چاہتے ہوں۔

اگر کوئی دعوت دے تو ضرور شریک ہونا چاہئے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص دعوت دے تو اس کی دعوت میں شریک ہونا چاہئے۔ بشرطیکہ اس میں کوئی غیر اسلامی بات نہ ہو، آپؐ نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی کو دعوت دی اور اس نے اس کی دعوت رد کر دی، تو اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص نفل روزے سے ہو، اور کوئی اس کو بلائے تو اس کو جانا چاہئے، اور پھر جا کر کھانے سے معذرت کر دینی چاہئے کہ میں روزے سے ہوں۔

جہاں کوئی غیر اسلامی بات ہو

البتہ جس دعوت میں [illegible] خلاف اسلام کام ہو رہا ہو، مثلاً باجا بج رہا ہو یا ریکارڈنگ ہو رہی ہو، یا رقص و سرور ہو یا کھانے میں کوئی حرام چیز مثلاً شراب رکھی ہوئی ہو، تو فوراً دعوت سے اٹھ جانا چاہئے، اور اگر پہلے سے معلوم ہو تو جانا ہی نہیں چاہئے۔

حضرت علی فرماتے ہیں کہ ایک بار میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانے کی دعوت دی، آپ گھر کے اندر تشریف لائے تو دیکھا کہ گھر کے پردے میں چند تصویریں ہیں، آپ اسی وقت واپس تشریف لے گئے اور کھانا تناول نہیں فرمایا۔ (ابن ماجہ)

آپ نے فرمایا کہ جو شخص توحید و آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اس کو چاہئے کہ وہ اس دعوت میں شرکت نہ کرے جس میں شراب کا دور چل رہا ہو۔ (مسند احمد)

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ شادی بیاہ کی تقریبات ہی میں نہیں بلکہ آدمی کو خود اپنے گھر میں بھی غیر اسلامی اور گناہ کی باتوں سے بچنا چاہئے، بلکہ ایسی تقریبوں میں شریک بھی نہ ہونا چاہئے جن میں کوئی منکر یعنی غیر اسلامی کام ہو رہا ہو۔

ختنہ اور عقیقہ کی دعوت کا حکم

شادی کے علاوہ بھی اگر کوئی شخص اپنے احباب یا اعزہ کو کھانے پر بلاتا ہے، یا ان کے پاس ہدیہ بھیجتا ہے تو اس سے آپس میں محبت بڑھتی ہے اس لئے ایسا کرنا چاہئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تہادوا تحابوا، ہدیہ بھیجا کرو اس سے محبت بڑھے گی۔

اسی طرح اگر لڑکے کے عقیقے یا ختنے کے موقع پر بغیر کسی اہتمام کے بے تکلف اپنے اعزہ و احباب اور پڑوسیوں کو کھانے کی دعوت دے دی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن اگر اس کے لئے اپنے اعزہ و احباب کو دور سے بلایا جائے اور وہ لوگ لڑکے کے لئے کپڑے اور تحفے وغیرہ لیکر آئیں، چاندی کی کٹوری میں روپیہ ڈالیں تو یہ سب باتیں قرآن و سنت کے سراسر خلاف ہیں، اسی بنا پر صحابہ رضی اللہ عنہم عقیقہ و ختنہ کی دعوتوں میں شرکت سے پرہیز کرتے تھے کہ کہیں یہ رواج نہ بن جائے۔

حسن بصری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان ابن ابی العاص رض کو ایک بار ایک ختنے کی دعوت میں بلایا گیا تو آپ نے جانے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہ تو ختنوں میں شرکت کرتے تھے اور نہ اس کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا جاتا تھا۔

اگر دو جگہ سے ایک ہی وقت میں دعوت آ جائے تو جس کی دعوت پہلے آئے، پہلے اسی کے یہاں جانا

باقی صفحہ [illegible] پر

وفیات

حضرت مولانا عبدالحمید صاحب نعمانی کی رحلت

ہندوستان میں جدید عربی ادب کے ذوق کی آب یاری سب سے پہلے ندوہ نے کی اور ندوہ سے ماہرین افراد نے اس میں نمایاں حصہ لیا ان میں مولانا عبدالحمید نعمانی مرحوم بھی تھے۔ انھوں نے درجنوں معیاری کتابوں کے ترجمہ کئے اور ادبی ادب کا ذوق پیدا کرنے کیلئے متعدد مفید کتابیں مرتب کیں۔ عربی دینی تعلیم میں ان کا ایک مخصوص نقطۂ نظر تھا اور اسی نقطۂ نظر کے مطابق انھوں نے مالیگاؤں میں معہد ملت کے نام سے ایک درسگاہ قائم کی جس کا شمار ہندوستان کے ممتاز درسگاہوں میں ہوتا ہے۔ اور پھر ان کا یہ بھی کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اپنے مخلص اور لائق شاگردوں کی ایک ٹیم بھی چھوڑ گئے۔ جو ان کے چھوڑے ہوئے کام کو بوجہ اتم پورا کر رہی ہے۔ خاص طور پر مولانا محمد حنیف صاحب ملّی ان کے ہر اعتبار سے جانشین ثابت ہوئے ہیں مرحوم پر کئی سال پہلے فالج کا حملہ ہوا تھا جس کی وجہ سے غفلتِ نسیان کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اور آخر کار اسی مرض میں ۲۰ جنوری ۱۹۸۳ء کو ان کا انتقال ہوا۔ ان کے انتقال کی اطلاع مولانا محمد حنیف صاحب ملّی نے راقم الحروف کو دی تھی۔ ان کیلئے مدرسہ میں ایصال ثواب بھی کیا گیا، مگر افسوس ہے کہ اس کا ذکر اب تک الرشاد میں نہیں آسکا تھا۔ اس کوتاہی پر ہم مولانا محمد حنیف صاحب ملی اور معہد ملت کے دوسرے حضرات سے معذرت خواہ ہیں اور ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ان کو اپنے جوارِ رحمت خاص میں جگہ عنایت کرے۔ آمین

مولانا داؤد اکبر صاحب مرحوم

افسوس ہے کہ ہمارے ضلع کے ایک ممتاز عالم اور مدرسۃ الاصلاح کے فاضل مولانا داؤد اکبر صاحب کا ایک مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ مولانا مدرسۃ الاصلاح کے قدیم فضلاء میں تھے۔ اور قرآن پاک اور قدیم ادب عربی پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کی کتاب "مشکلات القرآن" سے قرآن سے ان کے شغف اور گہرے مطالعہ کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ جامعۃ الرشاد کے ابتدائی دور میں وہ کئی سال تک ایک استاذ کی حیثیت سے اس سے وابستہ رہے ہیں علم و فضل اور گھر کے خوش حال ہوتے ہوئے بھی ان کی زندگی اتنی سادہ اور لباس اتنا معمولی ہوتا تھا کہ جب تک بتایا نہ جائے ان کی حیثیت کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔ ہمیشہ ہاتھ کا دھلا ہوا کپڑا پہنتے تھے۔ اور دوسرے معاملات زندگی میں بھی انتہائی محتاط تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کو غریق رحمت کرے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۰ سے متجاوز ہو چکی تھی پس ماندگان میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی صاحب اولاد چھوڑی ہے۔ آمین

بیان ملکیت و تفصیلات متعلقہ جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ

فارم چہارم، قاعدہ نمبر ۸

(۱)	مقام اشاعت	رشاد نگر اعظم گڈھ۔
(۲)	وقفۂ اشاعت	ماہانہ
(۳)	طابع کا نام	مولانا مجیب اللہ ندوی
	قومیت	ہندوستانی۔
(۴)	ناشر کا نام	مولانا مجیب اللہ ندوی
	سکونت	رشاد نگر اعظم گڈھ۔
(۵)	ایڈیٹر کا نام	مولانا مجیب اللہ ندوی۔
	قومیت	ہندوستانی
	سکونت	رشاد نگر اعظم گڈھ۔
(۶)	ملکیت	جامعۃ الرشاد ایجوکیشنل سوسائٹی رشاد نگر اعظم گڈھ

میں مجیب اللہ ذریعہ ہٰذا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط طابع و ناشر

مجیب ندوی

خاکہ سامنے آجاتا ہے کہ اس کی روشنی میں صحیح اسلامی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دارالمصنفین سے شائع ہوا تھا

اہل کتاب صحابہ و تابعین

مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی

اس کتاب میں ان صحابہ اور تابعین کا تذکرہ ہے۔ جو یہودی یا عیسائی تھے اور انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کتاب میں تقریباً سو صفحے کا ایک قیمتی مقدمہ بھی ہے جس سے عرب کے یہود و نصاریٰ کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے

اس پر مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کا دیباچہ بھی ہے۔ اس موضوع پر دنیا کی کسی زبان میں کوئی مکمل کتاب موجود نہیں ہے

خطبۂ نکاح

نکاح کے موقع پر جو خطبہ دیا جاتا ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور یہ ایک اہم معاشرتی ہدایت اور اصلاح معاشرہ کا پیغام ہے۔ مگر عام طور پر اس کے الفاظ دہرا دیئے جاتے ہیں، اس کا پورا مفہوم لوگوں کے ذہن نشین نہیں ہو پاتا ہے۔ اس کتابچہ میں اس کے ایک ایک لفظ کی ایسی موثر تشریح کی گئی ہے کہ یہ ہر نکاح کے موقع پر تقسیم کرنے کے قابل ہے۔ یہ تشریح مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی کے قلم سے ہے۔ صفحات قیمت عہ

اہل دل کی باتیں

یہ بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپگڈھی مدظلہ کے ان ملفوظات کا مجموعہ ہے جو وہ اپنی نجی مجلسوں میں اپنی پر اثر اور پر سوز زبان سے فرماتے رہے ہیں۔ اسے مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد نے مرتب کیا ہے۔ اس کا بہت سا حصہ ماہنامہ الفرقان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اب یہ جواہر پارے کتابی شکل میں دارالتصنیف دارالعلوم جامعۃ الرشاد کی طرف سے شائع کئے جا رہے ہیں۔

فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل

یہ محترم ناظم جامعۃ الرشاد کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو معارف اعظم گڈھ میں شائع ہو چکے ہیں یا مختلف سیمیناروں میں پڑھے گئے ہیں جس میں جدید مسائل کے حل کیلئے وہ مبادیات فراہم کی گئی ہیں جن کی روشنی میں جدید سے جدید مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔ یہ کتاب جامعہ ملیہ نئی دلی سے شائع ہوئی ہے اور اس پر اردو اکیڈمی نے مصنف کو انعام بھی دیا ہے۔ قیمت للعہ

ملنے کا پتہ: شکیل احمد منیجر مکتبہ جامعۃ الرشاد۔ رشاد نگر۔ اعظم گڈھ۔ یوپی

R. N. 38937/81
Phone:-46
Monthly Jameatur Rashad
Aaamgarh (U.P.)

شہر اعظم گڈھ کا مشہور ادارہ

جامعۃ الرشاد

ایک نظر میں

ادارے کے شعبے

(۱) عربی درجات (۲) درجہ حفظ و قرأت (۳) ابتدائی تعلیم کے مکاتب و جونیر ہائی اسکول (۴) کتابت و جلدسازی (۵) اسلامی نرسری اسکول (۶) الجامعۃ الشرعیہ اس کے ذریعہ نکاح و طلاق کے مسائل کا فیصلہ کیا جاتا ہے (۷) شعبہ نشر و اشاعت جس کے تحت کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں

ان تمام شعبوں میں کئی سو طلبہ ابتدائی اور اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ڈیڑھ درجن لائق اساتذہ کام کر رہے ہیں۔

ادارے کا خرچ

ادارے کا سالانہ خرچ ڈیڑھ لاکھ روپئے سے زیادہ ہے۔

ادارہ کی اہمیت اور خصوصیت (۱) جامعۃ الرشاد میں اعلیٰ عربی تعلیم کے ساتھ انگریزی زبان جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ (۲) یہاں سے عالمیت پاس کرنے کے بعد بی۔ اے میں براہ داخلہ مل جاتا ہے۔ (۳) سعودی عرب کی بعض یونیورسٹیوں نے ہر کلیہ میں اس کا معادلہ منظور کر کئی طلبہ داخل ہو کر فارغ ہو چکے ہیں اور اس سال بھی کئی طالب علموں کی درخواستیں بھیجی جا رہی ہیں۔

دینی تعلیم کے ساتھ بچوں کی بہترین دینی اور اخلاقی تربیت بھی کی جاتی ہے۔ جو لوگ بچوں کا داخلہ چاہیں ان کو رمضان المبارک میں خط و کتابت کرنا چاہئے۔ مکتب کے بچوں کا داخلہ ۲۵ جون کے بعد شروع ہو جاتا

ماہنامہ
الرشاد
جامعۃ

دارالتالیف والترجمہ کی تصانیف

عبادت و خدمت

مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہ

اس رسالہ میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور عام انسانوں کی خدمت بھی عبادت ہے، اور اس پر اسی طرح اجر و ثواب ملتا ہے جس طرح فرض عبادات پر ملتا ہے۔ اگر فرض عبادات کے اہتمام کے ساتھ ہمارے اندر عام انسانوں کی خدمت کا جذبہ بھی پیدا ہو جائے تو نفرت و حقارت کے بہت دبیز پردے ہٹ جائیں گے اور اسلام سے عام انسانوں کے دلوں میں ہمدردی ہو جائے گی۔ سائز ۱۸+۲۲۔ صفحات ۵۶، قیمت ۵۰ پیسے

دینی مدارس اور ان کی ذمہ داریاں

یہ محترم مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم دار المصنفین کی ان تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ ہے جو وہ اساتذہ، منتظمین مدرسہ اور عربی مدارس کے ذمہ داروں کے سامنے کرتے رہے ہیں۔ یہ تقریریں اور تحریریں درد و اثر میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ان میں بعض تقریروں کو محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ نے اپنے تائیدی نوٹ کے ساتھ الفرقان میں شائع فرمایا اور شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب مدظلہ العالی نے ایک بڑے مجمع میں پڑھوا کر سنوایا اور فرمایا کہ اسے ہر استاذ اور طالب علم کو پڑھنا چاہئے۔ سائز ۱۸+۲۲، صفحات ۱۰۰، قیمت للعہ

اسلامی تعلیم

حصہ اول، دوم، سوم، چہارم

بچوں کو اسلامی مسائل ذہن نشین کرانے کے لئے اردو زبان میں درجنوں رسالے لکھے گئے ہیں، مگر اس رسالہ کا انداز بیان اتنا دلچسپ ہے اور مسائل ایسے آسان طریقے سے سمجھایا گیا ہے کہ بچے اسے قصہ کہانی کی کتاب کی طرح دلچسپی و شوق سے پڑھتے ہیں۔ چار حصوں میں تمام ضروری مسائل آگئے ہیں۔

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ قیمت حصہ اول عہ، دوم عہ، سوم سعہ، چہارم ۵۰ پیسے

تبع تابعین حصہ اول

مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہ

کتاب میں ۱۴۴ اکابر تبع تابعین کا مفصل تذکرہ ہے۔ شروع میں مصنف کے قلم سے ایک فاضلانہ مقدمہ بھی ہے جس سے اسلام کی ابتدائی دو صدی کے دینی، تہذیبی اور سیاسی [illegible]

[illegible] مولانا مجیب اللہ ندوی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے نشاط پریس [illegible] سے چھپوا کر دفتر [illegible] سے شائع کیا

جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان

ماہنامہ

الرشاد

سالانہ چندہ
ہندوستان سے 24.00
چندہ ششماہی 12.00
قیمت فی پرچہ 2.50

سالانہ چندہ
ممالک غیر سے
بارہ ڈالر امریکی
$ 12.00

جلد نمبر (۳۱) | اپریل ۱۹۸۳ء مطابق رجب المرجب ۱۴۰۳ھ | شمارہ نمبر ۲۴

فہرست مضامین

مجلس ادارت

● پرچہ کی توسیع اشاعت کے ذمہ دار مولوی عقیل احمد صاحب ندوی ہیں

مطبوعہ رشاد پریس اعظم گڑھ

رشحات

راقم الحروف اس سے پہلے کئی بار عرض کر چکا ہے کہ آر ایس ایس کے ہیڈکوارٹر سے جو ہدایتیں جاری ہوتی ہیں، یا اس کے لیڈر جو بات اپنی تقریروں میں دہراتے رہتے ہیں، ہماری حکومت اسے عملی جامہ پہناتی ہے، اس کا ثبوت آزادی کے بعد کی ۴۵ سال تاریخ ہے، جس کی قدرے تفصیل ہم گذشتہ پرچوں میں کر چکے ہیں۔ غالباً آج سے بیس برس پہلے گروگوالکر آنجہانی نے گونڈہ یا کسی اور جگہ تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اگر آسام کی طرف پوری توجہ نہ دی گئی تو آسام میں مسلمانوں کی اکثریت ہو جائے گی"۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے لئے سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ کسی صوبہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہو جائے، چنانچہ آر ایس ایس نے وہاں آسامی اور غیر آسامی کا تعصب پھیلانا شروع کیا، اور اس ذہنیت کے نتیجہ میں مرکزی حکومت کو آسام کو کئی صوبوں میں تقسیم کرنا پڑا، اب جو بچا کھچا آسام رہ گیا تھا، اس میں قدرے مسلمانوں کا تناسب بہتر تھا، اس لئے آر ایس ایس کے ساتھ ہماری حکومت کو بھی اس کی فکر لاحق ہوئی کہ اس خطرہ کا سدِ باب کیا جائے، چنانچہ آہستہ آہستہ اس کا رخ وطنی اور لسانی جھگڑے کے بجائے مسلمان اقلیت کی طرف پھیرنے کی کوشش کی گئی۔

آسام میں یوں تو برسوں سے یہ عصبیت پیدا کی جا رہی تھی، مگر چار برس سے اس نے تشدد کا راستہ اختیار کر رکھا ہے، اور ادھر ایک سال کے اندر یہ تشدد اور زیادہ بڑھ گیا تھا، اسی صورت حال میں ہماری مرکزی حکومت نے اپنی سیاسی پوزیشن بحال کرنے کے لئے وہاں الیکشن کرانے کا فیصلہ کیا، چونکہ اس تحریک کا رخ اب بڑی حد تک لسانی اور وطنی عصبیت کے بجائے فرقہ واریت کی طرف مڑ چکا تھا اس لئے الیکشن کے دوران اندرا کانگریس کی طرف سے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات کھلے بندوں ڈالنے کی کوشش کی گئی کہ تمہارا تحفظ اسی وقت ممکن ہے جب کہ کانگریس کی حکومت یہاں ہو جائے۔ چنانچہ مسلمانوں نے

سو فیصد کانگریس کو ووٹ دیا، جس سے تحریک کے لوگوں کو مسلمانوں کیطرف سے اور زیادہ پرخاش ہو گئی اور الیکشن مخالف فرقہ پرور پارٹیوں نے اس کو اور زیادہ ہوا دی، اس لئے الیکشن ہوتے ہی وہاں بعض دوسرے شہریوں کے ساتھ مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا، جس میں ہزاروں ہزار مسلمان شہید ہوئے، اور لاکھوں بے گھر ہوئے، یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ الیکشن اسی لئے کرایا ہی گیا کہ تحریک والوں کے مطالبہ کو سیاسی انداز میں نہ مان کر دنیا میں انسان دوستی کا چرچا بھی کیا جائے، اور تشدد کے راستے سے ان کا مطالبہ پورا بھی ہو جائے اور آسام میں مسلمانوں کی موہوم اکثریت کا خطرہ ہمیشہ کے لئے ٹل جائے۔

دارالعلوم دیوبند کے ایک فاضل جو قدیم آسامی باشندے ہیں، اور اس وقت وہ گوہاٹی میں ایک مدرسہ میں کام کر رہے ہیں وہ اپنے ایک ساتھی مولوی جاوید احمد رشادی جو جامعۃ الرشاد میں پڑھاتے ہیں، جو خط لکھا ہے، اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ آسام کے مسلمانوں پر کیا قیامت گذر گئی اور گذر رہی ہے، خط کے چند جملے یہ ہیں:

دیگر اینکہ گذشتہ ۱۸ر فروری ۱۹۸۳ء کو کافروں کے حملے سے ہمارے گاؤں کے ۱۸۵ آدمی شہید ہو گئے، جنہیں میرے والدین، چھوٹے بھائی شفیق اللہ کی بیوی اور دو بچے، ایک بہن کے خاوند اور اس کے دو بچے، چار چچا اور پانچ چچیاں غرضیکہ خاندان کے پچاس آدمی شہید ہو گئے، اس وقت تک لاکھوں کے گھر جلا دیئے گئے (ہمارا پورا گاؤں بھی) اور تقریباً تین ہزار سے زائد مسلمانوں نے جام شہادت پیا، لکھتے ہوئے قلم اور دل قابو میں نہیں ہے، اب بھی کفار مسلمانوں کے خون کے پیاسے نظر آتے ہیں، حالات بہت خراب ہیں، دعا کریں، شہداء کے لئے اور خاص طور پر والدین کے لئے نیز ہمارے اور تمام مسلمانان آسام کے لئے دعا فرمائیں۔

کفایت اللہ القاسمی۔
دارالعلوم گوہاٹی۔ گاڑی گاؤں گوہاٹی ۱۲

ان کے گاؤں کا پتہ یہ ہے: موضع ٹاپیاری ۲، ڈاکخانہ بھیلکر یا بازار ضلع کامروپ (آسام)

مسز گاندھی نے ہمدردی ظاہر کرنے کے لئے آسام کا دورہ بھی کر دیا، اور دس کروڑ روپے پناہ گزینوں کی بحالی کے لئے منظور بھی کر دیئے، مگر سوال یہ ہے کہ جب ایسے سنگین حالات تھے تو انہوں نے الیکشن کرایا کیوں اور اگر ان حالات میں الکشن کرایا تھا، اور تحریک والے پہلے سے اس قتل عام کی دھمکی دے رہے تھے، اور الیکشن کے دوران بھی وہ تشدد کا مظاہرہ کرتے رہے، جیسا کہ اس خط سے ظاہر ہوتا ہے، تو پھر پہلے سے مسلمانوں کی جان و مال کے تحفظ کا انتظام کیوں نہیں کیا گیا؟ قتل عام کے بعد جو فوج بھیجی گئی ہے وہ اس سے پہلے کیوں نہ بھیج دی گئی؟ کیا پناہ گزینوں کی واپسی اور ان کے مکانوں کی نئی تعمیر سے اس نقصان کی تلافی ممکن ہے جو اس الیکشن کے نتیجہ میں مسلمانوں کو وہاں پہونچا ہے؟ پھر اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کو چھوڑیئے، دوسری سیکولر کہنے والی مخالف پارٹیوں کے کسی لیڈر نے بھی اس پر اپنے غم کا اظہار نہیں کیا، اور نہ کوئی بڑا لیڈر اس صورت حال کی سدھار کے لئے وہاں گیا۔ ہم اسی لئے برابر یہ کہہ رہے ہیں کہ مسلمانوں کی حیثیت یہاں خس و خاشاک کی بنا دی گئی ہے، جسے ہوا کا ہر جھونکا جدھر چاہے پھینک دے۔

ہمارے غیرت مند نیشنلسٹ اردو، انگریزی اخبارات نے صدر جنرل ضیاءالحق کے اس فقرہ پر کہ ... "ہندوستان کے مسلمان اپنے کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں" صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالے، مگر ان کو کبھی یہ توفیق نہیں ہوئی کہ حکومت کو متوجہ کریں کہ یہ ۳۵ برس سے مسلسل جو فسادات ہو رہے ہیں، اور آسام میں جو قتل عام ہوا ہے، جس نے فلسطینیوں کے اس قتل عام کو بھلا دیا جس پر ساری دنیا چیخ اٹھی تھی، وہ خود جنرل ضیاءالحق کی بات صحیح ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ آپ افغانستان کے معاملہ میں ٹانگ اڑائیں، کمبوڈیا میں روس کی حمایت کریں، فلسطینیوں کی حمایت کریں تو جائز ہے، اور اگر کسی اسلامی ملک کے سربراہ نے ہندوستان کے مسلمانوں کی مظلومیت کا اظہار کر دیا تو آپ اپنی احساس کمتری یا تیرہ دلی کی وجہ سے چراغ پا ہو جائیں یہ کہاں کی غیرت مندی اور شرافت ہے؟ آپ ہندوستانی مسلمانوں کی زبان بند کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں، مگر

جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

مشہور صحافی نیرد چودھری جو آج کل لندن میں ہیں، کی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ یہاں خلافت کے دور سے ہندو لیڈروں نے یہ کوشش کی کہ کسی طرح مسلمان ان میں مدغم ہو جائیں، مگر ایسا نہیں ہو سکا اور

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو مسلمانوں میں کشمکش بڑھی اور ملک دو حصوں میں بٹ گیا، انہوں نے لکھا ہے کہ اس سے ہندوؤں کو گریز کرنا چاہیئے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے مسئلہ کے حل کی تین صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ان کا قتل عام کر دیا جائے، لیکن یہ نہ ممکن ہے اور نہ حکومت یہ کر سکتی ہے، دوسرے یہ کہ ان کو دوسرے درجہ کا شہری قرار دے دیا جائے، ایسا کرنے کی بھی آپ ہمت نہیں کر سکتے (گو عملاً ایسا ہے) تو پھر تیسری صورت یہ ہے کہ ان کو ایک الگ قوم تصور کر کے ان سے ویسا ہی طرز عمل اختیار کیا جائے، اس مسئلہ کا حل یہی ہے، اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو پھر آئندہ پھر اس کے نتائج اچھے نہیں نکلیں گے۔

نیرد چودھری کی بات چاہے کتنی کڑوی ہو، چاہے اسے لوگ پاگل کہیں، جیسا کہ ہندوستان کے اخبارات کہہ رہے ہیں، مگر ہے یہ حقیقت پسندانہ بات۔ یہی بات گوپال اچاری آنجہانی آزاد ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل بھی کہتے رہے ہیں۔

بہرحال حکومت اور فرقہ پرست عوام کو قدرت خداوندی پر یقین ہو یا نہ ہو ہمیں پورا یقین ہے کہ ؎

ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں ؎ ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں

اس صورتحال میں مسلمانوں سے ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ جو قوم اتنے زبردست خطرات میں گھری ہوئی ہو بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ جسکے ہر طرف بارود کی سرنگیں بچھی ہوئی ہوں، ان کو ان خطرات کا نہ صرف احساس ہونا چاہیئے بلکہ ان کو اپنا ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا چاہیئے، اور ان کو ایسے اعمال و اخلاق سے باز آجانا چاہیئے جس سے خدا تعالیٰ کا غضب بھڑکتا ہے اور افراد اور قومیں اسکی نصرت اور مدد سے محروم ہو جاتی ہیں، جس وقت نادر بادشاہ نے دہلی پر حملہ کیا اور کشتے کے پشتے لگ گئے، اس وقت کے مشہور عارف باللہ حضرت مرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ

"شامت اعمال ما صورت نادر گرفت"

انہوں نے ایسا اس لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ظلم سے بری اور سراپا عدل ہی عدل ہے، تو جب کبھی ایسی صورت پیش آئے تو ہم کو سب سے پہلے اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہیئے، اور اس کا احتساب کر کے اپنی غلطیوں کی اصلاح کرنی چاہیئے، خود قرآن پاک میں لکھا ہے۔

مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ ‌ ‌ ‌ اگر کوئی اچھائی پہنچتی ہے تو اسے اللہ تعالیٰ

اللّٰہِ وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَیِّئَۃٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ کا عطیہ سمجھنا چاہئے اور اگر کوئی تکلیف یا مصیبت آپہونچے تو اسے اپنے اعمال کا نتیجہ سمجھنا چاہئے

پھر اس کے لئے پورے طور پر مادی تدبیریں اختیار کرنی چاہئے، اور اسی کے ساتھ پورے الحاح وزاری کے ساتھ آسام اور ہمارے ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے لئے اس اعتراف کے ساتھ دعا کرتے رہنا چاہئے:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ۝

جب ہم پر ظلم ہو رہا ہو اور ہم دشمنوں کے سامنے کمزور دکھائی دیں تو اس کے لئے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا سکھائی ہے: اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَجْعَلُكَ فِیْ نُحُوْرِھِمْ وَنَعُوْذُبِكَ مِنْ شُرُوْرِھِمْ۔

(۱) ذہانت کبھی محنت کا بدل نہیں بن سکتی، جو لوگ محنت ولگن کے عادی بنتے ہیں وہ زندگی میں کامیاب رہتے ہیں، اور جو لوگ محض ذہانت اور چالاکی کے بل پر آگے بڑھتے ہیں، ان کی زندگی بلبلے کے مانند ہوتی ہے۔

(۲) کسی فرض کی ادائیگی اور کسی کام کی ذمہ داری بھی ایک امانت ہے، اس میں کوتاہی سب سے بڑی خیانت ہے۔

(۳) صفائی اور ستھرائی کے ساتھ کھانے پینے اور لباس میں سادگی اور قناعت پسندی سے آدمی کو ذہنی سکون اور قلبی راحت ملتی ہے، اور ٹیپ ٹاپ سے آدمی میں دکھاوا اور غرور پیدا ہوتا ہے، اور لوگوں کی نگاہوں سے آدمی گر جاتا ہے۔

(۴) کسی کے ساتھ نیکی اور احسان کرکے بھول جانا چاہئے، نیکی اور احسان کا بھول جانا شرافت وبلندی کی بات ہے، اور اس کے یاد رکھنے میں احسان کے بدلہ کی توقع ہوتی ہے، اور توقع پوری نہیں ہوتی تو آدمی کڑھتا ہے اور یہ چیز نیکی اور احسان کے ثواب اور فائدہ کو ختم کر دیتی ہے۔ "نیکی کر دریا میں ڈال" کا یہی مفہوم ہے۔

(۵) اپنی غلطی کا اعتراف کرلینا بڑائی کی بات ہے، غلطی کے اعتراف سے آدمی کی عزت بڑھتی ہے اور ہٹ دھرمی سے عزت گھٹتی ہے۔

تواضع

(مجیب اللہ ندوی)

اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں تواضع اور خاکساری ایک بنیادی تعلیم ہے، جب تک افراد میں یہ صفت نہ پیدا ہو جائے، اس وقت تک کسی صالح معاشرہ کا وجود میں آنا ناممکن ہے، اس مضمون میں اسی کی تشریح کی گئی ہے، لیکن تواضع کی تشریح سے پہلے چند تمہیدی باتیں بیان کردینی ضروری ہیں۔

اسلام کے نزدیک کبر و غرور ایک مذموم صفت ہے، اس لئے جس مسلمان کے اندر یہ عیب پایا جائے گا وہ نہ صرف سزاوار ملامت اور قابل مذمت قرار پائے گا، بلکہ مستحق جہنم ٹھہرے گا، قرآن پاک میں ہے

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

الا اخبرکم باھل النار کل عتل جواظ متکبر — میں تم کو آگاہ کرتا ہوں کہ ہر متکبر، حد سے گذرنے والا اور مغرور آدمی دوزخی ہے۔

صحابہ نے دریافت فرمایا کہ یا رسول اللہ! ایک شخص اچھا کپڑا، عمدہ جوتا اور اچھی چیز پسند کرتا ہے کیا یہ بھی کبر و غرور اور بڑائی جتانے میں شامل ہے، آپ نے فرمایا کہ یہ کبر و غرور نہیں ہے، بلکہ کبر و غرور یہ ہے کہ حق بات اس کے سامنے آئے تو اسے ٹھکرا دے اور دوسرے لوگوں کو اپنے سے ذلیل سمجھے۔ بطر الحق وغمط الناس۔

کبر و غرور کے مقابلہ میں دنائت و پستی ہے جو اسی کی متضاد صفت ہے، اور کبر و غرور کی طرح یہ بھی ایک مذموم چیز ہے، جس طرح کسی مسلم کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ متکبر اور مغرور ہو کر اپنی بڑائی جتائے اور دوسروں کو اپنے سے ذلیل اور پست سمجھے، اسی طرح یہ بات بھی ایک مسلمان کے مرتبہ سے گری

ہوئی ہے کہ وہ اپنے اغراض اور مقاصد کے حصول کے لیے اپنی خودداری روش کو چھوڑ کر خوشامد، چاپلوسی، دنائت و پستی سے کام لے کر اپنے کو ذلیل و خوار کرے، چنانچہ حدیث میں یہ صفتیں منافق اور فاسق و فاجر کی بیان کی گئی ہیں اس لئے کہ یہ حصول اغراض کے لئے ذلیل سے ذلیل اور پست سے پست طریقہ کے اختیار کرنے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے، اور نہ اس میں ان کو کوئی ندامت اور شرمندگی ہوتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

والفاجر خب لئیم	فاجر دغاباز، کینہ اور دنی ہوتا ہے

ایک ضعیف حدیث میں ہے:

لیس من اخلاق المومن التملق	چاپلوسی مومن کے اخلاق کے منافی ہے

دوسری حدیث میں ہے:

المومن کالجمل الذلول والمنافق والفاسق ذلیل	مومن سدھائے ہوئے اونٹ کی طرح ہوتا ہے اور منافق اور فاسق ذلیل ہوتا ہے۔

اعتدال کی راہ تواضع ہے تکبر اور غرور میں افراط ہے اور دنائت و پستی میں تفریط ہے، اسلام چونکہ زندگی کے تمام شعبوں میں افراط اور تفریط سے بچنا چاہتا ہے، اس لئے اس نے یہاں بھی ان دونوں کے درمیان ایک معتدل اور توسط کی راہ اختیار کی ہے، اور وہ تواضع اور خاکساری کی راہ ہے۔

اسلام نے یہ درمیانی راہ اس لئے اختیار کی، کہ جب انسان افراط یعنی کبر و غرور کی راہ اختیار کرتا ہے، تو وہ لامحالہ دوسرے انسانوں پر ظلم و تعدی کرے گا ان کے حقوق کو پامال کرے گا، اور اپنے تفوق و ترفع کے لئے دوسروں کو ذلیل و خوار کرنے میں اسے دریغ نہیں ہوگا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عام انسانوں کی صلاحیتیں پروان چڑھنے کے بجائے ٹھٹھر کر رہ جائیں گی، اور محبت و مساوات کے تمام رشتے یکسر کٹ جائیں گے، اسی لئے اللہ تعالےٰ نے قوت و اقتدار کے وہ تمام طریقے جن کے ذریعہ ایک انسان دوسرے انسان کو اپنا غلام بنا کر اس پر ظلم و زیادتی کر سکتا ہے، اسے بند کر دیا ہے۔ اور اس قسم کے تمام اختیارات اس نے اپنے لئے مخصوص کر لیئے ہیں۔ چنانچہ کبریائی اس نے خاص اپنی صفت قرار دی ہے، جس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

اب کسی بندہ کو یہ مجاز نہیں کہ وہ کبریائی کرے، اور بڑائی جتائے، اگر وہ ایسا کرتا ہے، تو گویا وہ خدا

کی ہمسری اور اس سے بغاوت کرتا ہے، اور ظاہر ہے کہ اس سے ہمسری اور بغاوت کرنے والے کا ٹھکانا جہنم ہے۔
قرآن نے صاف الفاظ میں اعلان کر دیا ہے کہ

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	اسی کے لئے بڑائی ہے آسمانوں اور زمینوں میں

اور جو لوگ کبر کرتے ہیں، ان کے لئے فرمایا کہ

اَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ	کیا تکبر کرنے والوں کا ٹھکانا جہنم نہیں ہے؟

حدیث میں ہے کہ

الکبریاء ردائی فمن نازعنی	کبریائی میری چادر ہے، جو شخص اس کے لینے
فقد عذبتہ (مسلم شریف)	کے لئے جھگڑے گا، میں اس کو عذاب دوں گا

اسی طرح اسلام نے تفریط یعنی دنائت وپستی سے بھی روکا ہے، اس لئے کہ اس مذموم صفت کے معنی یہ ہیں کہ اسلام انسان کو اخلاق وعمل کے جس بلند مرتبہ پر لیجانا چاہتا ہے، اس سے وہ گر جائے، اور ذلیل اغراض اور پست مقاصد میں پھنس کر اپنے لاہوتی مقصد کو بھول جائے۔

ظاہر ہے کہ اس کے بعد اس کی حیثیت چوپایوں اور کیڑے مکوڑوں سے زیادہ نہیں رہ جاتی، جو ہر جگہ ذلیل وخوار ہو کر روندے جاتے ہیں، اور اسلام کسی انسان اور خاص طور سے کسی مسلم کے لئے یہ بات پسند نہیں کرسکتا کہ وہ ذلیل وخوار ہو، اسی لئے جہاں خاکسارانہ روش سے انسان کا ضعف اور پستی ظاہر ہو، وہاں اسلام نے عارضی اور نمائشی طور پر خودداری اور کبر وغرور کا حکم دیا ہے۔ ۷ھ میں صحابہ جب ادائے عمرہ کے لئے آئے، تو چونکہ مدینہ کے وبائی بخار نے ان کو کمزور کر دیا تھا، اس لئے کفار نے طنز کیا کہ محمد اور انکے ساتھی ضعف کی وجہ سے خانۂ کعبہ کا طواف نہیں کر پارہے ہیں، اس پر آپ نے صحابہ کو حکم دیا کہ طواف تین چکر اکڑ کر کریں، تاکہ مشرکین پر ان کی طاقت کا اظہار ہو[۱] عربی زبان میں اسی کو رمل کہتے ہیں، چنانچہ آج تک یہ سنت باقی ہے۔

اسی طرح جہاد میں بھی قوت کے اظہار کا موقع ہوتا ہے، اس لئے وہاں بھی اسلام نے خاکساری کے بجائے کبر وغرور کو پسند کیا ہے، حدیث میں ہے کہ جنگ کے موقع پر اترانا خدا کو پسند ہے[۲] لیکن یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ اجازت صرف عارضی اور محض عزت نفس کے بچاؤ کیلئے ہے، کوئی مستقل قانون نہیں ہے

---

[۱] سیرۃ النبیؐ ج ۲ ص ۱۸۶ [۲] ابوداؤد باب الجہاد

اس تمہید کے بعد اب ہم تواضع کی تشریح کرتے ہیں۔

تواضع کی لغوی تشریح | تواضع وضع اور ضعت سے مشتق ہے، جس کے معنی گرنے اور پست ہونے یا کسی کو پست کرنے کے ہیں۔ اسی لئے پست اور ذلیل آدمی کو وضیع کہتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان تمام معانی سے ایک مذموم صفت کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ لیکن تواضع کے تقاضا میں یہ مفہوم یا تو بدل جاتا ہے، یا پھر ایک محمود صفت بن جاتا ہے۔
تواضع کے لفظی معنی ہیں تذلل یعنی عاجزی اور انکساری کا اظہار کرنا۔ اسی لئے عرب زمین کے اس حصہ کے لئے جو اپنے قریب کے حصہ سے نیچا ہو "تواضعت الارض" استعمال کرتے ہیں اسی سے "تواضع القوم" نکلا ہے جس کے معنی ہیں قوم کا کسی ایک بات پر متفق ہو جانا، دور سے کسی آبادی کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین سے بالکل لگی ہوئی ہے۔ عرب اس کیفیت کا اظہار "ان بلدکم لتواضع" سے کرتے ہیں اسی سے "تواضع بینہما" نکلا ہے جس کے معنی ہیں آپس میں جو رنجش اور خلش کی بات تھی وہ دور ہو گئی۔ (لسان)

تواضع کا شرعی مفہوم | تواضع کا جو شرعی مفہوم ہے۔ اس میں یہ تمام لغوی معانی موجود ہیں، یعنی ایک بندہ (عبد) کی بندگی اور عبدیت کا تقاضا ہے کہ وہ خدا کے احکام کے آگے اپنے سرنیاز کو بالکل جھکا دے، اپنی کسی علمی یا عملی خوبی سے اپنے کو دوسروں سے بلند نہ سمجھے اور نہ دوسروں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے۔
جس بات کو حق سمجھ لے اس کی ہمیشہ موافقت کرے۔ دوسروں کے ساتھ انکساری سے پیش آئے، ظاہری طور پر اس کی کوئی حیثیت نہ معلوم ہو لیکن جب اس سے معاملہ پڑے تو وہ معاشرہ کے لئے خوشی و مسرت کا سبب بن جائے۔ اس کے دل میں کسی سے رنج و حسد اور کینہ و بغض نہ ہو۔ جب یہ صفات اس کے اندر پیدا ہو جائیں گے تو خدائے قدوس اس کی اس اختیاری پستی اور گراوٹ کو بلندی و رفعت اور عزت و محبت سے بدل دے گا۔ حدیث میں اسی مفہوم کو اس طرح ادا کیا گیا ہے۔

من تواضع للہ رفعہ اللہ | جو اللہ کے لئے انکساری اختیار کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو بلند کر دے گا۔

اب ہم قرآن و حدیث، آثار صحابہ و تابعین اور صوفیہ کے اقوال کی روشنی میں اس کی مزید توضیح کرتے ہیں۔

قرآن | قرآن نے تواضع کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے بلکہ اس نے تواضع کی تعلیم اس کے مظاہر و مواقع کے ذریعہ دی ہے، زندگی کے تمام مسائل میں قرآن کا مطمح نظر یہ ہے کہ انسان ہر وقت اور ہر آن خدا کا

بندہ اور اس کا عبد ہے، اس لئے اس کا ہر کام دائرۂ عبدیت کے اندر ہونا چاہئے۔ اس کو کسی لمحہ یہ مجاز نہیں ہے کہ وہ اپنے کو اس دائرہ سے خارج سمجھے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد اس کو ان تمام طریقوں اور راستوں کو چھوڑنا پڑے گا جو عبدیت کے تقاضوں اور اس کے مظاہر کے خلاف ہیں۔

تواضع کی تعلیم بھی قرآن نے اسی مقصد کی تکمیل کے لئے دی ہے۔ کہ ایک بندہ، بندہ ہوتے ہوئے اپنی پوری زندگی اور خاص طور سے معاشرتی زندگی میں کوئی ایسی روش اختیار کرے جو ایک صالح معاشرے کے مزاج کے خلاف یا اس میں کدورت پیدا کرنے کا سبب ہو بلکہ اسے وہی روش اختیار کرنی چاہئے، جس سے معاشرے میں زیادہ خوشگواری اور لطف و محبت پیدا ہو سکے، چنانچہ قرآن نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو زمین پر اکڑ کر چلتے ہیں، اس لئے کہ ان کی یہ روش منشائے عبادیت اور ایک صالح معاشرہ کے مزاج کے خلاف ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ فروتنی سے چلتے پھرتے ہیں، ان کی توصیف کی ہے

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا	اللہ کے بندے وہ لوگ ہیں جو زمین پر فروتنی سے چلتے پھرتے ہیں۔

حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو جو نصیحت فرمائی تھی اس میں بھی تواضع کے متعدد مظاہر کا ذکر ہے۔ آپ نے فرمایا:

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِى الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ وَاقْصِدْ فِىْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ (لقمان)	اور لوگوں سے اپنا رخ مت پھیرو اور زمین پر اترا کر مت چلنا، بے شک اللہ تعالیٰ تکبر اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا اور اپنی رفتار میں میانہ روی اختیار کرنا اور اپنی آواز کو پست رکھنا

سورۂ بنی اسرائیل میں کبھی مسلمانوں کو اور کبھی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے جو اخلاقی تعلیمات دی گئی ہیں، ان میں بھی ہے کہ "زمین پر اترا کر مت چلو" اس لئے کہ یہ ایک بری عادت اور غرور کی علامت ہے۔

ان آیات میں تواضع اور خاکساری کے مختلف مظاہر بتائے گئے ہیں۔ بات کرنے میں بے رخی نہ کی جائے۔ زمین پر اکڑ اکڑ کر نہ چلا جائے، چال ڈھال میں غرور کا شائبہ نہ ہو، اور نہ آواز میں غرور کے مارے سختی اور کرختگی ہو۔

قرآن نے ایک دوسری جگہ بڑے لطیف انداز سے تواضع کی تعلیم دی ہے۔

وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ (حجر)	اور اپنا بازو مومنوں کے لئے جھکا دے۔

دوسری جگہ سورہ شعرا میں ہے کہ:

وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝	جو لوگ مسلمان ہیں ان سے نرمی اور فروتنی سے پیش آئے۔

خفض جناح یعنی بازو کا جھکا دینا تواضع اور خاکساری سے استعارہ ہے، جناح پرندہ کے بازو کو کہتے ہیں۔ پرندہ جب زمین پر اترنے لگتا ہے یا تھک کر بیٹھنا چاہتا ہے، تو اپنے بازوؤں کو جھکا دیتا ہے اس لئے یہ استعارہ کیا گیا ہے۔ کہ انسان کو بھی خاکساری اور فروتنی سے اپنے بازوؤں کو نیچے کر لینا، اور تکبر اور ترفع کی چوٹی پر جانے کے بجائے تواضع کی پستی کی طرف اترنا چاہیئے۔

امام ابن قیم نے تواضع کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس آیت میں

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ (سورہ مائدہ)	اے ایمان والو! جو بھی تم میں سے اپنے دین سے پھرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ عنقریب ایک ایسی قوم کو لائے گا جن سے وہ محبت کرتا، اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں، وہ نرم دل ہیں، مومنوں پر، اور زبردست ہیں کافروں پر۔

اللہ تعالیٰ نے "اذلۃ علی المؤمنین" میں علی کا حرف استعمال کیا ہے، جس سے اس طرف اشارہ ہے کہ مومنین کے مقابلہ میں فروتنی، نرم خو اور فرمانبردار رہنا، ان کی خاص صفت ہے[1] ظاہر ہے کہ تواضع کی تعلیم کا بھی اصل مقصد یہی ہے کہ معاشرہ کے تمام افراد کے اندر فروتنی، نرمی اور انقیاد کی صفت پیدا ہو جائے تاکہ معاشرتی زندگی زیادہ سے زیادہ خوشگوار اور پر لطف ہو سکے، قرآن پاک نے تواضع کے مظاہر کا ذکر کیا ہے۔ اس میں یہ بھی شامل ہے کہ نشست و برخاست میں ترفع کے بجائے فروتنی ہو، بات چیت میں اس کی آواز کرخت نہ ہو۔ اپنی زبان یا طرز عمل سے اپنی بڑائی کا اظہار نہ کرتا ہو۔ اسی طرح قرآن نے اور بہت سی چیزوں کی تعلیم دی ہے جس سے تواضع اور خاکساری پیدا ہو، اور بہت سے ایسے کاموں

---

[1] مدارج السالکین ج ۲ ص ۱۸۸۔

اگلے انبیاء اور تواضع امام غزالیؒ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ "میں اس کی نماز قبول کرتا ہوں جو میری عظمت کے سامنے متواضع اور فروتن ہو، اور میری مخلوق پر اپنی عظمت کا اظہار نہ کرتا ہو[1]۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ تواضع کرنے والوں کے لئے دنیا میں خوشخبری ہے، کہ وہ قیامت کے دن صاحب منبر ہوں گے[2] یعنی قیامت میں ان کا مرتبہ بلند ہوگا۔

حدیث نبوی میں تواضع کی تعلیم اوپر ذکر آچکا ہے کہ تواضع دنائت و پستی سے مختلف چیز ہے، دنائت سے انسان کے اندر گراوٹ پیدا ہوتی ہے، لیکن تواضع سے اس میں بلندی و رفعت پیدا ہوتی ہے، حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے بلند کر دیتا ہے۔

دوسری حدیث میں ہے کہ تواضع سے بندے میں رفعت ہی پیدا ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ

تواضعوا وجالسوا المساکین تکونوا من کبراء اللہ وتخرجوا من الکبر[3]	تواضع اختیار کرو، اور غرباء کے ساتھ اٹھو بیٹھو تو اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑوں میں ہو جاؤ گے (اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا) کہ کبر کے عیب سے پاک ہو جاؤ گے۔

اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ غرباء و مساکین جنھیں سوسائٹی میں حقیر و ذلیل سمجھا جاتا ہے، انکے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بھی تواضع میں داخل ہے، اس کا فائدہ یہ ہے کہ تم کبر و غرور جیسے مہلک عیب سے پاک ہو جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں جو لوگ بلند مرتبہ پائیں گے، ان میں تم بھی ہوگے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے۔

ان اللہ اوحیٰ الی ان تواضعوا حتی لا یفخر احد علی احد ولا یبغی احد علی احد[4]	اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی کی ہے کہ تواضع اور انکساری اختیار کرو تاکہ کوئی کسی پر ظلم یا فخر نہ کر سکے۔

---

[1] احیاء العلوم ج ۳ ص ۲۴۹ [2] ایضاً [3] حلیۃ الاولیاء بحوالہ جامع صغیر ج ا ص ۲۵۵۔ [4] مسلم شریف بحوالہ مدارج السالکین۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ظلم و زیادتی اور فخر و مباہات کا طریقہ تواضع اور انکساری کے خلاف ہے اس لئے کہ اس طریقہ سے ایک انسان کو دوسرے انسان کے حقوق کی پامالی اور اس کو حقیر و ذلیل کرنے کا موقع ملتا ہے، اور تواضع میں کسی حال میں انسان کو اس قسم کا کوئی موقع نہیں ملتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث سے ان مذکورہ بالا باتوں کی اور زیادہ وضاحت ہو جاتی ہے۔ وہ حدیث یہ ہے۔

علیکم بالتواضع فان التواضع	تواضع کو اپنے اوپر لازم کرلو اور تواضع کی اصلی
فی القلب ولا یوذین مسلم مسلما	جگہ قلب میں ہے (اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ) کوئی
فلوب متضاعفه فی اطمار لو اقسم	مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف نہ دے،
علی الله لا بره	اس لئے کہ پھٹے پرانے کپڑوں میں رہنے والے
(طبری بحوالہ جامع صغیر)	ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وہ اللہ کے اوپر (بھروسہ کرکے) قسم کھالیں تو اللہ ان کی قسم کو پورا کریگا

اس حدیث میں تین باتیں مذکور ہیں۔ (۱) تواضع کا تعلق قلب سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف ظاہری طور سے انکساری کا اظہار کافی نہیں ہے، بلکہ ضروری ہے کہ قلب میں یہ کیفیت جاگزیں ہو اس لئے کہ اگر قلب میں تواضع کی یہ کیفیت پورے طور پر نہ اتری ہوئی ہوگی، تو اس میں اخلاص نہ ہوگا اور بغیر اخلاص کے کوئی عمل قبول نہیں۔

(۲) اگر واقعی یہ کیفیت دل میں اتر گئی تو اس کا مظاہرہ یہ ہے کہ اس سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

(۳) بہت سے پھٹے حال لوگ اللہ کے یہاں بلند مرتبہ رکھتے ہیں، اس لئے سوسائٹی کے معمولی سے معمولی آدمی کو بھی حقیر نہ سمجھنا چاہئے۔ اور نہ اس کے ساتھ کوئی برا سلوک کرنا چاہئے، کیونکہ گو تواضع کا تعلق قلب سے ہے، لیکن دل کا حال اللہ تعالٰی کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں، اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس کی ظاہری بدحالی تواضع اور انکساری کی وجہ سے ہو اور اس کے قلب میں بھی یہ کیفیت پیدا ہو، اس لئے یہ تحقیر خدا کی ناراضگی کا سبب ہوگی۔

خلاصہ یہ ہے کہ تواضع اور انکساری کا تقاضا ہے کہ معاشرہ کے تمام افراد کے ساتھ مساویانہ اور برادرانہ سلوک روا رکھا جائے، اور دوسروں کی ظاہری پستی اور بدحالی سے کوئی غلط فائدہ اٹھانے کیلئے اپنے اسلامی معیار اور معاشرتی تقاضوں کو نہ چھوڑ دیا جائے۔

اسوۂ نبوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، اس کی تفسیر آپ کی عملی زندگی میں دیکھی جا سکتی ہے۔

امام ابن قیم نے تواضع کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع ہی تھی کہ وہ اپنے ہاتھ سے اپنا کام کرتے تھے، اپنے کپڑے سیتے، اپنے جوتے گانٹھ لیتے تھے، اپنی بکریاں خود ہی دوہ لیتے تھے، راستہ میں بچوں تک کو خود سلام کرتے تھے، گھر والوں کی ضروریات خود پوری کرتے تھے، معمولی معمولی بات کے لئے بھی کوئی بلاتا تو بلا تامل اس کی بات سن لیتے، اور اس کا جواب دیتے تھے۔ اپنے خادموں کے ساتھ کھانا کھاتے تھے، اور غربا کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے، کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہیں دیتے تھے، کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا، ہر شخص سے خندہ پیشانی اور نرم خوئی سے ملتے۔ آپ کی معاشرتی زندگی سے اور بہت سی مثالیں پیش فرمانے کے بعد فرماتے ہیں:

کان متواضعًا من غیر ذلۃ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متواضع تھے مگر آپ کی یہ تواضع کسی ذلت و پستی یا احساس کمتری کی وجہ سے نہیں تھی۔

دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی تواضع و انکساری بھی باوقار تھی، ایسا نہیں تھا کہ دل میں کسی قسم کی گراوٹ پیدا ہو جائے، بہرحال تواضع و انکساری گراوٹ یا کسی جذبۂ کمتری کی وجہ سے نہ ہونی چاہیے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ارشاد فرمایا ہے:

طوبی لمن تواضع فی غیر منقصۃ وذل فی نفسہ (طبرانی وغیرہ)	خوشخبری ہو اس کے لئے جس نے بغیر کسی اخلاقی نقص اور بغیر کسی احساس کمتری کے تواضع و انکساری اختیار کی۔

مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ اپنی ذاتی کمزوری اور کمتری کی وجہ سے تواضع اختیار کرتے ہیں، ان کی کوئی تعریف نہیں ہے، بلکہ قابل ستائش وہ لوگ ہیں جو اپنی ذاتی محاسن اور اخلاقی خوبیوں کے باوجود اختیاری طور پر اپنے اندر یہ صفت پیدا کرتے ہیں۔

صحابہ کرام اور تواضع | قرآن و حدیث اور اسوۂ نبوی کے تذکرے کے بعد ضروری ہے کہ صحابہ کرام کے آثار

اُن کی معاشرتی زندگی سے بھی تواضع کی توضیح و تشریح کی جائے۔ اس لئے کہ اسلام جس طرح کا مثالی اور صالح معاشرہ بنانا چاہتا ہے، اس کی صحیح نمایندگی صحابہ کرام ہی کرتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، کہ جب بندہ تواضع کرتا ہے تو اللہ تعالٰی اس کی عقل و بصیرت میں اضافہ کر دیتا ہے، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ فرماتے ہیں کہ جو شخص خدا کے لئے انکساری کرتا ہے، خدائے تعالٰی قیامت کے دن اس کا درجہ بلند کر دے گا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، کہ لوگ ایک بہت افضل عبادت سے غفلت برتتے ہیں، وہ عبادت تواضع ہے۔ (احیاء العلوم ج ۳ ص ۳۴۳)

عروہ بن زبیر رضی اللہ فرماتے ہیں، میں نے حضرت عمر کو ایک بار دیکھا کہ وہ پانی کا مشکیزہ اپنے کندھے پر رکھے ہوئے جا رہے ہیں، میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ امیر المومنین ہیں، آپ کے لئے یہ زیبا نہیں ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "جب میرے پاس وفود اطاعت و فرماں برداری کی خبریں لے کر آتے ہیں، تو اس کی وجہ سے میرے نفس میں ایک قسم کی نخوت پیدا ہو جاتی ہے، تو میں نے چاہا کہ اس طرح سے نفس کے کبر کو توڑ دوں" ظاہر ہے کہ تواضع کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ نفس میں کبر و نخوت نہ رہنے پائے۔

ایک بار حضرت عمرؓ نے صحابہ کے درمیان کچھ کپڑے تقسیم کئے، ان میں سے ایک قیمتی جوڑا حضرت معاذؓ کے پاس بھی بھجوا دیا، حضرت معاذ نے اسے فروخت کر کے کچھ غلام خریدے، اور انہیں آزاد کر دیا، حضرت عمر کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے ایک دوسرا جوڑا ان کے پاس بھجوایا، حضرت معاذؓ کو یہ بات ناپسند ہوئی، اور انھوں نے حضرت عمر پر خفگی کا اظہار کیا، حضرت عمر نے ان سے فرمایا کہ چونکہ آپ نے پہلا جوڑا فروخت کر دیا تھا، اس لئے میں نے دوسرا بھجوادیا، حضرت معاذ نے فرمایا، جب آپ میرا حصہ دے چکے تھے، تو آپ پر کیا ذمہ داری تھی، اس کے بعد انہوں نے بڑے سخت لہجہ میں فرمایا کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ میں اسکو آپ کے سر پر پٹک دوں، حضرت عمرؓ نے نہایت ہی انکساری سے فرمایا کہ میرا سر حاضر ہے۔ (مدارج السالکین ج ۲ ص ۱۹۵)

ایک بار حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہا گھوڑے پر سوار ہوئے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بڑھے کہ رکاب تھام لیں، حضرت زیدؓ نے منع کیا، حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ نے فرمایا، ہمیں اپنے بڑوں کے ساتھ ایسا ہی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت زید نے ان سے کہا کہ اپنا ہاتھ لاؤ، انہوں نے ہاتھ بڑھایا تو حضرت زید نے ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اور فرمایا کہ ہم کو اہل بیت کے ساتھ ایسا ہی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

ایک بار حضرت ابوذر رضی نے حضرت بلال رض کو سیاہ فام کہدیا، حضرت بلال تو کچھ نہیں بولے، لیکن بعد میں حضرت ابوذر رض کو ندامت ہوئی، اور انہوں نے اپنے کو حضرت بلال رض کے سامنے ڈال دیا اور قسم کھائی کہ جب تک بلال میرے چہرے پر پاؤں نہ رکھ دیں گے، میں اپنا چہرہ نہ اٹھاؤں گا۔[1]

حضرت ابوبکر رض نے فرمایا کہ شرافت اور بلندی تواضع میں ہے۔

یہ تمام واقعات امام ابن قیم اور امام غزالی نے تواضع کی تشریح کرتے ہوئے لکھے ہیں۔

صوفیائے کرام اور تواضع اوپر لکھا جا چکا ہے، کہ تواضع کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر خدا کی فرمان برداری اور اس کی رضا جوئی کی ایسی تڑپ پیدا ہو جائے کہ وہ زندگی کے تمام کاموں میں اور خصوصیت سے اپنی معاشرتی زندگی میں کوئی ایسی روش نہ اختیار کرے جو اس کی عبدیت کے منشا کے منافی ہو، پھر یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ تواضع افراط و تفریط کے درمیان کی راہ ہے، اس لئے اس راہ پر چلنے کے لئے بہت احتیاط کی ضرورت ہے، اگر وہ افراط کی طرف بڑھا تو گویا اس نے اللہ سے بغاوت کی اور اگر تفریط اختیار کی تو اس نے اپنے کو ذلیل و خوار کیا۔

صوفیائے کرام نے بھی بڑی وضاحت کے ساتھ تواضع کی یہ وسیع تشریح کی ہے۔ فضیل بن عیاض سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا، تو انہوں نے فرمایا کہ حق کے لئے مطیع و فرمانبردار ہو جائے، ابن عطار نے فرمایا: تواضع یہ ہے کہ حق جس سے بھی معلوم ہو جائے اسے قبول کر لیا جائے۔

یوسف بن اسباط نے فرمایا: تھوڑی تواضع بہت سی کوششوں کے برابر ہے۔ ایک بار ابن مبارک نے ہارون رشید سے کہا کہ امیر المومنین تواضع اس مرتبۂ خلافت سے زیادہ بلند ہے۔

حسن بصری فرماتے ہیں، تواضع یہ ہے کہ جب تم اپنے گھر سے نکلو تو جس مسلمان سے بھی ملو اس کو اپنے سے افضل سمجھو۔ زیاد نمری کا قول ہے کہ غیر متواضع زاہد اس درخت کے مانند ہے جس میں پھل نہیں آتا۔

حضرت شبلی رح فرماتے ہیں، کہ تواضع یہ ہے کہ انسان اپنے کی قیمت نہ سمجھے، عروہ ابن الورد نے فرمایا کہ تواضع شرف و بزرگی کی شکارگاہ ہے، ہر نعمت پر حسد کیا جا سکتا ہے، لیکن تواضع ایسی نعمت ہے کہ اس پر حسد نہیں کیا جا سکتا۔

عبداللہ بن مبارک نے فرمایا ہے کہ اصل تواضع یہ ہے کہ جو لوگ تم سے کم درجہ کے ہیں ان کے سامنے

---

[1] مدارج السالکین ج ۲ ص ۱۹۵۔

اپنے کو اس طرح گرا دو کہ وہ یہ سمجھیں کہ دنیا میں تم کو ان پر کوئی فضیلت نہیں ہے، اور جو لوگ تم سے اونچے درجے کے ہیں، ان کے سامنے اس طرح خوددار رہو کہ وہ یہ سمجھیں کہ دنیا میں ان کو تمہارے اوپر کوئی فضیلت نہیں ہے، یحییٰ بن خالد برمکی کا قول ہے کہ شریف آدمی جب زہد اختیار کرتا ہے، تو وہ متواضع اور منکسر ہو جاتا ہے، اور جب کمینہ آدمی زاہد ہوتا ہے تو وہ متکبر ہو جاتا ہے، حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو حسن و جمال یا مال و دولت کی نعمت دے اور وہ منکسر نہ ہو تو اس کے لئے یہ نعمت وبال ہے۔

شیخ اسماعیل ہروی نے منازل السائرین میں لکھا ہے کہ

التواضع ان یتواضع العبد لصولة الحق۔	تواضع یہ ہے کہ بندہ خدا کی صولت و کبریائی کے آگے جھک جائے۔

امام ابن القیم نے اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بندہ کو چاہئے کہ وہ خدا کی مرضی کے آگے اپنے کو اس طرح ڈال دے، اور اس کا ایسا فرماں بردار اور منقاد ہو جائے، جس طرح ایک غلام اپنے آقا کا فرماں بردار اور مطیع ہوتا ہے، جب ایک عبد میں اپنے معبود کے ساتھ یہ تعلق اور اس کی رضا کا یہ جذبہ پیدا ہو جائے گا، تب وہ تواضع کی صفت سے متصف ہو سکتا ہے۔

شیخ ہروی نے تواضع کے تین درجے قرار دیئے ہیں۔ پہلا درجہ "التواضع للدین" "تواضع للدین" یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ منقول ہے اس کی اطاعت اور فرماں برداری کو اپنا نصب العین بنا لیا جائے، اور جو چیز بھی اس سے ٹکراتی ہو اس کو چھوڑ دیا جائے۔ امام ابن قیم نے اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دنیا میں چار چیزوں کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے تعارض پیدا کیا گیا ہے، معقول، قیاس، ذوق اور سیاست۔

معقولات کا طریقہ فلاسفہ اور متکلمین نے اختیار کیا، کہ جب عقل و نقل کا مقابلہ آ گیا، تو یا تو انھوں نے عقل (جو ہر طرح سے ناقص ہے) کو نقل پر ترجیح دی، یا پھر نقل میں غلط قسم کی تاویلات کر کے اس کو عقل پر منطبق کرنے کی کوشش کی۔

دوسرا طریقہ یعنی قیاس، تو اس کو بعض فقہاء نے اختیار کیا کہ جب نص اور قیاس کا اجتماع ہوا تو انھوں نے قیاس کو نص کے مقابلہ میں ترجیح دی، اور نص میں موشگافی کی۔

تیسرا طریقہ ذوق و وجدان کا ہے، اسے اہل تصوف نے اختیار کیا ہے، اسکا مشاہدہ آج بھی

کیا جا سکتا ہے کہ ان کے سامنے شریعت کے صریح احکام رکھ دیجئے، لیکن وہ اپنے ذوق و وجدان اور ملفوظات شیخ کے مقابلہ میں اس کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔

چوتھا طریقہ اہل سیاست کا ہے کہ جہاں شریعت و سیاست کا مقابلہ آجاتا ہے، اہل سیاست شریعت کے احکام کو "سیاسی مصلحت" میں غدر بود کرنے کی کوشش کرتے ہیں (آج دنیا کے سارے مسلمان اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ ان کے دل و دماغ میں موجودہ مادی سیاست نے اس قدر جگہ پکڑ لی ہے کہ اگر ان کو اسلامی زندگی کی طرف بلایئے تو وہ فوراً جواب دیں گے کہ یہ زمانہ اسلامی نظام کا نہیں ہے، اس وقت تو مادی سیاست کا ہمیں مقابلہ کرنا ہے۔ اس لئے ہمیں اپنی زندگی کے بقا کے لئے اسی طرز کو اختیار کرنا ہے) اس تفصیل کے بعد امام ابن قیم لکھتے ہیں۔ ان تمام گروہوں کا شمار اہل کبر میں ہے، اس لئے کہ یہ خدا کے احکام کے مقابلہ میں ان مذکورہ بالا چیزوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ تو گویا اس کی کبریائی کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ تواضع للدین ان تمام قیود کے توڑ دینے کا نام ہے۔

تواضع کا دوسرا درجہ شیخ نے یہ قرار دیا ہے:

ان ترضی بما رضی الحق به لنفسه عبدا من المسلمین اخا وان لا ترد علی عدوك حقا وتقبل من المعتذر معاذیره

چونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو اپنا بندہ بنانا پسند کیا ہے اس لئے وہ تمام آپس میں بھائی بھائی ہوئے اس لئے ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ خود بھی تمام مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھے۔ یعنی ان سے بھائیوں جیسا برتاؤ کرے، اور اپنے دشمنوں کے حق کو بھی رد نہ کرے، یعنی اُن کا کوئی حق ہو تو اسے ادا کر دے، اور اگر ان میں سے کسی سے غلطی ہو جائے اور وہ معذرت کرے تو اس کی معذرت قبول کر لے۔

شیخ نے تیسرا درجہ یہ قرار دیا ہے کہ:

ان تتضع للحق فتنزل عن رأیك وعوائدك فی الخدمة

حق کے سامنے اپنے کو بالکل ڈال دے اور پھر اپنی رائے اور طبعی موانع سے [illegible]

ہو کر اس کی خدمت میں لگ جائے

امام ابن قیم اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں، کہ

التواضع بأن تخدم الحق سبحانه وتعبده بما أمرك الله على مقتضى أمره لا على ما تراه من رأيك ولا يكون الباعث لك داعي العادة وحاصله أنه لا يكون باعثه على العبودية مجرد رأي وموافقة هوى ومحبة ولا عادة بل الباعث مجرد الأمر والرأي والمحبة والهوى والعوائد منفذة تابعة لا أنها مطاعة باعثة

تواضع یہ ہے کہ عبدیت اور اس کی بندگی یہ سمجھ کر کرنا کہ اس کا حکم اور عبدیت کا تقاضا یہی ہے، نہ یہ کہ تمہاری رائے یا تمہاری عادت وطبیعت اس کا سبب ہو۔

حاصل یہ کہ اس کی عبودیت اور طاعت کا باعث صرف رائے، خواہش نفس اور محبت وعادت نہ ہو، بلکہ اس کا سبب محض امر خداوندی ہو،

رائے، محبت اور خواہش وعادات یہ سب اطاعت کے تابع ہیں نہ یہ کہ وہ اس کا سبب ہیں۔

اس تشریح کے بعد فرماتے ہیں کہ اس نکتہ سے اہل بصیرت ہی واقف ہو سکتے ہیں، امام غزالی نے احیاء العلوم میں بڑی تفصیل کے ساتھ تواضع کے متعلق لکھا ہے، آخر میں انھوں نے جو قیمتی باتیں لکھی ہیں اس کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے،

جاننا چاہئے کہ تمام اسلامی اخلاق کی طرح تواضع کے بھی دو طرف (کنارے) اور ایک وسط ہے، اس کا ایک طرف زیادتی (افراط) کی طرف جھکا ہوا ہے جس کا نام تکبر ہے۔ اور دوسرا نقصان (تفریط) کی طرف، اس کا نام ذلت وپستی اور دنائت او چاپلوسی ہے، چونکہ ہر کام میں اللہ تعالٰی عدل اور وسط کو پسند کرتا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ تواضع پسندیدہ چیز ہے، لیکن محمود تواضع وہی ہے جس میں زاوٹ، کھینگی نہ پیدا ہونے پائے۔

اپنے برابر کے لوگوں سے تواضع اس طرح کی جائے کہ ان کے جو حقوق ہیں، ان کو ادا کیا جائے، اسی طرح عام لوگوں کے ساتھ تواضع یہ ہے کہ ان سے خندہ پیشانی

[اور ان دونوں کے درمیان جو چیز ہے اس کا نام تواضع ہے،]

سے ملا جائے، ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جائے، اگر وہ کسی ضرورت
کے لئے بلائیں تو ان کی بات سن کر ان کی ضرورت پوری کرنے کی کوشش کی
جائے، اور ان کے علاوہ اور جو معاشرتی امور ہیں، ان میں ان کا لحاظ کیا
جائے۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ کسی وقت ان کو ذلیل، چھوٹا
اور اپنے کو ان سے بہتر و برتر نہ سمجھا جائے، پھر تواضع کا یہ بلند مرتبہ اس
وقت حاصل ہو سکتا ہے جب یہ تمام افعال بغیر کسی تکلف اور کوشش کے صادر
ہوں اور ان کے کرنے میں طبیعت پر کسی قسم کا بار نہ معلوم ہو۔ ورنہ اس میں
کسی کی رعایت اور ریا شامل ہو، اس لئے کہ اگر کسی کی قدر و منزلت کی
رعایت یا ریا کی وجہ سے تواضع کی جائے گی۔ تو اس میں تملق اور گراوٹ پیدا
ہو جائے گی، اور یہ چیز تفریط کی طرف لے جائے گی، اور ظاہر ہے کہ کسی مومن
کے لئے یہ بالکل زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنے کو ذلیل و خوار کرے، اگر کبھی
اس کی ذلت کا موقع آجائے۔ تو اسے چاہئے کہ وہ ایسے موقع پر اپنے کو بلند
رکھنے کی کوشش کرے،

آخر میں ہم حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ کا قول نقل کر کے اپنا مضمون ختم کرتے ہیں کہ انھوں نے
فرمایا ہے کہ ساری خرابی کا جڑ یہ ہے کہ ہر آدمی اپنے کو دوسرے سے بڑا اور بلند سمجھتا ہے، ظاہر ہے کہ
جب سب بڑے ہو جائیں گے تو ٹکراؤ لازمی ہے، اس کے بجائے اگر ہر شخص اپنے کو دوسرے سے کمتر اور
چھوٹا سمجھنے لگے تو سارے جھگڑے ختم ہو جائیں۔

بقیہ نوٹ صفحہ ۵۲ کا: کو بھی برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتے، وہ اپنے مخصوص ذوق ہی کو حق و ناحق کا
معیار بنائے بیٹھے ہیں۔ اسکی ایک جھلک ہمیں مؤتمر رشیدیہ کے اشتہار میں بھی نظر آئی۔ مذکورہ بالا مضمون
کا عنوان "وحدۃ امت" ہے، اس لئے میں اس کے ذمہ داروں سے معذرت کرتے ہوئے یہ عرض کروں گا
کہ اشتہار کے اندر مقاصد ثلاثہ کے پہلے اور تیسرے مقصد کے یہ جملے ذہن کو بہت کھٹکے ہیں۔ اول: دیوبندی
طبقات کی وحدت عمل " سوم" جماعتی مساجد کا تحفظ وبقا۔

شاہ عبدالرحیم صاحب دہلویؒ

(مجیب اللہ ندوی)

شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان ساتویں آٹھویں صدی ہجری میں ہندوستان آیا۔ اس خاندان میں علم و فضل وراثۃً چلا آرہا تھا۔ ان کے اجداد میں سب سے پہلے شیخ شمس الدین ہندوستان تشریف لائے۔ اور اس خانوادہ کے علم و فضل کی روشنی سب سے پہلے انہی کے ذریعہ ہندوستان میں پہنچی، ان کے اسی علم و فضل کی وجہ سے عہدۂ قضا و احتساب ان کے سپرد ہوگیا، اور پھر یہ سلسلہ کئی پشت تک چلتا رہا، شاہ عبدالرحیم صاحبؒ سے تین پشت پہلے عہدۂ قضا و احتساب کے بجائے شیخ محمود نے علم تصوف کے ساتھ فن سپہ گری اختیار کرلی، یہ سلسلہ شاہ صاحب کے والد شیخ وجیہ الدینؒ تک قائم رہا، مگر شاہ عبدالرحیم رح نے پھر خاندان کا رخ علم و فضل کیطرف پھیر دیا اور خود اپنی پوری زندگی علم دین ہی کی خدمت اور تزکیہ نفس میں گذار دی۔ اور پھر ان کے بعد ان کے صاحبزادے شاہ ولی اللہ اور پھر ان کے چاروں صاحبزادگان آسمان علم و فضل کے مہر و ماہ ہوکر ہندوستان کے افق پر اس طرح چمکے کہ پورا ہندوستان علم دین کی روشنی سے جگمگا اٹھا۔ اور قال اللہ و قال الرسول کی آواز گھر گھر پہنچ گئی اس وقت ہند و پاک میں تعلیم و تزکیہ کی جو شعاعیں نظر آتی ہیں، اگر کھوج لگایا جائے تو ان سب کا منبع فیض یہی خانوادہ نظر آئے گا۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں کے جس طبقہ نے اس منبع فیض سے فائدہ نہیں اٹھایا، یا اس سے گریزاں رہا، اس کے حصہ میں بدعت و جہالت ہی آئی۔

فتاوی عالمگیری کی ترتیب میں ہندوستان کے جن ممتاز علما نے حصہ لیا، ان میں ایک شاہ عبدالرحیم صاحب بھی ہیں۔ گویہ اپنے استغنا کی بنا پر عالمگیر جیسے دیندار بادشاہ سے بھی ملنے نہیں گئے

مگر بالواسطہ اس میں شریک ہے، جس کی تفصیل مارچ ۱۹۸۳ء کے پرچہ میں آچکی ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ پر بہت کچھ لکھا گیا، مگر شاید شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کے حالات اور علم و فضل پر اتنی تفصیل اس سے پہلے نہیں لکھا گیا۔ راقم الحروف نے اسی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں راقم الحروف کو جو تفصیلات مل سکی ہیں وہ پیش خدمت ہیں۔

نام و نسب شاہ عبدالرحیم صاحب ۱۰۵۴ھ میں دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ وجیہ الدین نے ان کا نام عبدالرحیم رکھا، لیکن خواص میں ابوالفیض[1] کے نام سے بھی مشہور رہیں۔

شاہ صاحب دادیہال کی جانب سے فاروقی اور نانہال کی طرف سے سید ہیں۔ جدی سلسلۂ نسب یہ ہے:

عبدالرحیم ابن الشہید وجیہ الدین ابن معظم بن منصور بن احمد بن محمود بن قوام الدین عرف قاضی قاسم بن قاضی کبیر عرف قاضی بدھ بن عبدالملک بن قطب الدین کمال الدین بن شمس الدین مفتی[2] بن شیر ملک[3] بن محمد عطا ملک بن ابوالفتح ملک بن فاروق بن جرجیس بن احمد بن محمد شہریار بن عثمان بن ہامان بن ہمایوں[4] بن قریش بن سلیمان بن عفان بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالے عنہم

مشہور ہے کہ نانہالی سلسلۂ نسب حضرت علیؓ تک منتہی ہوتا ہے۔ لیکن بہت تلاش و جستجو کے بعد بھی مکمل شجرہ نہ مل سکا، نامکمل شجرہ یہ ہے:

والدۂ شاہ عبدالرحیم صاحب بنت شیخ رفیع الدین محمد بن قطب عالم بن عبدالعزیز بن حسن بن طاہر[5] (انفاس العارفین ص ۱۹۸)

---

[1] بعض تذکرہ نویسوں نے ابوالفیض ان کی کنیت لکھی ہے، لیکن اس کی حقیقت شاہ ولی اللہ صاحب نے یہ لکھی ہے کہ میں نے اپنے بعض دوستوں سے سنا کہ عالم بالا میں حضرت کا نام ابوالفیاض ہے، چنانچہ میں نے والد صاحب سے اس کے متعلق دریافت کیا تو وہ مسکرائے اور فرمایا کہ ہم چنیں است و نام تو ابوالفیاض است (انفاس العارفین ص ۳)

[2] ان بزرگوں کے نام میں قاضی اور کہیں مفتی کی نسبت ان کے علم و فضل کو ظاہر کرتی ہے۔ [3] ملک کا لفظ کسی امتیازی شان کا شارح ہے، شاہ ولی اللہ صاحب خود لکھتے ہیں کہ ملک در زبان قدیم لفظ تعظیم است مثل خان در زمان ما۔ (انفاس العارفین ص ۱۷۸) [4] ہمایوں جرجیس وغیرہ سے عجمیت کا اظہار ہوتا ہے [illegible] ربانی الاصل

شاہ صاحب کی والدہ کے سلسلۂ نسب میں عام تذکرہ نویسوں نے غالباً ذیل کی روایت کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے انفاس العارفین میں لکھا ہے کہ ایک روز والد مکرم شاہ عبد الرحیم صاحبؒ اپنے ایک خواب کی تعبیر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

بحضرت عمر شجرہ ما می رسد و بحضرت علی از جہۃ امہات نسل داخل می شود

(انفاس العارفین ص۲۳۹)

لیکن از جہۃ امہاتؒ کی مزید تشریح کی ضرورت ہے۔

شاہ صاحبؒ کے اجداد کی ہندوستان میں آمد اور ان کے کارنامے

شاہ صاحب کے ننہالی خانوادہ کے متعلق تو غالباً کسی نے یہ نہیں لکھا ہے کہ وہ کب ہندوستان آیا، لیکن ددیہال کے متعلق شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ اس خانوادہ کے سب سے پہلے شخص جو ہندوستان آئے وہ شیخ شمس الدینؒ مفتی ہیں۔ وہ یہاں آکر پہلے دہلی کے قریب رہتک میں مقیم ہوئے، پھر وہیں متوطن ہو گئے، اس زمانے میں حکومت کا دستور تھا کہ شہر میں جو کمال اور ذی وجاہت آدمی ہوتا بغیر کسی انتخاب اور تقرر کے وہاں کا عہدۂ قضا و احتساب اس کے سپرد ہو جاتا تھا، گو وہ قاضی اور محتسب

بقیہ حاشیہ گذشتہ: جس سے قیاس ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی تین ہی پشت کے بعد یہ خاندان عرب سے عجم میں آگیا تھا۔ ؎ شیخ طاہر، شیخ حسن، شیخ عبد العزیز اور شیخ قطب عالم کا تذکرہ... عبد الحق محدث دہلوی رحمہ نے اخبار الاخیار میں بھی کیا ہے، لیکن شیخ طاہر کے اوپر کے سلسلۂ نسب کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔ (اخبار الاخیار ص ۱۸۳، ۲۶۶)

حاشیہ صفحہ ھذا: ؎ امہات کا لفظ جمع ہے، اور اس کو جمع ہی پر محمول کرنا چاہیئے، معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبد الرحیم صاحبؒ اپنی والدہ کے ساتھ اپنی دادی زوجہ شیخ معظم اور زوجہ شیخ محمود کو بھی شامل کر لیا ہے، کیونکہ یہ دونوں خواتین سونی پت کے سادات گھرانے سے تھیں (واللہ اعلم بالصواب) ؎ شاہ ولی اللہ صاحب ان کے متعلق لکھتے ہیں: "وایں بزرگ مردے عالم و عابد بود ست و اول کسے کہ از نژاد قریش در آں بلدہ (رہتک) آمد و بسبب وے شعائر اسلام ظہور نمود و طغیان کفر منطفی شد اول کسے کہ از نژاد قریش" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پہلے سے مسلمان موجود تھے، لیکن ابھی تک کوئی ممتاز خاندان یہاں آباد نہیں ہوا تھا۔... ان کے دوسرے بھائی شیخ بہاء الدین تھے جس سے مولانا فضل حق خیرآبادی وغیرہ کا خاندان ہے۔

کے نام سے موسوم نہیں ہوتا تھا، شیخ شمس الدین چونکہ باوجاہت اور صاحب علم و فضل تھے اس لئے عام قاعدہ کے مطابق وہاں کے قاضی اور محتسب ہوئے[1]

شیخ شمس الدین کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ کمال الدین، اور شیخ کمال الدین کے صاحبزادے شیخ قطب الدین، اور شیخ قطب الدین کے صاحبزادے شیخ عبد الملک یکے بعد دیگرے عہدہ قضا و احتساب سنبھالتے رہے۔ شیخ عبد الملک کے زمانہ میں عہدۂ قضا نے قانونی شکل اختیار کرلی، اور حکومت کی طرف سے قضاۃ کا تقرر ہونے لگا۔ اور چونکہ یہ خاندان پہلے اعزازی طور پر اس عہدہ قضا پر سرفراز تھا، اس لئے اسی خاندان سے قاضی عبد الملک[2] کا انتخاب عمل میں آیا، اور انھوں نے اپنے اجداد کی وراثت سمجھ کر اسے قبول کرلیا، قاضی عبد الملک کے بعد ان کے صاحبزادے قاضی کبیر الدین عرف قاضی بدھ اور ان کے بعد قاضی قاسم اور قاضی قوام الدین عرف قاضی قادن وغیرہ اس عہدہ پر مامور ہوئے[3]

عہدۂ قضا کے بجائے پیشۂ سپہ گری

قاضی قادن کے فرزند شیخ محمود نے اپنے لئے اس عہدہ کو پسند نہیں کیا، اور اس کے بجائے حکومت کے دوسرے کاموں غالباً سپہ گری وغیرہ کو اختیار کیا لیکن اس تبدیلی سے خاندان کی عزت و وجاہت میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔

شیخ محمود سے پہلے یہ خاندان علم اور تصوف دونوں میں ممتاز تھا، مگر انہوں نے تصوف کے ساتھ علم کے بجائے جسمانی قوت کو اہمیت دی، اور اس کے مظاہر جرأت، ہمت اور شجاعت و دلیری کا صدور ہونے لگا،[4] اور یہ سلسلہ کئی پشت تک چلا۔

---

[1] شیخ شمس الدین کی آمد کا زمانہ سنہ کے اعتبار سے صحیح طور پر متعین نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر علماء انساب کے قیاسی اصولوں کو مشعل راہ بنایا جائے تو کچھ تقریب پیدا کی جا سکتی ہے۔ شاہ عبد الرحیم صاحب کے اوپر بارہویں پشت میں شیخ شمس الدین پڑتے ہیں، اہل انساب کے اس حساب کے مطابق کہ تین پشت پر ایک سو برس گذر جاتے ہیں، بارہ پشتوں کا زمانہ چار سو برس قرار دیا جائے گا۔ شاہ عبد الرحیم صاحب کی پیدائش گیارہویں صدی کے وسط میں ہوئی تھی۔ اگر ان کی پیدائش کے زمانہ سے چار سو برس نکال دیئے جائیں تو شیخ شمس الدین کی آمد کا زمانہ ساتویں صدی کے اوائل یا وسط قرار دیا جا سکتا ہے۔ [2] ان کے بعد سے قاضی کا لفظ ان کے اہل خاندان کا جز بن گیا [3] انفاس العارفین ص ۱۵۹

[4] قاضی محمود کی شادی سونی پت کے سادات گھرانے میں ہوئی تھی، ان سیدہ کے بطن سے دو صاحبزادے احمد اور اعظم تھے۔

قاضی محمود کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ احمد[1] بھی باپ ہی کے نقشِ قدم پر چلے، ان کے بعد شیخ منصور[2] بھی شجاعت و بہادری میں ضرب المثل تھے، ان کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ معظم یعنی شاہ عبدالرحیم صاحب کے دادا نے بھی فوجی خدمات کے سلسلہ میں بڑا نام پیدا کیا، شاہ ولی اللہ صاحب ان کی شجاعت اور بہادری کے متعلق لکھتے ہیں:

شیخ معظم بدرجۂ قصوی از شجاعت وغیرہ متصف بود وقائع عجیبہ دریں باب بیش از حد احصا است (انفاس العارفین ص ۱۶۱)

شیخ معظم کی شادی بھی سونی پت کے ایک ممتاز گھرانے میں سید نور الجبان[3] کی صاحبزادی سے ہوئی تھی، اس نیک بخت خاتون کے بطن سے تین صاحبزادے شیخ جمال، شیخ فیروز اور شیخ وجیہ الدین، شاہ عبدالرحیم کے والد پیدا ہوئے۔

شیخ وجیہ الدین | شیخ وجیہ الدین بھی اپنی خاندانی خصوصیات کے مالک تھے، ان کی شجاعت و بہادری کے قصے بھی عام طور سے مشہور ہیں، اور زیادہ تر لوگ ان سے اسی حیثیت سے واقف ہیں، لیکن وہ ان خصوصیات کے ساتھ صلاح و تقویٰ میں بھی سرآمد روزگار تھے، تواضع و خاکساری جو شجاعت و بہادری کے ساتھ بہت کم جمع ہوتی ہے، وہ ان میں بدرجۂ اتم تھی۔

تلاوت قرآن | تلاوت قرآن خاص معمول تھا، سفر میں ہوں، خواہ حضر میں، روزانہ دو پارے بڑے ہی اہتمام اور سوز و گداز کے ساتھ پڑھتے تھے، ان کی یہی قرآنی نسبت ان کی اولاد و احفاد میں منتقل ہوئی۔

ورع و تقویٰ | ورع و تقویٰ کا دامن بھی کسی حالت میں نہیں چھوٹا، عام طور پر جب کسی مہم پر جاتے

---

[1] شیخ احمد کے دو لڑکے شیخ منصور اور شیخ حسین تھے۔ شیخ احمد کی شادی شیخ عبدالغنی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ شیخ عبدالغنی اپنے وقت کے بڑے برگزیدہ لوگوں میں تھے، اکبری دربار سے ان کا تعلق تھا، لیکن جب اکبر نے کفر و الحاد کا اظہار کیا تو وہ دربار سے علٰحدہ ہو گئے۔ [2] شیخ منصور کی دو شادی ہوئی تھی ایک شادی سے شیخ معظم اور شیخ اعظم تھے اور دوسری سے شیخ عبدالغفور و شیخ اسمٰعیل تھے۔ [3] انفاس العارفین میں ہے "موضع شکوہ پور کہ تعلقہ شیخ معظم بود ص ۱۶۱" ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ صاحب جائداد تھے [4] انفاس میں ہے کہ "سید نور الجبان کہ سیدے عالی نسب بود گرامیش آباء و اجداد بحلیہ فضل و علم متصف بودند (ص ۱۶۲)

جاتی ہیں، تو راستہ میں ہر قسم کی بے عنوانیاں شروع کر دیتی ہیں۔ یہ بھی عالمگیر کے فوج میں ملازم تھے، اور بار ہا محاذ جنگ پر بھیجے گئے۔ لیکن ان سے کبھی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، حتیٰ کہ کسی کے کھیت میں گھوڑے کو منہ تک مارنے نہیں دیا۔ بعض اوقات جب کسی فوجی کو کسی کا نقصان کرتے ہوئے دیکھتے اور ذرا جاتا تو فوج کی عام شاہراہ کو چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کر لیتے۔

ایک مرتبہ فوج کو رسد نہیں پہنچ سکی، اس لئے عام فوجیوں نے لوٹ مار شروع کر دی، شیخ وجیہ الدین پر دو تین فاقے گذر گئے، لیکن انہوں نے کسی غیر مشروع چیز کو اپنے لئے جائز نہیں رکھا، دو روز کے بعد اتفاق سے تھوڑا سا چنا کہیں پڑا ہوا مل گیا، آپنے اس کو بھگو کر سد رمق کا کام لیا۔

معاملات میں صفائی لین دین اور خرید و فروخت کے علاوہ عام معاملات میں بھی شیخ وجیہ الدین بہت محتاط اور امیر و غریب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے تھے، شاہ عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں:

معاملہ کہ والدمن علیہ الرحمہ (شیخ وجیہ الدین) با خدم وحشم و علف فروش وغیراں می کرد ند بوجہے از رفق و انصاف بود کہ از متقیان روزگار کم دیدہ می شود

والد محترم فوج سے لے کر گھاس بیچنے والے تک سے نرمی اور انصاف کا جو معاملہ کرتے تھے وہ اس زمانے کے متقیوں (انفاس ص۱۲) میں کم دیکھنے میں آیا۔

استغنا و قناعت قناعت و استغنا انکی خاص خصوصیت تھی، چنانچہ شاہ شجاع کے مقابلہ کیلئے عالمگیر نے جو فوج بنگال بھیجی تھی، اس میں شیخ وجیہ الدین بھی تھے۔ انھوں نے اس جنگ میں بڑا کارنامہ دکھایا، اور ان کی وجہ سے بڑی کامیابی ہوئی۔ عالمگیر نے اس کے صلہ میں ان کے منصب اور مرتبہ میں اضافہ کرنا چاہا مگر آپ کی قناعت پسند طبیعت نے اسے پسند نہیں کیا (انفاس ص۱۶)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی فوجی ملازمت صرف دنیا طلبی کے لئے نہیں تھی، بلکہ اس میں دینی خدمت اور جہاد کی روح بھی موجود تھی، اس جذبۂ جہاد کا پتہ آپ کے واقعۂ شہادت سے بھی ملتا ہے:

واقعۂ شہادت شاہ عبدالرحیم صاحب بیان فرماتے ہیں کہ والد صاحب حسب معمول ایک روز تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے، سجدہ میں معمول سے زیادہ دیر ہوئی، اس سے مجھے خیال ہونے لگا، کہ کہیں آپ کی روح پرواز تو نہیں کر گئی، لیکن دیر کے بعد جب آپنے سجدہ سے سر اٹھایا، تو میں نے پوچھا، آج آپ نے سجدہ میں اتنی دیر کیوں کی، فرمایا: آج میں اللہ تعالیٰ سے بڑی آہ و زاری کے ساتھ یہ دعا کر رہا تھا کہ مجھے شہادت

نصیب فرما، چنانچہ مجھ پر دعا کی مقبولیت کا انکشاف ہوگیا ہے، اور یہ بھی اشارہ مل گیا ہے کہ میری جائے شہادت دکن میں ہے،

شاہ ولی اللہ صاحب بیان فرماتے ہیں، کہ اس واقعہ سے پہلے ہی آپ شاہی ملازمت سے دست بردار ہو چکے تھے، اور فوجی کاموں سے نفرت پیدا ہو چکی تھی، دکن جانے کے لئے سامان سفر موجود نہ تھا مگر آپ نے فوراً تمام سامان درست کیا، سواری کے لئے ایک عمدہ گھوڑا خریدا، اور اس ارادہ کے ساتھ دکن روانہ ہوئے کہ شیواجی کا جو دکن میں مسلمانوں کے ساتھ بڑی زیادتیاں کر رہا ہے قلع قمع کروں گا لیکن جب برہان پور (گجرات) پہنچے تو اشارۂ غیبی ہوا کہ اپنی جائے شہادت تو پیچھے چھوڑ آئے، اس لئے آپ وہاں سے پلٹ پڑے، قصبہ پنڈیا میں کچھ تاجر بھی جو دلی جا رہے تھے، آپ کے ساتھ ہو گئے، اثناء سفر میں ایک دن ایک سو سالہ بڑھیا جو ڈاکوؤں کی جاسوس تھی، افتاں و خیزاں آپ کے پاس آئی، آپ نے پوچھا، کہاں کا ارادہ ہے، اس نے کہا دلی جانا چاہتی ہوں آپ نے اسے بھی قافلہ میں شامل کر لیا، اور وہ جتنے روز قافلہ کے ساتھ رہی، آپ کے ملازم سے کچھ پیسے روزانہ لے کر خرچ کرتی رہی، جب یہ قافلہ سرائے برہا پہنچا تو اس پیرزال نے اپنے ڈاکو ساتھیوں کو اطلاع کر دی، تھوڑی دیر کے بعد ڈاکوؤں کی جماعت سرائے میں پہنچی، آپ اسوقت تلاوت قرآن میں مشغول تھے، دو تین ڈاکوؤں نے آپکے سامنے آکر پوچھا، وجیہ الدین کس کا نام ہے، جب معلوم ہوا کہ آپ کا نام ہے تو یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے، کہ ہمیں تم سے کام نہیں کیونکہ تمہارے پاس مال و متاع بھی نہیں ہے، اور پھر ہماری ایک ہم جماعت نے نمک بھی کھایا ہے (غالباً یہ بڑھیا کے پیسہ لینے کی طرف اشارہ تھا) ہمیں اس قافلہ میں فلاں فلاں تجار سے کام ہے، اور انہی کا مال و اسباب ہمیں لوٹنا ہے، ڈاکوؤں نے اگرچہ آپ سے کوئی تعرض نہیں کیا، لیکن آپ نے رفقائے سفر کا ساتھ چھوڑنا پسند نہیں کیا، اور ان کی مدافعت کے لئے تیار ہو گئے، اور دونوں طرف سے جنگ شروع ہو گئی، آپ نے بڑی پامردی سے ڈاکوؤں سے مقابلہ کیا، لیکن گروہ کا مقابلہ آسان نہ تھا، آپ کے بدن پر بیس بائیس گہرے زخم آئے تھے، جس سے آپ کا جسم بالکل چور ہو چکا تھا کہ اسی حالت میں ایک شقی نے گردن پر ایک کاری ضرب لگائی، اور آپ کا سر تن سے جدا ہو گیا، اس طرح آپ کی شہادت کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون ، شہادت کے سن و تاریخ کی کوئی تصریح نہیں مل سکی۔

اولاد | آپ کی شادی شیخ رفیع الدین[1] محمد کی صاحبزادی سے ہوئی تھی، ان کے بطن سے تین صاحبزادے شیخ عبدالحکیم، شیخ ابوالرضا محمد، اور شاہ عبدالرحیم پیدا ہوئے، اور تینوں صاحب علم وفضل اور

[1] شیخ رفیع الدین کا خاندان ملتان کا رہنے والا تھا۔ ان کے اجداد میں شیخ طاہر تعلیم کے لئے بہار گئے تکمیل تعلیم کے بعد قاضی بدھ حقانی (بہار کے قاضی) نے اپنی صاحبزادی سے ان کی شادی کر دی، اس سلسلہ میں وہ کچھ روز بہار ہی میں رہے، پھر اپنے اہل وعیال کے ساتھ جونپور آئے اور وہیں متوطن ہو گئے ان کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ حسن بھی کچھ روز جونپور ہی میں رہے، لیکن ۸۹۹ھ یا ۹۰۰ھ میں دلی چلے آئے، تصوف میں ایک کتاب مفتاح الفیض آپ کی یادگار ہے (ملفوظات شاہ عبدالعزیز ص ۳۶) ان کے صاحبزادے شیخ عبدالعزیز صاحب اپنے وقت کے بڑے مرتاض بزرگوں میں تھے۔ ۸۹۸ھ میں پیدا ہوئے، ۹۷۵ھ میں وفات پائی۔ محدث دہلوی لکھتے ہیں:

اورا در تواضع وحلم وصبر ورضا وتسلیم وشفقت برخلق واعانت فقرا نظیر نہ بود،

در زمان خود یادگار مشائخ چشت بود، در دلی بوجود او سلسلۂ ارشاد ومشیخت برپا بود (اخبار الاخیار ص ۲۶۶)

شیخ عبدالعزیز وحدت وجود کے قائل تھے۔ کئی کتابیں بھی ان کی یادگار ہیں، وحدت وجود میں رسالہ عینیہ اور تصوف میں رسالہ عزیزیہ اور آداب السلوک ان کی یادگار ہیں۔ شیخ عبدالعزیز کے صاحبزادے شیخ قطب عالم شاہ عبدالرحیم کے پرنانا تھے وہ بھی اپنے وقت کے اتقیاء میں تھے۔ محدث دہلوی لکھتے ہیں: قطب عالم، عالم وفاضل وصاحب اخلاق حمیدہ وصفات پسندیدہ وقدم صدق واستقامت برسجادۂ پدر نہادہ اوقات بطاعت وعبادت معمور دارد" (اخبار الاخیار ص ۲۶۶)

شیخ قطب عالم کے صاحبزادے شیخ رفیع الدین محمد شاہ عبدالرحیم صاحب کے نانا تھے، یہ خواجہ باقی باللہ کے ارشد خلفاء میں سے تھے، خواجہ باقی باللہ کو شیخ رفیع الدین سے اتنا شدید تعلق تھا، کہ لوگ ان کو خواجہ کا محبوب کہتے تھے۔ ان پر بھی وحدت وجود کا بڑا غلبہ تھا، آپ کی دو شادیاں ہوئی تھیں، پہلی شادی کا کوئی علم نہیں، دوسری شیخ محمد اعظم پوری کی صاحبزادی سے ہوئی تھی، انہی کے بطن سے شاہ عبدالرحیم صاحب کی والدہ پیدا ہوئیں، آپ کی اس شادی میں خود حضرت خواجہ باقی باللہ اور بہت سے صوفیہ شریک تھے، شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں" خواجہ باقی باللہ) لاچار شدند و اعظم پور رفتند، صوفیہ آن ناحیہ چوں مقدم خواجہ شنیدند، ہمہ جمع آمدند دو رفقائی سرگردہ کم کسے

صاحب رشد و ہدایت ہوئے، ان میں سے شاہ عبدالرحیم صاحب کے حالات پیش کیے جاتے ہیں۔

شاہ عبدالرحیم صاحب کا اجمالی تعارف

شاہ عبدالرحیم صاحب نے علم و فضل، جرأت و ہمت، استغنا اور قناعت اپنے اسلاف سے بطور وراثت پائی تھی، شاہ صاحب کا ددھیالی اور ننھیالی دونوں خاندان، جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، ہمیشہ صاحب عزت و وجاہت رہا، اور ان کے اکثر و بیشتر افراد فضل و کمال، صلاح و تقوی کا نمونہ تھے، اور یہ فیض تھا دودمان فاروقی اور مرتضوی سے نسبت و تعلق اور اس شراب دوآتشہ کا،

شاہ صاحب نے اپنے اسلاف سے علم و فضل، رشد و ہدایت اور صلاح و تقوی کا جو خزانہ بطور وراثت پایا تھا، اس کی انہوں نے نہ صرف پوری نگہداشت کی، اور ہمیشہ حرز جان بنائے رکھا، بلکہ اس اصل سرمایہ میں کچھ بیش بہا اضافہ بھی کیا، آئندہ صفحات میں ان کے اسی کارنامے کی تفصیل بیان کی جائے گی۔

تعلیم و تربیت اور ماحول

شاہ صاحب نے جب آنکھ کھولی تو اپنے گھر کو علم اور دین کے چرچے سے معمور پایا، اور دل تک اللہ و رسول کے ذکر کے علاوہ کان میں اور کوئی آواز نہیں پڑی، خاندان کے بزرگوں کی موجودگی کی وجہ سے خاندان کا ماحول بھی جادۂ اسلاف سے ہٹا نہیں تھا، آپ کے والدین خود شب زندہ دار اور تہجد گذار تھے، اس لئے بچپن ہی سے ان کی عبادت اور تہجد اور اذکار و اشغال کو دیکھتے، اور ان میں شریک ہوتے تھے، اسی ماحول میں آپ کی تعلیم و تربیت شروع ہوئی، اور اسی گہوارۂ احسان و تصوف میں آپ کی روحانیت پروان چڑھی۔

بقیہ حاشیہ گذشتہ: باشد از صوفیہ کہ دراں صحبت حاضر نہ شد، مجلس عجیب کہ ہرگز مثل آں مسموع نہ شدہ" (انفاس ص۲۰)

۱؎ شیخ رفیع الدین نے ایک دن گھر کا تمام سامان جمع کر کے اپنی تمام اولاد میں تقسیم کر دیا جب چھوٹی صاحبزادی یعنی شاہ عبدالرحیم صاحب کی والدہ کی باری آئی، تو انھوں نے ان کو چند اوراق میں کچھ وظائف اور اپنے پیروں کا شجرہ لکھا دیا، صاحبزادی کی والدہ نے کہا ابھی لڑکی کی شادی نہیں ہوئی، سامان شادی دینا چاہیے، یہ اوراق دینے سے کیا فائدہ، آپ نے فرمایا کہ ہمارے بزرگوں کی اصلی میراث یہی ہے جسے میں اس کو دے رہا ہوں، انشاء اللہ اس کے بطن سے ایک لڑکا ہوگا جو ہماری معنوی میراث کا مالک ہوگا، جب شاہ عبدالرحیم صاحب بڑے ہوئے تو ان کی نانی نے وہ اوراق ان کے حوالے کر دیئے، اور وہ واقعی اس معنوی میراث کے مالک ہوئے (انفاس ص۲)

ابتدائی مکتبی تعلیم عام دستور کے مطابق گھر ہی پر ہوئی، جب سن شعور کا آغاز ہوا تو عربی شروع کرائی گئی، عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے بڑے بھائی شیخ ابوالرضا محمد سے پڑھیں، دس سال کی عمر میں متوسطات کی تکمیل کرلی، خود فرماتے ہیں:

"رسائل صغار تا شرح عقائد و حاشیہ خیالی بخدمت مخدومی اخوی شیخ ابوالرضا گذرانیدم"[1]

اس کے بعد میرزاہد[2] کی خدمت میں جو اکبرآباد میں عالمگیر کی طرف سے محتسب تھے، پہنچے اور بقیہ کتابیں ان سے پڑھیں۔

استاذ کی شفقت | شاہ عبدالرحیم صاحب میرزاہد کے عزیز ترین تلامذہ میں تھے، مرزا ان کی ذہانت اور ذکاوت کی وجہ سے ان سے اس قدر محبت کرتے تھے، کہ جس روز یہ مطالعہ کرکے نہیں آتے تھے، اس روز بھی ایک دو سطریں پڑھا دیتے، کہ ناغہ نہ ہونے پائے، خود فرماتے ہیں:

ایشاں با من التفات بسیاری کردند، بحدے کہ می گفتم کہ امروز مطالعہ نہ کردہ ام می گفتند یک دو سطر خوانید کہ ناغہ نہ شود (انفاس ص ۴۲)

استاذ اور شاگرد میں غایت تعلق کی وجہ سے ایک طرح کی مساوات اور بے تکلفی ہوگئی تھی، میرزاہد کے اس مساویانہ برتاؤ سے جو اپنے وقت کے افلاطون اور ارسطو سمجھے جاتے تھے، لوگوں کو سخت تعجب ہوتا تھا[3]

ایک روز عالمگیر نے میرزاہد کو کسی ضرورت سے بلا بھیجا، وہ جانے کا قصد کرہی رہے تھے کہ شاہ عبدالرحیم صاحب پہنچ گئے، انہوں نے مکان کا دروازہ بند کردیا اور کہا کہ جب تک میرا فلاں کام نہ ہوجائیگا آپ کو نہ جانے دوں گا۔ میرزاہد صاحب نے کہا، اس وقت پراگندہ خاطر ہوں، بادشاہ کے پاس سے واپس ہوکر اس کام کو انجام دوں گا، لیکن شاگرد نے پھر اصرار کیا، آخرکار وہ ٹھہر گئے، اور اس کام کو

[1] انفاس ص ۱۵ نیز القول الجلی میں ہے کہ شیخ ابوالرضا اپنے زمانہ کے بڑے صاحب حال اور صاحب کرامت بزرگ ہوئے ہیں، شاہ عبدالرحیم صاحب اور ان کے خانوادہ کی روحانی تربیت میں ان کا بڑا ہاتھ تھا، اسی کے ساتھ ساتھ علمی حیثیت سے بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا، شاہ ولی اللہ صاحب نے انفاس العارفین میں ان کا حال بہت مفصل لکھا ہے۔ [2] اس وقت کے مشہور اساتذہ میں تھے، اور یونانی فلسفہ و منطق جو اس وقت تک معیار علم سمجھا جاتا تھا، میں ان کی حیثیت امام کی سمجھی جاتی تھی، مآثر الکرام میں ان کا تذکرہ تفصیل سے موجود ہے۔ [3] انفاس العارفین ص ۴۳

انجام دینے کے بعد دربار میں گئے۔[1]

جودت طبع اور قوت مطالعہ

شاہ صاحب لڑکپن ہی سے نہایت ذہین اور ذکی تھے، جودت طبع اور قوت مطالعہ کا یہ حال تھا کہ ان کے اساتذہ اور ہم سبق ان کے نئے نئے سوالات اور اعتراضات سے گھبرا جاتے تھے، ایک مرتبہ اپنے بڑے بھائی شیخ ابوالرضا سے خیالی پڑھ رہے تھے، اثناء درس میں کوئی اعتراض کیا، شیخ نے جواب دیا، لیکن انہیں تسکین نہیں ہوئی، انھوں نے دوبارہ اعتراض کیا، اور استاذ و شاگرد میں بحث ومباحثہ اتنا طول کھینچا کہ استاذ ناخوش ہو گئے اور انہوں نے پڑھانا چھوڑ دیا۔

شرح ملا جامی میں عطف کے بیان میں ایک عبارت دقیق ہے، جس کے حل کرنے میں اکثر فضلاء اٹک جاتے ہیں۔ مطالعہ کے دوران انکے دل میں اعتراض پیدا ہوا، صبح کو انہوں نے اسے اپنے ہم سبق شیخ حامد سے بیان کیا، انہوں نے کہا کہ میرے ذہن میں بھی یہی اعتراض آیا تھا، شاید توارد ہو گیا ہے۔ دوسرے روز اس اعتراض کو حل کیا، اور پھر اس عبارت پر ایک دوسرا اعتراض پیدا کیا، اسی طرح کئی روز تک یہ سلسلہ جاری رہا۔[2]

اگرچہ تعلیم کی تکمیل میر زاہد کی خدمت میں کی تھی، لیکن یہ تحصیل، تحصیل حاصل تھی، اس لئے کہ اکثر کتاب کے شروع کا حصہ میر زاہد سے پڑھتے تھے، اور آخر کے حصہ کا خود درس دیتے تھے، ان کے الفاظ یہ ہیں:

اگرچہ اتمام تفصیل بخدمت میر زاہد کردم، اما گویا تحصیل حاصل می شد بسا می بود
کہ از اول کتاب می خواندم و از آخر درس می گفتم[3] (انفاس ص ۱۶)

یہ تو صاف پتہ نہیں چلتا کہ آپ نے حدیث و فقہ اور تفسیر کس سے پڑھی، مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ ابوالرضا ہی سے پڑھی ہو گی، اس لئے کہ ان کے دوسرے استاذ میر زاہد ہروی ہیں، جو اس کوچہ سے بالکل نابلد تھے، اور تیسرے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا، اور حقیقۃً ان علوم کی تکمیل میں تعلیم و تعلم سے زیادہ ان کی فطری مناسبت اور بزرگوں کی صحبت کا اثر تھا۔

درس و تدریس

شاہ صاحب نے تکمیل تعلیم کے بعد ایک مدرسہ قائم کیا[4] جس میں انہوں نے درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا تھا، ان کے درس میں فقہ و تصوف، کلام و فلسفہ کے علاوہ قال اللہ و قال الرسول کی آواز بھی جو ابھی ہندوستان میں بہت عام نہیں ہوئی تھی، سنائی دیتی تھی، شاہ ولی اللہ صاحب

---

[1] انفاس ص ۳۳ [2] انفاس ص ۱۵ [3] یہ اس شخص کے متعلق کہہ رہے ہیں جو اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا اور مسلم معقولی تھا [4] اس مدرسہ کا نام آپ کے بعد مدرسہ رحیمیہ پڑا۔ آج بھی یہ مدرسہ اس نام سے زندہ ہے۔

کو قرآن و حدیث کی وہ روشنی جس کو انہوں نے اتنا پھیلایا کہ سارا ہندوستان منور ہو گیا، سب سے پہلے اپنے والد شاہ عبدالرحیم صاحب ہی کے درس سے ملی تھی۔

آپ کی دی ہوئی کئی سندیں آپ کے مجموعۂ مکتوبات[1] میں موجود ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ تین چیزوں کی اجازت آپ خاص طور سے دیتے تھے، تفسیر، حدیث، اور تصوف، ایک سند میں فرماتے ہیں:

اجزت لہ الدرس التفسیر والحدیث

دوسری سند میں فرماتے ہیں:

وتعلم منی علم التفسیر والحدیث والتصوف

آپ کے علم و فضل کے بیان میں ہم اس کی اور تفصیل کریں گے، آپ کے تلامذہ اور متوسلین کی فہرست بہت ملی جلی ہے، اس لئے ہم دونوں کی فہرست آگے چل کر ایک ہی جگہ نقل کریں گے۔

روحانی تربیت | علم ظاہر کے ساتھ ہی ساتھ گھر کے ماحول میں ان کی باطنی تربیت بھی شروع ہو چکی تھی، اور غیر محسوس طور پر ان کی روحانیت فروغ پا رہی تھی، شاہ صاحب کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ احسان اور تصوف سے ان کو فطری لگاؤ تھا جس کے آثار بچپن ہی سے نمایاں ہونے لگے تھے۔ خود بیان فرماتے ہیں کہ میرے ماموں شیخ عبدالحئی اپنے لڑکوں کی حالت دیکھ کر فرماتے تھے کہ

ترسیدم کہ سر اسلاف ما از عقب ما منقطع گردد	مجھے خوف ہے کہ اپنے اسلاف کا طریقہ ہمارے بعد منقطع نہ ہو جائے

لیکن ایک روز مجھے بڑے اہتمام سے وضو کرتے ہوئے دیکھا تو بیحد مسرور ہوئے اور فرمایا کہ:

حالا معلوم شد کہ حال آں سرور خاندان ما بودہ است اگر در اولاد پسر نیست چہ باک در اعقاب دختری ہست (انفاس ص ۱۸۴)	اب معلوم ہوا کہ اب بھی خاندان کی لاج رکھنے والا موجود ہے، اولاد نرینہ میں نہ سہی اولاد دختری ہی میں سہی۔

ان کے علاوہ دوسرے بزرگوں نے بھی ان کے صلاح و رشد کو دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ

[1] انفاس رحیمیہ کے نام سے آپ کے چھوٹے صاحبزادے شاہ اہل اللہ صاحب نے آپ کے مکاتیب کو جمع کیا تھا جو مطبع مجتبائی میں ۱۳۱۷ھ میں چھپ گیا ہے۔ اس مجموعہ میں آپ کی دی ہوئی کئی سندیں بھی نقل کی ہیں۔

بچہ اس راہ میں کسی ممتاز شخصیت کا مالک ہوگا، شاہ صاحب کے مرشد حافظ سید عبداللہ صاحب نے ایک مرتبہ ان سے فرمایا کہ جب تم چھوٹے تھے، اور لڑکوں کے ساتھ لہو ولعب میں مشغول رہتے تھے، اس وقت سے میری طبیعت تمہاری طرف مائل تھی، اور میں تمہارے لئے یہ دعا کرتا تھا کہ

بارے خدایا ایں پسر را از اولیا گردان (انفاس العارفین ص ۱۱)

بارہ برس کی عمر میں آپ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو خواب میں دیکھا، اس کے بعد سے آپ کے روحانی ذوق میں ایک غیر معمولی انقلاب پیدا ہوا، اور ذکر و اذکار میں پہلے سے زیادہ دلبستگی پیدا ہوگئی۔

بیعت کا قصد | یوں تو اپنی فطری صلاحیت کی بنا پر آپ نے احسان وتصوف کی بہت سی منزلیں طے کرلی تھیں، لیکن اس میں پختگی اور دوام کے لئے کسی ہاتھ میں ہاتھ دینے کی ضرورت تھی، اس خواب کے بعد آپ نے بیعت کا قصد کیا، لیکن ابھی اس کی نوبت نہیں آنے پائی تھی کہ ایک روز حضرت خواجہ نقشبند شیخ عبدالعزیز شکر بار کو خواب میں دیکھا کہ وہ فرما رہے ہیں:

اے فرزند ارادت بکسے بدہ تا آنکہ حضرت خواجہ ترا قبول نہ فرمایند

شاہ صاحب صبح کو حضرت خواجہ خرد (حضرت باقی باللہ کے صاحبزادے) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خواب کی تعبیر پوچھی، اور تعبیر ملنے سے پہلے ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ شہر میں اس لقب (خواجہ) سے آپکے علاوہ کوئی مشہور نہیں ہے۔ غالباً یہ اشارہ آپ ہی کی طرف ہے، اس لئے اپنی خدمت میں قبول فرمالیجئے حضرت خواجہ نے فرمایا کہ اس خواب میں اشارہ میری طرف نہیں ہے، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے انشاء اللہ تم کو زیارت نصیب ہوگی۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد یہ سعادت بھی نصیب ہوئی۔

کچھ روز کے بعد پھر خواجہ خرد کی خدمت میں حاضر ہوکر دوبارہ بیعت کی درخواست کی، انہوں نے از راہ تواضع یہ عذر کیا کہ میں اتباع سنت میں متساہل ہوں، اور نہیں چاہتا کہ تمہارا قدم جادۂ شریعت سے ذرہ بھی الگ ہو۔

بیعت کا مشورہ | شاہ صاحب نے کہا کہ پھر آپ ہی مشورہ دیجئے کہ میں کسی سے بیعت ہو جاؤں، خواجہ خرد نے فرمایا کہ اگر سید آدم بنوری کے خلفاء میں کوئی مل جائے تو اس سے بہتر کوئی نہیں ہے، شاہ صاحب نے حافظ سید عبداللہ کا نام لیا، خواجہ صاحب نے تائید فرمائی، چنانچہ ان کی خدمت میں حاضر ہوکر ان سے بیعت ہوئے، فرماتے ہیں:

باوجود آنکہ طریق اختفار وخمول برایشان غالب بود دراول مرۃ
بیعت قبول نمودند۔ (انفاس ص ۶)

حافظ صاحب ان کو بے حد عزیز رکھتے تھے، کبھی کوئی خدمت نہیں لیتے تھے، اگر وہ کبھی ارادہ بھی کرتے، تو حافظ صاحب ٹال دیا کرتے تھے، ایک مرتبہ شاہ صاحب خدمت کی غرض سے حاضر ہوئے مرشد نے تھوڑی سی خدمت لے کر فرمایا کہ

این خطرہ (خدمت کاررا بخاطر خود راہ ندہید کہ جمیع حقوق صحبت
چہ ظاہری وچہ باطنی ہمہ عفو کردم[1] (انفاس ص ۱۲)

اس درمیان میں آپ کی آمد و رفت خواجہ خرد کے پاس بھی ہوتی رہی، اور ان سے بھی استفادہ اور صحبت کا سلسلہ جاری رہا، اگرچہ شاہ صاحب ان سے باقاعدہ بیعت نہ تھے، لیکن ان کی صحبت سے پورا فائدہ اٹھایا، خواجہ صاحب کی حیثیت تقریباً مرشد کی تھی، مگر انہوں نے شاہ صاحب سے ہمیشہ عزیزانہ برتاؤ رکھا، ایک مرتبہ شاہ عبدالرحیم سے خواجہ صاحب کی مجلس میں کسی مسئلہ پر کسی میخوار سے بحث ہو گئی شاہ صاحب ناخوش ہو کر چلے آئے، اور ارادہ کر لیا کہ اب خواجہ کی مجلس میں نہ جاؤں گا، دو تین روز کے بعد خواجہ خرد خود ان کے مکان پر آئے، اور بہت ہی لطف و محبت سے ناخوشی دور کی[2]

خلیفہ ابوالقاسم | حافظ صاحب کی وفات کے بعد آپ کو کسی دوسرے مرشد کی تلاش ہوئی، کسی نے ابوالقاسمؒ اکبر آبادی کا ذکر کیا، شاہ صاحب اکبر آباد ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، شیخ نے انکی بڑی پذیرائی کی، اور بہت شفقت اور عنایت سے پیش آئے، ان کی تربیت میں خاص توجہ کی، شاہ صاحب فرماتے ہیں:

تا آنکہ بعضی قدیماں برمن حسد ھی بردند (انفاس ص ۲۰)

حضرت خلیفہ کو اس قدر تعلق خاطر تھا کہ جب شاہ صاحب کو بیعت و ارشاد کی اجازت دی، تو ایک بڑی دعوت کی، جس میں بہت سے خواص و عوام شریک ہوئے، اور اس مجمع کے سامنے حضرت خلیفہ

---

[1] ترجمہ: خدمت نہ کرنے کا جو خیال لاحق ہے، اسے دل سے نکال دو۔ میں نے ظاہری و باطنی ہر طرح کی خدمت سے بری کر دیا ہے۔

[2] انفاس العارفین ص ۱۸ [3] انفاس

نے شاہ صاحب کے سر پر دستار ارشاد و خلافت باندھی۔

شاہ عبدالرحیم صاحب کو بھی مرشد سے بڑی محبت تھی۔ خود فرماتے ہیں کہ حضرت خلیفہ مجھ سے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "درویشاں شہر را زیارت کنید" (شہر کے دوسرے بزرگوں سے بھی ملاقات کیا کرو) لیکن میں اس سے اس لئے پس وپیش کرتا تھا کہ مرشد سے تعلق کی یکسوئی میں فرق نہ آجائے۔

ایک دن حضرت خلیفہ نے شاہ صاحب سے فرمایا کہ سید عظمت اللہ (جو چشتیہ سلسلہ کے بڑے برگزیدہ بزرگ تھے) کی خدمت میں جاؤ۔ ان کو حسب معمول اس میں تامل ہوا، تو آپ نے خادم سے کہا کہ انکو سید صاحب کی خدمت میں لے جاؤ۔ چنانچہ آپ خادم کے ہمراہ سید صاحب کی خدمت میں گئے، وہ زنان خانہ میں صاحب فراش تھے، اس لئے پہلے تو انہوں نے معذرت کر دی، لیکن جب حضرت خلیفہ کی نسبت کا خیال آیا تو خادم سے چارپائی اٹھوا کر باہر تشریف لائے، اور شاہ صاحب سے نام و نسب پوچھا، انہوں نے بتایا، مگر شیخ عبدالعزیز شکر بار کی نسبت کا اظہار نہیں کیا، مگر باتوں باتوں میں جب سید صاحب اس نسبت کا علم ہوگیا، تو وہ فوراً چارپائی سے نیچے اتر آئے۔ بعد تواضع کی شفقت فرمائی ان کے سر پر عمامہ باندھا، اور کچھ نقد اور کچھ تبرکات جو شیخ عبدالعزیز شکر بار نے میرے دادا کے حوالے کئے تھا، وہ آج میں تمہارے سپرد کرتا ہوں۔

شاہ صاحب یہ تبرکات لے کر حضرت خلیفہ کی خدمت میں آئے، اور ان کے سامنے انہوں نے

فرمایا کہ

نقد اشارت است جمعیت ظاہر	نقد سے اطمینان ظاہری کی طرف اشارہ
وعمامہ اشارت باجازت وجمعیت	ہے اور عمامہ سے جمعیت باطن کی طرف
باطن ودریں ہردو امر شریک نتواں	اشارہ ہے، اور یہ دونوں چیزیں بہت
شد (انفاس ص ۲۸)	کم جمع ہوتی ہیں۔

اس جمعیت ظاہری کی بشارت کے بعد خود شاہ عبدالرحیم صاحب کا بیان ہے کہ معاشی پراگندگی کا سوال ان کی زندگی میں سرے سے پیدا ہی نہیں ہوا، اور نہ جمعیت باطن کی اس خوش خبری کے بعد انہیں حیات اخروی کے لئے کبھی کوئی دشواری اٹھانی پڑی (الفرقان ولی اللہ نمبر)

تلامذہ اور متوسلین | شاہ صاحب کے تلامذہ اور متوسلین کی کوئی تفصیل تذکروں میں موجود نہیں ہے، اس

لئے صحیح تعداد تو نہیں بتائی جا سکتی، لیکن ان کے مکتوبات اور حالات کے ضمن میں جن لوگوں کے نام مل گئے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

(۱) شاہ ولی اللہ (۲) شاہ اہل اللہ، شاہ صاحب کے چھوٹے صاحبزادے جنہوں نے ان کے مکتوبات "انفاس رحیمیہ" کے نام سے جمع کیے ہیں۔ (۳) شیخ محمدؒ (۴) شیخ معظم (۵) ولدار بیگ (۶) شیخ زین العابدینؒ (۷) شیخ عبداللہ جیو، شیخ ابوالقاسم کے صاحبزادے (۸) شیخ عبدالوہاب (۹) خواجہ احمد (۱۰) شیخ عبیداللہ (۱۱) حبیب الدین (۱۲) فیض اللہ (۱۳) حسام الحق یا حسام الدین یہ اسماء انفاس رحیمیہ سے لئے گئے ہیں۔ (۱۴) مولوی نذیر محمد جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں مشہور تھے (۱۵) شاہ گل۔ یہ نام شاہ عبدالعزیز صاحب کے ملفوظات سے لئے گئے ہیں (۱۶) شیخ محمد فاضل (۱۷) شیخ عبداللہ چلپیؒ مترجم فتاوی عالمگیری (۱۸) مرزا علی خوانی (۱۹) شیخ محمد غوث پھلتی، یہ نام انفاس العارفین سے لئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کے متوسلین میں دو خاتونوں کا بھی نام ملتا ہے (۲۰) ام عبیداللہ انفاس رحیمیہ میں ان کے نام ایک خط موجود ہے (۲۱) بی بی شریف خانم۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ از مستفیضان جد شریف بود صاحب توجہ وکشف۔ (ص ۱۱۹)

طبابت اور ذریعہ معاش | شاہ صاحب کے خاندان میں امراض روحانی کے علاج کے ساتھ ساتھ جسمانی امراض کے معالجہ کا بھی سلسلہ قدیم سے چلا آرہا تھا۔ خود شاہ صاحبؒ نے اس کی تکمیل کی تھی، اور اس میں مہارت بہم پہنچائی تھی۔ ان کے مہارت فن کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔

ایک مرتبہ بارہہ کے کسی دیہات میں گئے ہوئے تھے۔ وہاں ان کے سامنے کسی مریض کا قارورہ لایا گیا انہوں نے دیکھ کر نسخہ تجویز کردیا۔ اس وقت ایک ہندو طبیب موجود تھا، اس نے کہا کہ آپ نے مرض کی تشخیص اچھی طرح کرلی ہے یا نہیں، شاہ صاحب مسکرائے، اور فرمایا، یہ عورت کا قارورہ ہے، اسے فلاں فلاں بیماری

لہ ان کے نام کئی خط ہیں ۔ سے ان کے نام بھی متعدد خطوط ہیں ۔ سے شاہ صاحب نے ان کا بڑا شہرہ سنا تھا۔ ایک دن ان سے ملنے گئے، مگر مل کر کچھ خوش نہیں ہوئے۔ ایک روز کسی مجلس میں شاہ صاحب سے ان سے پھر ملاقات ہوگئی، عبداللہ چلپی نے کوئی دعا پڑھی، اور اعراب میں کچھ غلطی کی، شاہ صاحبؒ نے انہیں ٹوکا، اس طرح سے دونوں میں کچھ مناظرہ کی شکل پیدا ہوگئی۔ لیکن آخر میں عبداللہ چلپی نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا، اور شاہ صاحب سے بیعت ہوگئے۔ (انفاس العارفین صفحہ ۵۴)

ہے۔ اور اس کے یہ اسباب ہیں، اس طبیب نے پھر آپ سے پوچھا کہ یہ کس کتاب میں ہے، شاہ صاحب نے فرمایا کہ

ایں طب نیست فراست صادقۂ محمدیاں است (انفاس ص ۵۹)

یہ کسی طب کی کتاب میں نہیں ہے، بلکہ فراست امت محمدیہ ہے۔

ان کی مہارت فن کے متعلق شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

درطب حدس ایشاں بنہایت رسا و سلیم بود (انفاس ۸۶)

شاہ صاحب کے بعد بھی یہ فن ان کے خاندان میں علمی حیثیت سے باقی رہا، مگر عملی حیثیت سے شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کا سلسلہ بند کر دیا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کے ملفوظات میں ہے،

حکمت ہم در خاندان ما معمول بود، چنانچہ جد بزرگوار و عم فقیر غالباً شاہ اہل اللہ صاحب، دوامی کردند والد ماجد بندہ موقوف ساختہ (ص ۲۲)

لیکن یہ تصریح نہیں مل سکی کہ شاہ عبدالرحیم صاحب یا ان کے اجداد نے طبابت کا پیشہ ذریعۂ معاش کے لئے اختیار کیا تھا۔ یا صرف خدمت خلق کے لئے۔ یا دونوں شکلیں تھیں۔ "دوامی کردند" اور "موقوف ساختہ" وغیرہ الفاظ سے دونوں صورتیں نکل سکتی ہیں، مگر قرائن[1] سے پتہ چلتا ہے کہ اس پیشہ کو شاہ صاحب یا

---

[1] ان کے اجداد میں مفتی شمس الدین صاحب سے قاضی محمود صاحب تک غالباً عہدۂ قضا ہی ذریعۂ معاش رہا، اس کے بعد فوجی ملازمت شروع ہوئی، اور غالباً عہدۂ قضا کی جگہ اس نے لے لی۔ شاہ صاحب کے دادا شیخ معظم شاہی ملازمت کے ساتھ ساتھ ایک بڑی جائداد کے بھی مالک تھے۔ شیخ وجیہ الدین یعنی شاہ صاحب کے والد بھی عالمگیر کی فوج میں ملازم تھے، اس لئے ان میں کسی کو طبابت کے ذریعۂ معاش بنانے کی ضرورت پیش نہیں آئی، تو شاہ عبدالرحیم صاحب نے البتہ نہ کوئی ملازمت کی اور نہ شاہی دربار اور امرا سے کوئی مدد لی، اس لئے وہ طبابت کو ذریعۂ معاش بنا سکتے تھے مگر ان کے حالات پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے بھی صلحا کے طریقہ کے مطابق قناعت و توکل ہی کی زندگی بسر کی اور مستقل طور سے کوئی ذریعۂ معاش اختیار نہیں کیا، لیکن مرشد کی دعا کے مطابق انہیں جمعیت ظاہری و دولت ہمیشہ نصیب رہی ______ شاہ صاحب کے محلہ میں ایک بزرگ خواجہ ہاشم رہتے تھے، انہوں نے ایک دن شاہ صاحب سے بطور امتحان کہا کہ میں ایک درود جانتا ہوں، جس کے پڑھنے سے آدمی متمول ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا "خدائے تعالیٰ مرا بواسطہ والدین نقدی رساند دیگر احتیاج ندارم"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ والد محترم شیخ وجیہ الدین کچھ

ان کے اجداد نے ذریعۂ معاش نہیں بنایا تھا۔

وفات | فرخ سیر کے عہد میں بروز چہارشنبہ ۱۲ر صفر ۱۱۳۱ھ ۰۰ کی عمر میں وفات پائی، اور مقام مہندیون جہاں اس خانوادہ کے دوسرے گوہرِ شب چراغ پوشیدہ ہیں، آپ بھی مدفون ہوئے۔

علم و فضل | اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی رح کے اجداد میں قاضی محمود نے عہدۂ قضا چھوڑ کر حکومت کے دوسرے کام سنبھال لئے تھے، جس سے ان کے خاندان میں علم کا چرچا بالکل ختم تو نہیں ہوا مگر اس میں کمی ضرور آگئی۔ قاضی محمود کے بعد بھی بہت دنوں تک اس خاندان میں علمی زندگی کیطرف کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی۔ لیکن شاہ عبدالرحیم صاحب کی ذات سے دوبارہ چرچا شروع ہوا، اور انہوں نے خاندان کی قدیم علمی روایات کو زندہ کیا، اور پھر سے ان علمی مشاغل کو رواج دیا، جو ایک ایک کرکے خاندان سے مٹ رہے تھے، شاہ صاحب کی علمی استعداد اور ذہانت کا کچھ تذکرہ پہلے کیا جاچکا ہے، چند واقعات یہاں بھی درج کئے جاتے ہیں:

شاہ صاحب کے استاذ میر زاہد ہروی نے معقولات اور علم کلام کی کتابوں پر جو اہم حواشی (زوائد ثلاثہ) لکھے ہیں، آج تک عربی درسگاہ اور خصوصاً درس نظامی کا ضروری جزء ہیں، ان اہم اور دقیق حواشی کی تحریر و ترتیب میں شاہ عبدالرحیم صاحب کی بھی شرکت تھی، شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

ظاہراً تسوید حاشیہ شرح مواقف بہ تقریب قرأۃ حضرت ایشاں بود (انفاس ص ۳۴)

والد محترم کے درس کی وجہ ہی سے مواقف کا حاشیہ انہوں نے لکھا۔

شاہ عبدالعزیز اس کو اور واضح طور سے لکھتے ہیں:

و شریک مسودۂ حواشی بودند (ملفوظات ص ۸۵)

وہ اس حاشیہ کے لکھنے میں شریک رہے

فقہ پر شاہ صاحب کی بڑی گہری نظر تھی، خود ان کے استاد میرزاہد کو بھی اس کا اعتراف تھا، ایک مرتبہ کسی رئیس نے میرزاہد سے شرح وقایہ پڑھنے کی خواہش کی، میرزاہد نے منظور تو کرلیا، مگر جب تک شاہ صاحب موجود نہیں ہوتے تھے، سبق نہیں پڑھاتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

امیرے شرح وقایہ می خواند بے جد بزرگوار سبق نمی فرمود (ملفوظات ص ۸۲)

علمی مجلسیں اور مباحثے | سید شیخ علم اللہ (شیخ آدم بنوری کے خلیفہ) نے تمباکو کی تحریم میں ایک رسالہ

ف دہلی میں اسوقت تمباکو کے جواز اور تحریم و اباحت پر بڑے زور کی مناظرانہ بحثیں اور رسالہ بازی ہو رہی تھی، سید شیخ علم اللہ عہد عالمگیری کے مشہور بزرگ ہیں اور حضرت سید احمد شہید رح کے جد امجد تھے جن کا مزار تکیہ ۔ رائے بریلی میں ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ان کے حالات میں مستقل کتاب لکھی ہے

لکھا تھا اور قرآن کی اس آیت
فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ ۝ (اس روز کا انتظار کیجئے، جب آسمان پر ایک صاف اور ظاہر دھواں دکھائی دے۔)
سے تحریم پر استدلال کیا تھا، انہوں نے اس رسالہ کو اپنے دو شاگردوں کے ذریعہ علمار دہلی کے پاس تصدیق کے لئے بھیجا، اتفاق سے وہ طالب علم سب سے پہلے رسالہ شاہ عبدالرحیم صاحب کے پاس لائے، انہوں نے دیکھ کر فرمایا کہ یہ استدلال غلط ہے، اور اس آیت کے شان نزول[1] علمائے تفسیر کی آراء اور فقہ و حدیث کی روشنی میں اس آیت کا مطلب واضح کیا، وہ لوگ تائید کے متوقع تھے، اس لئے شاہ صاحب کی بات پسند نہیں آئی، اور وہ ناخوش ہو کر چلے گئے۔

ملا یعقوب تمباکو کی اباحت کے قائل تھے، اور اس کے جواز کے ثبوت کے لئے درس کے اوقات میں بھی حقہ پیتے تھے، سید علم اللہ کے شاگرد شاہ صاحب کے یہاں سے ملا یعقوب کے پاس پہنچے، اور ان کے سامنے رسالہ پیش کیا، انہوں نے اباحت کے دلائل کو ان کے سامنے بیان کیا، وہ دونوں طالب علم پھر شاہ صاحب کے پاس آئے، انہوں نے فرمایا کہ تم نے تحریم کا جو دعویٰ پیش کیا تھا، وہ تو بہر حال غلط ہے، اس کے بعد آپ نے ملا یعقوب کے استدلالات کے متعلق فرمایا کہ ان سے جا کر پوچھو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہد اسی لئے تو حرام کر لیا تھا کہ حضرت زینب نے کہا تھا کہ آپ کے منہ سے مغافیر (بدبودار پھول) کی بو آتی ہے، شہد سے آپ کی کراہت کی وجہ کیا تھی؟ حدیث میں لہسن اور پیاز کے کھانے کے بعد فلا یقربن مسجدنا (ہماری مسجد کے قریب نہ جائیں) کا حکم کیوں دیا گیا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلعم خوشبو کو پسند اور بدبو کو ناپسند فرماتے تھے، ان آیات اور احادیث سے کیا پتہ نہیں چلتا کہ رسول اللہ کو ہر بدبودار چیز ناپسند اور بار خاطر ہوتی تھی، اس لئے اتباع سنت اور تقویٰ کا تقاضا تو یہی ہے کہ اس قسم کی تمام چیزوں کو ترک کر دیا جائے، یہ دونوں طالب علم پھر ملا یعقوب کے پاس آئے، اور شاہ صاحب کی پوری تقریر نقل کی، ملا یعقوب نے اپنی لغزش کا اعتراف کیا، اور حقہ پینا چھوڑ دیا (انفاس)

مسائل فقہیہ میں شاہ ولی اللہ صاحب کی اعتدال پسندی شاہ عبدالرحیم صاحب کے اسی فیض صحبت کا نتیجہ تھی ایک مرتبہ شاہ صاحب کے مکان پر شہر کے علماء وصلحاء کا مجمع تھا، اس مجمع میں ایک شخص نے سوال کیا کہ خواجہ حافظ تو کہتے ہیں کہ

---

[1] اس آیت میں قحط زدوں کی حالت اور کیفیت کی طرف اشارہ ہے۔

امروز چوں جمال تو بے پردہ ظاہر است
در حیرتم کہ وعدۂ فردا برائے چیست

اور عقائد کی کتابوں میں لکھا ہے، کہ دنیا میں خدا تعالیٰ کا دیدار نہیں ہو سکتا، ان دونوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے، وجہ تطبیق کیا ہے۔ اس سوال پر سب نے اظہار خیال کیا، مگر کوئی بات طے نہ پا سکی، آخر میں لوگوں نے شاہ صاحب سے رجوع کیا، انہوں نے علمی انداز میں شعر کی تشریح کی، اور فرمایا،

خدائے تعالیٰ محتجب است محجوب نیست

یعنی وہ اپنی ذات کی طرف سے تو عیاں ہے، مگر ہماری مادی آنکھوں کے لئے وہ پوشیدہ ہے، خواجہ حافظ نے حالت شوق میں فرمایا ہے، کہ اے خدا تعالیٰ تیرا جمال عام ہے، اور یہ ہماری آنکھوں کا قصور ہے کہ تجھے دیکھ نہیں پاتیں، تو پھر ہماری آنکھوں کا پردہ کیوں نہیں اٹھا دیتا کہ وہ اسی دنیا میں تجھے دیکھ لیں، وعدۂ فردا سے کیا فائدہ، تمام مجمع نے شاہ صاحب کی اس تشریح کی تحسین کی، اور اسے قبول کیا۔

ایک مرتبہ شاہ صاحب کسی صاحب حال بزرگ سے ملنے گئے، انہوں نے فرمایا، میرے دل میں بہت دنوں سے یہ خدشہ پیدا ہو رہا ہے، اور کسی طرح اطمینان نہیں ہوتا، کہ علما کہتے ہیں کہ دنیا میں رویت باری محال ہے، اور میں بالکل عیاں اور ظاہر طور سے دیکھتا ہوں، اگلے صوفیہ نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ شعر اسی معنی میں کہا گیا ہے۔

دیدہ را فائدہ آنست کہ دلبر بیند
ور نہ بیند چہ بود فائدہ بینائی را

شاہ صاحب نے کہا، آپ فرماتے ہیں کہ ظاہر و عیاں دیکھ رہا ہوں، یہ بصیرت کا بصر سے اشتباہ ہے، پھر فرمایا، اپنی آنکھ بند کیجئے۔ انہوں نے بند کر لی۔ شاہ صاحب نے ان سے پوچھا کہ اس وقت آپ کا وہ پہلا ادراک باقی ہے یا نہیں، انہوں نے فرمایا، ہاں باقی ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا، یہی اشتباہ کی پہچان ہے، اس وقت آپ کو (آنکھ بند کرنے کی صورت میں) جو ادراک ہو رہا ہے، وہ بصر کا نہیں، بلکہ بصیرت ہے۔ اور آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ بھی بصری کا ہے۔ اسی طرح آپ رویت باری کا مشاہدہ تو دیدہ بصیرت سے کرتے ہیں۔ مگر سمجھتے ہیں کہ یہ مشاہدہ بصر سے ہو رہا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی دقت نظر اور تطبیق بین المسائل کی خصوصیت میں بڑی حد تک شاہ صا

کی اس متوازن ذہنیت اور تربیت کا ہاتھ تھا، خود شاہ ولی اللہ صاحب نے کئی جگہ اس طرف اشارہ کیا ہے۔

متن قرآن کی تعلیم | ہندوستان میں علم دانائی اور معقولات کے مقابلہ میں دوسرے دینی علوم کی حیثیت ہمیشہ ثانوی رہی ہے، اور اس سے بہت کم اعتنا کیا گیا، دسویں صدی میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے فیض سے حدیث کا چرچا تو عام ہوا، مگر قرآن ابھی تک بیضاوی اور کشاف ہی کے ذریعہ سمجھا جارہا تھا، متن قرآن کے پڑھنے پڑھانے کا رواج ابھی شروع نہیں ہوا تھا، ہندوستان کے علماء میں شاہ عبدالرحیم صاحب پہلے شخص ہیں جنہوں نے قرآن کو فلسفہ اور منطق کے سہارے کے بغیر پڑھا پڑھایا، اور ہندوستان میں اس سنت حسنہ کو زندہ کیا، ان کے بعد ان کے خانوادہ نے اس طریقہ کو اپنے ترجموں اور درس و تدریس کے ذریعہ عام کردیا، شاہ ولی اللہ صاحب کہتے ہیں:

غالباً در حلقہ یاراں بیروں از تلاوت ہر روز دو رکوع بہ تدبر و بیان معانی می خواندند (انفاس العارفین ص ۹۶)

شاہ ولی اللہ صاحب جہاں اپنے اوپر انعام الٰہی کا ذکر کرتے ہیں، وہاں اپنے والد کے اس طریقہ درس کو اپنے لیے نعمت عظمٰی اور فتح عظیم فرماتے ہیں۔ جزء لطیف میں ہے:

از جملہ منن عظمٰی بریں ضعیف آں بود کہ چند بار در مدرسہ قرآن عظیم با تدبر ...... بہ خدمت ایشاں حاضر شدم و ایں معنی سبب فتح عظیم افتاد (انفاس ص ۲۴)

(باقی)

بقیہ: حدیث نبوی کا تحقیقی اور تربیتی مطالعہ

موجودہ دور کا سب سے بڑا فتنہ اور ہماری نوجوان نسل کے بگاڑ کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس وقت ان کو نہ تو گھر میں اچھی صحبت حاصل ہے، اور نہ تعلیم گاہوں میں اور نہ محلہ و پڑوس میں، اسی لئے نیک لوگوں کی صحبت، دینی ماحول اور وعظ و پند کی مجلسوں سے انہیں گھبراہٹ ہوتی ہے۔ وہ بازار میں پورا دن اور پوری رات گذار دیں گے، مگر مسجد میں انہیں چند منٹ رہنا بھی گراں گذرتا ہے، غلط قسم کے دوستوں کی صحبت میں جوان کی صحت اور پیسہ دونوں برباد کرتے ہیں، ان کا دل لگتا ہے، مگر جن لوگوں کی صحبت میں ان کو پاکیزہ زندگی مل سکتی ہے ان سے وہ کتراتے ہیں، اسی صحبت بد کی وجہ سے پورا معاشرہ خراب ہو جاتا ہے، غرض یہ کہ یہ حدیث نبوی ہمیں دنیا اور آخرت دونوں جگہ سرخرو رہنے کا ایک نسخۂ کیمیا بتاتی ہے۔۔

حدیث نبوی کا تحقیقی اور تربیتی مطالعہ

(اچھی اور بری صحبت کی مثال)

"عام طور پر ہمارے مدارس میں دوسرے علوم کے مقابلہ میں قرآن پاک اور حدیث نبوی کی تعلیم سرسری انداز میں دی جاتی ہے، خاص طور پر حدیث نبوی کے درس میں چند مخصوص فقہی اور اختلافی مسائل پر تو بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے، اور ان کے دلائل فراہم کرنے میں بھی پوری قوت صرف کردی جاتی ہے، مگر اس میں تحقیقی پہلو اور تربیتی انداز بہت کم اختیار کیا جاتا ہے جس سے فقہ کے مسائل و دلائل پر تو کسی قدر طلبہ کی نظر ہو جاتی ہے، مگر اس کی نحوی و ادبی خوبی، تحقیقی دقت نظری اور اس میں فکر و عمل کی اصلاح و تربیت کے جو پہلو ہوتے ہیں ان کی طرف طلبہ کی توجہ کم مبذول کرائی جاتی ہے، اسی لئے عام طور پر نئے فارغین کی زندگی میں نہ تو تفقہ فی الدین کی کوئی جھلک دکھائی دیتی ہے، اور نہ ان کے عمل میں سنت نبوی کی اتنی بھی روشنی نظر آتی ہے جتنی عام دینداروں میں ہوتی ہے۔

بحمد اللہ جامعۃ الرشاد میں قرآن و حدیث کی تعلیم اس طرح دی جاتی ہے کہ طلبہ کے اندر واقعی معنی میں "تفقہ فی الدین" پیدا ہو، اور ان کے فکر اور عمل دونوں میں وہ چیزیں رچ بس جائیں، اسی لئے یہاں درجہ سوم ہی سے قرآن پاک اور حدیث نبوی کی تعلیم اسی انداز میں شروع کردی جاتی ہے۔ درجہ سوم میں سب سے پہلے امام بخاری کی "الادب المفرد" پڑھائی جاتی ہے پھر درجہ چہارم میں مشکوٰۃ کا دوسرا حصہ، یعنی فضائل قرآن، کتاب الدعوات، کتاب الآداب اور کتاب الرقاق وغیرہ کتاب الملاحم تک پڑھایا جاتا ہے، اس کا پہلا حصہ درجہ پنجم میں پڑھایا

جاتا ہے۔ ابتدائی درجات میں قرآن پاک کی ہر آیت کی اور حدیث نبوی میں ہر باب کی دو
چار حدیثوں کی تعلیم اسی انداز پر دی جاتی ہے۔ تاکہ طلبہ دوسری حدیثوں کو اسی انداز پر سمجھنے
کی کوشش کریں، بحمد اللہ یہ انداز تدریس کتاب ختم کرا دینے سے زیادہ مفید معلوم ہوا۔
قرآن وحدیث کے کئی گھنٹے مرتب کے پاس بھی رہتے ہیں، ایک ہونہار طالب علم اختر حسین
نیپالی متعلم درجہ چہارم نے درس حدیث کے جو نوٹ کچھ اپنی ذاتی محنت سے اضافہ کرکے تیار
کئے ہیں، اس کا ایک حصہ ناظرین الرشاد کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ عام
لوگوں کو بھی اس سے فائدہ پہنچے گا، اور خاص طور پر طلبہ کے لئے یہ چیز بہت ہی مفید ثابت ہوگی
گو اس میں کچھ طالبعلمانہ کمیاں ہیں مگر پھر بھی نئے فارغین اور طلبہ کے لئے یہ فائدے سے
خالی نہیں ہے" ——— (مرتب)

عن ابی موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ
ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال:
انما مثل الجلیس الصالح وجلیس
السوء کحامل المسك ونافخ
الکیر فحامل المسك اما ان
یحذیك واما ان تبتاع منه
واما ان تجد منه ریحا طیبة
ونافخ الکیر اما ان یحرق ثیابك
واما ان تجد منه ریحا منتنة
(مشکوٰۃ بحوالہ بخاری ومسلم)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضؓ سے روایت ہے کہ
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نیک اور
برے ساتھی کی مثال عطر فروش اور بھٹی پھونکنے
والے لوہار کی طرح ہے، عطر فروش یا تو تمہیں
معطر رولی کا ایک آدھ پھاہا بطور ہدیہ دے
دے گا یا تم اس سے (عطر) خرید وگے یا کم از
کم وہاں پاک خوشبو ملے گی، اور بھٹی پھونکنے
والا (لوہار) یا تو تمہارے کپڑے جلا دے گا
یا تمہیں وہاں کریہہ بدبو سونگھنے کو
مل گے۔

لغوی تحقیق

انما مثل ، انما حرف حصر ہے، اور مثل عجیب وغریب بات کو کہتے ہیں، یہ لفظ دور کی چیز کو
قریب لانے اور کسی اہم اور بڑی بات کو سمجھانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

"ذٰلِكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ" ۔ مثالوں سے ذہن پر اچھا اثر پڑتا ہے اور اس سے تاثیر پیدا ہو جاتی ہے ۔ اسی لئے قرآن کریم میں کثرت سے مثالیں دی گئی ہیں۔

الجلیسُ الصالح : الجلیس الصالح سے یہاں بہترین اور اخلاق کریمہ کا حامل دوست مراد ہے جیساکہ دوسری حدیث شریف میں آتا ہے " لاتصاحب الا مومنا ولا یاکل طعامك الا تقی "، یعنی صرف مومن دوست کی صحبت اختیار کرو، اور تمہارا کھانا صرف متقی آدمی کھائے۔

جلیس السُّوء : اس سے یہاں برا دوست اور ساتھی مراد ہے، جس کی فطرت بگڑی ہوئی ہو اور اخلاق برے ہوں السوء بالفتح مصدر ہے اور بالضم اسم مصدر ہے، ارباب لغت کے نزدیک فتح السین والضم دونوں جائز ہے، یہ لفظ قرآن پاک میں دونوں طرح استعمال ہے، جلیس السوء بھی صفت موصوف

حامل المسك ؛ اس سے مراد مشک بیچنے والا ہے، عطر ایسی خوشبو ہوتی ہے، جس سے طبیعت خوش ہو جاتی ہے، یعنی اچھے ہم نشیں اور ساتھی کی مثال عطر فروش کی ہے، اس کے مقابلہ میں برے ساتھی کی مثال بھٹی پھونکنے والے یعنی لوہار ہی سے دی جاسکتی ہے، اس کے لئے نافخ الکیر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

نافخ الکیر: الکیر لوہار کی بھٹی کو کہتے ہیں اور نافخ الکیر سے مراد لوہار ہے جو آگ کو پھونکتا ہے اور لوہا گرم کرتا ہے۔

تبتاع منه : تو اس سے خریدے۔ یہ باب افتعال سے فعل مضارع ہے اور خرید و فروخت میں بطور مبالغہ استعمال ہوتا ہے، جیساکہ حدیث شریف میں ہے "اذا رأیتم من یبیع او یبتاع فی المسجد فقولوا لا اربح الله تجارتك" یعنی جب تم مسجد کے اندر کسی کو خرید و فروخت کرتے دیکھو، تو اس سے کہو کہ اللہ تعالیٰ تمہاری تجارت میں نفع نہ دے،

ان یحذیك : أن مصدریہ ناصبہ ہے اور یحذی باب افعال کے فعل مضارع کا صیغہ ہے احذاء کے معنیٰ ہیں کسی کو عطیہ یا ہدیہ دینا، اس سے مراد یہ ہے کہ عطر فروش عموماً عطر کا ایک پھاہا دیدیا کرتا ہے۔

ریحاً طیبة : طیبة، ریح کی صفت ہے، ریح کا لفظ مذکر و مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ تمہیں ایک پھاہا بطور ہدیہ نہ دے یا تم اس سے کچھ نہ خریدو تو کم از کم اس کی دوکان

پر اچھی اور بہترین خوشبو سونگھنے کو مل ہی جائے گی،

ریحا منتنۃ : یعنی کریہہ بدبو، جس سے طبیعت میں نفرت پیدا ہوتی ہے، کھانا جب خراب ہوجاتا ہے، اور اس میں بدبو پیدا ہوجاتی ہے تو نوک زبان پر یہ مقولہ آتا ہے انتن الطعام۔

نحوی تحقیق :

۱۔ انما : اس سے حصر اور تاکید کا فائدہ ہوتا ہے، اس کا ترجمہ لفظ واقعی سے کیا جا سکتا ہے۔ لفظاً اس کا کوئی عمل نہیں ہوتا، یعنی اس مثال میں حصر کا مطلب یہ ہے کہ واقعیت اور عام فہم ہونے کی حیثیت سے بری اور بھلی صحبت کی اس سے بہتر کوئی مثال نہیں دی جا سکتی۔

۲۔ مثل الجلیس : یہ مبتدا ہے اس کی خبر اگلا جملہ کحامل المسک و نافخ الکیر ہے

۳۔ فحامل المسک : مضاف مضاف الیہ مل کر مبتدا ہے اور اس کی خبر اما یحذیک پورا جملہ آخر تک ہے۔

۴۔ ریحا طیبۃ ، ریحا ، واما ان تجد کا مفعول بہ ہے اور طیبۃ اس کی صفت ہے، اسی طرح ریحا منتنۃ ہے اور اما شرطیہ ہے جو تفصیل کے معنی دیتا ہے

بلاغت :

۱۔ انما مثل : بلاغت کی اصطلاح میں اسے قصر اضافی کہتے ہیں، اور دوسرے الفاظ میں قصر موصوف علی صفت، کہتے ہیں، علماء نحو کا کہنا ہے کہ انما حصر کے لئے آتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: اِنَّمَا یَخْشَی اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ۔

۲۔ مثل الجلیس الصالح : اس میں تشبیہ تمثیلی ہے، یعنی جلیس صالح کو عطر فروش سے تشبیہ دی گئی ہے، جس کے پاس انسان جاتا ہے، اس سے عطر خریدتا ہے، یا وہ روئی کا پھاہا ہی بطور ہدیہ دے دیتا ہے، یا کم سے کم وہاں بیٹھنے سے آدمی کو عطر کی پاکیزہ خوشبو سونگھنے کو مل جاتی ہے، اسی طرح نیک آدمی کی صحبت کسی حال میں فائدہ سے خالی نہیں ہوتی۔

۳۔ کحامل المسک ونافخ الکیر : یہ جملہ لف ونشر مرتب کے طریقے پر ہے جو بہترین کلام کی خوبی ہے، یعنی جس بات کو جس ترتیب سے بیان کیا جائے اسی ترتیب سے اس کی مثال دی جائے مثلاً عطر فروش کی مثال اچھے ساتھی کی دی گئی ہے اور بھٹی پھونکنے والے لوہار کی مثال برے ساتھی کے

لے دی گئی ہے، اور اسی کو بلاغت کی اصطلاح میں "لف ونشر مرتب" کہتے ہیں، اس لئے کہ دونوں کی مثال بالترتیب دی گئی ہے، جیساکہ قرآن پاک میں ارشاد ہے جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ " (ترجمہ) تمہارے لئے رات اور دن کو بنایا تاکہ تم اس (رات) میں سکون حاصل کرو اور اس (دن) میں اللہ تعالےٰ کے فضل سے روزی تلاش کرو۔

اس آیت کریمہ میں بالترتیب لتسکنوا فیہ کا تعلق اللیل سے ہے، اور لتبتغوا من فضلہ کا تعلق النہار سے ہے۔

راوی حدیث | اس حدیث نبوی کے راوی ایک جلیل القدر صحابی حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ہیں، ان کا نام عبداللہ بن قیس ہے، وہ قبیلہ اشعریین کے ایک فرد ہیں، جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ

ان الاشعریین اذا ارملوا فی الغزو او قل طعام عیالهم بالمدینة جمعوا ما کان عندهم فی ثوب واحد ثم اقتسموا بینهم فی إناء واحد بالسویة فهم منی وانا منهم

قبیلہ اشعریین کے لوگ جب جنگ کے دوران بے سروسامان ہو جاتے ہیں یا بستی میں انکے کھانے پینے کی چیزیں کم ہو جاتی ہیں، تو ان لوگوں کے پاس جو کچھ ہوتا ہے اسے وہ جمع کرتے ہیں پھر وہ اسے آپس میں ایک برتن میں برابر بانٹ لیتے ہیں، پس وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔

آپ یمن کے رہنے والے تھے، کہ آکر مشرف بہ اسلام ہوئے اور پھر واپس جاکر اپنی قوم میں اسلام پھیلایا، اور کچھ دنوں کے بعد خدمت نبوی میں حاضری کے ارادہ سے ایک وفد لے کر چلے جس میں تقریباً پچاس ساٹھ آدمی تھے، یہ کشتی میں بیٹھ کر بحر احمر کے راستے سے مدینہ روانہ ہوئے لیکن اتفاق سے راہ میں مخالف ہوا چلی اور کشتی مدینہ کے قریب آنے کے بجائے حبشہ چلی گئی، جہاں حضرت جعفر بن ابی طالب سے انکی ملاقات ہوگئی، اور پھر ان کے ساتھ ہی فتح خیبر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، فتح مکہ کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یمن کے کچھ حصوں کا والی بنایا۔ پھر حضرت عمرؓ کے زمانے میں وہ بصرہ کے والی بنائے گئے، اور انہیں کی سرکردگی میں اہواز اور اصبہان وغیرہ فتح

ہوئے۔ پھر حضرت عثمان رضہ نے انہیں کوفہ کا ذمہ دار بنایا۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضہ کو اللہ تعالیٰ نے تفقہ فی الدین کے ساتھ حسن آواز کی دولت بھی نوازا تھا۔ وہ قرآن پڑھتے تو لحن داؤدی کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ ایک روز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کی قیام گاہ کیطرف سے گذر ہوا تو وہ لحن داؤدی کے ساتھ قرآن پاک پڑھ رہے تھے، آپ نے فرمایا کہ "لقد اوتیت مزمارًا من مزامیر آل داؤد" حضرت عمر رضہ جب ان کو دیکھتے تو فرماتے کہ "ذکرنا ربنا یا ابا موسیٰ" آپ قرآن پڑھ کر ہمارے اندر خدا کی یاد تازہ کر دیجئے تو وہ حضرت فاروق کو کچھ آیتیں قرآن کی پڑھ کر سناتے تھے۔ اہل بصرہ کو فقہ اور قرآن پاک کا علم انہیں سے ملا، شیخ علی بن المدینی کہتے ہیں کہ صحابہؓ میں قاضی چار ہوئے ہیں۔ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت زید بن ثابتؓ۔ ۶۳ برس کی عمر میں ۴۳ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

ادبی و معنوی خوبی | اس حدیث نبوی میں بھلے ساتھی کے فائدے اور برے ساتھی کے نقصانات کی مختصر الفاظ میں جیسی بہترین تصویر کشی کی گئی ہے، یہ بلاغت نبوی کا اعجاز ہے، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس کے ایک ایک لفظ سے بلاغت نبوی کا نور ٹپکتا ہے، یہ حدیث "ان من البیان لسحرا"، کی زندہ تصویر ہے اچھا ساتھی وہ ہے، جس کی ہم نشینی، روح کو سکون اور دل کو اطمینان و مسرت سے بھر دے، اس کی زبان میں لطف و محبت ٹپکے، اس کی ہم نشینی قلب و دماغ کے لیئے نشاط و انبساط کا سامان فراہم کرے واقعی نیک دوست خوشحالی اور صحت میں ایک قیمتی سامان زندگی ہوتا ہے، اور بدحالی میں سکون و تسلی کی آماجگاہ اور زخمی دل کا مرہم اور نفس کی راحت ہے، جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

صحبۃ الصالحین بلسم قلبی انہا للنفوس اعظم راق

یعنی نیک لوگوں کی صحبت میرے دل کا مرہم ہے، اور وہ نفس کے لئے سب سے زیادہ خوشگوار چیز ہے۔

اسی لئے جلیس صالح کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عطر فروش سے تشبیہ دی ہے، جس کی تھوڑی دیر کی صحبت بھی دل و دماغ کو نیکی و بھلائی کی خوشبوؤں سے معطر کر دیتی ہے۔ اور مشام جان کو اس سے ایک روحانی سرور حاصل ہو جاتا ہے۔

اور برے ساتھی کی مثال لوہار کی بھٹی سے زیادہ بلیغ کوئی دوسری نہیں ہو سکتی، جو اپنی آگ کو ہر وقت پھونکتا رہتا ہے، اس کی صحبت میں فائدے کے بجائے نقصان ہی نقصان ہے، اگر اس کے

پاس بیٹھنے والا آگ سے نہ جلے، تو کم از کم اس کی بھڑکتی ہوئی چنگاریوں کی لپیٹ تو ضرور ہی اس کو لگے گی، الغرض اس کی تھوڑی دیر کی بھی صحبت تکلیف یا نقصان سے خالی نہیں ہے۔
کسی شاعر نے اس شعر کا جواب طلب کیا ؎

مالی أری یذوی الشمع فی معادنہ ✻ من صحبۃ النار ام من فرقۃ العسل

یعنی کیا بات ہے کہ موم اپنے معدن میں پگھل رہا ہے۔ کیا ایسا آگ کی وجہ سے ہے یا شہد کی جدائی کے غم کی وجہ سے ہے؟
کسی ادیب نے اس کا جواب دیا ؎

من لم تجانسہ فاحذر ان تجالسہ ✻ ما ضر بالشمع الا صحبۃ الفتل

یعنی جو تمہارا ہم جنس اور ہم مذاق نہ ہو اس کی صحبت سے بچو کیونکہ موم کو اسکی ناجنس بتی کی صحبت ہی پگھلا رہی ہے
اسی طرح ایک مقولہ ہے "من جالس جانس"۔ یعنی جس نے کسی کی صحبت اختیار کی وہ اس کا ہم جنس ہو جاتا ہے، اس لئے کہ ہم نشینوں سے نفس انسانی خیر یا شر ضرور اختیار کرتا ہے، اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے کا حکم دیا ہے "یا ایہا الذین آمنو اتقو اللہ وکونوا مع الصادقین" اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اور یہ تقویٰ اگر حاصل کرنا ہے تو پھر سچے اور اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔

صحبت صالح ترا صالح کند ✻ صحبت طالح ترا طالح کند

اس حدیث نبوی میں برے اور بھلے افراد بھی مراد ہیں، بری اور بھلی مجلسیں بھی مراد ہیں اور بری اور بھلی جگہیں بھی مراد ہیں، مثلاً انسان جب مسجد میں ہوتا یا ذکر و وعظ کی مجلس میں ہوتا ہے تو اس کے قلب و دماغ کی کیفیت کچھ اور ہوتی ہے، اس کے کان کلمات خیر ہی سنتے ہیں، اور زبان سے کلمات خیر ہی ادا ہوتے ہیں، یا پھر وہ اپنی خاموشی سے بہت سی برائیوں سے اپنے کو بچا لیتا ہے، اس کی آنکھیں نیکی و بھلائی کی فضا میں ڈوبی ہوئی رہتی ہیں، وہ ایسا محسوس کرتا ہے کہ خدا کے دربار میں حاضر ہے
اس کے برخلاف اگر وہ بازار میں یا کسی ہوٹل میں یا کسی غلط تفریح گاہ یا کسی مشاعرہ اور قوالی کی مجلس میں پہنچ جاتا ہے تو اس کے دل و دماغ کی وہ حالت باقی نہیں رہ جاتی، اس وقت اس کے کان میں شر و فساد کی باتیں پڑتی ہیں، اس کی آنکھیں اچھے اور بھلے مناظر کے بجائے ناقابل ذکر مناظر دیکھتی ہیں اور اسکی زبان اگر کلمۂ شر و فساد سے محفوظ رہی تو لایعنی اور فضول باتوں سے تو محفوظ رکھنا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

وحدتِ امت

(مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ)

اقتباس ایک صبح نمازِ فجر کے وقت حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ صدر المدرسین و شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند سر پکڑے ہوئے بہت مغموم بیٹھے ہیں، میں نے پوچھا حضرت مزاج کیسا ہے؟ کہا: ہاں ٹھیک ہی ہے، میاں مزاج کیا پوچھتے ہو، عمر ضائع کر دی۔ میں نے عرض کیا، حضرت آپ کی ساری عمر علم کی خدمت اور دین کی اشاعت میں گذری ہے، اگر آپ کی عمر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی؟

حضرت نے فرمایا: ہماری عمر کا، اور ہمارے درس کی تقریروں کا، ہماری ساری کد و کاوش کا خلاصہ یہ رہا کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کر دیں، کیا حاصل ہے اس کا؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو "صواب محتمل الخطاء" ثابت کر دیں، یعنی درست مسلک جس میں خطاء کا احتمال موجود ہے، اور دوسرے مسلک کو "خطاء محتمل الصواب" کہیں۔ یعنی غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے، اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں ان تمام بحثوں اور تحقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں ——— پھر فرمایا اے میاں! اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا، کہ کون سا مسلک صواب تھا اور کون سا خطاء۔

اجتہادی مسائل صرف یہی نہیں کہ دنیا میں ان کا فیصلہ نہیں ہو سکتا، بلکہ قبر میں بھی منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا ترک رفع یدین حق تھا، آمین بالجہر حق تھی یا بالسر حق تھی، اور نہ برزخ میں اس کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو رسوا کرے گا، نہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو، نہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو نہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو۔ جن کو اللہ نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا، جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے

بڑے حصے کو لگایا، جنہوں نے نورِ ہدایت چار سو پھیلایا، جن کی زندگیاں سنت کا نور پھیلانے میں گذریں، اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کرے گا۔ وہ میدان حشر میں کھڑا کرکے یہ نہیں معلوم کرے گا کہ امام ابوحنیفہ رح نے صحیح کہا تھا یا امام شافعی رحمۃ نے، یہ نہیں ہوگا۔

تو جس کو نہ دنیا میں نکھرنا ہے، نہ برزخ میں، نہ محشر میں، اسی کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کردی، اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی، اور جو مسائل سبھی کے مابین متفق تھے، اور دین کی جو ضروریات سبھی کے نزدیک اہم تھیں، جن کی دعوت انبیاء کرام علیہم السلام لے کر آئے تھے، جن کی دعوت کو عام کرنے کا حکم ہمیں دیا گیا تھا، آج یہ دعوت تو نہیں دی جا رہی ہے۔

وہ منکرات جن کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی تھی، آج وہی منکرات پھیل رہے ہیں، گمراہی پھیل رہی ہے، الحاد آرہا ہے، شرک و بت پرستی چل رہی ہے حلال و حرام کا امتیاز اٹھ رہا ہے، لیکن ہم لگے ہوئے ہیں ان فروعی بحثوں میں۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ نے فرمایا: اس لئے غمگین بیٹھا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ عمر ضائع کردی۔

خلفاء راشدین اور صحابہ کرام کے عہد میں امور انتظامیہ کے علاوہ جب نئے نئے حوادث اور شرعی مسائل پیش آئے، جن کا قرآن و حدیث میں صراحتاً ذکر نہ تھا، تو صحابہ و تابعین کو قرآن و سنت کے نصوص میں غور کر کے تعارض کو رفع کرکے اور شرعی مسائل کے استخراج میں اپنی رائے اور قیاس سے کام لینا پڑا تو ان میں اختلاف رائے ہوا، جس کا ہونا عقل و دیانت کی بنا پر ناگزیر تھا۔

پھر صحابہ کرام کے شاگرد حضرات کا یہ عمل بھی ہر اہل علم کو معلوم ہے کہ ان میں سے ایک جماعت کسی صحابی کی رائے کو اختیار کرلیتی تھی، لیکن اس پورے خیر القرون میں کہیں ایک واقعہ بھی ایسا سننے میں نہیں آیا کہ دوسرے کو فاسق کہتے ہوں، یا کوئی مخالف فرقہ سمجھ کر ایک دوسرے کے پیچھے اقتدا کرنے سے روکتے ہوں ان اختلاف آرا کی بنا پر ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدل، سب و شتم، توہین و استہزا، یا فقرہ بازی کا تو ان مقدس زمانوں میں کوئی تصور ہی نہ ہوا۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب اسیر مالٹا نے رہائی کے بعد علماء سے فرمایا:

"میں نے جیل کی تنہائیوں میں غور کیا کہ پوری دنیائے اسلام دینی اور دنیوی حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہی ہے، تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا

قرآن پاک چھوڑنا، دوسرے آپس میں اختلاف اور خانہ جنگی، اس لئے میں وہیں
سے عزم لے کر آیا کہ قرآن کریم کی تعلیمات اور اس پر عمل کو عام کیا جائے اور مسلمانوں
کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔"

آپ غور فرمائیں کیا آپ اس پر عمل کر رہے ہیں؟

اس دور کے بعض علما، فروعی اختلافات پر اکثر تقریریں کر کے یہ تاثر دیتے ہیں کہ دین اسلام میں کئی فرقے ہیں۔ اور مسلمانوں میں شدید تعصب اور نفرت کی فضا پھیلاتے ہیں۔ حقیقت میں اسلام کے بنیادی احکام اور اصولوں پر کوئی بھی اختلاف نہیں ہے مسلمانوں میں موجودہ فرقہ بندی دیوبندی بریلوی اہل حدیث تو صرف ستر اسی سال سے شروع ہوئی ہے، فرقہ واریت نے وحدت ملت کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔

مسلمانو! فرقہ بندی ختم کرو

پیران پیر سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ امام احمد بن حنبل رح کے مقلد تھے آمین بلند آواز سے کہتے تھے، اور رفع یدین کرتے تھے، اللہ تعالٰی نے انہیں اتنا بلند مرتبہ دیا کہ تمام مسالک کے اکابر ان سے عقیدت رکھتے ہیں، جن سے ظاہر ہے کہ دین اسلام میں مسلک سے زیادہ تقویٰ عبادت اور اعمال صالح کی اہمیت ہے۔

(ماہنامہ "الرشید" جمادی الاخریٰ ۱۴۰۸ھ۔ ساہیوال۔ پاکستان)

نوٹ از ادارہ

یہی وہ آواز تھی جسے آج سے نوّے برس پہلے ندوۃ العلما، (لکھنؤ) کے پلیٹ فارم سے ہندوستان کے مختلف الخیال علماء نے اٹھائی تھی، جس سے ہندوستان کے دوسرے حلقے بھی متأثر ہوئے، اور بحمداللہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فارغ علماء نے اس اعتدال پسندی کا پورا ثبوت دیا، جس حلقہ اور جس مکتب فکر میں جو خوبی نظر آئی اس کے اپنانے میں انہوں نے ایک لمحہ بھی تأمل نہیں کیا، اور نہ انہوں نے کسی طرح کی "گروہی عصبیت" کو اپنے دل و دماغ میں کوئی جگہ دی۔ بلکہ دوسرے حلقے کے متعدد بزرگوں کی نیازمندی سے بھی دریغ نہیں کیا۔

مگر افسوس ہے کہ اب بھی بعض حلقے علم و تقویٰ کو اپنے ہی اندر دائر سمجھتے ہیں، اور دوسرے حلقوں میں انہیں کوئی خوبی نظر نہیں آتی، اور مسلکی اختلاف کو تو جانے دیجئے وہ تھوڑے سے "فقہی اختلاف"

باقی صـ۳۱ پر

جامعۃ الرشاد میں طلبہ کے

بحمداللہ جامعۃ الرشاد کے ذمہ داروں کا ذہن ہمیشہ کھلا رہا ہے۔ انہوں نے کوشش کی ہے کہ جن چھوٹے یا بڑے مدارس میں جو خوبیاں نظر آئیں، ان سب کو اپنایا جائے۔ اسی لئے انہوں نے اپنے نصاب تعلیم و طریقۂ تربیت میں بھی اپنے کو کسی خاص دائرہ میں محدود نہیں کیا ہے۔ اور نہ طلبہ کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے، بلکہ تعلیم وتزکیہ دونوں کی خوبیوں کو یکجا کرنے کی کوشش ہمیشہ جاری رکھی گئی، اور بحمداللہ اس میں کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے، اوپر حدیث نبوی کے تحقیقی مطالعہ کے ضمن میں طریقۂ درس کے بارے میں کچھ باتیں آچکی ہیں۔ اب یہاں جامعۃ الرشاد میں طلبہ شب و روز کس طرح گذارتے ہیں، اس کی تھوڑی سی تفصیل اس امید پر کر دی جاتی ہے، کہ ممکن ہے اس میں کوئی ایسی خوبی نظر آجائے جس سے دوسرے مدارس کے ذمہ دار فائدہ اٹھا سکیں۔

مدرسہ میں فجر کی اذان تہجد کا وقت ختم ہوتے ہی ہوتی ہے اذان سے ۳۰، ۳۵ منٹ پہلے طلبہ کو نگراں صاحب اٹھا دیتے ہیں، اور طلبہ وضو کرکے تلاوت شروع کر دیتے ہیں، اس میں حافظ کے طلبہ کی قید نہیں ہے، بلکہ عربی درجات اور مکتب کے بچے بھی اسی وقت اٹھا دیئے جاتے ہیں، اور وہ بھی تلاوت میں مشغول ہو جاتے ہیں، اذان سے دس منٹ پہلے ایک رکوع کی تلاوت کوئی مجود طالب علم لاؤڈ اسپیکر پر کرتا ہے اور تلاوت کے فوراً بعد اذان ہو جاتی ہے، اذان کے ۳۵ منٹ بعد جماعت کھڑی ہوتی ہے، جماعت کے

---

[1] یہاں یہ ذکر کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ قرآن پاک سے زیادہ سے زیادہ مناسبت پیدا کرنے کیلئے عربی کے ابتدائی درجات کے تین سالوں میں طلبہ کو سورہ حجرات سے سورہ ناس تک مع تجوید حفظ کرنا ضروری ہے، اور اسکا باقاعدہ امتحان ہوتا ہے، اسی طرح ہر درجہ کے لئے کم سے کم ۲۵ حدیثیں اور ضروری دعائیں یاد کرنا ضروری ہے۔

کھڑے ہونے سے پانچ منٹ پہلے طلبہ تلاوت بند کر کے سنت پڑھتے ہیں، جماعت کے بعد پھر آدھ گھنٹہ طلبہ تلاوت میں مشغول رہتے ہیں، آدھ گھنٹہ کے بعد پھر طلبہ اپنے کمرہ میں جا کر کمرہ کی صفائی کرتے ہیں، اور بستر وغیرہ درست کرتے ہیں، پھر پندرہ منٹ کے بعد پی۔ٹی۔ کی گھنٹی لگ جاتی ہے، اور ایک استاذ کی نگرانی میں چھوٹے بڑے تمام طلبہ کو پی۔ ٹی یعنی دس بارہ قسم کی ہلکی ورزش کرائی جاتی ہے، پی ٹی ختم ہوتے ہی ناشتہ کی گھنٹی لگ جاتی ہے، ناشتہ کا انتظام مدرسہ کی طرف سے ہوتا ہے، عام طور پر اس میں چنے کی گھگھنی اور جاڑوں کے موسم میں اس کے ساتھ ایک پیالی چائے بھی دی جاتی ہے، آدھ گھنٹہ بعد درجہ کی گھنٹی لگ جاتی ہے، تمام طلبہ دو تین صفوں میں کھڑے ہو جاتے ہیں، ایک طالب علم پہلے سورۃ الفاتحہ کی تلاوت تجوید کے ساتھ کرتا ہے اور سارے بچے دہراتے ہیں، پھر دو لڑکے مل کر کوئی حمد پڑھتے ہیں عام طور پر مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی حمد "تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا" پڑھتے ہیں، پھر وہی لڑکے مولانا جامی کی مناجات "بادشاہا جرم مارا در گذار" تمام طلبہ کو پڑھاتے ہیں، پھر ایک لڑکا مختلف اوقات کی جامع دعائیں سید الاستغفار کے ساتھ سب طلبہ کو پڑھاتا ہے، پھر طلبہ اپنے اپنے درجہ میں چلے جاتے ہیں۔

یہ عربی اور حفظ کے طلبہ کا پروگرام ہے، مکتب عام طور پر عربی درجات کے ایک گھنٹہ بعد لگتا ہے، اور وہ بھی اسی طرح ترانہ پڑھتے ہیں، البتہ ترانے کے بعد ان کے سامنے کوئی طالب علم ساتوں کلمے، نماز کی پوری دعائیں، دعائے قنوت کبھی آذان کی دعا، اور کبھی جنازہ وغیرہ کی دعائیں سب کو پڑھاتا ہے، پھر وہ درجہ میں چلے جاتے ہیں، گرمیوں میں، دونوں درجات کی چھٹی بارہ بجے ہوتی ہے، مکتب کے بچے وضو کر کے مسجد میں چلے جاتے ہیں۔ سنت کے بعد اول وقت میں ظہر کی فرض نماز ان کو بلند آواز سے پڑھائی جاتی ہے، جس کی نگرانی مکتب کے اساتذہ کرتے ہیں، اس کے بعد ان کی چھٹی ہو جاتی ہے عربی اور حفظ کے بچے اور مکتب کے جو بچے دار الاقامہ میں رہتے ہیں، ان کے لئے سوا بارہ بجے بار کی گھنٹی لگتی ہے، نوکر کھانا پکا کر کھانے کے ہال میں پہونچا دیتے ہیں، اور دستر خوان لگا دیتے ہیں، اور کھانا کھلانے کی جن لڑکوں کی باری ہوتی ہے، وہ وہاں پہنچ کر پہلے اساتذہ کو کھانا ان کے کمرہ میں پہنچا دیتے ہیں، پھر طلبہ کے لئے الگ الگ پلیٹوں میں سالن نکال دیتے ہیں، اور روٹی ہر پلیٹ کے ساتھ رکھ دیتے ہیں، اس کے بعد کھانا کھانے کی گھنٹی لگتی ہے، چھوٹے طلبہ ایک طرف بیٹھتے ہیں اور بڑے ایک طرف

اگر کسی لڑکے کو کوئی چیز کم ہو تو وہ اشارہ سے مانگتا ہے، جب روٹی ختم ہو جاتی ہے، تو باری والے طلبہ چاول ہر پلیٹ میں لگا دیتے ہیں، اور اگر کوئی لڑکا سالن یا دال مانگتا ہے تو وہ اسے دے دیتے ہیں، کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھ کر کھانے اور کھانے کے بعد کی دعا پڑھنے کی بھی تاکید سے ہدایت کی جاتی ہے، بحمداللہ طلبہ اس کے عادی ہو گئے ہیں، کھانے کے بعد تمام طلبہ کو سو جانے کی ہدایت کی جاتی ہے، ایک بجکر ۵ منٹ پر ظہر کی اذان ہوتی ہے۔ اور بیس منٹ بعد سوا دو بجے جماعت ہوتی ہے، جماعت کے بعد چار بجے تک ہر طالب علم کو پڑھنا ضروری ہے، اساتذہ اس کی نگرانی کرتے ہیں، چار بجے سے ۴¾ بجے تک ان کو نہانے دھونے یا کوئی اور کام کرنے کی آزادی ہے۔ پھر پانچ بجے عصر کی نماز ہوتی ہے، نماز کے بعد ختم خواجگان پڑھی جاتی ہے، اور اگر کوئی عام ہدایت یا نصیحت کرنی ہوتی ہے تو اسی وقت دس منٹ کے اندر کر دی جاتی ہے، اور پھر طلبہ ہلکے پھلکے کھیل کود میں لگ جاتے ہیں۔ دوپہر کے بعد کا یہ پروگرام گرمیوں میں صرف دو مہینے رہتا ہے، برسات اور جاڑے میں عربی اور حفظ کے درجات ۸ ۸½ بجے اور مکتب ۹½ بجے لگتا ہے، اور مدرسہ دونوں وقت چلتا ہے، مکتب کے جو بچے شہر سے آتے ہیں، وہ اپنا کھانا لے کر آتے ہیں، اور پھر وہ ظہر اور عصر کی نماز پڑھ کر گھر جاتے ہیں، ان دنوں میں شام کو مکتب کے بچوں کی چھٹی پندرہ منٹ پہلے ہوتی ہے، اس مدت میں بچے وضو کر کے پہلے دو رکعت مشق نماز بلند آواز سے پڑھتے ہیں، یعنی ایک لڑکا آگے نیت باندھ کر پڑھتا ہے، اور دوسرے لڑکے نیت باندھ کر اس کے پیچھے بلند آواز سے دہراتے ہیں۔

نماز مغرب کے بعد عربی طلبہ مطالعہ و مذاکرہ میں لگ جاتے ہیں، اور حافظہ کے لڑکے قرآن پاک کے یاد کرنے میں، مکتب کے بچے الگ یکجا بیٹھکر پڑھتے ہیں، ان سب کی نگرانی اساتذہ حضرات کرتے ہیں، یہ سلسلہ جاڑوں میں دو گھنٹے اور گرمیوں میں ڈیڑھ گھنٹے جاری رہتا ہے، اسی لئے عشاء کی نماز تاخیر سے ہوتی ہے، عشاء کی اذان سے ۳۵ منٹ پہلے کھانے کی گھنٹی لگتی ہے، اور لڑکے کھانا کھا کر عشاء کی نماز پڑھتے ہیں عشاء کے بعد طلبہ کو اختیار ہوتا ہے، وہ اپنے اپنے کمروں میں پڑھیں یا پھر سو جائیں، صرف حافظہ کے لڑکوں کے لئے عشاء کے بعد بھی آدھا گھنٹہ پڑھنا ضروری ہے، یہاں یہ بھی ذکر کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ طلبہ کو نوافل کے اہتمام پر ابھارا جاتا ہے، اور ہر نماز کے بعد تسبیح فاطمہ پڑھ کر پھر طلبہ سنت و نفل پڑھتے ہیں عصر کی نماز کے بعد تمام طلبہ و اساتذہ ختم خواجگان پڑھ کر مدرسے کے لئے دعا کرتے ہیں۔

عصر کی نماز کے بعد جن طلبہ کو بازار وغیرہ جانے کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اجازت لیکر باہر جا سکتے ہیں،
بقیہ طلبہ مدرسہ کے احاطہ کے اندر ہی کھیل کود یا چہل قدمی کرتے ہیں

لباس اور صفائی | طلبہ کو قلب و دماغ کی صفائی کے ساتھ ظاہری صفائی اور سادگی پر بھی آمادہ کیا جاتا ہے
اسی لئے ان کے لئے لباس مقرر ہے، کرتا، پاجامہ اور دوپلی ٹوپی ہر طالب علم کیلئے ضروری ہے، مکتب کے جو بچے
شہر سے آتے ہیں، ان سے بھی اس کی پابندی کرائی جاتی ہے۔
صحن اور برآمدے کی صفائی تو عموماً ملازمین کرتے ہیں، مگر کمرہ کی صفائی طلبہ خود کرتے ہیں، بحمداللہ مدرسہ
میں فلیش سسٹم بیت الخلاء اور عمدہ قسم کے پیشاب خانے اور غسل خانے بنے ہیں، ان کی صفائی روزانہ طلبہ ہی
کرتے ہیں، جن طلبہ کی کھانا کھلانے کی باری ہوتی ہے، وہی اس دن اسکی دھلائی کرتے ہیں اسی لئے اسمیں جوتا چپل پہنکر جانے کی اجازت نہیں ہے، اسی طرح مسجد کی روزانہ
صفائی بھی طلبہ ہی کرتے ہیں۔ جمعہ کے دن مدرسہ کی نالیوں اور صحن وغیرہ کی صفائی بھی طلبہ ہی کرتے ہیں، ان سے یہ
اس لئے کرایا جاتا ہے کہ ان میں اجتماعی خدمت کی عادت پڑے، ہمارے مدارس میں انفرادی خدمت کا جذبہ
تو ابھارا جاتا ہے، مگر اجتماعی خدمت کا جذبہ مفقود نظر آتا ہے، اس لئے طلبہ فارغ ہونے کے بعد خادم سے زیادہ مخدوم
بننے کی کوشش کرتے ہیں، اور جب بہت سے مخدوم جمع ہو جاتے ہیں، اور خادم کوئی نہیں بنتا تو مخدومین میں کشمکش پیدا
ہوتی ہے، اور اس سے بہت سے فتنے پیدا ہوتے ہیں، اسی لئے انفرادی خدمت سے زیادہ اجتماعی خدمت کا ذہن طلبہ
میں پیدا کیا جاتا ہے۔ پھر انفرادی خدمت سے خود غرضانہ اور خوشامدانہ ذہن پیدا ہوتا ہے، اس لئے اس سے گریز کیا
جاتا ہے۔

جماعت کا اہتمام | وقت سے اذان اور جماعت کا روزانہ پانچوں وقت اہتمام کیا جاتا ہے، اذان رضاکارانہ
طور پر خوش آواز طلبہ دیتے ہیں، اور امامت عموماً تجوید کے اساتذہ کرتے ہیں، بحمداللہ جماعت میں بہت کم ہی طلبہ
مسبوق ہوتے ہیں، جو اکابر یہاں تشریف لاتے رہتے ہیں، انہوں نے اس اہتمام پر اپنے کلمہ خیر سے ہمیشہ کارکنوں کی ہمت افزائی
کی ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک

لائبریری | مدرسہ کے کتب خانہ کے علاوہ طلبہ کی انجمن ندوۃ الطلبہ کی الگ لائبریری ہے جس میں معتد بہ تعداد میں
دینی و اخلاقی اردو کی کتابیں ہیں، شوقین طلبہ عصر بعد آکر بیٹھکر مطالعہ کرتے ہیں۔

تقریر | جمعرات کے دن عربی درجات کے پورے گھنٹے ظہر سے پہلے ختم ہو جاتے ہیں اور ظہر کے بعد عربی تقریر کا پروگرام ہوتا ہے،
جسمیں عربی طلبہ شریک ہوتے ہیں، اور پھر مغرب کے بعد اردو تقریر ہوتی ہے جس میں سارے طلبہ شریک ہوتے ہیں، مکتب کے بچوں کا

[illegible]

الرشاد کی ڈاک

پاریس
۱۵ر جمادی الاولیٰ ۱۴۰۳ھ

محترمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ستمبر ۱۹۸۲ء کا شمارہ ابھی ابھی فروری ۱۹۸۳ء کے اختتام پر پہنچا ہے، شکر گزار ہوں۔ اس کے صفحہ ۴۳ پر آپ کے ایک بیان کا اقتباس بھی ہے کہ مغازی امام زہری" مصنف عبدالرزاق کے ضمن میں شائع ہو چکی ہے"۔

یہ سہو قلم یا سہو حافظہ ہے، مصنف عبدالرزاق کی آخری دو جلدوں میں جامع معمر بن راشد چھپی ہے اور اس کے آڈیٹر مولانا اعظمی (مولانا حبیب الرحمٰن صاحب) کو اشتباہ نہ ہوا کہ یہ ایک الگ کتاب ہے، مصنف عبدالرزاق نہیں، بلکہ عبدالرزاق کے استاذ معمر بن راشد کی کتاب الجامع ہے۔

فواد سزگین کے مطابق مغازی زہری کے اقتباسات کو الدوری نے شائع کیا ہے، اور یہ کہ زہری اصل میں مؤلف نہیں، بلکہ عروہ کے راوی ہیں، عروہ کی مغازی کے اقتباسات حال میں ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی نے شائع کئے ہیں۔

والسلام
(ڈاکٹر) محمد حمید اللہ صاحب (پیرس)

کسی دوسرے کی چیز یا کسی ادارہ یا دفتر کی چیز بغیر اجازت اپنے ذاتی استعمال میں لانا خیانت ہے، اس سے آدمی کے اندر چوری و بے حیائی پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر بڑی سے بڑی بددیانتی کی عادت پڑ جاتی ہے۔

غزل

جناب محمد طفیل صاحب مدنی ۔ الہ آباد یونیورسٹی ۔ الہ آباد

جدا جو سلسبیل و زمزم و کوثر میں رہتے ہیں
وہ سارے ذائقے یکجا میرے ساغر میں رہتے ہیں

صدا توحید کی بت خانوں سے اٹھے تو کیا حیرت
خلیل وقت اکثر خانۂ آزر میں رہتے ہیں

بھلا بتلائیں گے کیا اہل ثروت کرب کی لذت
یہ ہم سے پوچھئے ہم کرب کے محشر میں رہتے ہیں

سنائی دیتی ہیں سانپوں کی پھنکاریں جہاں اکثر
ہمارا حوصلہ دیکھو ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں

یہ بیچارے اسیران قفس سمجھیں گے کیا ان کو
عزائم جو کسی شاہیں کے بال و پر میں رہتے ہیں

اگر اک غم ہو تو شکوہ کرے کوئی زمانے سے
نہ جانے کتنے غم اک غم کے پس منظر میں رہتے ہیں

تصور ہی سے جن کے ساری دنیا کانپ اٹھتی ہے
وہ سیلاب حوادث تو میری ٹھوکر میں رہتے ہیں

نشان سجدہ سے آخر جبیں کیسے رہے خالی
نقوش سجدہ ہائے شوق جب پتھر میں رہتے ہیں

نگاہ فتنہ زا ، دزدیدہ نظریں شرمگیں آنکھیں
نہ جانے کتنے فتنے ایک حسیں پیکر میں رہتے ہیں

طفیل اہل جنوں نے یہی اکثر بتایا ہے
وہ دل ہائے شکستہ اور چشم تر میں رہتے ہیں

خاکہ سامنے آجاتا ہے کہ اس کی روشنی میں صحیح اسلامی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دارالمصنفین سے شائع ہوا تھا

اہل کتاب صحابہ و تابعین

مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی

اس کتاب میں ان صحابہ اور تابعین کا تذکرہ ہے. جو یہودی یا عیسائی تھے اور انہوں نے اسلام قبول کیا. اس کتاب میں تقریباً سو صفحے کا ایک قیمتی مقدمہ بھی ہے جس سے عرب کے یہود و نصاریٰ کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے

اس پر مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کا دیباچہ بھی ہے. اس موضوع پر دنیا کی کسی زبان میں کوئی مکمل کتاب موجود نہیں ہے

خطبۂ نکاح

نکاح کے موقع پر جو خطبہ دیا جاتا ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور یہ ایک اہم معاشرتی ہدایت اور اصلاح معاشرہ کا پیغام ہے. مگر عام طور پر اس کے الفاظ دہرا دیئے جاتے ہیں، اس کا پورا مفہوم لوگوں کے ذہن نشین نہیں ہو پاتا ہے. اس کتابچہ میں اس کے ایک ایک لفظ کی ایسی موثر تشریح کی گئی ہے کہ یہ ہر نکاح کے موقع پر تقسیم کرنے کے قابل ہے. یہ تشریح مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی کے قلم سے ہے. صفحات قیمت

اہل دل کی باتیں

یہ بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپگڈھی مدظلہٗ کے ان ملفوظات کا مجموعہ ہے جو وہ اپنی نجی مجلسوں میں اپنی پراثر اور پرسوز زبان سے فرماتے رہے ہیں. اسے مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد نے مرتب کیا ہے. اس کا بیشتر حصہ ماہنامہ الفرقان میں بھی شائع ہو چکا ہے. اب یہ جواہر پارے کتابی شکل میں دارالتالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد کی طرف سے شائع کئے جا رہے ہیں.

فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل

یہ محترم ناظم جامعۃ الرشاد کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو معارف اعظم گڈھ میں شائع ہو چکے ہیں یا مختلف سیمیناروں میں پڑھے گئے ہیں جس میں جدید مسائل کے حل کیلئے وہ بنیادیں فراہم کی گئی ہیں جن کی روشنی میں جدید سے جدید مسائل حل کئے جا سکتے ہیں. یہ کتاب جامعہ ملیہ نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے اور اس پر اردو اکیڈمی نے مصنف کو انعام بھی دیا ہے. قیمت

ملنے کا پتہ:۔ شکیل احمد منیجر مکتبہ جامعۃ الرشاد. رشاد نگر شہر اعظم گڈھ. یوپی

d. No R. N. 38937/81

Monthly Jameatur Rashad

Phone:-46

Azamgarh (U.P.)

شہر اعظم گڈھ کا مشہور ادارہ

جَامِعۃُ الرَّشَادْ

ایک نظر میں

ادارے کے شعبے

(۱) عربی درجات (۲) درجہ حفظ وقرأت (۳) ابتدائی تعلیم کے مکاتب وجونیر ہائی اسکول (۴) کتابت وجلدسازی
(۵) اسلامی نرسری اسکول (۶) الجامعۃ الشرعیہ اس کے ذریعہ نکاح وطلاق کے مسائل کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ (۷)
شعبہ نشر واشاعت جس کے تحت کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں
ان تمام شعبوں میں کئی سو طلبہ ابتدائی اور اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، ڈیڑھ درجن سے زیادہ
لائق اساتذہ کام کر رہے ہیں۔

ادارے کا خرچ

ادارے کا سالانہ خرچ ڈیڑھ لاکھ روپئے سے زیادہ ہے۔

ادارہ کی اہمیت اور خصوصیت (۱) جامعۃ الرشاد میں اعلیٰ عربی تعلیم کے ساتھ انگریزی زبان اور ضروری جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ (۲) یہاں سے عالمیت پاس کرنے کے بعد بی۔اے میں براہ راست داخلہ مل جاتا ہے۔ (۳) سعودی عرب کی بعض یونیورسٹیوں نے ہر کلیہ میں اس کا معادلہ منظور کرلیا ہے۔ کئی طلبہ داخل ہوکر فارغ ہوچکے ہیں اور اس سال بھی کئی طالب علموں کی درخواستیں بھیجی جارہی ہیں۔ (۴) اعلیٰ دینی تعلیم کے ساتھ بچوں کی بہترین دینی اور اخلاقی تربیت بھی کی جاتی ہے۔ جو لوگ بچوں کا داخلہ چاہتے ہوں ان کو رمضان المبارک میں خط وکتابت کرنا چاہیے۔ مکتب کے بچوں کا داخلہ ۲۵ رجون کے بعد شروع ہوجاتا ہے۔

ماہنامہ

الرشاد

جامعہ

دارالتالیف والترجمہ کی تصانیف

عبادت و خدمت
مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہٗ

اس رسالہ میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور عام انسانوں کی خدمت بھی عبادت ہے، اور اس پر اسی طرح اجر و ثواب ملتا ہے جس طرح فرض عبادات پر ملتا ہے۔ اگر فرض عبادات کے اہتمام کے ساتھ ہمارے اندر عام انسانوں کی خدمت کا جذبہ بھی پیدا ہو جائے تو نفرت و حقارت کے بہت دبیز پردے ہٹ جائیں گے اور اسلام سے عام انسانوں کے دلوں میں ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ سائز ۲۲×۱۸ صفحات ۵۶، قیمت ۷۵ پیسے

دینی مدارس اور ان کی ذمہ داریاں
یہ محترم مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد کی ان تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ ہے جو وہ طلبہ، اساتذہ، منتظمین مدرسہ اور عربی مدارس کے ذمہ داروں کے سامنے کرتے رہے ہیں۔ یہ تقریریں اور تحریریں دردو اثر میں ڈوبی ہوئی ہیں، ان میں بعض تقریروں کو محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہٗ نے اپنے تائیدی نوٹ کے ساتھ الفرقان میں شائع فرمایا اور شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب مدظلہ العالی نے ایک بڑے مجمع میں پڑھوا کر سنوایا اور فرمایا کہ اسے ہر استاذ اور طالب علم کو پڑھنا چاہئے۔ سائز ۲۲×۱۸، صفحات ۱۰۰، قیمت ۱/۲۵

اسلامی تعلیم
حصہ اول، دوم، سوم، چہارم

بچوں کو اسلامی مسائل ذہن نشین کرانے کے لئے اردو زبان میں درجنوں رسالے لکھے گئے ہیں، مگر اس رسالہ کا انداز بیان اتنا دلچسپ ہے اور مسائل ایسے آسان طریقے سے سمجھائے گئے ہیں کہ بچے اسے قصہ کہانی کی کتاب کی طرح دلچسپی و شوق سے پڑھتے ہیں۔ چار حصوں میں تمام ضروری مسائل آگئے ہیں۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت حصہ اول ۵۰/، دوم ۵۵/، سوم ۶۰/، چہارم ۶۵/

تبع تابعین حصہ اول
مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہٗ

کتاب میں ۱۴۹ اکابر تبع تابعین کا مفصل تذکرہ ہے، شروع میں مصنف کے قلم سے ایک فاضلانہ مقدمہ بھی ہے جس سے اسلام کی ابتدائی دو صدی کے دینی، تہذیبی و سیاسی تاریخ کا ایسا

مولانا مجیب اللہ ندوی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے نشاط پریس ٹانڈہ میں چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد، رشاد نگر اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کا ترجمان

ماہنامہ

الرشاد

سالانہ چندہ	
ہندوستان سے	24.00
چندہ ششماہی	12.00
قیمت فی پرچہ	2.50

سالانہ چندہ
ممالک غیر سے
بارہ ڈالر امریکی
$ 12.00

جلد نمبر (۳)

مئی ۱۹۸۳ء، شعبان المعظم ۱۴۰۳ھ

شمارہ نمبر (۲۹)

فہرست مضامین

مجلس ادارت

سرخ نشان علامت ہے کہ آپ کا چندہ کئی ماہ پہلے ختم ہو گیا ہے، مگر اس امید پر پرچہ بند نہیں کیا گیا کہ ممکن ہے رمضان کے مبارک مہینے میں آپ کے جذبۂ خیر کو حرکت پیدا ہو، اور آپ اس کار خیر میں تعاون کر سکیں۔

• پرچہ کی توسیع اشاعت کے مستقل ذمہ دار مولوی عقیل احمد صاحب ندوی ہیں۔ مگر شعبان و رمضان میں دوسرے حضرات بھی ہمیں بھیجیں گے

رشحات

ہندوستان نے آزادی کے بعد اقتصادی، صنعتی اور فوجی حیثیت سے یقیناً غیر معمولی ترقی کی ہے، اور شدید گرانی کے باوجود ہر طرف خوشحالی کی چہل پہل نظر آتی ہے، مگر اس مادی ترقی کے ساتھ اخلاقی حیثیت سے ملک یہی نہیں کہ پہلے کے مقابلہ میں پیچھے ہو گیا ہے، بلکہ دیوالیہ ہوتا جا رہا ہے، اور خاص طور پر ہندوستان کے ہندی بولنے والے صوبوں میں یہ اخلاقی انحطاط اپنی آخری حد تک پہونچ گیا ہے، بعض برائیاں اور اخلاقی خرابیاں جن کے بارے میں حکومت اور عوام دونوں قدرے حساس واقع ہوئے ہیں، ان کی روک تھام کی قانونی کوشش کی جا رہی ہے، مثلاً چوری، ڈاکہ، اغوا اور زنا بالجبر وغیرہ، مگر وہ اخلاقی خرابیاں جو عموماً قانون کی گرفت میں نہیں آتیں، یا ان کے فوری اثرات محسوس نہیں ہوتے لیکن وہ ایسی خرابیاں ہیں کہ وہ ملک کے وقار و کردار کو خاک میں ملا دیتی ہیں، اور عوام ان کی تکلیفوں سے کراہ رہے ہیں، مثلاً آپ کسی دفتر چلے جائیے، بغیر رشوت دیئے آپ ایک ادنیٰ کام بھی نہیں کرا سکتے، پہلے فائل نکالنے کے لئے چپراسی ایک روپیہ اپنا حق سمجھتے تھے، اب بعض آفسوں میں دس روپئے سے کم میں آپ کوئی فائل نہیں نکلوا سکتے، ابھی رجسٹریشن آفس بنارس میں دو بار مدرسہ کے رجسٹریشن فائل نکلوانے میں دس دس روپئے مدرسہ کے منشی جی کو دینے پڑے، رجسٹریشن کے رینول (تجدید) کی فیس دس روپئے ہے، مگر ڈھائی سو روپئے کا مطالبہ ہے، یا تو اسے پورا کیا جائے، ورنہ پھر کام ہونا مشکل ہے۔ کچہریوں سے جن لوگوں کو واسطہ ہے، وہ بتا سکتے ہیں کہ اسوقت انصاف کتنا مہنگا ہو گیا ہے، بلکہ نایاب ہو گیا ہے، شاید ہی کوئی بڑا سے بڑا حاکم ایسا ہے جو چند سو یا چند ہزار روپئے کے بدلے انصاف کا خون نہ کرتا ہو، چند پرانے وکلاء کو چھوڑ کر نئے وکلاء زیادہ تر موکلوں کو دھوکہ فریب دیکر اور دلالی اور مجرموں کی ہمت افزائی کر کے پیسہ کماتے ہیں، چک بندی محکمہ جس میں کتنے لوگوں کی زندگی اور موت کا فیصلہ قانون گو اور اے۔ سی۔ او جیسے تیسرے درجہ کے لوگوں کے ہاتھ میں دیدیا گیا ہے، جو رشوت لے کر سیاہ کا سفید اور سفید کا سیاہ کرتے رہتے ہیں، پہلے کے پٹواری اور لیکھ پال دس بیس یا سو پچاس میں بکتے تھے، اور اب انکی قیمت گرانی الاؤنس کے ساتھ لگتی ہے، ڈاکخانہ ایک ایسا محکمہ تھا جس کی کارکردگی آزادی کے بعد بھی بہت دنوں تک قدرے غنیمت رہی مگر اب اس کا نظام ابتر سے ابتر ہو گیا ہے، عام خطوط قسمت ہی سے ملتے ہیں، رجسٹری کے ٹکٹ بھی چرا لئے جاتے ہیں، فارن کی کئی رجسٹری پورے ٹکٹ لگا کر بھیجی گئی جن میں سے چھ روپئے کے ٹکٹ نکال لئے گئے، اور بمبئی سے یہ لکھ کر رجسٹری واپس آئی کہ ٹکٹ کم ہیں، دوبارہ ٹکٹ لگا کر بھیجا گیا، لکھنؤ کے خط کئی کئی مہینے کے بعد ملتے ہیں، تار کا معاملہ خط سے بھی زیادہ برا ہو گیا ہے، ریلوے کا حال اس سے بھی برا

ہے۔ اور اب تو اس کے سفر میں جان و مال اور عزت و آبرو کے لئے بھی ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے، سیاسی لیڈروں ایم۔ ایل۔ اے
ایم۔ پی اور وزیروں کی رشوت خوری، بددیانتی اور عیش پرستی نے ماحول کو آخری حد تک گندا کر ڈالا ہے، سارے جرائم
کی آماجگاہ، قوم کے یہی نمائندے ہوتے ہیں، اسکول و کالج کے ذریعہ خاص طور پر یوپی و بہار میں جو نسل تیار کی جارہی ہے، اس
میں نہ تو علمی صلاحیت پیدا ہو رہی ہے، اور نہ اخلاق و تہذیب کا کوئی سایہ ان پر پڑ رہا ہے، نہ استاد کی عزت محفوظ ہے اور
نہ پرنسپل کی، اور عوام ان کے فتنے و فساد سے ہر وقت ڈرتے رہتے ہیں، وہ امتحان میں نقل چھپکر نہیں، بلکہ کتاب رکھ کر
کتاب کھول کر کرتے ہیں، اور کاپی باہر سے لکھوا کر منگاتے ہیں، اور اب تو غضب یہ ہے کہ والد صاحبان بہ نفس نفیس بیٹوں کی
مدد کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں، خود ہمارے عوام کا حال یہ ہے کہ ان کے اندر نہ آپس میں ہمدردی اور بھائی چارگی دکھائی دیتی
ہے اور نہ خلوص، اور نہ ایک دوسرے کی عزت و آبرو کا خیال و پاس باقی رہ گیا ہے، جو کچھ قدر رہ گئی ہے، وہ پیسہ اور دولت کی ہے،
اس نے ہماری زندگی میں خدا کی حیثیت حاصل کر لی ہے، اگر اسمیں کمی واقع ہو تو وہ کسی کی گردن مار دینے اور جلا کر خاک کر دینے
میں بھی دریغ نہیں کرتے ہیں، نہ جانے کتنی معصوم بچیاں صرف اسی دولت کا ڈھیر لے کر سسرال نہ آنے کی وجہ سے بے دردی کے
ساتھ قتل کر دی گئی اور جلا ڈالی گئی ہیں۔

میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ چوری ڈاکہ، اغوا اور زنا بالجبر کے روک تھام کی کچھ نہ کچھ کوشش ہو رہی ہے، مگر دوسری
طرح کی اخلاقی خرابیوں کی اصلاح کی کوئی کوشش نہیں ہو رہی ہے، ان خرابیوں کے لئے قانون ضرور موجود ہے، مگر ظاہر
ہے کہ قانون سے بچنے کے لئے آدمی ہزار تدبیریں پیدا کر لیتا ہے، ضرورت ہے ذہن و دماغ کے بدلنے کی، قلب و ضمیر میں اخلاقی
حس پیدا کرنے کی، اور جس کو نہ تو ملک کی قسمت کے معمار سیاسی لیڈر کوئی اہمیت دے رہے ہیں، اور نہ ہماری درسگاہوں
کے اساتذہ اور ذمہ داروں میں عملاً اس کی کوئی اہمیت باقی رہ گئی ہے، یہی حال عوام کا ہے کہ ان کے نزدیک مادی منفعت
اور دولت کی فراوانی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے، وہ معمولی سے معمولی فائدہ کے لئے بڑی سے بڑی اخلاقی قدر کو پامال
اور ہمدردی اور بھائی چارہ کے قوی سے قوی رشتے کو کاٹ سکتے ہیں، اور انسانیت کا خون کر سکتے ہیں، اور کر رہے ہیں۔

بظاہر اس صورت حال میں کسی تبدیلی کے آثار دکھائی نہیں دیتے، اس میں تھوڑی بہت تبدیلی اگر کوئی طبقہ
لا سکتا تھا، تو وہ مسلمانوں کا طبقہ ہے، اس لئے کہ بحمد اللہ اب بھی اس طبقہ میں خدا کا خوف، اخلاقی حس، اخلاقی
قدر و قیمت کا احساس بالکل فنا نہیں ہوا ہے، اور خاص طور پر علماء اور تعلیم یافتہ مسلمان چاہے کتنے محدود پیمانے
پر سہی، کچھ نہ کچھ اخلاقی اصلاح کی مثال قائم کر سکتے تھے، مگر افسوس ہے کہ پورے ہندوستان میں مولانا سید
ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے علاوہ کوئی اس کی کسک محسوس نہیں کر رہا ہے، اور نہ اس کے لئے کوئی آواز اٹھا رہا ہے۔

بلکہ صورت حال جتنی بگڑتی جا رہی ہے ہم سب اپنے کو اس میں اڈجسٹ یعنی اس کے مطابق بنانے کی کوشش میں لگے ہوگئے ہیں، اور ہمارا پورا معاشرہ آہستہ آہستہ اسی ڈگر پر چلا جا رہا ہے، جو عام باشندگان ملک کی ڈگر ہے، حالانکہ ہم "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" اور "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی"، کے لئے نہیں پیدا کئے گئے ہیں، بلکہ ہمارا شیوہ "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز" کا ہونا چاہئے، حالات چاہے جتنے بگڑ جائیں ایک مومن کی حیثیت سے ہمیں بہرحال اپنا ناصحانہ اور داعیانہ فرض ادا کرنا ہی چاہئے۔ قرآن پاک نے یہود کی سرکشی و نافرمانی کا ذکر کرتے ہوئے یہ واقعہ نقل کیا ہے، کہ جب ان میں سے کچھ لوگوں نے ازراہ ہمدردی یہ کہا کہ:

لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا اللّٰہُ مُھْلِکُھُمْ — تم لوگ ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جو ہلاک ہی ہونے والے ہیں

تو نصیحت کرنے والوں نے جواب میں کہا:

قَالُوْا مَعْذِرَۃً اِلٰی رَبِّکُمْ — انہوں نے کہا تاکہ ہم اپنے رب کے سامنے اپنی معذرت پیش کر سکیں کہ ہم نے اپنے فرض میں کوتاہی نہیں کی۔

اس بگڑے ہوئے ماحول میں بھی لوگ ہم سے یہ آس لگائے ہوئے ہیں کہ ہم اس فرض کو انجام دے سکتے ہیں، دو ذاتی واقعے سے آپ کو اس کا اندازہ ہوگا۔

ہمارے شہر اعظم گڈھ میں ایک ممتاز ہندو وکیل ہیں جو مدرسہ کے بعض مقدمات دیکھتے ہیں۔ ان کی لڑکی کی شادی تھی، انہوں نے مجھے بھی مدعو کیا، تعلقات کی وجہ سے دو دن پہلے میں ان کے یہاں گیا، اور شادی کی تفصیل پوچھی تو انہوں نے اخراجات کی جو تفصیل بتائی، تو اس پر میں نے ان سے کہا کہ آپ کے سماج میں تو لڑکی کی شادی ایک مصیبت ہوگئی ہے، خاص طور پر غریبوں کے لئے۔ انہوں نے کہا کہ آپ بالکل صحیح کہتے ہیں، مگر کیا کیا جائے مجبوری میں کرنا پڑتا ہے، پھر انہوں نے کہا کہ، مولوی صاحب آپ لوگ (یعنی مسلمان) اس مصیبت کو کچھ دور کر سکتے تھے، مگر اب تو آپ لوگ خود ہی اس میں گرفتار ہوگئے ہیں،، ان کے اس جملہ کے بعد مجھے اتنی شرمندگی ہوئی کہ میں پھر کچھ کہہ نہ سکا۔ البتہ حسب حال مصرعہ زباں پر آیا کہ

او خویشتن گم است کرا رہبری کند۔

اسی طرح ایک مسلمان ایکزیکیٹو انجینئر کے یہاں لڑکی کی شادی میں میں نے خطبۂ نکاح کی تشریح میں شادی بیاہ میں سادگی پیدا کرنے کے سلسلہ میں مذکورہ بالا واقعہ کا ذکر کیا جس میں درجنوں بڑے بڑے غیر مسلم افسر شریک

باقی ۴۴

حضرت فضیل بن عیاضؒ

(مجیب اللہ ندوی)

تبع تابعین میں جن بزرگوں کا زہد و اتقاء ضرب المثل تھا، انہیں حضرت فضیل بن عیاض بھی تھے، علم و فضل کے لحاظ سے بھی معاصرین میں یہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، مگر دلوں میں ان کی فضیلت اور عظمت و جلالت ان کے زہد و اتقاء ہی کی وجہ سے تھی۔ ان کی زندگی توبہ و انابت الی اللہ کی صحیح تصویر تھی۔

خاندان ان کا خاندان صوبہ خراسان کی ایک بستی طالقان کا رہنے والا تھا۔ جو بعد میں فندین میں آباد ہو گیا تھا۔ اسی فندین کے قریب ایک بستی اَبیوَرد تھی، وہیں ان کی ولادت[1] ہوئی۔

ابتدائی حالات فضیل گو ایک آزاد مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ مگر ان کو سازگار ماحول نہیں ملا جس کی وجہ سے ان کی عادتیں بگڑ گئیں، اور کچھ دنوں میں وہ ایک مشہور ڈاکو کی حیثیت سے مشہور ہو گئے، ان کی ڈاکہ زنی کا اتنا چرچا تھا کہ خراسان کے آس پاس سے قافلے گذرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

توبہ ان کی زندگی کے یہی لیل و نہار تھے کہ یکایک فضل ایزدی نے ان کا دامن پکڑا، اور ان کو توبہ کی توفیق نصیب ہوئی۔ ان کی توبہ کی داستان میں کتنوں کے لئے سامان بصیرت ہے۔ ان کو کسی لڑکی سے عشق ہو گیا تھا مگر خواہش نفس کی تکمیل کی کوئی سبیل پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ ایک دن موقع پا کر اس کے گھر کی دیوار پھاند کر اندر داخل ہونا چاہتے تھے کہ کسی خدا کے بندے نے یہ آیت تلاوت کی۔

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ آمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ	کیا ابھی اہل ایمان کے لئے وقت نہیں آیا ہے،
قُلُوْبُهُمْ لِذِکْرِ اللّٰهِ	کہ ان کے دل اللہ کی یاد کے لئے جھک جائیں۔

کلام الٰہی کی یہ دل گداز آواز ان کے کانوں میں پہنچی، اور کانوں کے ذریعہ دل میں اتر گئی، ایمان کی دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھیں بے اختیار بول اٹھے۔ یارب آن، پروردگار، وہ وقت آ گیا۔ کہ میں بحر معاصی سے نکل کر تیرے دامن رحمت میں پناہ لوں۔ وہاں سے وہ اسی وقت واپس ہوئے، رات کا وقت تھا، اس لئے ایک خرابہ میں ٹھہر گئے، پاس ہی کوئی قافلہ پڑاؤ ڈالے پڑا تھا، اہل قافلہ آپس میں مشورہ کر رہے تھے، کہ کب رخت سفر باندھا جائے بعضوں کا خیال تھا کہ اسی وقت چل دینا چاہیے۔ مگر اہل تجربہ نے رائے دی کہ صبح ہونے سے پہلے

---

[1] ابن خلکان ج ۲ ص ۱۵۸۔

سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے، اسی راستہ پر فضیل قافلوں پر ڈاکے ڈالتا ہے۔ فضیل کا بیان ہے کہ میں نے دل میں سوچا کہ میں رات بھر معاصی میں غرق رہتا ہوں، اور بندگان خدا مجھ سے ڈرتے ہیں، حالانکہ خدا نے ان کے درمیان مجھے اس لئے نہیں بھیجا ہے۔ پھر صدق دل سے توبہ کی اور یہ دعا کی،

اللّٰھم انی تبت الیک وجعلت توبتی مجاورۃ البیت الحرام[1]	اے خدا میں تیری طرف پلٹتا ہوں، اور اس توبہ کے بعد اپنی زندگی کو تیرے گھر کی خدمت کے لئے مخصوص کرتا ہوں۔

اس توبۂ نصوح کے بعد ان کو علم دین کی تحصیل کا شوق دامن گیر ہوا، اور اسی شوق میں وہ ترک وطن کرکے کوفہ آئے، یہاں امام اعمش، شیخ منصور اور بعض دوسرے ائمہ حدیث سے اکتساب فیض کیا، پھر حسب وعدہ جوار حرم کو اپنا مسکن بنایا، اور پھر اسی کے سایہ میں پوری زندگی بسر کردی[2]

علمی مقام پچھلی زندگی کا ان پر کچھ ایسا ردعمل ہوا تھا، کہ وہ گوشہ گیر ہوکر ایک گونہ دنیا سے بے تعلق ہوگئے تھے، عام طور پر محدثین ایسے زاہدوں اور گوشہ گیروں کو کوئی علمی مقام نہیں دیتے تھے، اور نہ ان کی روایتوں کو قبول کرتے تھے، مگر فضیل بن عیاض کی ذات اس سے مستثنیٰ تھی، ان کی روایتوں کو عام محدثین نے قبول کیا ہے، اور خود بھی ان سے روایت کی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فضیل بن عیاض کی زہدپسندی نے انہیں حصول علم دین سے بے نیاز نہیں کردیا تھا۔ توبہ کے بعد گو ان کی عمر کافی ہوچکی تھی، لیکن وہ اس کے باوجود کوفہ پہنچے، اور وہاں ممتاز شیوخ حدیث و فقہ سے استفادہ کیا[3]

ان کے ممتاز شیوخ فقہ و حدیث یہ ہیں: امام اعمش، سلیمان التیمی، منصور بن معتمر، حمید الطویل، یحییٰ بن سعید الانصاری، محمد بن اسحٰق، جعفر بن محمد الصادق، اسماعیل بن خالد، سفیان ثوری وغیرہ ہیں[4] فقہ میں خاص طور پر انہوں نے فقہ کے سب سے ممتاز ائمہ، امام ابوحنیفہ، اور محمد بن ابی لیلیٰ سے استفادہ کیا[5]

زہد و اتقاء میں ان سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد کا حصر تو ناممکن ہے۔ مگر جن لوگوں نے زہد و اتقاء کے ساتھ ان سے علمی استفادہ کیا تھا، ان کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ سفیان ثوری گو ان کے شیوخ میں ہیں، مگر

---

[1] تہذیب ج ۸ ص ۲۹۵ [2] ابن خلکان ج ۲ ص ۱۵۸ [3] البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۹۸ و تہذیب الاسماء نووی ج ۲ ص ۵۱ [4] البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۹۸ و تہذیب الاسماء نووی ج ۲ ص ۵۱۔ اور تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۲۹۴۔ [5] الجواہر المضیہ ج ۱ ص ۴۰۹۔

خود انہوں نے بھی ان سے روایت کی ہے، اسی طرح سفیان بن عیینہ، ابن مبارک اور امام شافعی ان کے تلامذہ میں ہیں، ان کے علاوہ یحییٰ بن سعید القطان، ابن مہدی، عبدالرزاق حمیدی، ابن وہب، اصمعی یحییٰ بن یحییٰ التیمی وغیرہ نے ان سے استفادہ کیا تھا۔[1]

روایت حدیث میں احتیاط | تمام محدثین نے ان کے علم وفضل کا اعتراف کیا ہے، ان کی روایتیں قبول کی ہیں، لیکن اس کے باوجود تحدیث روایت سے حتی الامکان گریز کرتے تھے، امام نووی نے لکھا ہے، وہ حدیث سے سخت خائف رہتے تھے، اور اس کی روایت ان پر بہت گراں گذرتی تھی[2] خاص طور پر کسی غیر محدث سے حدیث کی روایت کو تو پسند ہی نہیں کرتے تھے۔ ایک بار کسی نے ان سے کہا کہ آپ جعفر بن یحییٰ سے روایت نہیں کرتے، تو آپ بولے کہ میں حدیث نبوی کو اس سے بلند سمجھتا ہوں کہ اس کی روایت ابن یحییٰ سے کی جائے،[3] فرماتے تھے کہ اگر کوئی مجھ سے درہم و دینار مانگ لے تو یہ میرے لئے آسان ہے، مگر مجھ سے تحدیث کی خواہش نہ کرے۔[3]

محدثین کا اعتراف | ان کے علم وفضل کی زیادہ تفصیل تذکروں میں نہیں ملتی، ابن جوزی نے ان کے حالات میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے، اگر وہ مل جاتی تو البتہ ان کے بارے میں کافی معمولات ملتیں۔ لیکن ممتاز ائمہ حدیث وفقہ نے ان کے بارے میں جو رائے دی ہے، اس سے کسی حد تک ان کے علم وفضل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سفیان بن عیینہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے[4] قاضی شریک نے ان کو حجت کہا ہے، ابن ناصر الدین نے امام الحرم، شیخ الاسلام قدوۃ الاعلام وغیرہ کے الفاظ سے ان کا تذکرہ کیا ہے[5]۔ دارقطنی اور نسائی نے ثقہ، اور ابو حاتم نے صدوق کہا ہے۔ ابن سعد نے ان کو ثقہ فاضل متقی اور کثیر الحدیث بتایا ہے، امام نووی نے لکھا ہے کہ ان کی توثیق پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ وہ صحیح الحدیث اور صدوق اللسان تھے، ان کی روایتیں صحیح اور سچی ہوتی تھیں[6] ان کے علم وفضل کی توثیق کے لئے یہ بات کافی ہے کہ ان سے سفیان ثوری، یحییٰ بن سعید القطان، امام بخاری، امام مسلم جیسے ائمہ حدیث نے روایت کی ہے، بعض محدثین ان

[1] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۵۱ [2] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۵۱ [3] الجواہر المضیئہ ج ۱ ص ۹۰۴ [4] تہذیب ج ۸ ص ۲۹۵ [5] شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۱۰ [6] تہذیب التہذیب اور تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۵۲

کی روایت قبول کرنے میں کچھ تامل بھی کرتے تھے، مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔

زہد و اتقا، | ان کے صحیفۂ زندگی کا سب سے تابناک باب یہی ہے۔ ابن مبارک جن کا زہد و اتقا خود ضرب المثل تھا، وہ فرماتے ہیں کہ فضیل اس زمانہ میں سب سے متقی آدمی تھے، دوسری روایت ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ میرے نزدیک زمین پر اس وقت ان سے زیادہ افضل آدمی کوئی دوسرا نہیں ہے[1]۔ خلیفۂ وقت ہارون رشید کہا کرتا تھا کہ علما میں امام مالک سے زیادہ بارعب اور فضیل بن عیاض سے زیادہ متقی آدمی میں نے نہیں دیکھا، ہارون رشید نے جو کچھ کہا تھا وہ سنی سنائی بات نہیں تھی، بلکہ خود اس کا ذاتی تجربہ تھا۔

فضل بن ربیع کا بیان ہے کہ امیر المومنین ہارون رشید حج کے لئے نکلے تو وہ مجھ سے بھی ملنے آئے، میں نے سنا کہ امیر المومنین آئے ہیں، تو تیزی سے اس کے پاس آیا، اور عرض کیا آپ مجھ ہی کو طلب کر لیتے، میں خود حاضر ہو جاتا۔ انہوں نے کہا کہ میرے دل میں کچھ خلش ہے، کسی ایسے آدمی کے پاس لے چلو جس سے میں اپنی تسکین حاصل کر سکوں، فضل نے کہا کہ یہاں سفیان بن عیینہ موجود ہیں۔ آپ میرے ساتھ ان کے پاس چلئے، چنانچہ ہم لوگ ان کے دروازہ پر پہنچے، دروازہ کھٹکھٹایا، انھوں نے اندر سے پوچھا کون؟ میں نے کہا کہ امیر المومنین آپ سے ملنے آئے ہیں، یہ سن کر وہ تیزی سے آئے، اور بولے امیر المومنین، آپ نے بلایا ہوتا میں خود حاضر ہو جاتا ہارون نے کہا کہ اچھا جس کام کے لئے ہم آئے ہیں، وہ شروع کیجئے، ہارون نے ان سے کچھ دیر بات چیت کی، پھر پوچھا کہ آپ پر کسی کا قرض تو نہیں ہے۔ ابن عیینہ نے اثبات میں جواب دیا، ہارون اس کی ادائیگی کا حکم دے کر ان سے رخصت ہوا، جب باہر آیا تو اس نے فضل سے کہا کہ تمہارے دوست سے مجھ کو تسکین نہیں ہوئی، کسی دوسرے صاحب علم کے پاس لے چلو، فضل عبدالرزاق بن ہمام کی خدمت میں لے گیا، وہاں بھی ہارون کو تسکین نہیں ہوئی، پھر یہ قافلہ فضیل بن عیاض کے پاس پہنچا، ابن عیاض اس وقت نماز میں مشغول تھے، اور ایک ہی آیت کو بار بار دہرا رہے تھے۔ غالباً جب وہ فارغ ہو گئے تو ان لوگوں نے دستک دی، انھوں نے اندر سے پوچھا کون؟ فضل نے کہا، امیر المومنین آپ سے ملنے آئے ہیں، اس کے جواب میں انھوں نے بڑی بے نیازی سے فرمایا، مجھ سے امیر المومنین کو ملنے کی کیا ضرورت ہے، فضل نے کہا کیا آپ پر اطاعت ضروری نہیں ہے؟ اس کے بعد ابن عیاض کوٹھے سے نیچے اترے اور دروازہ کھولا، ہم لوگ ان کے پاس بیٹھ گئے، انہوں نے چراغ گل کر دیا، اور خود ایک گوشہ میں

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۱۹۵۔

میں بیٹھ گئے، اتفاقاً سے اندھیرے میں ہارون کا ہاتھ فضیل کے بدن پر پڑ گیا، فضیل نے کہا کہ کتنا نرم ہاتھ ہے کاش کل یہ عذاب دوزخ سے بچ جائے، ہارون نے اس کے بعد کچھ ہدایتیں کرنے کی فرمائش کی۔ ابن عیاض نے بڑے پراثر انداز میں فرمایا کہ عمر بن عبد العزیز خلیفہ منتخب ہوئے تو انہوں نے سالم بن عبداللہ، محمد بن کعب القرظی اور رجاء بن حیوۃ کو بلایا۔ اور پر درد لہجے میں فرمایا کہ میں آزمائش میں ڈال دیا گیا ہوں۔ آپ لوگ مجھے اس سلسلہ میں مشورہ دیجئے تو انھوں نے خلافت کی ذمہ داری کو بلا آزمائش، قرار دیا۔ اور آپ اور آپ کے اصحاب نے اس کو محض نعمت قرار دیا۔ سالم بن عبداللہ نے عمر بن عبد العزیز سے فرمایا کہ اس دنیا میں ایک روزہ دار کی طرح رہنا چاہیئے۔ ابن کعب نے کہا کہ جو مسلمان آپ سے بڑے ہیں انہیں آپ اپنے والد کی طرح سمجھیں، اور جو متوسط عمر کے ہیں، انہیں بھائی سمجھیں، اور جو چھوٹے ہیں، انہیں اپنا لڑکا سمجھیں، تو باپ کی توقیر کیجئے، بھائی کا اکرام و اعزاز کیجئے، اور لڑکے سے پوری شفقت و محبت سے پیش آیئے، رجاء بن حیوۃ بولے، اگر آپ کل قیامت کے دن عذاب الٰہی سے نجات چاہتے ہیں۔ تو مسلمانوں کے لئے وہی پسند کیجئے، جو آپ اپنے لئے پسند کرتے ہیں ابن عیاض نے ہارون کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ اس دن جس دن لوگوں کے پیر اپنی جگہ سے ڈگ رہے ہونگے آپ کے لئے میں خائف ہوں، آپ پر خدا رحم کرے، کہ آپ کے قریب ایسے لوگ نہیں ہیں جو آپ کو اس طرح کا مشورہ دے سکیں، یہ سن کر ہارون پھوٹ پڑا، اور اس پر غشی کی کیفیت طاری ہوگئی، پھر جب یہ کیفیت دور ہوئی، تو ہارون نے کہا کہ آپ پر خدا رحم کرے، کچھ اور ارشاد ہو، ابن عیاض نے پھر اسی انداز میں فرمایا کہ امیر المومنین مجھے یہ بات معتبر طریقہ سے معلوم ہوئی ہے کہ عمر بن عبد العزیز کے ایک عامل نے ان کو خط کے ذریعہ اپنی کسی تکلیف کا اظہار کیا، جواب میں انہوں نے لکھا کہ میرے بھائی میں تم کو اہل دوزخ کے دوزخ میں ابدالاباد تک جاگتے رہنے کی یاد دلاتا ہوں، اور ڈرو کہ کہیں تم خدا کے پاس اس حالت میں واپس ہو کہ تم کو بخشش کی کوئی امید نہ رہ جائے، جب یہ خط اس عامل نے پڑھا تو سارے کام چھوڑ کر عمر بن عبد العزیز کی خدمت میں حاضر ہوا، انہوں نے وجہ دریافت کی تو بولا کہ آپ کا خط پڑھ کر میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اب موت تک کسی ذمہ داری کو قبول نہیں کروں گا، یہ سن کر ہارون پر ایک بار پھر رقت طاری ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے مزید ہدایت کی خواہش ظاہر کی، ابن عیاض نے فرمایا کہ اے امیر المومنین! نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ ایک بار خدمت نبوی میں آئے، اور خواہش ظاہر کی کہ مجھے کسی جگہ کا امیر بنا دیجئے، تو آپ نے فرمایا کہ امارت کی ذمہ داری قیامت کے دن سراسر ندامت و حسرت ہوگی، تو اس کی خواہش نہ کیجئے اس پر ہارون پھر ایک

بالو بھوٹ بھوٹ کر رو دیا، اور مزید کچھ کہنے کی خواہش کی، آپ نے فرمایا کہ اے خوبرو چہرے والے قیامت کے دن اپنی مخلوق کے بارے میں خدا تعالیٰ پوچھ گچھ کرے گا، اگر آپ یہ خوبصورت چہرہ آگ سے بچانا چاہتے ہیں تو اس طرح بچایئے کہ کبھی کسی رعیت کی طرف اپنے دل میں کوئی کھوٹ کینہ نہ رکھئے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، کہ جو شخص لوگوں کی طرف سے کینہ اور کھوٹ رکھتا ہے، اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے یہ سن کر ہارون پھر رو پڑا، جب سکون ہوا تو اس نے پوچھا کہ آپ پر کسی کا قرض تو نہیں ہے۔ ابن عباض نے فرمایا کہ ہاں میرے رب کا قرض میرے اوپر ہے۔ جس کا وہ محاسبہ کرے گا، میری تو ہلاکت ہی ہے۔ اگر اس نے مجھ سے سوال کیا، میری بربادی ہی ہے، اگر اس نے پوچھ گچھ کی اور میرا جواب اس نے کافی نہیں سمجھا، ہارون بولا، میں بندوں کے قرض کے بارے میں آپ سے سوال کر رہا ہوں، بولے میرے رب نے اس کا حکم مجھے نہیں دیا ہے میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تنہا اسی کو رب سمجھوں، اور اسی کی اطاعت کروں، پھر قرآن کی آیت پڑھی وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعِمُونِ ۝ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ۝ ہارون نے کہا کہ یہ ایک ہزار دینار (دس ہزار روپے سے زیادہ) حاضر ہیں، اسے قبول کیجئے، اور اپنے اہل وعیال پر صرف کیجئے۔ بولے سبحان اللہ! میں تو آپ کو نجات کا راستہ بتاتا ہوں، اور آپ اس شکل میں بدلہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ فرمانے کے بعد بالکل خاموش ہو گئے، ہارون اپنے قافلہ کے ساتھ وہاں سے واپس ہوا، اور باہر نکل کر فضل سے کہا کہ آئندہ اگر کسی کے پاس لے چلنا، تو انہی جیسے آدمی کے پاس لے چلنا، یہ واقعۂ سید المسلمین ہیں۔ (صفوۃ الصفوہ)

اس گفتگو سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوئیں۔

(۱) ایک یہ کہ حکومت کی ذمہ داری کو عیش وطرب کا ذریعہ نہیں بنانا چاہئے۔ بلکہ اسے ایک آزمائش سمجھ کر اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرنی چاہئے۔

(۲) دوسری بات یہ کہ اسلامی حکومت کے حکمرانوں کی زندگی آخرت کی بازپرس اور احساس ذمہ داری سے خالی نہ ہونا چاہئے۔ اگر اس سے ان کی زندگی خالی ہوگی تو وہ کبھی عدل وانصاف نہ کر سکیں گے۔

(۳) تیسری بات یہ کہ انہوں نے اس میں مثال زیادہ تر عمر بن عبد العزیز کی دی جو اموی خلیفہ تھے، جن کے بارے میں عباسی حکمران بدگمان بھی رہا کرتے تھے، اور ان سے اپنے کو برتر بھی سمجھا کرتے تھے۔ ابن عیاض نے مثالیں دے کر ان کے اس پندار کو توڑنے کی کوشش کی، اس سے ان کی حد سے بڑھی ہوئی جرأت کا پتہ بھی چلتا ہے

اور حکمت وقت سے ان کی ناخوشی کا اظہار بھی ہوتا ہے

۴۔ چوتھی بات یہ کہ حضرت عباس رض کو امارت کے قریب جانے سے آپ نے اس لئے منع فرمایا کہ یہ کوئی موروثی چیز نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو آپ ان کو یہ ذمہ داری ضرور سونپ دیتے۔ لیکن چونکہ اس کا مدار اہلیت وصلاحیت پر ہے۔ اس لئے آپ نے آل سے ان کو روک دیا۔

حلال ذریعۂ رزق | وہ اکل حلال کے سلسلہ میں حد درجہ محتاط تھے، یہی وجہ تھی کہ انہوں نے نہ تو امراء وخلفاء کی مدد قبول کی، اور نہ عوام کی، اپنے ہاتھ کی کمائی سے جو کچھ مل جاتا تھا، وہ کھا لیتے تھے، امام شعرانی کے الفاظ میں

یسقی علی اللہ وام وینفق من الث	ہمیشہ بہشتی کا کام کرتے تھے، اور اسی سے اپنا اور
علی نفسہ وعیالہ (ص ۵۲)	اپنے اہل وعیال کا خرچ چلاتے تھے۔

ذکر الٰہی اور قرآن سے شغف | قرآن کے ساتھ ان کو عشق تھا، اوپر ذکر آچکا ہے، ہارون جب ان کے پاس گیا، تو وہ قرآن کی ایک آیت دہرا رہے تھے، خادم خاص ابراہیم بن اشعث کہتے ہیں، کہ فضیل کے دل میں خدا کی جس قدر عظمت تھی اتنی میں نے کسی کے دل میں نہیں دیکھی، ان کے سامنے جب خدا کا ذکر آجاتا تھا یا وہ قرآن کی کوئی آیت سن لیتے تھے، تو

ظہر بہ الخوف والحزن وفاضت	ان پر خوف وغم کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی
عیناہ فبکی حتی یرحمہ من حضرہ[1]	اور بے طرح روتے تھے کہ دیکھنے والوں کو رحم آنے لگتا تھا

احمد بن حنبل کا بیان ہے کہ ایک بار ہم لوگ فضیل بن عیاض کے پاس گئے۔ اور ان سے اندر آنے کی اجازت چاہی، تو اجازت نہیں ملی۔ کسی نے کہا کہ وہ اگر قرآن کی آواز سن لیں تو نکل آئیں گے، ہمارے ساتھ ایک بلند آواز آدمی تھا، ہم نے اس سے کہا کہ قرآن کی کوئی آیت پڑھو، اس نے بلند آواز سے سورۂ تکاثر پڑھنی شروع کردی، وہ فوراً نکل آئے۔ اس وقت ان کا حال یہ تھا کہ داڑھی آنسوؤں سے تر تھی، وہ خود قرآن پڑھتے تو ان کی آواز نہایت غمگین اور پسندیدہ ہوتی، اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی انسان کو مخاطب کر رہے ہیں[2]

وفات | محرم ۱۸۷ھ میں ان کی وفات ہوئی، عمر اسی سے متجاوز تھی

اہل وعیال | ان کے اہل وعیال کے بارے میں زیادہ تفصیل نہیں ملتی، بعض واقعات سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ

---

[1] تہذیب التہذیب [2] صفوۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۳۵۔

شادی ہوئی تھی۔ اور ایک اولاد بھی تھی جن کا نام علی تھا۔ یہ عادات و خصائل میں ان کے مثنیٰ تھے، مگر عین عالم شباب میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ابن خلکان کا بیان ہے:

کان ولدہ شاباسریا من کبار	ان کے یہ صاحبزادے موت کے وقت جوان، ممتاز
الصالحین وھو معدود فی جملۃ	اور کبار صالحین میں تھے۔ ان کا شمار ان لوگوں
من قتلہ محبۃ الباری سبحانہ	کے زمرہ میں ہوتا ہے، جن کی موت کا سبب خدا کی محبت بنی

لیکن صبر و شکر کا عالم یہ تھا کہ نوجوان صالح اولاد کے انتقال پر بھی وہ بے قابو نہیں ہوئے، بلکہ ایک غم آمیز تبسم سے فرمایا۔ خدا نے جو پسند کیا میں بھی اس پر راضی ہوں۔ (ابن خلکان ص ۱۵۸)

زریں اقوال | اوپر کی تفصیل سے زہد و اتقا سے بھرپور زندگی کا ایک خاکہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے، مگر ان کے سوانح حیات کے پورے خط و خال دیکھنے کے لئے ان کے ان گراں مایہ اقوال پر بھی ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے، جو ان کی پر حکمت زبان سے گاہ بگاہ صادر ہوتے رہے ہیں۔

فرماتے تھے کہ ہماری صحبت میں اس نے کچھ نہیں پایا جس نے نماز اور روزہ کی کثرت سیکھی، بلکہ اس کے لئے طبیعت کی سخاوت، قلب کی سلامت اور امت کی خیر خواہی کی ضرورت ہے۔

جس نے انسانوں کو پہچان لیا وہ راحت پا گیا[1] مقصد یہ ہے کہ یہ حقیقت جس نے پالی کہ کوئی انسان کچھ بنا بگاڑ نہیں سکتا، تو پھر ان سے بالکل بے پرواہ ہو جائے گا، اور اپنی ساری توجہ خدا کی طرف مبذول کر دے گا۔

فرماتے تھے کہ جب کبھی خدا کی کوئی نافرمانی کر بیٹھتا ہوں تو میں اپنے گدھے، اپنے خادم، اور اپنی بیوی میں اس کا اثر محسوس کرتا ہوں، یعنی یہ سب میرے نافرمان ہو جاتے ہیں۔

جب خدا تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے، تو اس کو رنج و غم زیادہ دیتا ہے، اور جب کسی سے ناخوش ہوتا ہے، تو اس پر دنیا کو وسیع کر دیتا ہے۔

فرماتے تھے کہ اگر دنیا اپنی ساری آسائشوں اور زینتوں کے ساتھ مجھے دی جائے، اور اس کے استعمال میں محاسبہ کا بھی کوئی خوف نہ ہو، جب بھی میں اس سے اسی طرح بچوں گا، جس طرح تم لوگ مردار کھانے سے بچتے ہو۔

فرماتے تھے، اگر مجھے مقبولیت دعا کی سعادت ملتی تو میں صرف امام وقت کے لئے دعا کرتا، کیونکہ امام

---

[1] تہذیب الاسماء، ج ۲ ص ۵۲۔

وقت کی صلاح پر رعیت کی صلاح کا مدار ہے، جب یہ صالح ہو جائے گا، تو ملک اور اہل ملک دونوں سلامتی پا جائیں گے۔

اپنے ہم نشینوں سے ملاطفت اور حسن خلق کا برتاؤ کرنا رات بھر نفل نماز پڑھنے اور دن بھر نفلی روزہ رکھنے سے زیادہ ثواب کا کام ہے۔ ایک بار ہارون رشید نے ان سے کہا کہ آپ کے زہد کا کیا کہنا، جواب میں فرمایا آپ تو مجھ سے بھی زیادہ زاہد ہیں۔ کیونکہ میں نے تو دنیا سے بے رغبتی اختیار کی ہے۔ اور یہ ایک مچھر کے پر سے بھی کم درجہ کی چیز ہے۔ لیکن آپ نے اس آخرت سے بے نیازی اختیار کی ہے، جس میں دنیا کی کوئی قیمت نہ ہوگی، تو میں فانی کا زاہد ہوں۔ اور آپ باقی کے زاہد ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ یہ بات آپ نے سلیمان بن عبدالملک سے کہی تھی۔

فرمایا کہ دوسروں کے دکھاوے کے لئے کوئی عمل کرنا شرک ہے، اور دوسروں کی وجہ سے کوئی عمل چھوڑ دینا ریا ہے۔ اور اخلاص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دونوں سے محفوظ رکھے[1]

فرماتے تھے کہ جب تم رات کو اٹھ کر نفل پڑھنے اور دن کو روزہ رکھنے پر قادر نہ ہو، تو سمجھ لو کہ محروم ہو، اور تم کو تمہارے گناہوں نے گھیر لیا ہے۔ محمد بن حسان کہتے ہیں کہ ایک بار میں فضیل کی خدمت میں گیا۔ وہاں امام ابن عیینہ بھی موجود تھے۔ وہ امام سے مخاطب ہو کر کہہ رہے تھے کہ آپ لوگ یعنی علمائے دین زمین کا چراغ تھے جن سے روشنی لی جا سکتی تھی، مگر آپ لوگ ظلمت کا سبب بن گئے ہیں۔ آپ لوگ ستاروں کے مانند تھے جن سے گم کردہ راہ راستہ پا سکتے تھے، مگر آپ سراپا حیرت بن گئے ہیں۔ آپ میں کوئی آدمی بھی ایسا نہیں ہے، جو ان ظالم حکمرانوں کا مال لینے، اور پھر مسند درس پر بیٹھ کر حدثنا فلاں عن فلاں کہنے سے شرمائے[2]

فرماتے تھے کہ کوئی صاحب فضل و کمال اسی وقت صاحب فضل و کمال ہے، جب تک وہ خود اپنے کو صاحب فضل و کمال نہ سمجھے۔

فرماتے تھے۔ اخیر زمانہ میں قوموں اور قبیلوں کے سردار منافق قسم کے لوگ ہو جائیں تو اس وقت ان سے بچنے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ یہ ایسا مرض ہیں کہ ان کی کوئی دوا نہیں ہے، لوگوں سے دور بھاگو، مگر جماعت ترک نہ ہونے پائے، یہ زمانہ خوشی کا نہیں بلکہ رنج و غم کا ہے[3]

---

[1] یہ تمام اقوال البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۹۹ اور ابن خلکان ج ۲ ص ۱۵۰ سے لئے گئے ہیں۔ [2] صفوۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۳۵ حضرت فضیل نے غایت تشدد میں ایسی بات کہہ دی ہے۔ ورنہ تبع تابعین کی ایک معتد بہ تعداد ایسی تھی جو حکومت سے کوئی مدد لیتی تھی [3] [illegible]

فرماتے تھے کہ ہر چیز کا ایک دیباچہ ہوتا ہے، علماء کا دیباچہ یہ ہے کہ سب سے پہلے غیبت ترک کریں۔
فرماتے تھے کہ حامل قرآن کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنی کوئی ضرورت امراء واہل دولت کے پاس
لیجائے، بلکہ اس کا منصب یہ ہے کہ خلق خدا اپنی حاجتیں اس کے پاس لے جائیں۔

دوستی کے بارہ میں قیمتی ہدایت | فرماتے تھے کہ رحمان کے بندے وہ لوگ ہیں جن میں خشوع اور تواضع ہوتی ہے، اور
دنیا کے بندے وہ ہیں جن میں تکبر اور خود پسندی ہوتی ہے۔ اور وہ عام لوگوں کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ فرمایا کرتے تھے
کہ جو شخص بے عیب دوست تلاش کرتا ہے، وہ بغیر دوست ہی رہیگا۔ ایسے شخص سے دوستی نہ کرو کہ جب تم سے خفا
ہو تو تمہارے اوپر بہتان تراشے۔ وہ تمہارا دوست نہیں ہے، جس نے تم سے کوئی چیز مانگی، اور تم نے نہیں دی تو
وہ غضبناک ہوگیا۔ اب آپس میں وہ اخوت و ہمدردی نہیں رہی، کہ ایک بھائی، ایک دوست اپنے بھائی
یا دوست کے مرجانے کے بعد اس کی اولاد کو اپنی نگرانی میں لے لیتا تھا! اور بالغ ہونے تک اپنے بچوں کی
طرح ان کی پرورش کرتا تھا۔

علم و زہد کے بارے میں جامع ہدایات | جو شخص قرآن پڑھتا ہے۔ اس سے اس طرح سوال کیا جائے گا۔ جس طرح
انبیاء علیہم السلام سے تبلیغ و رسالت کے بارے میں سوال ہوگا، کیونکہ قرآن
پڑھنے والا انبیاء کا وارث ہے۔

آخرت پسند عالم کا علم پوشیدہ رہتا ہے اور دنیا پسند عالم کے علم کی نشر و اشاعت ہوتی ہے،
عالم آخرت کی پیروی کرو۔ اور عالم دنیا کی صحبت سے بچو، کیونکہ یہ اپنی فریب خوردگی اور دنیا وی زیب
و زینت کے پھندے میں تمھیں ڈال دے گا، اس کی دعوت بغیر عمل کے ہوتی ہے۔ اور اس کے عمل میں کوئی
صداقت نہیں ہوتی۔ زہد کی علامت یہ ہے کہ جب امراء اور اس کے ہمنشینوں کے ایمان[1] ان کے جہل کا ذکر
کیا جائے، تو وہ خوش ہوں۔

اکل حلال | جو شخص یہ جان لے کہ اس کے پیٹ میں کیا جارہا ہے وہ خدا کے یہاں صدیق شمار کیا جائے
گا تو چاہیئے کہ تم یہ دیکھو کہ تمہارا رزق کہاں سے اور کس ذریعہ سے آرہا ہے[2]

بقیہ حاشیہ گذشتہ: اور نہ ان کو پسند کرتی تھی، [1] مقصد یہ ہے کہ دینی زندگی کا جب رواج کم ہوجائے تو پھر مسلمان رہتے ہوئے خوش رہنا مناسب نہیں ہے، بلکہ کم سے کم اس پر افسوس تو کرنا چاہیئے، (حاشیہ صفحہ ہذا) [2] یہ اس صورت میں ہے جب اپنے علم کو شہرت ہی کی غرض سے شائع و ذائع کرے، [3] الطبقات الکبریٰ ج ۱ ص ۵۸، ۵۹ -

شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی رحمۃ اللہ

(۲)

(محمد محبوب اللہ ندوی)

حکمت عملی | عام طور پر علماء نے ارسطو کی فلسفیانہ حکمت نظری ہی کیطرف توجہ کی، اور اسی کو اپنا سرمایۂ فخر سمجھا اور حکمت عملی کیطرف جو خالص اسلامی چیز ہے، اس کی طرف توجہ بہت کم ہوئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء کے اکثر و بیشتر افراد زندگی کی انفرادی اور اجتماعی ضروریات میں عملی جدوجہد سے یکسر محروم ہو گئے، اور عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا کہ یہ لوگ کشاکش حیات میں کوئی کام نہیں آسکتے۔ لیکن شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ انہوں نے حکمت نظری کے ساتھ ساتھ حکمت عملی کو بھی اپنایا، اور اس کو زندگی میں برتنے اور سیکھنے پر زور دیا۔ انفاس میں ہے

حضرت ایشاں ...... عقل معاش مثل عقل معاد کامل و وافر داشتند و در
مجلس صحبت حکمت عملی و آداب معاملہ بسیار می آموختند (ص ۸۰)

شاہ ولی اللہ صاحب کو حکمت عملی کی تعلیم جس کو انہوں نے پھیلا کر ایک دفتر بنا دیا، سب سے پہلے گھر ہی سے ملی تھی، فرماتے ہیں:

(حضرت ایشاں) ایں فقیر را در مجلس صحبت حکمت عملی و آداب معاملہ بسیار
می آموختند (ص ۸۴)

مضمون کے آخر میں شاہ صاحب کے کچھ حکیمانہ جملے نقل کئے جائیں گے۔

ذوق سخن | شاہ صاحب کو ذوق سخن سے بھی حصہ ملا تھا، اور وہ بڑے سخن فہم اور کسی حد تک سخن گو بھی تھے، افہام و تفہیم کے وقت بکثرت اشعار پڑھتے تھے، اشعار میں ایسے نکات پیدا کرتے تھے، کہ ان کے بزرگ بھی تحسین کئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ ان کی نکتہ آفرینی کے دو ایک واقعے اوپر نقل کئے جا چکے ہیں، ایک واقعہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

شاہ صاحب پہلی مرتبہ اپنے مرشد خلیفہ ابوالقاسم کی خدمت میں گئے، تو وہ گھر کی تعمیر میں مشغول تھے، اور زبان پر یہ شعر جاری تھا:

ہر کرا ذرہ وجود بود ؛ پیش ہر ذرہ در سجود بود

شاہ صاحب نے وجود کے لفظ کو شہود سے بدل کر پڑھا۔ حضرت خلیفہ نے فرمایا کہ میں نے صحیح نسخوں میں لفظ "وجود" ہی دیکھا ہے۔ شاہ صاحب نے عرض کیا، جی ہاں! میں نے بھی ایک صحیح نسخہ دیکھا ہے جس میں لفظ "شہود" ہے۔ حضرت خلیفہ اس وقت زیادہ مشغول تھے، اس لئے اس روز بات ختم ہوگئی دوسرے روز شاہ صاحب پھر ان کے پاس گئے، تو انہوں نے پوچھا۔ اگر لفظ "شہود" مانا جائے، تو شعر کے معنی کیا ہوں گے۔ شاہ صاحب نے عرض کیا، کہ

ہر کسے را کہ اول شہود حضرت حق
در ذرات عالم پیدا شد لا محالہ
پیش ہر ذرہ سجود خواہد کرد (انفاس ص)

جس کو ہر ذرہ میں اللہ تعالیٰ کا شہود ہو جائے گا، وہ یقیناً ہر ذرہ کے سامنے سجدہ کرے گا۔

اور کہا کہ اگر "وجود" کا لفظ رکھا جائے، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ عبد و معبود دونوں بالکل مجتمع اور متحد ہو گئے۔ تو پھر سجدہ کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سن کر مرشد نے فرمایا کہ لیکن صحیح نسخوں میں لفظ وجود ہے، اس کی کیا تاویل ہوگی شاہ صاحب نے عرض کیا کہ اگر وجود کا لفظ صحیح ہے۔ تو "وجود" کے معنی وجدان کے ہونگے جو شہود کا ہم معنی ہے۔ یعنی جس کو خدا کا وجدان ہو جائے گا، وہ ذرہ ذرہ میں اس کا جلوہ دیکھے گا۔ اور اس کے سامنے سربسجود ہوگا۔ حضرت خلیفہ اس نکتہ آفرینی سے بہت خوش ہوئے۔ اور اس کے بعد سے ان کو بہت عزیز رکھنے لگے۔

شاہ صاحب نے انفاس العارفین اور مکتوبات و ملفوظات میں سیکڑوں ہندی و فارسی اشعار استعمال کئے ہیں، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں کتنے اشعار شاہ صاحب کے ہیں، صرف دو فارسی رباعیوں اور ایک ہندی شعر کے متعلق یہ تصریح مل سکی ہے کہ وہ آپ ہی کے ہیں، ہندی شعر جس میں رحیم تخلص ہے، یہ ہے:

جب جیو نہ تھا تب پیو نہ تھا اب پیو ہے جیو نا تھا[1]
رحیم پیا سوں یوں ملی جوں بوند سمند رہا تھ

---

[1] اس شعر سے ان کے مسلک وحدۃ الوجود پر روشنی پڑتی ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ جب ہمارا وجود نہ تھا، تو ہمارا کوئی معشوق بھی نہ تھا، لیکن اب معشوق تو ہے، مگر وجود باقی نہیں رہا، اس کی مثال ایسی ہے کہ جس طرح پانی سمندر میں مل کر فنا ہو جاتا ہے اسی طرح میں بھی خدا کی ذات میں اس درجہ مستغرق ہوں کہ کوئی الگ چیز رہ ہی نہیں گیا ہوں، یعنی میرے وجود پر اب اسی کا قبضہ ہے، میرا وجود خود میرے قبضہ میں نہیں ہے۔

ایک روز نماز ظہر کے بعد شاہ صاحب نے فی البدیہہ یہ رباعی کہی:

گر تو راہی حق بخواہی اے پسر — خاطر کس را امر بخال الحذر
در طریقت رکن اعظم رحمت است — ایں چنیں فرمود آں خیر البشر

او شاہ ولی اللہ صاحب سے فرمایا، اس کو لکھ لو۔ میرے دل پر القا ہوا ہے، کہ میں تمہیں یہ وصیت کر جاؤں۔

یہ فارسی رباعی بھی ان ہی کی ہے:

اے کہ نعمائے تو از حد فزوں — شکر نعمتہائے تو از حد فزوں
عجز از شکر تو باشد شکر ما — گر بود فضل تو مارا رہنموں

تصنیف شاہ صاحب کی اولاد و احفاد، خلفاء، و تلامذہ کی ایک بڑی تعداد ان کی بے بہا اور نہ مٹنے والی یادگار ہے، اور جن کے ذریعہ انشاء اللہ ان کا علمی اور روحانی فیض قیامت تک جاری رہے گا لیکن ان مادی یادگاروں کے علاوہ کچھ ان کی علمی یادگاریں بھی ہیں، جو کمیت کے لحاظ سے کچھ زیادہ نہیں مگر کیفیت اور افادیت کے اعتبار سے بہت قیمتی اور قابل قدر ہیں۔

شاہ صاحب میں بچپن ہی سے تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا ہو چکا تھا، مگر ان کے روحانی ذوق و استغراق نے اسے زیادہ ابھرنے نہیں دیا، خود ان کے مرشد خواجہ خرد ان سے ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ:

ہمیں وصیت می فرمودند کہ خود را از درس و تدریس و مطالعہ کتب و حکایات غیر ضروریہ بحیسو دارد و خود را بالکلیہ بآں نسبت (روحانی) گمارد (انفاس، ۲۴)

لیکن پھر بھی اس فطری ذوق کا کچھ نہ کچھ ظہور ہو ہی کے رہا۔

خیالی پر حاشیہ لکھنے کا خیال زمانہ طالب علمی میں میر زاہد کے حواشی کی ترتیب و تسوید میں شاہ صاحب کی شرکت کا ذکر آ چکا ہے، ان کی طالب علمی ہی کا ایک دوسرا واقعہ بھی ہے۔

ایک بزرگ نے ان سے اسم ذات کے تصور کے دوام کی یہ تدبیر بتائی کہ تم کاغذ یا تختہ پر جس قدر ہو سکے اس کو لکھتے جاؤ۔ کچھ روز کے بعد خود بخود ذہن میں اس کا تصور بیٹھ جائے گا، چنانچہ شاہ صاحب نے یہ عمل شروع کر دیا۔ اس خامہ فرسائی سے ان کے ذوق تصنیف کو بھی تحریک ہوئی، اور ان کو ملا عبد الحکیم کے حاشیہ خیالی پر جس کے وہ ابھی طالب علم تھے، ایک دوسرا حاشیہ لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور اس کو لکھنا بھی شروع کر دیا

مگر وہ خیالی کا حاشیہ کیا لکھتے، ان کے لوح دل پر اسم ذات کا نقش ایسا جم چکا تھا کہ وہی صفحۂ قرطاس پر ابھرنے
لگا، اس غلبہ میں وہ پندرہ سولہ صفحات اسم ذات سے سیاہ کر گئے، اور ان کو اس کا احساس بھی نہ ہوا، کہ وہ
حاشیہ لکھ رہے تھے، یا کاغذ پر نقطہ ہائے دل نمایاں ہو رہے تھے خود فرماتے ہیں:

خواستم کہ حاشیہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی بنویسم یک با دگما بیش اسم ذات
می نوشتم وشعور نداشتم (انفاس ص ۵)

شاہ صاحب کے استغراق روحانی کی وجہ سے گویا یہ کام تکمیل کو نہیں پہنچ سکا، مگر اس واقعہ سے ان
کے تصنیفی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

تصوف کے ایک عربی رسالہ کا ترجمہ | شیخ تاج سنبھلی[1] نے حضرت خواجہ باقی باللہ کے طریقہ ارشاد وتصوف پر سلف کی عبارت سے اخذ کرکے عربی میں ایک رسالہ لکھا تھا، شاہ صاحب نے اس کا فارسی
میں ترجمہ کیا، جو ان کے خاندان میں بہت دنوں تک متداول رہا۔

مکتوبات | صوفیہ کے مکتوبات اور ملفوظات میں تعلیمات کا بڑا خزانہ پوشیدہ ہوتا ہے، جو باتیں ہزاروں صفحات
کے مطالعہ سے نہیں معلوم ہوتیں، وہ ان کے دو ایک جملوں میں معلوم ہو جاتی ہیں، گو ظاہری ترتیب وتبویب کے
لحاظ سے انہیں تصنیف نہیں کہا جا سکتا، مگر افادیت کے لحاظ سے اس کا درجہ کسی مستقل تصنیف سے کم نہیں ہوتا۔
شاہ عبدالرحیم صاحب نے بھی کچھ خطوط اپنے متوسلین اور تلامذہ کو لکھے تھے، جس کو ان کے چھوٹے صاحبزادے
شاہ اہل اللہ صاحب نے "انفاس رحیمیہ" کے نام سے جمع کر دیا ہے۔ گو اس کی ضخامت ۳۵ - ۴۰ صفحات سے
زیادہ نہیں ہے۔ مگر اس عجالہ نافعہ میں جو اخلاقی جواہر ریزے بکھرے ہوئے ہیں، وہ سیکڑوں ضخیم کتابوں سے
بھاری ہیں۔

ایک ہندی شعر کے —
جب کہ ایک دوسرے "مجموعۂ مکتوبات" کا ذکر حضرۃ الاستاد مولانا سید سلیمان ندوی نے
رحیم بیا سو کی کتب خانہ میں ان کی نظر سے گذرا تھا[2] معلوم نہیں اس کو کس نے جمع کیا[3]
کبھی اس تک رسائی ہوئی تو انشاء اللہ اس پر کچھ لکھا جائے گا۔

---

[1] اس شعر سے ان کے مسلک وحدۃ الوجود پر روشنی
ہمارا کوئی معشوق کبھی نہ تھا، لیکن اب معشوق تو ہے اول خلفاء حضرت خواجہ (باقی باللہ) بودند ودر آخر بمکہ معظمہ
پانی سمندر میں حل کر فنا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح میں کیے نیقر زمتاخران مشائخ اہل ہند ہیچ کس را ندید کہ اہل مکہ زیادہ از
نہیں گیا ہوں، یعنی میرے وجود پر اب اسی کا قبضہ سیرت سید احمد شہید

فتاوے عالمگیری | فتاوی کی تالیف[1] میں ملا حامد جونپوری معاون کی حیثیت سے شاہ صاحب بھی شریک تھے، گو بعض
اسباب کی بنا پر وہ زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکے، پھر بھی جتنے دنوں رہے، بڑے مفید اور قیمتی اضافے کئے، ذیل
میں ان کی شرکت کا پورا واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

فتاوی کی تدوین کا کچھ کام ملا حامد کے سپرد تھا۔ ملا حامد میرزاہد کے درس میں شاہ صاحب کے ہم سبق
رہ چکے تھے، اس تعلق کی بنا پر از راہ ہمدردی انہوں نے شاہ صاحب سے اس میں شرکت کے لئے کہا، اور کچھ مالی
معاوضہ کی بھی امید دلائی۔ شاہ صاحب شاہی ملازمت پسند نہیں کرتے تھے، اس لئے انہوں نے انکار کر دیا،
ان کی بیوہ والدہ کو اس کی خبر ہوئی، تو بہت برہم ہوئیں اور باصرار اس خدمت کے قبول کر لینے پر مجبور کیا، ناچار
شاہ صاحب نے اس میں شرکت کر لی، لیکن جب شاہی ملازمت کی خبر ان کے مرشد حضرت خلیفہ ابوالقاسم
کو ہوئی تو انہوں نے ناپسندیدگی ظاہر کی، اور ترک ملازمت کا مشورہ دیا۔ شاہ صاحب نے والدہ کی ناخوشی کا عذر
کیا۔ لیکن مرشد نے فرمایا:

اذا جاء حق اللہ ذھب حق العباد — جب خدا کا حق آگیا، تو بندہ کا حق باقی نہیں رہا

شاہ صاحب نے مرشد سے پھر عرض کیا، کہ آپ دعا فرمائیں کہ ملازمت خود بخود چھوٹ جائے۔ تاکہ والدہ کی
ناراضی کا سوال نہ پیدا ہونے پائے، مرشد نے اس پر رضامندی کا اظہار کیا، اور دعا فرمائی۔

عالمگیر کے سامنے کارکنوں کے عزل و نصب کی فہرست ہمیشہ پیش ہوتی رہتی تھی، اب کی بار جو فہرست
پیش ہوئی، تو اس نے شاہ صاحب کے نام پر بھی قلم پھیر دیا، اور ان کے یہاں کہلا بھیجا، کہ اگر وہ چاہیں تو ۳۱
بجائے کچھ زمین دے دی جائے۔ لیکن دربار شاہی سے قطع تعلق ہی کے لئے دعا کرائی گئی تھی، (۳۱)
کے قبول کرنے کا کیا سوال تھا، خود فرماتے ہیں، کہ

" قبول نکردم و شکرانہ بجا آوردم و حمد خدائے تعالیٰ گفتم   دیگر میں شاہ صاحب کی شرکت کا
شاہ صاحب کی معزولی کا اصلی سبب تو ان کا   یہ دوسرا واقعہ بھی ہے۔
لئے کسی سبب ظاہر کی بھی ضرورت تھی، شاہ صاحب کے مدام کی یہ تدبیر بتائی کہ تم کاغذ یا تختہ پر جب قدر ہو سکے
اوپر ذکر آچکا ہے کہ شاہ صاحب جس حد کا تصور بیٹھ جائے گا، چنانچہ شاہ صاحب نے یہ عمل شروع
اس پر انہوں نے ایک حاشیہ چڑھا دیا تھا، جس کی دا تحریک ہوئی، اور ان کو ملا عبدالحکیم کے حاشیہ خیالی

---

[1] فتاوی عالمگیری کی تالیف میں ان کی شرکت کا مختصر ذکر اد | لکھنے کا خیال پیدا ہوا، اور اس کو لکھنا بھی شروع کر دیا

چونکہ یہ حصہ ملا حامد کے سپرد تھا، اس لئے ملا نظام نے ان سے باز پرس کی، اور ان پر برہم ہوئے، ملا حامد تو اسوقت کچھ نہیں بولے۔ مگر ملا نظام کے جانے کے بعد شاہ صاحب سے اظہار ملال کیا، شاہ صاحب نے کتاب کے مآخذ کیطرف رجوع کیا، اور مسئلہ کی پیچیدگی ان پر واضح کی۔ وہ بظاہر مطمئن ہوگئے، مگر ان کے دل میں ان کی طرف سے غبار باقی رہا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

ازاں باز اکثر آں قوم برمن حسد بردند و بظاہر سبب ایں عزل حسد ایشاں بود
(انفاس ص ۲۴)

اکثر آں قوم سے غالباً وہ تمام لوگ مراد ہیں جنہیں شاہ صاحب سے علمی چشمک تھی، اور انہوں نے اپنی دالنست میں شاہی ملازمت چھڑوا کر ان کو نقصان عظیم پہنچایا تھا۔

مسلک | شاہ صاحب ہر چیز میں اعتدال اور توسط کو پسند کرتے تھے، اور مختلف مسائل میں فریق بن کر اختلاف کو بڑھانے کے بجائے ان میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس وقت تک علماء میں جو مسائل شرعی ہوں خواہ ذوقی، پیدا ہو چکے تھے۔ ان سب میں آپ کا مسلک زیادہ تر تو خذ ما صفا ودع ما کدر تھا، شاہ صاحب صوفی تھے، مگر تصوف میں بھی ان کی راہ تقشف و تقید کے درمیان تھی، شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

در ہر امر توسط او دوست می داشتند نہ چنداں در تنسک و تعمق فرو رفتہ بودند کہ بہ رہبانیت کشد و نہ چنداں ترک تقید باداب مترسل بودند کہ تہاون میل کند۔ (انفاس ص ۸۵)

اس طرح تصوف یا فقہ کے جتنے طریقے ہیں، ان میں کسی طریقہ کو اس حد تک بڑھنے بڑھانے یا ترجیح دینے کو جس سے دوسرے کی تنقیص ہونے لگے، بہت ناپسند کرتے تھے، شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں:

بارہا از فحوائے کلام حضرت ایشاں معلوم شد کہ تفضیل صاحب طریق دیگر لاسیما بروجہے کہ بمنقصت مفضول مفضی باشد مکروہ می داشتند (انفاس)

وحدۃ الوجود | صوفیہ میں وحدۃ الوجود کا مسئلہ ہمیشہ ایک معرکۃ الآراء مسئلہ رہا ہے، لیکن شیخ ابن عربی سے پہلے یہ مسئلہ خالص ذوقی اور وجدانی تھا، اس کی کوئی علمی یا شرعی حیثیت نہیں تھی، حضرت شیخ محی الدین ابن عربی

پہلے شخص ہیں، جنہوں نے اس کو علمی اور نیم شرعی حیثیت بھی دی۔ ان کے بعد سے عام صوفیاء نے ان ہی کی تقلید کی۔ اس تقلید کی رسم ایسی عام ہوئی کہ ہر صوفی (ان میں مستثنیات بھی ہیں) خواہ اس کے ذوق وکیفیت سے آشنا ہو یا نہ ہو، وہ اپنے کو لذت آشنا ظاہر کرنا ضروری سمجھتا تھا، اور بغیر اس کے اپنے کو ہلکا محسوس کرتا تھا شیخ کے اس عقیدے پر سب سے پہلے امام ابن تیمیہ نے اور ان کے بعد حضرت مجدد الف ثانی نے تنقید کی۔

امام ابن تیمیہ نے قرآن وحدیث اور آثار صحابہ کی روشنی میں وحدۃ وجود کا ابطال کیا۔ مجدد الف ثانی نے جو قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ بادۂ وحدت کے بھی لذت شناس تھے، اس کی تردید بھی کی اور اصلاح بھی، اور ان کی "ہمہ اوست" کی تعبیر کو "ہمہ از وست" اور وحدۃ وجود کو وحدۃ شہود اور عینیت کو والیت ودلولیت سے بدل دیا، جس سے ہر مسئلہ کی اصلی صورت سامنے آگئی، اور عوام کی گمراہی کے تمام منافذ بھی بند ہو گئے۔

شاہ عبد الرحیم صاحب کے زمانہ میں بھی یہ مسئلہ عام طور پر صوفیہ کا مرکز نظر بنا ہوا تھا، خود شاہ صاحب کے خاندان میں کئی ایسے بزرگ گذر چکے تھے[ل] اور بعض موجود بھی تھے[ل۲] جو وحدۃ الوجود کے قائل تھے، اس لئے ان پر بھی اس ماحول اور خاندان کا اثر تھا، وہ شیخ ابن عربی کے فلسفۂ وجود اور ان کی کتابوں کی طرف کافی حد تک مائل تھے، ابن عربی کی کتابوں سے ان کو اس قدر شغف تھا کہ اکثر فرمایا کرتے تھے،

اگر خواہم فصوص الحکم را بر سر منبر تقریر کنم وجمیع مسائل آں را بآیات وحدیث مبرہن سازم وبطورے بیان نمایم کہ ہیچ کس را شبہ نماید (انفاس ص ۸۲)

لیکن ان کے مرشدین کے جذبۂ اتباع شریعت[ل۳] اور مجدد صاحب کے سلسلہ سے وابستگی نے انہیں اس مسئلہ میں بھی جادۂ اعتدال سے بہت کم ہٹنے دیا، اور غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ اس کو ذوقی

ل۔ مثلاً عبد العزیز شکر بار اور شیخ رفیع الدین وغیرہ جو ان کے نانا اور پرنانا ہوتے تھے، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ل۲ مثلاً ان کے بڑے بھائی شیخ ابو الرضا محمد جن کی صحبت میں ان کی ظاہری اور باطنی دونوں تعلیم ہوئی۔ ل۳ ان کے مرشد سید عبد اللہ اور خلیفہ ابو القاسم دونوں اتباع شریعت پر بہت زور دیتے تھے، سید عبد اللہ حضرت آدم بنوری کے خاص تربیت یافتہ تھے، اور حضرت آدم بنوری حضرت مجدد صاحب کے اجل خلفاء میں تھے، اس لئے وہ مجدد صاحب کے روحانی فیض سے خالی نہیں تھے۔

اور وجدانی چیز سمجھ کر عام طور اس کی تشریح سے گریز کرتے تھے۔ کہ عام لوگ ذوق و شوق کی باتوں کو نہ سمجھ سکیں، اور ورطۂ ضلالت میں پڑ جائیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

از تصریح وحدۃ وجود احتراز می نمودند کہ غالب اہل زماں آں را فہم نمی توانند کرد، و در ورطۂ اتحاد و زندقہ می فتند (انفاس ص ۸۲)

وحدۃ وجود کی تشریح سے اس لئے احتراز فرماتے تھے، کہ لوگ اس کو سمجھ نہ سکیں گے، اور بلاوجہ شبہات میں مبتلا ہو کر گمراہی کے گڑھے میں جا گریں گے۔

پھر بھی دل کا پیمانہ جس شرابِ معرفت سے لبریز تھا، وہ کب تک اثر نہ دکھاتا، چنانچہ کبھی کبھی ان کی زبان سے ایسے فقرے نکل جاتے تھے۔ جن سے اندرونی میلان کا پتہ چلتا ہے، ایک مکتوب میں لکھتے ہیں

"کفر شریعت دو معبود پنداشتن و کفر حقیقت دو موجود دانستن"۔ (مکتوبات ص ۳۳)

ایک دوسرے مکتوب میں اس کو یوں لکھتے ہیں:

"معبود گفتن کفر شریعت، دو موجود دیدن کفر طریقت"۔ (مکتوبات ص ۲۱)

تعلق حادث بالقدیم کی علمی انداز میں یوں توجیہ کرتے ہیں:

صور علمیہ کہ آں را ملاحظہ می نمایم تحقق و تقرر در خارج ندارند محض بقوۃ علمیہ متحقق اند و آں ہمہ علم ماست کہ بچندیں رنگ بر آمد شبہ نیست کہ ایں صور را عین علم نتواں گفت زیرا کہ علم بود و ایں صور نبودند و منفصل از علم نیز نتواں گفت زیرا کہ ایں تلونات را قیوم و منشا بود (انفاس ص ۸۵)

وہ صور علمیہ جسے ہم ملاحظہ کرتے ہیں، خارج میں ان کا کوئی تحقق نہیں ہوتا، محض بالقوۃ وہ موجود ہوتی ہیں۔ یہ سب ہمارا علم ہے جو اس رنگ میں ظاہر ہوتا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ان کو عین علم نہیں کہا جا سکتا، اس لئے کہ علم تو موجود رہے گا، اور اس کی صورتیں نہ رہیں گی۔

مسئلہ صفات کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

"صفات عین ذات اند بمعنی آنکہ ذات فقط در مصدر آثار از صفات زائدہ قائمہ بذات کفایت می کند" ——— (انفاس ص ۸۳)

قرآن کی اس آیت اَیْنَمَا کُنْتُمْ هُوَ مَعَکُمْ (تم جہاں ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے) کی توضیح کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"این معیت محض بعلم نیست بلکہ در تحقق وتقرر نیز درین جا خدشہ نمی آید زیرا کہ این معیت جوہر بجوہر یا عرض بعرض یا جوہر بعرض نیست معنی است لطف ازین معیات"

(انفاس ۸۴)

اس مسئلہ معیت کی ایک دوسری لطیف توجیہ کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ شاہ صاحب اس قسم کے تمام مسائل کو ذوقی اور وجدانی سمجھتے تھے، جن میں ہر شخص اپنی روحانی استعداد اور قوت مشاہدہ کے مطابق مختلف توجیہیں کر سکتا ہے مگر کسی کے ذوق و وجدان اور قوت مشاہدہ کے فیصلہ کو دوسرے کے ماننے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، فرماتے ہیں:

"ہر کسے بحسب استعداد خود از مسئلہ معیت خطے گرفتہ است طائفہ دانستہ اند کہ حق سبحانہ بعلم وقدرت وسمع وبصر محیط است قال اللہ تعالیٰ مایکون من نجویٰ ثلثۃ الآیۃ وطائفہ معاینہ کردہ کہ ہر فعلے وانفعالے وحرکتے وصفتے کہ در عالم ظاہر است از حضرت حق است قال اللہ تعالیٰ کل من عند اللہ وما بکم من نعمۃ فمن اللہ وطائفہ مشاہدہ کردہ کہ ہر چہ ہست اوست وغیر او چیزے نیست قال اللہ تعالیٰ کل شئ ھالک الا وجھہ وقال ھو الاول والآخر والظاھر والباطن وطائفہ حق را در حق دیدند وعبارت از نکتہ این مقام قاصر است" (انفاس ص ۸۲)

عمل بالحدیث | شاہ صاحب فقہ میں حنفی مسلک رکھتے تھے، مگر اس وقت کے عام فقہا کی طرح جامد اور انتہا پسند نہیں تھے، بلکہ احادیث وآثار کا تتبع بھی کرتے تھے، اور جس مسئلہ میں جو مسلک حدیث کی روشنی میں انہیں صحیح معلوم ہوتا تھا، اسے اختیار کر لیتے تھے، خواہ وہ حنفی مسلک کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ عام فرض نمازوں میں امام کے پیچھے اور نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھتے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

"مخفی نماند کہ حضرت ایشاں در اکثر امور موافق مذہب حنفی عمل می کردند الا بعض چیزہا کہ بحسب حدیث یا وجدان بمذہب دیگر ترجیح می یافتند از انجملہ آنست

کہ در اقتدا سورۂ فاتحہ می خوانند و در جنازہ نیز،، (انفاس ص ۲۱)

ایک مرتبہ شیخ عبدالاحد نے قرأۃ خلف امام کے بارے میں شاہ صاحب سے بحث کی، اور اسکی نفی میں یہ عقلی دلیل پیش کی، کہ چند آدمی بادشاہ کے دربار میں کوئی غرض لے کر جاتے ہیں، تو اسے پیش کرنے کی خدمت ایک شخص کے سپرد کر دیتے ہیں، ہر شخص اپنی اپنی عرضداشت الگ الگ پیش نہیں کرتا، شاہ صاحب نے جواب میں فرمایا کہ اس پر نماز کا قیاس صحیح نہیں ہے، کیونکہ

"اصل در صلوٰۃ مناجات و تہذیب نفس است بدعا و خضوع چنانکہ حدیث لا صلوٰۃ لمن لا یقرء بام الکتاب دلالت می کند ،،

اس کے بعد فرمایا: خدا تعالیٰ ایسا سمیع (سننے والا) ہے، کہ اگر ساری دنیا کے لوگ ایک جگہ جمع ہو کر اپنی اپنی مختلف عرضداشتیں اپنی اپنی زبان میں بیک وقت شروع کر دیں، تو بھی ایک ساتھ ہر شخص کی گذارش سن سکتا ہے، اس سے کسی دوسرے کی گذارش میں کوئی خلل نہیں پڑے گا۔

اس کے بعد ان سے فرمایا کہ اس زمانہ میں تو امام اپنی زبان سے لفظ الحمد کہتا ہے، مگر اس کی حقیقت اور نماز کی روح سے بالکل غافل ہوتا ہے، لیکن آپ امام کے تشویش ذہن سے احتراز نہیں کرتے مگر دربار الٰہی میں چند آدمیوں کے ساتھ مناجات کرنے کو باعث تشویش سمجھتے ہیں۔

اسی طرح نماز سفر میں کبھی کبھی رخصت پر بھی عمل کر لیا کرتے تھے، اور قصر کے بجائے پوری نماز پڑھتے تھے۔ فرماتے ہیں:

در سفرے از اسفار در وقتے از اوقات صلوٰۃ بخاطرم رسید کہ قصر صلوٰۃ رخصت است گاہے باتمام ہم عمل باید کرد۔ بداں طریق نماز خواندم (انفاس ص ۱۷۸)

توسل | اس مسئلہ میں بھی عام متصوفین نے بہت سی بدعتیں پیدا کر دی ہیں جس سے عام مسلمان زندگی کے مشکلات و مصائب میں بارگاہ خداوندی کیطرف رجوع ہونے کے بجائے مختلف چوکھٹوں پر سر نیاز خم کرنے لگ گئے ہیں، اور ان کو وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِی عَنِّی فَاِنِّی قَرِیبٌ پر عملاً بالکل یقین نہیں رہ گیا ہے۔

اس مسئلہ وسیلہ کی خامیوں پر سب سے پہلے غالباً امام ابن تیمیہ نے قلم اٹھایا، اور اس کو شریعت کی روشنی میں منقح کیا۔ ان کے مسلک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی وسیلہ پکڑنا صحیح نہیں تھا، لیکن بعض دیگر ائمہ کی طرح شاہ عبدالرحیم صاحب نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وسیلہ کو جائز رکھا ہے،

مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور سے وسیلہ کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

وہرچہ مشکل افتد مدداز روحانیت حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم
باید خواست واز غیر حبیب خدا کسے دیگر، رجوع نباید کرد (مکتوبات ص۱۴)

عرس وسماع | عمل بالحدیث کے جذبہ کے باوجود شاہ صاحب کبھی کبھی عرس اور سماع میں بھی شرکت کرلیا کرتے تھے[1] لیکن ناجائز اغراض کے لئے جولوگ ختم خواجگان وغیرہ پڑھتے تھے، اسے وہ ناپسند کرتے تھے۔ (انفاس ص۵۲)

اخلاق وعادات | شاہ صاحب اخلاق و عادات میں اسلاف کی یادگار تھے۔ مزاج میں سادگی اور طبیعت میں صفائی اور بے تکلفی تھی۔ نشست وبرخاست، گفتگو و ملاقات، تعزیت وتہنیت، لین ودین، خرید وفروخت، تواضع وخاکساری، امداد واعانت، غرض اپنی زندگی کے ہر کام میں وہ نمونۂ عمل تھے، اور ان کا کوئی کام، حکمت، ادائے سنت یا خدمت خلق کے جذبے سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ فرمایا کرتے تھے، کہ

کار عاقلاں وحکیماں آنست کہ استیفائے لذت فقط مقصود نباشد بلکہ
باید کہ آں درضمن دفع حاجتے باقامت فضیلتے باادائے سنت واقع شود (انفاس ص۸۵)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر | کسی شخص کو سنت یا تعامل کے خلاف کوئی کام کرتے دیکھتے تھے، تو بڑی نرمی اور شفقت سے منع کرتے تھے۔ انفاس میں ہے،

اگر نصیحت می خواستند نہایت رفق ولین ادا می نمودند (ص۸۵)

جسکا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان کی نصیحت لوگوں پر بہت جلد اثر انداز ہو جاتی تھی۔

آپ کے ایک ملنے والے کو جو علم وفضل سے بھی بہرور تھے، فضول گوئی کی عادت تھی، شاہ صاحب نے ایکدن ان سے بڑی شفقت سے فرمایا، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت وتعلق چاہتے ہو، تو اس عادت کو ترک کردو، ورنہ اس دربار سے فیض نہیں پہنچ سکتا، آپ کی یہ بات انکے دل میں گھر کرگئی اور انہوں نے وہ عادت چھوڑدی۔

اگر کسی کو نیک بات کی تلقین کرتے، تو اس میں ملائمت کے ساتھ ساتھ مخاطب کی صلاحیت کو بھی ملحوظ رکھتے تھے۔

---

[1] انفاس ص۴۴، مگر اس زمانہ کا عرس محض قرآن خوانی اور سماع بغیر مزامیر دیندار لوگوں سے سننے کا رواج تھا، اس وقت کی قوالی اور عرس کے میلہ کو اس سے کوئی نسبت نہیں تھی۔

۱۰ امر بالمعروف و نہی منکر و مسائل مخصوصہ بشرط ظن قبول برفق ولین می کردند" (ص۸۵)

عام فائدہ کے لئے جمعہ کے دن وعظ بھی فرمایا کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے، کہ اس میں اجنبی بھی شرکت کرتے تھے[۱] زیادہ تر مشکوٰۃ، تنبیہ الغافلین، غنیۃ الطالبین اور آخر میں تفسیری وعظ کا معمول تھا۔ (انفاس ص۸۶)

آپ کے احباب ملنے آتے، تو رخصت کرتے وقت ان کے سامنے یہ شعر بطور وصیت پڑھا کرتے تھے:

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

خانہ داری کی ضروری خرید و فروخت خود کرتے۔ باوجود تنگی کے زندگی بھر کبھی قرض نہیں لیا۔ اور تعیش و تنعم کے لئے جو لوگ قرض لیتے تھے، ان کو بے حد ناپسند کرتے تھے۔ اور اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے،[۲] کھانے پینے میں مشتبہات سے بھی گریز کرتے تھے، ایک مرتبہ رمضان میں ان کے استاذ میر زاہد نے ان کی دعوت کی۔ اتفاق سے اسی وقت ایک کبابی آیا۔ اسے میر صاحب سے کچھ کام تھا جس کے لئے اس نے کباب کا ایک خوان بطور نذر کے پیش کیا۔ میر زاہد صاحب قبول نہیں کرتے تھے لیکن جب اس نے بہت اصرار کیا، تو ایک شاگرد سے کہا کہ قیمت لگا کر اسے رکھ لو۔ شاگرد نے کئی روپئے کے کبابوں کی قیمت کم لگائی اور کبابی راضی ہو گیا۔ شاہ صاحب نے میر زاہد سے آہستہ سے کہا کہ آپ رشوت سے بچنا چاہتے ہیں، مگر کئی روپئے کے کباب کم میں دینا علت سے خالی نہیں ہے۔ اگر غرض نہ ہوتی تو وہ کبھی راضی نہ ہوتا۔ شاہ صاحب کے اس کہنے پر میر صاحب نے شاگرد کو بلوا کر ڈانٹا۔ اور کبابوں کی پوری قیمت دلوائی[۳] اس کے بعد ان کبابوں سے افطار کیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے ان کے اخلاق و عادات کے متعلق جستہ جستہ بہت کچھ لکھا ہے۔ ایک جگہ جامع طور پر لکھتے ہیں:

حضرت ایشاں باخلاق سلیمہ مرضیہ از شجاعت و فراست و کفایت و عزت بدرجۂ اتم متصف بودند. عقل معاش شل عقل معاد کامل و وافر داشتند و در ہر امر توسط دوست می داشتند (انفاس ۸۵)

شاہی دربار او رامراء سے احتراز | شاہ صاحب امراء اور سلاطین سے ہمیشہ محترز رہے۔ شاہ ولی اللہ

[۱] انفاس ص۸۶ [۲] انفاس ص۸۶ [۳] انفاس ص۴۳

صاحب نے لکھا ہے کہ والد صاحب نے امراء کے پاس جانے اور ان سے ملاقات کرنے کی رسم بالکل امٹھا دی تھی، لیکن اگر ان میں سے خود کوئی آجاتا تھا، تو اس سے وہ کج خلقی بھی نہیں برتتے تھے، بلکہ اعزاز و اکرام سے پیش آتے تھے، اور اگر وہ نصیحت کی خواہش کرتے تھے، تو نہایت ہی رفق و تلطف سے دو چار کلمۂ خیر کہہ دیا کرتے تھے۔ (انفاس ص۸۵)

اوپر ذکر آچکا ہے کہ فتاوی کی تالیف کے سلسلہ میں شاہی ملازمت کو کس کشمکش کے بعد قبول کیا تھا، اور جب اس سے تعلق منقطع ہوا تو کس قدر مسرور ہوئے، اور شکرانہ ادا کیا، اور اس کے بعد جب شاہ عالمگیر نے زمین دینی چاہی تو اسے بھی قبول نہیں کیا

عالمگیر ہی کا ایک دوسرا واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کے ماننے والوں میں ایک صاحب عالمگیر کے درباری تھے۔ انہوں نے کسی موقع سے اس کے سامنے شاہ صاحب کے فضائل و مناقب کا ذکر کیا، عالمگیر نے ان سے اشتیاق ملاقات ظاہر کیا، انھوں نے بادشاہ سے عرض کیا کہ

بخانۂ ملوک و اغنیا رفتن طریقۂ ایشاں نیست (انفاس ص۶۹)

عالمگیر نے شاہ صاحب کے ایک دوسرے مخلص کے ذریعہ ملاقات کا پیغام بھیجا، لیکن شاہ صاحب نے اسے بھی قبول نہیں کیا، ہر چند انہوں نے اصرار کیا، مگر شاہ صاحب کسی طرح راضی نہ ہوئے، جب وہ بالکل مایوس ہو گئے، تو شاہ صاحب سے عرض کیا، کم از کم آپ ایک رقعہ ہی لکھ دیجئے، تاکہ کوتاہی نہ سمجھی جائے شاہ صاحب نے ایک کاغذ جس میں آپ کا جوتا لپٹا ہوا رکھا تھا۔ لیا اور اس پر یہ عبارت لکھ کر بادشاہ کے پاس بھیج دی

"اجماع اہل دولت است بر آنکہ بئس الفقیر علی باب الامیر و حق سبحانہ می فرماید وما متاع الحیٰوۃ الدنیا الا قلیل جز اقل بشمار سید و اگر بالفرض بمن خواہید داد جزء لا یتجزی خواہد بود برائے ایں جز لا یتجزی نام خود را از دیوان خدائے تعالیٰ چرا برآرم زیراکہ در بعض ملفوظات بزرگان چشتیہ مذکور است کہ ہر کہ نام او در دیوان بادشاہ نوشتہ شد، نام او را از دیوان حق سبحانہ برمی آرند"[1]

یہ خط اس بادشاہ کو لکھا گیا ہے، جو شاہان تیموریہ میں سب سے زیادہ دیندار اور مذہب کا دلدادہ

---

[1] انفاس العارفین ص۶۹ شاہ صاحب کے مکتوبات میں یہ خط کچھ تغیر الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔

تھا۔ اور جس کے ذریعہ "فتاویٰ عالمگیری" جیسا دینی اور اہم کام انجام پایا تھا۔ اسی طرح ایک مرتبہ عالمگیر کے پوتے عظیم الشان نے ملاقات کی خواہش کی، اور شاہ صاحب کے پاس لکھا کہ "اگر آپ خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زیارت کے لئے تشریف لے جاتے، تو اس بہانہ سے مجھے بھی شرف نیاز حاصل ہو جاتا" شاہ صاحب نے جواب میں لکھ بھیجا کہ

ان اللہ لا ینظر الی صورکم و اعمالکم	اللہ تعالیٰ صورت اور اعمال کی طرف نہیں دیکھتا
و انما ینظر الی قلوبکم و نیاتکم	اس کی نگاہ قلوب اور نیتوں پر پڑتی ہے۔
بامثال این امور فریفتہ نمی شوم	میں اس قسم کی چیزوں پہ فریفتہ نہیں ہوتا۔

شاہ صاحب کے زمانہ (۱۰۵۴ھ - ۱۱۳۱ھ) میں بڑے سیاسی انقلابات ہوئے، اور کئی سلاطین بدلے، جنہوں نے دعا و برکت کے بہانہ شاہ صاحب کی حمایت و ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی مگر آپ نے ہمیشہ گریز کیا، اور ان معاملات سے بہت کم دلچسپی لی۔

جب معز الدین جہاندار شاہ پر فرخ سیر نے چڑھائی کی، تو معز الدین نے دعائے فتح کے لئے شاہ صاحب کی خدمت میں آنا چاہا، لیکن آپ نے اپنے درباری احباب کے ذریعہ یہ کہلا کر اسے روک دیا کہ:

"اس کا آنا مناسب نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر سچ بولوں گا تو وہ ناخوش ہوگا، اگر جھوٹ بولوں تو فقیروں کا یہ شیوہ نہیں ہے" (انفاس ص۶۳)

اس طرح فرخ سیر اور سادات بارہہ میں ان بن ہوئی، تو شاہ صاحب کے سامنے بھی یہ جھگڑا پیش ہوا، آپ نے صرف اتنا فرمایا کہ "برائے من این راہم چنیں بگزارید" یعنی میری خاطر اس بادشاہ (فرخ سیر) کو اس کے حال میں چھوڑ دو۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب کا بیان ہے کہ:

"والد صاحب جب تک زندہ رہے، فرخ سیر پر کوئی آنچ نہیں آئی لیکن ان کے انتقال کے پچاس ہی دن بعد فرخ سیر کی بساط حکومت الٹ دی گئی، اور وہ قید کر لیا گیا" (انفاس ص۶۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو شاہ صاحب فرخ سیر کو کسی حد تک پسند کرتے تھے۔ یا اس کے بعد جو فتنہ و فساد ملک میں شروع ہونے والا تھا، اسے اپنی زندگی میں دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔

عبادت اور ذکر و اشغال ذکر و فکر، طاعت و عبادت، صلاح و تقویٰ کے اعتبار سے شاہ صاحب کی

زندگی نمونہ تھی۔ انہوں نے فرائض کے علاوہ نوافل و مستحبات میں بھی اپنا جو معمول بنالیا تھا، ان پر ہمیشہ مستقیم رہے، اور عذر شرعی کے علاوہ انہیں کبھی ترک نہیں کیا۔ ان کی زندگی کا اصول تھا کہ "الاستقامۃ خیر من الکرامۃ" (احکام الٰہی پر) استقامت کرامت سے بڑھ کر ہے" انہوں نے شیخ محمد جیو کو ایک خط میں لکھا کہ مجھے اللہ نے پانچ چیزیں عطا کی ہیں، تم بھی ان پر قائم رہو، ان میں سے ایک یہ ہے کہ الذکرُ والتقوٰی علیٰ کل حال یعنی ہر حال میں ذکر و تقویٰ پر استقامت ہونی چاہیئے۔ ذیل کے واقعات سے اسکا اندازہ ہوسکے گا۔

ہمیشہ نماز باجماعت پڑھتے تھے، عذر شرعی کے علاوہ کبھی اسے ترک نہیں کیا۔ نماز کی پابندی کا یہ حال تھا کہ جس شب آپ کا انتقال ہوا، تو نفس واپسیں سے کچھ دیر پہلے دریافت کیا، صبح صادق ہوئی یا نہیں۔ حاضرین نے نفی میں جواب دیا، آپ نے فرمایا کہ میرا رخ قبلہ کیطرف کردو۔ لوگوں نے اس کی تعمیل کی، اور آپ نے اشارہ سے نماز ادا کی۔ اسی طرح وفات سے چند مہینہ پہلے رمضان کا مہینہ آگیا، آپ بتقاضائے عمر اور علالت کی وجہ سے کمزور ہوچکے تھے، اور آپ کے لئے شرعی رخصت بھی موجود تھی، لیکن آپ نے اس سے فائدہ اٹھانا گوارہ نہ کیا، اور پورے روزے رکھے۔ آپ کی اہل خانہ نے افطار کے لئے اصرار کیا، تو فرمایا کہ "بس یہی تو ہوتا ہے کہ کمزوری کی وجہ سے بیہوش ہوجاتا ہوں، تو یہ میرے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے، بیہوش رہنے کا تو عادی ہوچکا ہوں"[۲] شاہ صاحب کے خاص خاص معمولات یہ تھے۔

تہجد، اشراق، اور چاشت کا خاص اہتمام تھا، لیکن تہجد میں رکعتوں کی تعیین نہیں تھی، بلکہ حضور ذہن اور نشاط کے ساتھ جتنی رکعتیں ہوجاتی تھیں، پڑھ لیا کرتے تھے۔ نماز مغرب کے بعد دو رکعت نفل والدین او اپنے بڑے بھائی کے ایصال ثواب کے لئے پڑھتے تھے۔

تلاوت قرآن روزانہ کا معمول تھا، اور اسے بڑی خوش الحانی، سوز و گداز اور تجوید کے ساتھ پڑھتے تھے۔ دن میں ایک ہزار بار درود شریف اور ایک ہزار نفی و اثبات، بارہ ہزار مرتبہ اسم ذات کا ورد کرتے تھے، اور گیارہ بار سورۂ مزمل اور گیارہ سو بار یا مغنی غنا و ظاہری کے لئے پڑھتے تھے، درود سے خاص عشق تھا، فرمایا

---

[۱] وہ پانچ چیزیں یہ ہیں: الذکر والتقوٰی علیٰ کل حال والایصال النفع للخلق من غیر تفرقۃ وعدم تفضیل نفسہ علی احد من الخلق والتواضع لامر اللہ وبخلق اللہ۔ ہر حالت میں ذکر و تقویٰ (مومن و کافر حیوان و انسان) کی تفریق کے بغیر مخلوق کی نفع رسانی اور اپنے نفس کو افضل نہ سمجھنا اور خدا کے حکم کے آگے جھکنا، اور اس کی مخلوق سے تواضع کے ساتھ پیش آنا۔ [۲] انفاس العارفین اور انفاس رحیمیہ۔

کرتے تھے کہ:

ہرچہ یافتیم بدولت ورود مجرد یافتیم (انفاس العارفین ط ۹)

حکیمانہ مقولے شاہ صاحب کے ملفوظات اور مکتوبات میں سیکڑوں حکیمانہ جواہر پارے بکھرے ہوئے ہیں، ہم ان میں سے چند جن کا تعلق معاملات سے ہے، نقل کرتے ہیں۔ آداب مجلس کے متعلق فرماتے تھے کہ

در مجلس ہرگز کوشش تو مے کمن مگو کہ اہل پورب چنیں اند واہل پنجاب چنیں وافغان چنیں۔ شاید دراں میاں مردے باشد ازاں قوم یا از اہل حمیت آں قوم بدیں سبب صحبت منغص شود۔

عام مجلس میں کسی قوم کو ملامت کرو، یہ نہ کہو کہ اہل پورب ایسے ہیں، اور اہل پنجاب ایسے ہیں، اور افغان اس طرح کے ہیں، ممکن ہے کہ اس قوم کا کوئی آدمی یا کوئی اہل غیرت شخص موجود ہو، اور وہ برا مانے، اور مجلس میں بے لطفی پیدا ہو۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ:

ہرگز سخنے مخالف جمہور در مجلس عام بزبان میار اگرچہ فی نفسہ صحیح باشد کہ ایشاں برآں انکار کنند و صحبت منغص شود۔

جو بات جمہور کے خلاف ہو، اسے ہرگز مجلس عام میں نہ کہو، اگرچہ وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ لوگ رد و قدح کریں گے اور مجلس میں تکدر پیدا ہوگا۔

فرمایا کہ:

در مجلس عام برکسے رد صریح مکن

مجلس عام میں کسی شخص کی کھلم کھلا تردید نہ کرو۔

فرمایا کہ:

اگر آنانکہ منزلت ایشاں از منزلت تو فروتر است ابتدا بالسلام کنند آنرا نعمتی از نعم الٰہی شناس و شکر آں بجا آرد و در روئے ایشاں منبسط شود تفقد حال ایشاں کن لباس مے باشد

جو لوگ تم سے کم مرتبہ کے ہیں، وہ اگر پہلے سلام کریں تو اس کو خدا کی نعمت سمجھو، اور اس پر اس کا شکر ادا کرو۔ اور ان سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آؤ، اور ان کی مزاج پرسی کرو، اس لئے کہ بسا اوقات ایک ادنے

ادنی التفاتے کہ نزدیک تو ہیچ قدر ندارد ودر چشم ایشاں عظیم نماید

التفات جسکی تمہارے نزدیک کوئی قیمت نہیں ہے، ان کے نزدیک اس کی بڑی عظمت ہوتی ہے۔

واگر آں را نیابند محزوں شوند

اور اگر وہ تمہاری طرف سے یہ ادنیٰ التفات نہ پائیں گے تو رنجیدہ ہوں گے۔

فرمایا کہ:

اگر ترا با کسے حاجتے باشد بروتمہید شایستہ کن وتدریج نما در طلب آں حاجت و نباید کہ سخن مثل سنگ اندازی۔

اگر تم کو کسی سے کوئی ضرورت پیش آجائے تو عمدہ پیرایے اور تدریجی طور سے اس کا اظہار کرو۔ یہ نہ ہو کہ بات پتھر کی طرح مارو۔

والدین کی خدمت کے بارے میں فرمایا، لوگ سمجھتے ہیں کہ اس سے عہدہ برآ ہونا بہت مشکل کام ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بہت آسان ہے۔ اس لئے کہ:

ایشاں بادنی خاطر جوئی رضامند می شوند واند کے را بسبب غایت شفقت بسیارے شمروند۔

والدین تھوڑی سی دلجوئی سے بھی راضی ہو جاتے ہیں، اور غلبۂ شفقت کی وجہ سے تھوڑی خدمت کو بھی بہت سمجھتے ہیں۔

درمخاطبہ بزرگان سخن مغلق و موجز وآہستہ گفتن روا نیست

بڑوں سے گفتگو کرنے میں مغلق، مختصر اور آہستہ بات نہیں کرنا چاہیئے۔

در سخن گفتن ودر راہ رفتن ونشستن ودر برخاستن برسم اقویا وعادت ایشاں کار کن اگرچہ ضعیف باشی

بات چیت کرنے، راستہ چلنے اور نشست و برخاست میں قوی لوگوں کی عادت اختیار کرو، خواہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو۔

وضع اور لباس کے متعلق فرماتے ہیں:

باید کہ لباس وزی مرد مشعر باشد بصفت کمال وے مثلاً کسے کہ دانشمند است باید لباس دانشمنداں

آدمی کا لباس اور اس کی وضع ایسی ہونی چاہیئے کہ اس سے اس کے صفت کمال کا پتہ چل جائے، مثلاً اگر کوئی فقیہ یا فلسفی ہو

پوشد بہ آئین ایشاں زندگانی کند و آنکہ فقیر است باید لباس فقیراں پوشد و بہ آئین ایشاں زندگانی کند

تو اس کو انہیں جیسا لباس پہننا چاہئے اور انہیں جیسی زندگی گذارنی چاہئے۔ اگر کوئی درویش ہے تو اسے اہل فقر ہی جیسا لباس اور انہیں جیسا رہن سہن اختیار کرنا چاہئے۔

اولاد شاہ صاحب کی دو شادیاں ہوئی تھیں، پہلی زوجہ کے متعلق یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کس کی صاحبزادی اور کس خاندان سے تھیں۔ ان کے بطن سے ایک صاحبزادے صلاح الدین پیدا ہوئے، جب شاہ صاحب کا سن ساٹھ برس کا ہوا تو بعض غیبی[1] بشارتوں کی بنا پر انہوں نے دوسری شادی محمد پھلتی[2] کی صاحبزادی سے کی۔ ان نیک بخت خاتون کے بطن سے دو صاحبزادے شاہ ولی اللہ[3] اور شاہ اہل اللہ[4] پیدا ہوئے، اور ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون کے سرچشمہ بنے۔۔

[1] اس غیبی بشارت کا تذکرہ شاہ ولی اللہ صاحب نے انفاس العارفین میں دو جگہ کیا ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں: "بر ایشاں منکشف ساختند تقدیر برآں جاری شد کہ ایشاں را فرزند دیگر موجود آید .... وآں مولود بفلاں وفلاں مقام خواہد رسید داعیہ تزوج بخاطر ایشاں پیدا شد" (انفاس ص۳۳) دوسری جگہ خود شاہ عبدالرحیم صاحب کی زبانی فرماتے ہیں: "می فرمودند دیگر بار بزیارت مرقد منور ایشاں (بختیار کاکی) رفتم روح ایشاں ظاہر شد، فرمودند ترا پسرے پیدا خواہد شد اورا قطب الدین احمد نام کن...... بعد از رفتنے داعیہ تزوج دیگر پیدا شد" (ص۴۴) [2] شیخ محمد کے اجداد سدمنور (بہار) کے رہنے والے تھے، ان کے جد اد میں شیخ احمد نے سکندر لودی کے دربار میں رسوخ حاصل کیا، جس سے ان کو پھلت کے قریب کچھ زمین مل گئی، اور وہ سدمنور سے پھلت آگئے۔ یہ خاندان دنیاوی وجاہت کے ساتھ ساتھ علم و فضل میں بھی ممتاز تھا، خود شیخ محمد بڑے برگزیدہ درمتانہ بزرگوں میں تھے۔ [3] شاہ ولی اللہ صاحب کی والدہ ایک رابعہ صفت اور مریم نظرت خاتون تھیں، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ان کی نسبت توجہ کا حال یہ تھا کہ ایک مرتبہ انہوں نے بیس عورتوں کو بیک وقت توجہ دی (ص۲۳) ان کی عبادت و ریاضت کے اور بھی واقعات انفاس العارفین میں ہیں۔ [4] شاہ اہل اللہ بھی علم و فضل و تصوف میں خاندانی روایات کے حامل تھے، انہوں نے شاہ عبدالرحیم صاحب کے مکتوبات کو انفاس رحیمیہ کے نام سے جمع کیا ہے، کتاب کے شروع میں چند سطریں انہوں نے بھی اخلاقیات پر لکھی ہیں، جن سے ان کی عظمت اور ولایت کا پتہ چلتا ہے۔

رمضان کی آمد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خطبہ

عن سلمان الفارسیؓ قال خطبنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی اٰخر یوم من شعبان فقال یا ایھا الناس قد اظلکم شھر عظیم شھر مبارک شھر فیہ لیلۃ خیر من الف شھر جعل اللہ صیامہ فریضۃ وقیام لیلہ تطوعا من تقرب فیہ بخصلۃ من الخیر کان کمن ادی فریضۃ فیما سواہ و من ادی فریضۃ فیہ کان کمن ادی سبعین فریضۃ فیما سواہ وھو شھر الصبر والصبر ثوابہ الجنۃ وشھر المواساۃ وشھر یزاد فیہ رزق المومن من فطر فیہ صائما کان لہ مغفرۃ لذنوبہ وعتق رقبتہ من النار وکان لہ مثل اجرہ من غیر ان ینتقص من اجرہ شیٔ قلنا یا رسول اللہ

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ماہ شعبان کی آخری تاریخ کو رسول اللہؐ نے ہم کو ایک خطبہ دیا، اس میں آپؐ نے فرمایا: اے لوگو تم پر عظمت اور برکت والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے، اس مبارک مہینہ کی ایک رات (شب قدر) ہزار مہینوں سے بہتر ہے، اس مہینہ کے روزے اللہ تعالیٰ نے فرض کئے ہیں اور اس کی راتوں میں بارگاہ خداوندی میں کھڑا ہونے (یعنی نماز تراویح پڑھنے) کو نفل عبادت مقرر کیا (جسکا بہت بڑا ثواب رکھا ہے) جو شخص اس مہینہ میں اللہ کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے کوئی غیر فرض عبادت (یعنی سنت یا نفل) ادا کریگا تو اس کو دوسرے زمانے کے فرضوں کے برابر اسکا ثواب ملے گا، اور اس مہینہ میں فرض ادا کرنے کا ثواب دوسرے زمانے کے ستر فرضوں کے برابر ملے گا، یہ صبر کا مہینہ ہے، اور صبر کا بدلہ جنت ہے یہ ہمدردی اور غمخواری کا مہینہ ہے، اور یہی وہ مہینہ ہے جس میں مومن بندوں کے رزق میں اضافہ کیا

یس کلنا یجد ما یفطر به الصائم فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعطی اللہ هذا الثواب من فطر صائماً علی مذقة لبن او شربة من ماء ومن اشبع صائما سقاه اللہ من حوضی شربة لا یظمأ حتی یدخل الجنة وهو شهر اوله رحمة واوسطه مغفرة واٰخره عتق من النار ومن خفف عن مملوکه فیه غفر اللہ له واعتقه من النار۔

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

جاتا ہے جس نے اس مہینہ میں کسی روزہ دار کو (اللہ کی رضا اور ثواب حاصل کرنے کیلئے) افطار کرایا تو اس کے لئے گناہوں کی مغفرت اور آتش دوزخ سے آزادی کا ذریعہ ہوگا۔ اور اس کو روزہ دار کے برابر ثواب ملے گا بغیر اس کے کہ روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی کی جائے آپ سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ ہم میں سے ہر شخص کو تو افطار کرانے کا سامان میسر نہیں ہوتا (تو کیا غرباء اس عظیم ثواب سے محروم رہیں گے؟) آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی دے گا جو دودھ کی تھوڑی سی لسی پر یا صرف پانی ہی کے ایک گھونٹ پر کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرادے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے آگے ارشاد فرمایا کہ) اور جو کوئی کسی روزہ دار کو پورا کھانا کھلادے اس کو اللہ میرے حوض (یعنی کوثر) سے ایسا سیراب کریگا جس کے بعد اس کو کبھی پیاس ہی نہیں لگے گی تا آنکہ وہ جنت میں پہنچ جائیگا اسکے بعد آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس ماہ مبارک کا ابتدائی حصہ رحمت ہے اور درمیانی حصہ مغفرت ہے اور آخری حصہ آتش دوزخ سے آزادی ہے (اس کے بعد آپ نے فرمایا) اور جو آدمی اس مہینہ میں اپنے غلام و خادم کے کام میں تخفیف اور کمی کردیگا اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمادیگا اور اس کو دوزخ سے رہائی اور آزادی دے دیگا۔

تشریح | اس خطبۂ نبوی کا مطلب و مدعا واضح ہے تاہم اسکے چند اجزاء کی مزید وضاحت کیلئے کچھ عرض کیا جاتا ہے:

(۱) اس خطبہ میں ماہ رمضان کی سب سے بڑی اور پہلی عظمت و فضیلت یہ بیان کی گئی ہے کہ اس میں ایک

ایسی رات ہوتی ہے جو ہزار دنوں اور راتوں سے نہیں، بلکہ ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ یہ بات جیساکہ معلوم ہے قرآن مجید سورۃ القدر میں بھی فرمائی گئی ہے، بلکہ اس پوری سورہ میں اس مبارک رات کی عظمت اور فضیلت ہی کا بیان ہے، اور اس رات کی عظمت و اہمیت سمجھنے کے لئے بس یہی بات کافی ہے۔

ایک ہزار مہینوں میں قریباً تیس ہزار راتیں ہوتی ہیں۔ اس لیلۃ القدر کے ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہونے کا مطلب یہ سمجھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے اور اس کے قرب و رضا کے طالب بندے اس ایک رات میں قرب الٰہی کی اتنی مسافت طے کر سکتے ہیں۔ جو دوسری ہزار دن راتوں میں طے نہیں ہو سکتی ہم جس طرح اپنی اس مادی دنیا میں دیکھتے ہیں کہ تیز رفتار ہوائی جہاز یا راکٹ کے ذریعہ اب ایک دن بلکہ ایک گھنٹہ میں اس سے زیادہ مسافت طے کی جا سکتی ہے جتنی پرانے زمانے میں سیکڑوں برس میں طے ہوا کرتی تھی۔ اسی طرح حصول رضائے خداوندی اور قرب الٰہی کے سفر کی رفتار لیلۃ القدر میں اتنی تیز کر دی جاتی ہے کہ جو بات صادق طالبوں کو سیکڑوں مہینوں میں حاصل نہیں ہو سکتی، وہ اس مبارک رات میں حاصل ہو جاتی ہے۔

اسی طرح اور اسی کی روشنی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب بھی سمجھنا چاہیئے کہ اس مبارک مہینہ میں جو شخص کسی قسم کی نفلی نیکی کرے گا اس کا ثواب دوسرے زمانے کی فرض نیکی کے برابر ملے گا، اور فرض نیکی کرنے والے کو دوسرے زمانہ کے ستّر فرض ادا کرنے کا ثواب ملے گا۔۔۔۔۔ گویا "لیلۃ القدر" کی خصوصیت تو رمضان مبارک کی ایک مخصوص رات کی خصوصیت ہے۔ لیکن نیکی کا ثواب ستّر گنا ملنا یہ رمضان مبارک کے ہر دن اور ہر رات کی برکت اور فضیلت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان حقیقتوں کا یقین نصیب فرمائے، اور ان سے مستفید اور متمتع ہونے کی توفیق دے۔

(۲) اس خطبہ میں رمضان کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ یہ صبر اور غمخواری کا مہینہ ہے۔ دینی زبان میں صبر کے اصل معنیٰ ہیں اللہ کی رضا کے لئے اپنے نفس کی خواہشوں کو دبانا اور تلخیوں اور ناگواریوں کو جھیلنا۔ ظاہر ہے کہ روزہ کا اول و آخر بالکل یہی ہے۔ اسی طرح روزہ رکھ کر ہر روزہ دار کو تجربہ ہوتا ہے کہ فاقہ کیسی تکلیف کی چیز ہے، اس سے اس کے اندر ان غرباء، اور مساکین کی ہمدردی اور غمخواری کا جذبہ پیدا ہونا چاہئے۔ جو بیچارے ناداری کی وجہ سے فاقوں پہ فاقے کرتے ہیں۔ اس لئے رمضان کا مہینہ بلا شبہ صبر اور غمخواری کا مہینہ ہے۔

(۳) یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ:۔۔۔۔۔۔ "اس بابرکت مہینہ میں اہل ایمان کے رزق میں اضافہ کیا جاتا ہے"۔۔۔۔۔۔ اس کا تجربہ تو بلا استثنا ہر صاحب ایمان روزہ دار کو ہوتا ہے کہ رمضان مبارک میں جتنا اچھا

اور جتنی فراغت سے کھانے پینے کو ملتا ہے، باقی گیارہ مہینوں میں اتنا نصیب نہیں ہوتا۔ خواہ اس عالمِ اسباب میں وہ کسی بھی راستے سے آئے، سب اللہ ہی کے حکم سے اور اسی کے فیصلہ سے آتا ہے۔

(۴) خطبہ کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ:—— "رمضان کا ابتدائی حصہ رحمت ہے، درمیانی حصہ مغفرت ہے، اور آخری حصہ جہنم سے آزادی کا وقت ہے۔"

اس عاجز کے نزدیک اس کی راجح اور دل کو زیادہ لگنے والی توجیہ اور تشریح یہ ہے کہ رمضان کی برکتوں سے مستفید ہونے والے بندے تین طرح کے ہو سکتے ہیں، ایک وہ اصحابِ صلاح و تقویٰ جو ہمیشہ گناہوں سے بچنے کا اہتمام رکھتے ہیں، اور جب کبھی ان سے کوئی خطا اور لغزش ہو جاتی ہے تو اسی وقت توبہ و استغفار سے اس کی صفائی و تلافی کر لیتے ہیں۔ تو ان بندوں پر تو شروع مہینہ ہی سے بلکہ اس کی پہلی ہی رات سے اللہ کی رحمتوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو ایسے متقی اور پرہیزگار تو نہیں ہیں، لیکن اس لحاظ سے بالکل گئے گزرے بھی نہیں ہیں تو ایسے لوگ جب رمضان کے ابتدائی حصے میں روزوں اور دوسرے اعمالِ خیر اور توبہ و استغفار کے ذریعہ اپنے حال کو بہتر اور اپنے کو رحمت و مغفرت کے لائق بنا لیتے ہیں، تو درمیانی حصہ میں ان کی بھی مغفرت اور معافی کا فیصلہ فرما دیا جاتا ہے۔—— اور تیسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو اپنے نفسوں پر بہت ظلم کر چکے ہیں اور ان کا حال بڑا ابتر رہا ہے، اور اپنی بداعمالیوں سے وہ گویا دوزخ کے پورے پورے مستحق ہو چکے ہیں، وہ بھی جب رمضان کے پہلے اور درمیانی حصے میں عام مسلمانوں کے ساتھ روزے رکھ کے، اور توبہ و استغفار کر کے اپنی سیاہ کاریوں کی کچھ صفائی اور تلافی کر لیتے ہیں تو آخیر عشرہ میں (جو دریائے رحمت کے جوش کا عشرہ ہے) اللہ تعالیٰ دوزخ سے ان کی بھی نجات اور رہائی کا فیصلہ فرما دیتا ہے۔

اس تشریح کی بنا پر رمضان مبارک کے ابتدائی حصے کی رحمت، درمیانی حصے کی مغفرت اور آخری حصے میں جہنم سے آزادی کا تعلق بالترتیب امتِ مسلمہ کے ان مذکورۂ بالا طبقوں سے ہوگا۔ واللہ اعلم۔

(معارف الحدیث)

روزہ جسم کی زکوٰۃ ہے

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکل شیئ زکوٰۃ وزکوٰۃ الجسد الصوم والصیام نصف الصبر (ابن ماجہ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہر گندگی کو دور کرنے کیلئے اللہ نے کوئی نہ کوئی چیز بنائی ہے اور جسم کو روحانی گندگی اور بیماریوں سے) پاک کرنے والی چیز روزہ ہے اور روزہ آدھا صبر ہے

تشریح جدید طبی تحقیقات کی رو سے تمام مسلم اور غیر مسلم ڈاکٹر اس بات پر متفق ہیں کہ اسلامی طرز پر روزہ رکھنے سے مہلک امراض قلب سے نجات مل جاتی ہے۔ جرمنی اور امریکہ میں ایسے شفا خانے موجود ہیں، جن میں خطرناک امراض کا علاج صرف روزہ سے کیا جاتا ہے۔

روزہ کے نصف صبر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ روزہ ایک ایسی عبادت ہے جو دوسری عبادتوں سے زیادہ خالص اور شائبۂ ریا سے پاک ہے، اس لئے اس سے نفس پر قابو پانے کی جو قوت حاصل ہوتی ہے، وہ دوسری تمام عبادتوں سے حاصل ہونے والی قوت سے نصف کے برابر ہوگی۔ واللہ اعلم

روزہ اور تراویح کا اجر

قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم من صام رمضان ایماناً واحتساباً غفر لہ ما تقدم من ذنبہ ومن قام رمضان ایماناً واحتساباً غفر لہ ما تقدم من ذنبہ

(بخاری ومسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے ایمان کے ساتھ اجر آخرت کی نیت سے رمضان کے روزے رکھے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو معاف کر دیگا جو پہلے ہو چکے ہیں اور جس شخص نے ایمان کے ساتھ اجر آخرت کی نیت سے رمضان میں تراویح پڑھی تو اللہ تعالیٰ اس کے پہلے کے گناہوں کو معاف کر دے گا۔

تشریح یہ حدیث بتاتی ہے کہ مغفرت دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے، اول یہ کہ وہ مومن ہو جس کا مطلب یہ ہے کہ بغیر ایمان لائے اگر کوئی رمضان کے روزے رکھے گا تو اس کا روزہ مقبول نہ ہوگا۔ دوسری شرط یہ کہ روزہ رکھنے کا محرک صرف خدا کی خوشنودی اور آخرت میں اجر پانے کی نیت ہو، اگر نیت کچھ اور ہے، تو ایسے مسلمان کے روزوں کی اللہ کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔

جن گناہوں کے معاف کرنے کا وعدہ اس حدیث میں کیا گیا ہے، ان سے وہ گناہ مراد ہیں جن کا تعلق خدا سے ہے۔ رہے وہ گناہ جو حقوق العباد سے تعلق رکھتے ہیں، وہ معاف نہ ہوں گے۔ ان کی معافی کی صرف ایک شکل ہے، اور وہ یہ کہ آدمی صاحب حق کو اس کا حق لوٹا دے۔ یا وہ اسکا دنیا میں معاف کر دے۔

روزہ کو خراب کرنیوالی چیزیں

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الصیام جنۃ واذا کان یوم صوم احدکم فلا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روزہ (شیطان اور شیطانی کاموں سے بچانیوالی) ڈھال ہے۔ اور جب تم میں سے کوئی روزہ دار ہو تو زبان

يرفث ولا يصخب فان سابّه احد او قاتله فليقل اني امرء صائم (بخاری ومسلم)

بے فحش بات نہ نکالے، نہ شور و ہنگامہ کرے اور اگر کوئی اس سے گالم گلوچ کرے یا لڑائی پر آمادہ ہو تو روزہ دار یہ سوچے کہ میں تو روزہ سے ہوں (میرے لئے مناسب حال یہ نہیں ہے کہ گالی اور لڑائی کروں)

روزہ کی روح | عن ابی هريرة رض قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من لم يدع قول الزور والعمل به فليس لله حاجة في ان يدع طعامه وشرابه (بخاری ومسلم)

حضرت ابو ہریرہ رض کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے (روزہ رکھنے کے باوجود) جھوٹ بات کہنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ کو اس کے بھوکا اور پیاسا رہنے سے کوئی دلچسپی اور مطلب نہیں۔

تشریح | یعنی روزہ رکھوانے سے مقصود انسان کو نیک بنانا ہے، اگر وہ نیک نہ بنا، اگر اس نے نیکی اور تقویٰ پر اپنی زندگی کی عمارت نہ اٹھائی۔ رمضان میں روزہ رکھکر باطل اور ناحق بات کہتا اور کرتا رہا تو ایسے شخص کو سوچنا چاہئے کہ وہ آخر کیوں صبح سے شام تک بھوکا اور پیاسا رہا۔

روزہ میں ریا سے پرہیز | قال ابو هريرة رض اذا صام فليدهن لا يرى عليه اثر الصوم (الادب المفرد للبخاری)

حضرت ابو ہریرہ رض نے فرمایا: جب آدمی روزہ رکھے تو چاہئے کہ تیل لگائے، اس پر روزہ کے آثار ظاہر نہ ہوں۔

تشریح | یعنی روزہ کی نمائش سے بچے، نہا دھولے، تیل لگالے، تاکہ روزہ کی وجہ پیدا ہونے والی سستی اور اضمحلال دور ہو جائے۔ روزہ کی نمائش روزہ کے لئے تباہ کن ہے۔

سفر میں رخصت | عن انس ابن مالك رض قال كنا نسافر مع النبي صلی الله علیه وسلم فلم يعب الصائم على المفطر ولا المفطر على الصائم (بخاری)

حضرت انس رض فرماتے ہیں کہ ہم (رمضان میں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر جہاد کرتے (کچھ لوگ روزہ رکھتے کچھ نہ رکھتے) تو روزہ رکھنے والے اعتراض نہ کرتے روزہ نہ رکھنے والوں پر اور بغیر روزہ دار اعتراض نہ کرتے روزہ

تشریح مسافر کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی گئی ہے، جو شخص بہ آسانی سفر میں روزہ رکھ سکے تو اس کے لئے سفر میں روزہ رکھنا افضل ہے، اور جسے زحمت ہو اس کے لئے نہ رکھنا افضل ہے کسی کو کسی پر اعتراض کرنا مناسب نہیں ہے، یہی حضرات صحابہ رضا کی رائے ہے، اور اسی پر ان کا عمل تھا۔

سحری کی تاکید قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم تسحروا فان فی السحور برکۃ (بخاری)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سحری کھاؤ، اس لئے کہ سحری میں برکت ہے۔

تشریح مطلب یہ ہے کہ سحری کھا کر روزہ رکھو گے تو دن آسانی سے کٹے گا، خدا کی عبادت اور دوسرے کاموں میں کمزوری اور سستی راہ نہ پائے گی، سحری نہ کھاؤ گے تو سستی اور کمزوری آئے گی عبادت میں جی نہ لگے گا اور یہ بڑی بے برکتی کی بات ہوگی، چنانچہ دوسری حدیث میں فرمایا جس کا ترجمہ یہ ہے، "روزہ رکھنے میں سحری سے مدد لو"۔ اسی مضمون کی ایک حدیث امام نسائی نے روایت کی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے "سحری کھانا باعث برکت ہے۔ یہ برکت صرف تم کو اللہ نے دی ہے تو سحری کھانا نہ چھوڑنا"۔ یہود سحری نہیں کھاتے تھے، اور آج بھی نہیں کھاتے، یہ وہ بدعت ہے جو ان کے عالموں نے ایجاد کی تھی۔ اللہ نے اپنے نبی رحمت کے ذریعہ ان بدعتوں اور ناروا اور نامعقول پابندیوں سے امت کو آزاد کیا، اور بہت سی آسانیوں سے نوازا، انہی میں سے سحری بھی ہے۔ نبی رحمت صلعم پر درود وسلام۔

افطار میں تاخیر نہ کرو عن سھل بن سعد رضؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یزال الناس بخیر ما عجلوا الفطر (بخاری)

حضرت سہل بن سعد رضؓ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ (یعنی مسلمان) اچھی حالت میں رہیں گے جب تک افطار میں جلدی کریں گے۔

تشریح یہودی بدعات میں ایک بدعت یہ تھی کہ روزہ افطار کرنے میں بہت تاخیر کرتے تھے، ستارے چھٹک جانے کے بعد روزہ کھولتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو یہود کی بدعت سے بچانے کے لئے امت کو یہ ہدایت کی۔

روزہ کی شفاعت عن عبد اللہ ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الصیام والقرآن

حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روزہ اور قرآن مومن کے لئے سفارش کریں گے، روزہ کہے گا اے رب

يشفعان للعبد يقول الصيام
اى رب انى منعته الطعام والشهوات
فشفعنى فيه ويقول القرآن
منعته النوم بالليل فشفعنى فيه
فيشفعان
(مشكوٰة)

رب میں نے اس شخص کو کھانے اور دوسری لذتوں
سے روکا تو یہ رکا رہا تو اے میرے رب اس کے بارے
میں میری سفارش قبول فرمالے، اور قرآن کہے گا،
اے میرے رب میں نے اس کو رات میں سونے سے روکا
(تو یہ اپنی میٹھی نیند چھوڑ کر تراویح میں قرآن پڑھتا
رہا) تو اے رب اس شخص کے بارے میں میری سفارش
قبول فرمالے۔ چنانچہ دونوں کی سفارشیں اللہ قبول کریگا

روزہ خوروں کا انجام | عن ابی امامۃ الباہلیؓ
قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
يقول بينا انا نائم اتانى
رجلان فاخذا بضبعى فاتيا بى
جبلا وعرا فقالا اصعد فقلت
انى لا اطيقه فقالا انا سنسهله
لك فصعدت حتى اذا كنت
فى سواء الجبل اذا باصوات شديدة
قلت ما هذه الاصوات؟ قالوا
هذا عواء اهل النار ثم
انطلق بى فاذا انا بقوم معلقين
بعراقيبهم مشققة اشداقهم
قال قلت من هؤلاء؟ قال
الذين يفطرون قبل تحلة صومهم
(المنذری بحوالہ صحیح ابن خزیمہ وابن حبان)

حضرت ابوامامہ باہلیؓ کہتے ہیں، میں نے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ میں سو رہا
تھا کہ دو شخص میرے پاس آئے، وہ میرا شانہ پکڑ
کر ایک دشوار گذار پہاڑ کے پاس لے گئے اور اس
پر چڑھنے کو کہا۔ میں نے کہا اس پر چڑھنا میری سکت
سے باہر ہے، انہوں نے کہا چڑھو ہم سہارا دیتے
ہیں، چنانچہ میں چڑھ گیا، جب پہاڑ کے بیچ میں پہنچا
تو شدید قسم کی چیخیں تھیں، میں نے پوچھا، یہ کیا چیخیں
سنائی دے رہی ہیں؟ انہوں نے بتایا یہ جہنم
والوں کی چیخیں ہیں، پھر مجھے اور آگے لے جایا
گیا تو دیکھا کچھ لوگ الٹے ٹانگ دیئے گئے ہیں
ان کے جبڑے پھاڑ دیئے گئے ہیں اور ان سے خون
بہہ رہا ہے۔ میں نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ بتایا
گیا یہ وہ لوگ ہیں جو رمضان کے دنوں میں
کھاتے پیتے تھے، روزے نہیں رکھتے تھے۔

روزہ رمضان کی اہمیت | عن ابی ھریرۃؓ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال من افطر یومًا من رمضان من غیر رخصۃ ولا مرض، لم یقضہ صوم الدھر کلہ وان صامہ (ترمذی، ابوداؤد)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص رمضان کا ایک روزہ بھی بلا عذر شرعی (سفر اور مرض) چھوڑ دے۔ پھر زندگی بھر اس کی کمی پوری کرنے کے لیے روزے رکھے جب بھی اس ایک رمضانی روزے کی کمی پوری نہ ہوگی۔

گناہوں کا کفارہ نماز، روزہ اور صدقہ

قال حذیفۃ رض انا سمعتہ یقول فتنۃ الرجل فی اھلہ ومالہ وجارہ یکفرھا الصلوٰۃ والصیام والصدقۃ (بخاری کتاب الصوم)

حضرت حذیفہ رض کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا: آدمی جو کچھ کوتاہیاں اور غلطیاں اپنے گھر والوں کے سلسلے میں اور مال کی خرید و فروخت اور پڑوسیوں کے بارے میں کرجاتا ہے (دانستہ نہیں کرتا بلکہ ہو جاتی ہیں) تو نماز روزہ اور صدقہ ان کا کفارہ بن جائیں گے۔ (سفینۂ نجات)

بقیہ: الرشاد کی ڈاک

پھر سارے مضامین کا انداز بیان سلیس اور علم و تحقیق کو اتنے سہل انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ ملتا ہے کہ ان مضامین کو کم علم طبقہ بھی سہولت سے سمجھ سکتا ہے، مارچ کے پرچہ میں "فن قرأت کی علمی تاریخ" بڑا اچھا مضمون ہے، آپ کے مضامین "فتاوی عالمگیری" "شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی" "دعوت ولیمہ" کا تو کہنا کیا ——— حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ شدید ضعف و نقاہت میں ہیں، مگر کھڑے ہو کر پنجوقتہ نماز اور بعد مغرب نوافل میں سوا پارہ قرآن کریم کا معمول جاری ہے، اگر آنمحترم اپنی مسجد مدرسہ میں حضرت موصوف کیلئے اور احقر کیلئے دعا صحت کرادیں، تو بڑا احسان ہو ——— والسلام ——— سید محمد ازہر شاہ قیصر

ادارہ | اس سے پہلے بھی مولانا سید ازہر شاہ قیصر، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ کی شدید علالت کی اطلاع دے چکے تھے۔ اور ہم لوگ ان کی صحت کے لئے دعا گو تھے، کہ یہ دوسرا خط ملا جس سے مزید تشویش ہوئی، ہم تمام اہل مدرسہ انکی صحت و عافیت کیلئے صدق دل سے دعا کرتے ہیں ——— حضرت قاری صاحب یادگار سلف ہیں اور ذاتی دینی حیثیت کیساتھ بزرگوں کی نسبت کیوجہ سے انکی ذات کو ہم اپنے لئے سایۂ رحمت سمجھتے ہیں، انہوں نے اپنی طبعی نرم خوئی کیوجہ سے پوری زندگی میں شاید ہی کسی کے آبگینۂ دل کو ادنیٰ ٹھیس پہنچائی ہو، مگر اللہ ان لوگوں کو نیک راہ دکھائے جنہوں نے ان کے معصوم دماغ کو مجروح اور بے داغ شیشۂ دل کو چور چور کرڈالا، اور انکی نصف صدی کی شاندار دینی خدمات کو بے رحم سیاسی لوگوں کی طرح پامال کرڈالا۔

زکوٰۃ

جنوری، فروری ۸۳ء کے مشترکہ شمارہ میں زکوٰۃ کے بارے میں پوری تفصیل الرشاد میں آچکی ہے۔ رمضان مبارک کی مناسبت سے چند حدیثیں اور پیش کی جاتی ہیں:-

زکوٰۃ معاشی توازن کیلئے

عن ابن عباس رضی قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ قد فرض علیھم صدقۃ تؤخذ من اغنیاءھم وترد علی فقراءھم

ابن عباس رضی سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان معاشرہ پر زکوٰۃ فرض کی ہے، جو ان کے مالداروں سے وصول کی جائے گی اور ان کے ضرورتمندوں کو لوٹائی جائیگی۔ (بخاری، مسلم)

تشریح | صدقہ کا لفظ قانونی زکوٰۃ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور یہاں یہی مراد ہے۔ اور اس کا اطلاق اس مال پر بھی ہوتا ہے، جو آدمی بطور خود اپنی خوشی سے خدا کی راہ میں دیتا ہے۔
"لوٹائی جائے گی" کا لفظ صاف صاف بتاتا ہے کہ زکوٰۃ دراصل مسلم معاشرہ کے غریبوں کا "حق" ہے جو انہیں دلوایا جائے گا۔

زکوٰۃ ادا نہ کرنے کا انجام

عن ابی ھریرۃ رضی قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اتاہ اللہ مالاً فلم یؤد زکوٰتہ مثل لہ مالہ یوم القیٰمۃ شجاعا اقرع لہ زبیبتان طوقہ یوم القیامۃ ثم یأخذ بلھزمتیہ یعنی شدقیہ ثم یقول انامالک انا کنزک ثم تلا ولا یحسبن الذین یبخلون الآیہ

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کو اللہ نے (زائد از ضرورت) مال دیا اور اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی، تو اس کا مال قیامت کے دن نہایت زہریلے سانپ کی شکل اختیار کرے گا جس کے سر پر دو سیاہ نقطے ہوں گے (جو انتہائی زہریلا ہونے کی علامت ہے) اور وہ اس کے گلے کا طوق بن جائے گا۔ پھر اس کے دونوں جبڑوں کو پکڑے گا، اور کہے گا میں تیرا محبوب مال ہوں میں تیرا خزانہ ہوں (جسے تم نے جمع کر رکھا تھا اور زکوٰۃ نہیں نکالی تھی) پھر آپ نے یہ آیت پڑھی ولا یحسبن الذین الخ جسکا ترجمہ یہ ہے "وہ لوگ جو اپنا

مال خرچ کرنے میں بخل کرتے ہیں وہ ہرگز یہ سمجھیں
کہ ان کا یہ مال ان کے حق میں بہتر ثابت ہوگا، نہیں
بلکہ یہ ان کے گلے کا طوق بنے گا یعنی سخت تباہی
کا باعث ہوگا۔

زکوٰۃ نہ دینا مال کی تباہی کا موجب ہے

عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت سمعت رسول
اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول
ما خالطت الزکوٰۃ مالاً قط
الا اھلکتہ (مشکوٰۃ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں، میں نے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا جس مال کی زکوٰۃ
نہ نکالی جائے اور اسی میں ملی جلی رہے، تو وہ مال
کو تباہ کرکے چھوڑتی ہے۔

زکوٰۃ کی دین میں اہمیت

عن عبد اللّٰہ
بن مسعود رضی اللہ عنہ قال امرنا باقام
الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ ومن لم
یزک فلا صلوٰۃ لہ وفی روایۃ
فلیس بمسلم ینفعہ عملہ
(ترغیب بحوالہ طبرانی)

حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم کو
نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم دیا گیا ہے
اور جو شخص نماز پڑھے اور زکوٰۃ نہ دے تو اس کی نماز
اللہ کے یہاں مقبول نہ ہوگی۔ اور ایک دوسری
روایت میں یہ ہے، "ایسا شخص مسلم نہیں ہے جس کو
اسکا عمل قیامت میں نفع دے۔

زکوٰۃ خدا کا حق ہے

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ
ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال
اذا ادیت زکوٰۃ مالک فقد
قضیت ما علیک ومن جمع مالاً
حراماً ثم تصدق بہ لم یکن
لہ فیہ اجر وکان اصرہ علیہ (صحیح ابن خزیمہ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا: جب تم نے اپنے مال کی زکوٰۃ (مفروضہ)
دے دی تو تم اللہ کے حق سے سبکدوش ہوگئے،
اور جس نے حرام مال جمع کیا اور اسے اللہ کی راہ میں
دیا تو اس پر اسے کوئی اجر نہیں ملیگا،
بلکہ الٹا گناہ ہوگا

عید الفطر کی زکوٰۃ

فرض رسول
اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فطرہ
کی زکوٰۃ امت پر واجب کیا تاکہ لغو اور

زکوٰۃ الفطر طھرۃ للصیام من اللغو والرفث وطعمۃ للمساکین (ابوداؤد)

بے حیائی کی باتوں ایسے جو روزہ کی حالت میں روزہ دار سے سرزد ہو جاتی ہیں کفارہ بنے اور مسکینوں کی خوراک کا انتظام ہو جائے

تشریح | مطلب یہ کہ فطرہ نکالنے کی دو مصلحتیں ہیں۔ ایک یہ کہ روزہ کی حالت میں جو کوتاہیاں باوجود کوشش کے ہو جاتی ہیں۔ اس کی تلافی ہو جائے، اور دوسری مصلحت یہ کہ اس دن معاشرہ کے غریب لوگوں کے گھر فاقہ نہ ہو۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ گھر کے تمام افراد پر صدقہ فطر واجب کیا گیا اور نماز عید سے پہلے دینے کی تاکید کی گئی ہے

غلے کی زکوٰۃ | عن ابن عمرؓ قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیما سقت السماء والعیون او کان عثریا العشر وما سقی بالنضح نصف العشر (صحیح بخاری م)

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو زمینیں بارش کے پانی سے یا چشمے سے سیراب ہوتی ہوں۔ یا دریا سے قریب ہونے کی وجہ سے پانی دینے کی ضرورت نہ پڑتی ہو ان کی پیداوار کا دسواں حصہ بطور زکوٰۃ نکالا جائیگا اور جن زمینوں کو سینچنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان کی پیداوار کا بیسواں حصہ نکالا جائے گا۔ (سفینۂ نجات)

بقیہ: رشحات

تھے، نکاح کے بعد ان میں سے دسیوں غیر مسلم افسر راقم الحروف سے ملے اور کہا کہ کاش ہمارے سماج میں بھی آپ جیسے لوگ کچھ اس طرح کی باتیں کرتے تو بڑا اسدھار ہوتا، یہ کام قانون سے نہیں ہو سکتا۔

یہ دو واقعے نہیں ہیں بلکہ آپ میں سے نہ جانے کتنے لوگوں کو اس طرح کے واقعات سے سابقہ پڑتا ہوگا اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ تمام خرابیوں اور بگاڑ کے باوجود معاشرہ میں اب بھی اخلاقی سدھار کی حس موجود ہے۔ صرف ضرورت ہے اس سے فائدہ اٹھانے کی۔ مگر یہ کام بڑی پتہ ماری چاہتا ہے، اور وہی لوگ اسے کر سکتے ہیں جن میں اس اخلاقی بگاڑ کا پرشور احساس پیدا ہو جائے، اور وہ اپنی عزت و شہرت ہر چیز کو اس داؤ پر لگا سکیں۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔ ••

مصنّف عبدالرزاق

از مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ العالی

رسالہ "جامعۃ الرشاد" اعظم گڈھ (اپریل ۱۹۸۳ء) کے ذریعہ میرے قدیم کرمفرما ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے ایک جدید اکتشاف کا علم ہوا۔ اس اکتشاف میں مجھ پر انہوں نے عدم انتباہ کا الزام لگایا ہے، میں اس بارے میں ان کو معذور تصور کرتا ہوں، اور تحقیق و صداقت سے قطعاً عاری، اس الزام پر اُن کو کوئی ملامت نہیں کرتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کسی خام مسلم مستشرق کی باتوں میں آگئے ہیں، کوئی شخص جس کی نظر سے "الاوائل" للشیخ سعید سنبل، یا حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کی "بستان المحدثین" بھی گذری ہو، وہ مجھ کو عدم انتباہ کے باعث مطعون نہیں کرسکتا۔

اوائل شیخ محمد سعید سنبل مکی کی تالیف ہے، حضرت شاہ محمد اسحٰق مہاجر مکی نے اس کی روایت شیخ عبد الکریم مکی سے لی ہے، انہوں نے علامہ شیخ محمد طاہر سے، اور انہوں نے اپنے والد شیخ محمد سعید سنبل سے روایت کی ہے۔

اوائل سنبل میں حدیث کی چالیس کتابوں سے عموماً ہر ایک کتاب کی پہلی حدیث جمع کی گئی ہے مگر مصنف عبدالرزاق کی آخری حدیث نقل کی ہے، لکھتے ہیں:

"وبالسند المتقدم الی الامام الحجۃ عبدالرزاق الصنعانی: أخبرنا معمر عن ثابت عن انس رضی اللہ عنہ قال: کان شعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی انصاف اذنیہ ۔۔۔ وھو آخر مصنفہ (ص ۲۲)

اب آپ مصنف عبدالرزاق کی گیارہویں جلد ہاتھ میں لیجئے، جس سے مصنف عبدالرزاق کی کتاب الجامع ختم ہوتی ہے، اور دیکھئے کہ کتاب الجامع کس حدیث پر ختم ہوتی ہے، اگر وہ یہی حدیث ہے جسے شیخ محمد سعید سنبل نے مصنف عبدالرزاق کی آخری حدیث قرار دیا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاہ محمد اسحٰق کے شیخ الشیخ کے شیخ کو بھی انتباہ نہیں ہوا، وہ بھی اس راز سربستہ کو نہ پاسکے کہ یہ مصنف عبدالرزاق کی آخری حدیث نہیں ہے، بلکہ معمر کی آخری حدیث ہے۔

اسی طرح شیخ المشائخ الہند شاہ عبدالعزیز دہلوی بستان المحدثین میں رقمطراز ہیں:

"طرفہ این است کہ مصنف خود را ختم کردہ است بشمائل۔ وشمائل را ختم بذکر موئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام کردہ می گوید: حدثنا معمر عن ثابت عن انس رضی اللہ قال کان شعر النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی انصاف اذنیہ" (ص ۵ طبع مصطفائی کانپور)

لیجئے شیخ المشائخ کو بھی اشتباہ نہیں ہوا کہ اس حدیث پر مصنف عبدالرزاق نہیں ختم ہو رہی ہے بلکہ جامع معمر ختم ہو رہی ہے۔

مصنف عبدالرزاق کی آخری کتاب، کتاب الجامع کو، جامع معمر قرار دینے والوں نے اس کی اکثر حدیثوں کو بروایت معمر پاکر اپنے استشراق کے زور سے اس کو جامع معمر یقین کر لیا۔ وہ اور کچھ نہیں، پوری کتاب الجامع کو حرفاً حرفاً پڑھ لیتے تو یہ دعوی کرتے ہوئے ان کو خود شرم محسوس ہوتی۔

مجھے استیعاب کے ساتھ تو ذکر کرنے کی فرصت نہیں ہے، مثال کے طور پر چند حدیثوں کی نشاندہی کرتا ہوں کہ ان کا کوئی تعلق معمر سے نہیں ہے، بلکہ ان کو عبدالرزاق نے اپنے دوسرے شیوخ حدیث سے روایت کیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

حدیث نمبر ۱۹۴۴۰، وحدیث نمبر ۱۹۴۷۵، وحدیث نمبر ۱۹۴۸۲، وحدیث نمبر ۱۹۶۴۳، وحدیث ۱۹۶۷۱، وحدیث نمبر ۱۹۷۰۹، وحدیث نمبر ۱۹۷۲۰ (مصنف عبدالرزاق جلد نمبر ۱۱)

اسی طرح جلد نمبر ۱۱ کی حدیث نمبر ۱۹۷۶۲، وحدیث نمبر ۱۹۷۶۶، وحدیث نمبر ۱۹۷۷۱، وحدیث نمبر ۱۹۷۷۳، وحدیث نمبر ۱۹۷۸۱، وحدیث نمبر ۱۹۷۹۰، وحدیث نمبر ۱۹۷۹۴، وحدیث نمبر ۱۹۷۹۵، وحدیث نمبر ۱۹۷۹۸، وحدیث نمبر ۱۹۸۰۱، وحدیث نمبر ۱۹۸۰۷، وحدیث نمبر ۱۹۸۴۴، وحدیث نمبر ۱۹۸۴۱، وحدیث نمبر ۱۹۸۵۸، وحدیث ۱۹۸۷۷، وحدیث نمبر ۱۹۸۹۲، وحدیث نمبر ۱۹۹۶۳، وحدیث نمبر ۲۰۰۰۰، وحدیث نمبر ۲۰۰۹۲، وحدیث نمبر ۲۰۴۳، وحدیث نمبر ۲۰۰۹۴، وحدیث نمبر ۲۰۰۹۵، وحدیث نمبر ۲۰۱۱۷، وحدیث نمبر ۲۰۱۳۶، وحدیث نمبر ۲۰۱۳۳، وحدیث نمبر ۲۰۲۴۸، وحدیث نمبر ۲۰۲۹۲، وحدیث نمبر ۲۰۹۵۱۔

صاحب کشف الظنون نے امام عبدالرزاق کی کتاب الجامع کا ذکر کیا ہے۔ اور فؤاد سید نیز شیخ ناصر الدین البانی نے لکھا ہے، کہ الجامع لعبد الرزاق کا ایک ایک نسخہ مکتبہ ظاہریہ دمشق میں محفوظ ہے۔ فؤاد سید نے یہ بھی لکھا ہے، کہ اس نسخہ پر ۵۵۸ھ کا ایک سماع درج ہے، نیز دوسرے

سماعات بھی ہیں ــــــــ تو کیا یہ سب محدثین غلط فہمی سے جامع معمر کو جامع عبدالرزاق سمجھ کر جامع عبدالرزاق کے سماع کا ثبت تحریر فرما رہے ہیں ؟ ۔۔

ادارہ | محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب علمی حیثیت سے ایک بلند مرتبہ، وسیع النظر اور بین الاقوامی شخصیت کے مالک ہیں، اور ساتھ ہی ان میں علمی تواضع بھی ہے، انہوں نے مصنف عبدالرزاق کی آخری جلدوں کے بارے میں ایک علمی و تحقیقی بحث اٹھائی ہے، کہ اس کی آخری دو جلدیں شیخ عبدالرزاق کی نہیں، بلکہ ان کے استاذ معمر بن راشد کی کتاب الجامع ہے۔ مصنف عبدالرزاق محترم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کی نگرانی میں کئی برس پہلے شائع ہوئی تھی، اس لئے انہوں نے یہ لکھا کہ ان کو اس پر اشتباہ نہ ہوا، اور پوری کتاب کو مصنف میں شامل کر لیا گیا، ڈاکٹر صاحب کی اس تحقیق سے مولانا اعظمی کو اختلاف ہے، اور انہوں نے اس سلسلہ میں یہ مختصر تحریر روانہ فرمائی ہے جو شائع کی جا رہی ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں راقم الحروف معذرت کرتے ہوئے عرض کرے گا، کہ مولانا نے جواب میں جو تحریر روانہ فرمائی ہے، اس میں غصہ کا انداز بیان ان کے شایان شان نہیں ہے، یہ علمی بحث ہے، اس میں علمی ہی انداز مناسب ہے، راقم الحروف کے پاس مصنف کے نسخے نہیں ہیں، اس لئے اس سلسلہ میں کوئی رائے دینا مناسب نہیں سمجھتا اگر اللہ تعالےٰ نے توفیق دی تو امام زہری کی کتاب المغازی اور معمر بن راشد کی کتاب الجامع دونوں کے سلسلہ میں آئندہ کسی شمارہ میں کچھ عرض کرے گا، جیسا کہ اس سے پہلے ڈاکٹر صاحب کے غزوہ بنی نضیر کے ایک مضمون کے بارے میں عرض کر چکا ہے۔ مولانا نے اس کی آخری حدیث کے سلسلہ میں شیخ محمد سعید سنبل کی اور شاہ عبدالعزیز صاحب کی بستان المحدثین کے حوالہ سے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ ان کے استدلال کے لئے کافی نہیں ہے، ان دونوں میں معمر عن ثابت عن انس ہی کا سلسلۂ سند ہے۔ البتہ جن دوسرے شیوخ کی حدیثوں کی نمبر وار انہوں نے نشاندہی کی ہے وہ البتہ ان کے استدلال کو وزنی بناتی ہیں۔ متاخرین نے متقدمین کی بہت سی کتابوں اور تحریروں پر استدراکات لکھے ہیں، راجح اور مرجوح قرار دیا ہے، اس میں تقدم و تاخر کو کسی استدلال کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ ۔۔

معذرت — مرتب کی شدید علالت کی وجہ سے جون ۸۳ء کے "الرشاد" میں ممکن ہے کہ تاخیر ہو جس کے لئے ناظرین سے ہم معذرت خواہ ہیں، اور ان سے دعا کی درخواست کرتے ہیں۔

محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب

دارالمصنفین اعظم گڈھ میں

(از مولانا ابو علی عبد الباری صاحب)

"مولانا عبد الباری صاحب تقریباً ساٹھ باسٹھ برس سے دار المصنفین سے وابستہ ہیں، گو ان کا تعلق شعبۂ تصحیح سے ہے، مگر وہ صرف کاپی و پروف کی تصحیح نہیں کرتے، بلکہ مضامین کی بھی تصحیح کر دیا کرتے ہیں. وہ خود صاحب ذوق ہیں اور شبلی کے طرز تحریر کے ادا شناس ہیں، اس لئے دوسروں کے مضامین پر ناقدانہ اصلاح کرتے ہیں. حتیٰ کہ وہ سید صاحب کی تحریروں پر بھی اصلاح سے نہیں چوکتے تھے، اور سید صاحب برا نہیں مانتے تھے، راقم الحروف کی بہت سی تحریریں ان کی اصلاح کی رہین منت ہیں. انہوں نے "الرشاد" کے لئے کئی مضامین لکھ کر دیئے. مگر ہر مضمون میں کسی نہ کسی نوعیت سے راقم الحروف کا ذکر ہوتا تھا، اس لئے مجھے اس کے شائع کرنے میں تأمل ہوتا تھا. اس مضمون کے شائع کرنے میں بھی کئی دن تأمل رہا، اس لئے کہ اس میں ایک ایسے علمی کام کے سلسلہ میں انہوں نے راقم الحروف کا ذکر کیا ہے جو میرے لئے مزید کسی آزمائش کا سبب بن سکتا ہے، مگر ان کا حکم اور اصرار ہے کہ اسے من وعن شائع کر دیا جائے. پھر ان کے تأثرات و مشاہدات، محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سے متعلق ہیں اور کچھ نئی معلومات بھی ہیں اس لئے ادباً شائع کئے جا رہے ہیں" (مرتب)

مولانا شبلی نے اپنے سلسلۂ سیرۃ النبی کی ایک جلد یوریین مصنفین کی سیرت کی غلط بیانیوں کی اصلاح کے لئے مخصوص کر دی تھی، دفتر سیرت میں اس کا ایک خاص شعبہ بھی قائم کیا تھا، اور اس کے لئے انگریزی داں اسسٹنٹ بھی رکھے تھے، جن کا کام انہی مستشرقوں کی کتابوں سے وہ تمام مواد اکٹھا کرنا تھا، جن میں انہوں نے غلط بیانیوں سے کام لیا تھا، اور اپنے زور قلم سے حقیقت پر پردہ ڈال دیا تھا، اس شعبہ میں ایک زمانہ میں اپنے عہد کے نامور ادیب اور صاحب طرز انشاء پرداز اور قرآن کے اردو و انگریزی مترجم وغیرہ مولانا عبد الماجد دریابادی بھی تھے، جنہوں نے بعد میں اپنے گوناگوں علمی و ادبی و ملی کارناموں کے ذریعہ غیر معمولی شہرت حاصل کی، اور خود بھی قرآن کی روشنی میں سیرت پر ایک کتاب لکھی، جس کا سب سے پہلے خیال مولانا

ابوالکلام آزاد کو الہلال کی مشغولیت سے پہلے ہوا تھا، اور اس کا ذکر مولانا شبلی سے بھی کیا تھا، اور عرض کیا تھا، کہ آپ اپنی سیرت نبویؐ میں ایک باب " قرآن اور سیرت محمدیہ " قرار دیجئے، اور اس میں صرف آیات قرآنیہ کو بہ ربط و ترتیب جمع کر کے دکھلائیے، کہ خود قرآن سے کہاں تک آپ کی شخصیت اور آپ کے وقائع و ایام معلوم ہو سکتے ہیں ؟ مولانا سے یہ مایوس کن جواب سن کر انہوں نے خود اس میں کچھ وقت صرف کیا، اور ایک مستقل سیرت نبویہ مجرد قرآن حکیم سے ماخوذ و مستنبط شروع کر دی۔ اور اس کو انہوں نے مرتب بھی کر دیا، لیکن اس کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی، پھر مولانا اپنی گوناگوں سیاسی و قومی ملی سرگرمیوں اور مشغولیتوں کی وجہ سے جن کا سلسلہ ان کے نفس واپسیں تک قائم رہا، اپنے اس کارنامے سے غافل بھی ہو گئے، لیکن مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی تفسیر قرآنی کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا، جو ان کے مفاخر میں شامل ہے، مولانا شبلی کے زمانہ تک اس شعبہ میں جتنا کام ہوا تھا، وہ مبیضہ کی شکل میں بہت دنوں تک موجود تھا، چونکہ ترتیب کے لحاظ سے اس کی اشاعت سب سے آخر میں رکھی گئی تھی، اس لئے اس کے طبع و اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ مولانا شبلی نے ابھی سیرت کی دو ہی جلدیں لکھی تھیں، کہ ان کا پیمانہ عمر لبریز ہو گیا، اور اس کی تکمیل کی حسرت وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق ان کے لائق شاگرد اور جانشین مولانا سید سلیمان ندوی نے اس سلسلہ کی تکمیل کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اور اس کی چار جلدیں اپنے قلم سے لکھیں، معاملات سے متعلق ساتویں جلد زیر تالیف تھی کہ ان کا بھی وقت موعود آ پہنچا، اور انتقال فرما گئے۔ اور استاد کی طرح وہ بھی اس کی ناتمامی کا داغ اپنے ساتھ لے گئے۔ ساتویں جلد کے سلسلہ میں انہوں نے جو چند متفرق مباحث اور مضامین لکھے تھے، بطور تبرک اور ان کی ایک اچھی علمی یادگار کے ان کا مجموعہ سیرت جلد ہفتم کے نام سے شائع کر دیا گیا ہے، یہ بھی سیرت کی اور جلدوں کی طرح جو علی الترتیب معجزات، منصب نبوت، تعلیمات نبوی اور اخلاق پر ہیں، لائق مطالعہ اور ایمان افروز ہے، اس میں بھی سیرت کی پہلی جلدوں ہی کی طرح حلاوت، شیرینی اور عذوبت ہے، کاش کہ سید صاحب کی عمر مستعار کچھ اور زیادہ ممتد ہوتی، تو یہ بھی اپنے موضوع پر مکمل اور حرف آخر ہوتی، سچ ہے،

کار دنیا کسے تمام نہ کرد ،

اب اس کی تکمیل کسی اور سیرت نگار رسول کے لئے مقدر ہے، جس کو قرآن و حدیث اور ائمہ اربعہ کی فقہ اور اس کی تمام جزئیات پر غائرانہ نظر ہو، اور اس جلد کا پورا حق ادا کر سکے، اس کے لئے سید صاحب کے

ص مولانا نے فرمایا کہ اچھا ہو اگر صرف قرآن مجید ہی کی بنا پر مکمل سلسلہ سے کہ سیرت کا ایک باب شامل کیا جائے ،

بعد ان سے میری نظر انتخاب مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی پر پڑی ہے ۔ اللہ تعالے نے انہیں تفقہ کا بہت اچھا ذوق بخشا ہے ۔ دار المصنفین سے جب تک ان کا تعلق قائم رہا، معارف میں زیادہ تر فقہی مضامین لکھتے رہے ، اور اب بھی اس موضوع پر ان کے افادات قلم کا سلسلہ جاری ہے ، انہوں نے اسلامی فقہ کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا ہے، جس کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں، اور وہ بعض مدارس میں فقہ کے نصاب میں شامل ہیں ان کے بعض فقہی مضامین کا مدراس کی ملیالم زبان میں بھی ترجمہ ہوا ہے ۔ اسلامی فقہ میں معاملات پر جو سیرت کی ساتویں جلد کا موضوع ہے، جتنی تفصیل سے لکھا ہے، اتنی تفصیل کسی دوسری اردو کی کتاب میں نہیں ہے ۔

آخری جلد جو یورپ کے مستشرقین کی غلط بیانیوں کی اصلاح کے لئے مخصوص تھی، اس کے لئے ہماری نظر انتخاب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب پیرس پر پڑی تھی ۔ وہ یورپ کی قریب قریب تمام زبانوں کے عالم ہیں، اور ان میں وہ برابر لکھتے پڑھتے رہتے ہیں ۔ وہ ہندوستان کی بھی اکثر زبانوں سے واقف ہیں، اور ان زبانوں کو بھی اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بناتے ہیں ۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے ۔ سیرت، حدیث اور قبل از اسلام کی تاریخ ان کا خاص موضوع ہے، اس پر ان کی کئی کتابیں شائع بھی ہو گئی ہیں، انہوں نے فرنچ زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ بھی کیا ہے ۔ اور سیرۃ پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی ہے ۔ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ کا ان کو پورا اعتماد حاصل تھا، سید صاحب ان کے فضل و کمال کے بڑے قائل تھے، اور ان کے مضامین بغیر کسی ترمیم و اصلاح و نظر ثانی کے بڑے فخر و انبساط کے ساتھ معارف میں شائع کرتے تھے ، یہ خصوصیت مولانا مسعود عالم ندوی کے بعد جنہوں نے سید صاحب کی فرمائش پر ان کی لغات جدیدہ کے دوسرے ایڈیشن پر جو انہی کے اہتمام میں معارف پریس میں چھپا تھا، بڑا عالمانہ ، فاضلانہ و محققانہ مقدمہ لکھا تھا ، انہی کو حاصل تھی ان کا جب کوئی مضمون معارف میں چھپنے کے لئے آتا تھا، تو باغ باغ ہو جاتے تھے، اور فوراً کتابت کے لئے کاتب کے حوالہ کر دیتے تھے، ذرا بھی تاخیر کو راہ نہ دیتے تھے ۔

ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب سید صاحب سے ملنے کے لئے دار المصنفین بھی آئے تھے، اصل میں وہ حیدرآباد سے پٹنہ دہالہ کے کسی رئیس کا پرائیویٹ کتب خانہ دیکھنے کے لئے آئے تھے، جو پچاسوں برس کے بعد خاص ان کے لئے کھولا گیا تھا، فرما رہے تھے، کہ کتابوں کے اوراق امتداد زمانہ سے اس طرح پیوستہ ہو گئے تھے کہ وہ کتابیں نہیں نری اینٹ معلوم ہوتی تھیں ۔ بہت ساری کتابیں تو رئیس کتب خانہ کی غفلت سے

ناقابل مطالعہ ہوگئی تھیں، وہاں سے واپسی میں شاہ گنج سے گذر رہے تھے، کہ یکایک ان کو دار المصنفین دیکھنے کا خیال آگیا، کہ اتنے قریب آکر اگر دار المصنفین نہ دیکھا تو بڑی بدقسمتی کی بات ہوگی، انہوں نے وہیں سے سفر کا رخ اعظم گڈھ کیطرف کردیا، اعظم گڈھ اسٹیشن پر آئے تو پہلے اپنا سامان اسٹیشن ماسٹر کی نگرانی میں دے دیا، اسٹیشن سے باہر آئے تو یکہ والوں اور رکشہ والوں سے پوچھتے ہیں کہ مجھے دار المصنفین جانا ہے، پہنچادوگے، اسوقت وہ شبلی منزل سے واقف نہیں تھے، سب نے لاعلمی کا اظہار کیا، تو ان کو بڑا تعجب ہوا، کہ اتنا بڑا عالمی تصنیفی ادارہ جس سے اب تک مختلف موضوعات پر سو، سوا سو کتابیں شائع ہوچکی ہیں، اور اس کی طرف سے معارف کے نام سے ایک گرانقدر علمی و دینی ماہنامہ بھی نکلتا ہے، جو نہ صرف ہندستان کے ایک ایک گوشے میں، بلکہ اس سے باہر یورپ اور ایشیاء کے مختلف ملکوں میں بھی جاتا ہے، حیرت ہے، کہ اس ادارہ کو یہاں کوئی نہیں جانتا، وہ بے چارے اپنے انہی خیالات میں محو، اور دار المصنفین تک پہنچنے کی سبیل کے لئے فکرمند تھے، کہ انہی یکہ والوں میں سے ایک نے ان کو آواز دی، اور کہا کہ میں سمجھ گیا، کہ آپ کو کہاں جانا ہے، آپ میرے یکہ پر سوار ہوئیے، میں آپ کو آپ کی منزل مقصود پر پہنچادوں گا، اس نے ان کو شبلی منزل پہنچا دیا، وہ پھاٹک سے باہر ہی یکہ سے اتر گئے، اور پیدل دار المصنفین کے احاطہ میں داخل ہوئے، کتب خانہ پہنچ کر راقم الحروف کے کمرے کے سامنے آکر کھڑے ہوئے، اور دریافت فرمایا کہ مولانا سید سلیمان ندوی ہیں، میں نے نفی میں جواب دیا، تو فرمایا: مولانا سید ریاست علی ندوی ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ کیا آپ ان سے واقف ہیں، فرمایا کہ ان سے میری ایک مرتبہ کی ملاقات ہے، میں نے کہا، وہ تو موجود ہیں، میں نے ان کی ظاہری وضع وہیئت دیکھ کر ان کو چشمہ فروش سمجھا، اس سے بہت پہلے جگر مرادآبادی، جناب اصغر گونڈوی، حضرت بہزاد لکھنوی اسی حیثیت سے دار المصنفین آئے تھے، اسی پر میں نے ان کو بھی قیاس کیا، سر پر غالباً سیاہ کلیاخ ٹوپی، گلے میں سفید کھدر کی شروانی جس میں بجائے بیدر کے اعلیٰ درجہ کے تکمے کے بہت معمولی سیپ کے بٹن لگے تھے، ٹانگوں میں سفید زین کا پرانا پتلون جس میں کہنگی کی وجہ سے جابجا سوراخ ہوگئے تھے، اور وہ نظر آرہے تھے، پیروں میں معمولی بوٹ جوتہ، میں ان کو ریاست علی صاحب کے کمرہ میں لیوا گیا، انہوں نے دیکھتے ہی ان کو پہچان لیا، اور کتب خانہ کے دوسرے ہال میں ان کو لے کر آئے، انہوں نے سیرت و متعلقات سیرت کی عربی کتابوں کی فہرست طلب کی، اور وہ اس کا جائزہ لینے لگے، میں دوڑا ہوا مولانا شاہ معین الدین صاحب کے پاس گیا اور کہا کہ

ایک صاحب اس وضع و ہیئت کے آئے ہیں، اور سیرت کی عربی کتابوں کی فہرست کا مطالعہ کر رہے ہیں، میرا خیال ہے کہ وہ حیدر آباد کے ڈاکٹر حمید اللہ ہیں، انہوں نے کہا کہ کیا بک رہے ہو، اتنا بڑا آدمی بغیر اطلاع کے دارالمصنفین نہیں آسکتا ہے، تم کو مغالطہ ہو رہا ہے، وہ کوئی اور ہوں گے، شاہ صاحب اٹھ کر دروازہ کے اوٹ سے ان کو دیکھنے لگے، لیکن ان کو کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ یہ ڈاکٹر حمید اللہ ہیں، میں نے کہا کہ وہ جس فن کی کتابوں کا جائزہ لے رہے ہیں، اس سے تو میں یہی سمجھتا ہوں کہ سوائے ڈاکٹر حمید اللہ کے کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا، وہ ان سے ملنے کے لئے اسی حال میں آگئے، مولانا ریاست علی صاحب نے ان سے ان کا تعارف کرایا، تو انہوں نے ان سے عرض کیا کہ اگر آپ شاہ گنج سے تار کے ذریعہ اپنی تشریف آوری کی اطلاع دیدیتے، تو ہم آپ کو لینے کے لئے اسٹیشن آتے، فرمایا، استغفر اللہ، استغفر اللہ، استغفر اللہ: میں کوئی بڑا آدمی تھا، کہ آپ حضرات کو اسٹیشن تک آنے اور اپنا خیر مقدم کرنے کے لئے زحمت دیتا، میں تو ایک بہت ہی معمولی طالب علم ہوں، ان کے احترام و اجلال میں جب بھی کوئی بات کی جاتی تو وہ تین مرتبہ استغفر اللہ ضرور کہتے، پھر انہوں نے سفر کی بہت ہی مفصل روداد سنائی، وہ شافعی المذہب تھے، لیکن دائرۃ المعارف النعمانیہ حیدر آباد نے فقہ حنفی کی جو اہات کتب شائع کی ہیں، اس کے وہ بہت زیادہ معترف تھے اور اس کی خدمات کا خاص طور سے ذکر کیا، پھر سیرت کے موضوع سے اپنی دلچسپی اور شغف کی داستان بیان کی، فرمایا کہ میں جب چھوٹا تھا، اور صاحب شعور نہیں ہوا تھا، تو میری والدہ جو بڑی پرہیزگار، متقی، صالحہ اور عابدہ تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے قصے اور کہانیاں سنایا کرتی تھیں، جو غیر شعوری طور پر دلنشیں ہوتی گئیں، اسی وقت میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں جب پڑھ لکھ کر فارغ ہونگا، اور اللہ تعالے نے صاحب قلم بنایا، تو اسی کو اپنا موضوع بناؤں گا، اس موضوع سے میری والہانہ دلچسپی تمامتر ماں کی تربیت کا فیض ہے، انہوں نے ظہر اور عصر کی دو نمازیں جماعت کے ساتھ پڑھیں، جس میں انہوں نے باقاعدہ رفع یدین بھی کیا تھا، مسجد میں جب تک رہے، بیٹھے بیٹھے ایک ایک گوشہ کو دیکھتے رہے، غالباً اس کے دونوں مینارے ان کو بہت زیادہ پسند آئے۔

ظہر کی نماز کے بعد پھر ان حضرات سے گفتگو میں مشغول ہوگئے، باتیں کیا کر رہے تھے، اللہ کے منہ سے پھول جھڑ رہے تھے، اور یہ حضرات نہایت حیرت و استعجاب کے ساتھ سن رہے تھے، ان کی غیر معمولی طاقت لسانی کے سامنے کسی کو بھی بولنے کی جرأت نہیں ہوئی، جب تک وہ شبلی منزل میں رہے پوری فضا

پر چھائے رہے. اس وقت یہ یاد نہیں کہ سیرت کی کتنی جلدیں شائع ہو چکی تھیں. ان حضرات سے فرمایا، کہ آپ سب لوگ مل کر اس کو پورا کیجئے. سید صاحب تنہا کب تک یہ کام کریں گے. اب ان کو آرام کرنے کا موقع دیجئے، عصر کی نماز کے بعد چائے پی کر روانہ ہو گئے. اسٹیشن تک مشایعت کے لئے یہ دونوں حضرات بھی گئے، جب تک وہ دار المصنفین میں رہے، میں برابر ان کے ساتھ رہا. اور ان کی عالمانہ، فاضلانہ باتیں ان کی زبان شیریں بیان سے سنتا اور ان سے لطف اٹھاتا رہا. یہی حال تمام سامعین کا بھی تھا.

وہ کتب خانہ میں جس کتاب کے دیکھنے کی بھی ان حضرات سے فرمائش کرتے. تو وہ الماری سے نکالنے کے لئے مجھ سے کہتے. اور میں نکال کر ان کی خدمت میں پیش کرتا. ان سے یہ دیکھا نہیں گیا. تو فرمایا، کہ اگر میں ان کو یہاں سے اٹھا کے اپنے ساتھ لے جاؤں، تو پھر کیا ہوگا، جس کا مقصد غالباً یہ تھا، کہ آپ تمام حضرات خود بھی اس کا خیال رکھیں، کہ فلاں کتاب کہاں ہے. اور کس الماری میں ہے. تاکہ حسب ضرورت خود اپنے ہاتھ سے الماری سے نکال لیں، اور کام میں لائیں، اس میں کوئی کسر شان نہیں ہے.

ان کی جب بھی کوئی کتاب آتی ہے، یا کسی رسالہ میں کوئی مضمون نظر سے گذرتا ہے، یا خود معارف میں شائع ہوتا ہے، تو فاضل وقت ہوتے ہوئے دار المصنفین میں طالب علمانہ حیثیت سے ان کے لئے بے سان و گمان آنے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے.

پہلے معارف میں ان کے مضامین برابر چھپتے تھے، لیکن ادھر بہت عرصہ سے ان کا کوئی مضمون نہیں چھپا ہے، لیکن معارف کے بہت بڑے قدرداں ہیں، اور اس کا ایک ایک حرف بہت غور سے پڑھتے ہیں، اس میں کوئی علمی یا مطبعی غلطی نظر آتی ہے، تو اس کی اصلاح کی طرف خط لکھ کر توجہ دلاتے ہیں. ادھر ان کے چھوٹے موٹے کئی مضمون اور استدراکات ماہنامہ الرشاد میں بھی شائع ہوئے ہیں، جو ضلع کے معروف مدرسہ جامعۃ الرشاد کا آرگن ہے..

بقیہ: نئی کتابیں

بھی متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں، لیکن سوویت روس کے ماتحت ریاست تاجکستان میں اقبال پر شاید یہ پہلا کام ہے، جو اردو داں طبقہ کے سامنے آیا ہے. ترجمہ اتنا رواں ہے کہ پڑھنے والے کو ترجمہ کا احساس نہیں ہوتا ـــــ کتاب ہر لحاظ سے قابل قدر اور قابل مطالعہ اور لائبریری میں رکھنے کے قابل ہے..

دہلی کے شائستہ سیاسی مہمان

انگریزی سے ترجمہ

(ماسٹر عتیق الزماں صاحب ایم۔ اے استاد شعبہ انگریزی جامعۃ الرشاد)

دہلی میں ساتویں چوٹی کانفرنس ہوئی، ناوابستگی کے مدعیان ایک سو ایک ریاستوں کے سربراہان مملکت کی اور وہ لوگ نشستند و گفتند و برخاستند کے بعد اپنے اپنے ملکوں کو واپس چلے گئے، ہم نے کریسنٹ انٹرنیشنل میں بارہا اس ناوابستگی کی حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے (مثلاً کریسنٹ انٹرنیشنل ۱-۱۵ مارچ ۱۹۸۱ء اور ۱-۱۵ مارچ ۱۹۸۳ء) لیکن ہمارے کچھ بہترین ساتھی اور دوست خصوصاً ایران میں اب بھی یہ یقین رکھتے ہیں کہ ناوابستگی کوئی اخلاقی بنیاد رکھتی ہے، اس وقت ہم اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتے، اس وقت ہم جس بات کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ نوع انسانیت کے یہ لیڈر جس وقت نئی دہلی میں موجود تھے، مشرق میں چند ہی سو میل کے فاصلہ پر ہندوستان کے لوگ جدید تاریخ کے ایک انتہائی گھناؤنے اور دہشت ناک جرم کے ارتکاب میں مصروف تھے۔ صرف اسرائیلیوں، نازیوں اور ویت نام میں امریکیوں کی خون آشامیوں کے بعد اس صدی کی بدترین خون کی ہولی ریاست آسام میں کھیلی جارہی ہے، جس میں کم از کم دس ہزار مسلمانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا گیا، اور کروڑوں کی جائداد برباد کردی گئی، پھر بھی ان مسلم سربراہوں میں سے کسی ایک میں بھی یہ اخلاقی جرأت نہ تھی کہ ان میزبان عورت صاحبہ جنہیں اندرا گاندھی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، ان کی توجہ اس قتل عام کیطرف مبذول کراتا، شاید ایسا کرنا سفارتی آداب اور نزاکتوں کے خلاف ہوتا۔ اس لئے زبان نہیں کھلی، معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفارتی نفاستیں اور نزاکتیں معصوم مسلمان عورتوں اور بچوں کے خون سے زیادہ اخلاقی قدر و قیمت کی حامل ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی مظلومیت اور بدحالی کے واقعات کا یہ صرف ایک جزو ہے کہ مظلوم کی دہلی میں کوئی شنوائی نہیں ہوئی اور نہ ان کی دادرسی کی کوئی صورت وہاں پیدا ہوئی، غریبوں کے ان نام نہاد لیڈروں کا ہدف سامراجی نظام رہا ہے۔ یہ ایک ایسا جانور ہے جس کی تعریف بمشکل ہی کی جاتی ہے، شہنشاہیت بذات خود کوئی بری چیز نہیں ہے، مگر یہ لیڈر اس کے خلاف اس لئے ہیں کہ ان کے عوام کو وہ اتنا متاثر نہیں کرتی، اور سیاسی لیڈروں کو اتنے مواقع نہیں ملتے جتنا کہ سیکولر طرز حکومت میں ان کو ملتے ہیں، آج وہ بذات خود دنیا کے کچھ انتہائی

ظالم حکمرانوں میں سے ہیں، ان کے مظالم مختلف نوعیت کے ہیں۔ کچھ نظریۂ سوشلزم اور جمہوریت کے نام سے عوام کو متاثر کرتے ہیں۔ حالانکہ آج دنیا کے موجودہ ڈکٹیٹر اسی نظریے کے سہارے اپنی ڈکٹیٹرشپ کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔

مسز گاندھی کا ہندوستان مبینہ طور پر ایک جمہوری ملک ہے، ان کے معاونین جمہوریت کے اس لیبل کا پروپیگنڈا کرکے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ حقیقتاً ہندوستان کا سیاسی اصول وہاں کے عوام کی اکثریت کے ذہن سے محو ہو چکا ہے۔ اسّی فی صدی ہندوستانی بھوک اور بیماری سے مر سکتے ہیں، لیکن اس جمہوریت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ شہری آبادی کے متوسط درجے کی سطح پر یہاں کی جمہوریت لاگو ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ایک انتہائی دولت مند حکمراں طبقہ ہے جس کی معاش کا مدار اونچے اونچے ٹکنالوجی سیکٹر اور بھاری صنعتیں ہیں جن کی بقا کی ضمانت عموماً ریاست کے متشدد افراد ہیں۔ ہندوستان کا حکمراں طبقہ ایسے اطاعت گذار عوام کی دعائیں حاصل کر چکا ہے جو انقلاب کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا، ہندوستان کے وہ باشندے جنہیں وقتاً فوقتاً خون لینے کا چسکا پڑ گیا ہے، وہ اپنی پیاس مسلمانوں کے خون سے بجھاتے رہتے ہیں۔

ہندوستان کو نہ صرف ضروری طول و عرض، انسانی قوت، قدرتی ذرائع اور دنیا کی سب سے بڑی حکومتوں کی پشت پناہی ہی حاصل کر چکا ہے، بلکہ سیاسی فریب، تجربہ اور سفارتی مہارت بھی اسے حاصل ہے۔ اسلام سے اس کی دشمنی اتنی تہہ در تہہ ہے کہ ایران کی حکومت جو اپنے کو اسلامی حکومت کہتی ہے، ایک ایسے خوبصورت فارسی بولنے والے "مسلمان" سفیر سے تہران میں دھوکہ کھا گئی۔ جس نے نہ صرف ہندوستان کی سرگرم دوستی کو قائم رکھا، بلکہ یہاں پر ہونے والے مسلمانوں کے قتل عام کے خلاف احتجاج کرنے میں بھی ناکام بنا دیا، کوئی اسلامی حکومت مظلوم مسلمانوں کا دل اس وقت تک کہیں نہیں جیت سکتی جب تک وہ انکے مقاصد کو اپنا مقصد نہ سمجھے۔

یہ تو مسلمان حکمرانوں کا حال تھا۔ دہلی میں جو غیر مسلم حکمراں آئے تھے، انہوں نے ایک دوسرے جمہوری قدر کو پامال کرنے میں حصہ لیا، وہ جدید بین الاقوامی دستور اور موجودہ عالمی نظام کی پامالی کے مرتکب ہوئے جس کے وہ خود ایک جزو کی حیثیت رکھتے ہیں، حقیقتاً ناوابستگی بہرحال گہری قدامت پسندی ہے، سطحی تبدیلی کے ماسوا زاویہ کوئی حقیقت رکھتی ہے، اور نہ تو منطقی طور سے اس کی کوئی حیثیت ہے۔

آخر میں ہم یہ کہیں گے کہ وہ لوگ جو دنیا میں انقلاب لانا چاہتے ہیں، انہیں اپنی انقلابی ذمہ داریوں کا پابند رہنا چاہئے...

(کریسنٹ، کناڈا) (Crescent، Canada)

الرشاد کی ڈاک

اقبال انسٹی ٹیوٹ
کشمیر یونیورسٹی سرینگر

۱۴ ؍ اپریل ۱۹۸۳ء

گرامی منزلت سلام مسنون

مارچ ۱۹۸۳ء کا الرشاد کل کی ڈاک سے موصول ہوا۔ فتاویٰ عالمگیری پر مقالہ پڑھکر دار المصنفین والے مولانا مجیب اللہ کی یاد تازہ ہوگئی۔ خدا کرے یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے، اور میری دیرینہ خواہش پوری ہو۔

ایک طالب علمانہ مشورہ یہ ہے کہ الرشاد میں جو مقالے شائع ہوں، ان کو آپ دیکھ لیا کریں۔ اسی شمارہ میں تدوین حدیث پر جو مقالہ ہے، اس کی زبان اتنی معرب ہے کہ خدا کی پناہ، خاص طور سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں طعام و شراب کا لفظ دیکھکر بڑی وحشت ہوئی۔ آپ کا رسالہ صرف علماء ہی نہیں پڑھتے، بلکہ ایسے لوگ بھی پڑھتے ہیں جو شراب کے صرف اردو معنی ہی سے واقف ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مقالہ خیر بننے کی جگہ شر بن جائے۔ اگر آپ اس مقالے کو پڑھ لیتے تو اس کی زبان آسان ہو جاتی۔ اسی طرح نوم و بیداری کا لفظ ہے، ان کو سوتے، جاگتے، سونے، جاگنے وغیرہ کے لفظ سے ظاہر کیا جاسکتا تھا۔ امید ہے کہ آپ اس امر کی طرف توجہ فرمائیں گے۔ —— خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہو —— والسلام

کبیر احمد جائسی

علیگڑھ
۱۲ ؍ مارچ ۸۳ء

محترمی و مکرمی جناب مدیر ماہنامہ "الرشاد" صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج شریف بخیر ہوں گے۔ میں آپ کا ماہنامہ "الرشاد" گاہے بگاہے دیکھتا رہتا ہوں۔ ماشاء اللہ اس میں اکثر و بیشتر اچھے اچھے اور معیاری مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں، لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ اسلامی فلسفہ اور تصوف پر بھی کبھی کبھی علمی اور تحقیقی مضامین شائع کرتے رہیں، کیونکہ اس وقت میرے

علم میں اردو کا کوئی دوسرا رسالہ یہ کام انجام نہیں دے رہا ہے۔ میں بھی انشاء اللہ آپ کو وقتاً فوقتاً قلمی تعاون کرسکتا ہوں۔ آپ کا " الرد علی المنطقیین " پر تبصرہ بہت پسند آیا۔ بمہربانی ماہنامہ الرشاد کا جنوری، فروری ۱۹۸۳ء کا شمارہ بذریعہ ڈاک میرے پتہ پر روانہ کرنے کی زحمت گوارہ کریں، یا وی، پی کردیں، میں انشاء اللہ پیسے ساتھ ہی روانہ کردوں گا۔ مجھے " الرد علی المنطقیین " پر آپ کا تبصرہ اپنے پاس محفوظ رکھنا ہے۔

والسلام

حمید نسیم

ڈیپارٹمنٹ آف فلاسفی اے ایم یو

(علی گڈھ)

مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی (ڈاکٹر ایم این ساہا روڈ۔ آسنسول ۷۱۳۳۰۱)

۱۶ / ۴ / ۱۹۸۳ء

عالی جناب حضرت مولانا مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ویسے ہم تمام سوسائٹی کے ارکان "الرشاد" کا برابر مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ خاص کر "رشحات" میں ملت کی دکھتی رگ کو اجاگر کرنا، اور انہیں نیک مشوروں سے نوازنا قابل قدر ہے ـــــــ سچ تو یہ ہے کہ آج ملت کے اندر زبردست اتحاد کی ضرورت ہے۔ جس کے لئے آپ جیسے بزرگ کی زور قلم و زور بیان جہاد اکبر سے کم نہیں!

دست بدعا ہوں کہ پروردگار عالم ملت کے اندر مذہبی، مسلکی، معاشرتی اختلاف سے بالاتر ہو کر ایک ملت، عظیم ملت کا انداز فکر عطا فرمائے۔ آمین

والسلام

احقر عبد الرؤف راعین

نانپارہ ضلع بہرائچ

مکرم و محترم جناب ایڈیٹر صاحب ماہنامہ الرشاد۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ آپ کا نام نامی اور آپ کے ادارہ کی شہرت سننے کا شرف اب سے قبل حاصل کرچکا تھا، لیکن خوش قسمتی سے آج آپ کے ماہنامہ کے ماہ دسمبر ۸۲ء کے شمارہ کو دیکھنے کی سعادت

حاصل ہوئی۔ آپ کی علمیت اور آپ کے ادارہ کے شایان شان پایا۔ لیکن "رشحات" کے مندرجات کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ اس میں آپ نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا ہے کہ اکثر علماء کرام کانگریس کے حامی تھے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ حمایت محض کورانہ تقلید تھی، اور ملت کی نہایت بدنصیبی تھی، جس طرح گاندھی جی شروع سے اردو کے مقابلہ میں ہندی کو لے کر چل رہے تھے۔ اور گائے کی حفاظت اور ذبیحہ گاؤ کی ممانعت کا بیڑا اٹھا رہے تھے، اس سے ہی ان کا کٹر ہندو ہونا ظاہر ہو رہا تھا۔ مسجد چھپور میں بے گناہ مسلمانوں پر گولیاں چلانے تک کے واقعہ کی انہوں نے مذمت نہیں کی۔ پھر تعلیم کے لئے جس طرح وردھا اسکیم اور ودیا مندر کی تحریک چل رہی تھی، اس سے بھی مستقبل کا نقشہ سامنے آسکتا تھا۔ جواہر لال نے مسلم تہذیب کو ٹونٹی دار لوٹے پائجامہ اور ترکی ٹوپی کے پھندے پر مشتمل بتایا تھا، وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کے بعد کانگریسی وزارتوں میں جس طرح مسلمانوں کو فسادات میں ظلم اور بے انصافی کا شکار بنایا گیا۔ اس کے باوجود ہمارے علماء کرام کا بلاشرط کانگریس کے ساتھ لگا رہنا ایک بہت بڑی بدنصیبی تھی جس کا خمیازہ علماء اور ملت دونوں کو بھگتنا پڑا۔ اگر علماء آزادی سے قبل کانگریس پر دباؤ ڈال کر اس کو مسلمانوں سے انصاف کرنے پر آمادہ کر لیتے تو عوام میں علماء سے بیزاری نہ پیدا ہوتی، اور بے دین لوگوں کے ہاتھ میں قیادت نہ چلی جاتی، جنہوں نے صرف قوم کے جذبات کی ترجمانی کر کے قائد اعظم کا خطاب حاصل کیا۔ اور اس کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو بے قیادت چھوڑ گئے۔ اور پاکستان میں بھی پہنچ کر بے دینی اور غیر منصفانہ حکومت قائم کی۔ آزادی کے بعد علماء نے دوسری غلطی یہ کی کہ مسلمانوں کی علاحدہ سیاست کو چھوڑ کر کانگریس کا دم چھلا بن گئے۔ جن کی وجہ سے کانگریس مسلمانوں کے ساتھ ظلم، بے انصافی اور برائی کر کے ہندو سبھا اور جن سنگھ سے ڈرا کر مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرتی۔ رہی۔ خود حکومت کرتی رہی۔ اور مسلمانوں کو دن بدن پسماندہ تر بناتی چلی گئی۔ اس پسماندگی سے صرف کیرلا مستثنیٰ رہا۔ جہاں کے مسلمانوں نے مسلم لیگ کی تنظیم کو باقی رکھ کر اپنی الگ سیاست کو قائم رکھا، اور الیکشن میں اپنے ووٹوں کو سودے بازی کے لئے استعمال کیا۔ اپنے لئے الگ ضلع کروالیا۔ ہر وزارت میں اہم رکن بنے۔ اور وزارت اعلیٰ کی کرسی تک پہونچے جہاں پولیس افیسر کو بے جا فائرنگ کرنے پر فوراً معطل کیا جا سکا۔ ورنہ شمالی ہندوستان وغیرہ میں ہمیشہ فائرنگ اور قتل عام کرنے والوں کو داد تحسین ملتی رہی۔ دراصل سیاسی حقوق، خصوصاً ووٹ کا حق، جان و مال عزت و آبرو کی حفاظت کا ایک ہتھیار ہیں، جس سے مظلوم انتخاب کے وقت حکومت کو چوٹ پہنچا سکتے ہیں

اور اسی چوٹ کے ڈر سے حکومت ظلم کرنے سے باز رہتی ہے۔ اور جان و مال، عزت و آبرو محفوظ رہ سکتے ہیں اس لئے علماء کرام چاہے جتنے بھی استقامت و عزیمت کے حامل ہوں، مسلم قوم اپنے اجتماعی فیصلہ کے وقت ان کو نظر انداز کرتی رہے گی۔ علماء کو چاہئے کہ ملت کی جداگانہ سیاسی تنظیم کریں۔ اور انتخابات کے وقت قوم کے مطالبات کو لے کر حکمراں جماعت اور حزب مخالف سے جوڑ توڑ کریں۔ مثلاً ابھی حال ہی میں میرٹھ میں جو فساد ہوا تھا، اس میں کئی سرکاری افسروں سے مسلمانوں کو سخت شکایت پیدا ہو گئی تھی، اگر پٹیالی اور لال گنج وغیرہ کے ضمنی انتخابات میں یہ مطالبہ کر دیا جاتا کہ پہلے فلاں فلاں افسران کو معطل اور برخاست کرو اور جیسا میں گرفتار کرو۔ ورنہ ایک مسلمان بھی حکومت کے امیدوار کو ووٹ نہیں دے گا، تو آئندہ کے لئے فسادات کا سدباب ہو جاتا۔ علماء نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہیں اور حضورؐ امت کے باپ بھی تھے، تو علماء کو بھی امت کا باپ بننا پڑے گا۔ ایک مسلمان کی جان و مال عزت و آبرو کے پامال ہونے پر علماء کو اپنی ساری قوت حکومت سے مطالبہ کرنے، اس کو ملک اور بیرون ملک خصوصاً عرب ملکوں میں بدنام کرنے اور انتخابات میں اس کو گرانے کی دھمکی دینے پر خرچ کر دینی چاہئے۔ اس کے بعد یہ ملت ضرور علماء کو قیادت کی زمام سونپ دے گی۔

شمات کے علاوہ آپ کی چار باتوں پر بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں آپ نے بجا طور پر مسلمانوں کو ایمان، عبادات، حقوق العباد اور خود اعتمادی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آج مسلمان ایک بے سری بھیڑ ہیں۔ بغیر تنظیم قائم کئے ہوئے ان چاروں باتوں پر عمل کیسے ہو سکتا ہے۔

والسلام

خادم: محمد طاہر۔ ایم۔ اے۔ پولیٹیکل سائنس

ایم اے اردو، بی۔ ٹی۔ سادات اشرف کالج نانپارہ بہرائچ

از مولانا انظر شاہ قیصر۔ دیوبند
۵ مئی ۱۹۸۲ء

حضرت مولانا مدظلکم

میرے اس خط کا تعلق کسی خوشامد سے نہیں ہے، بلکہ ایک تاثر قلبی ہے، اور اس کے اظہار پر مجبور ہوں، میں نے بہت سے اچھے برے رسائل پڑھے بھی، اور خود بھی مرتب کئے، مگر جو بصیرت اور انشراح آپ کے رسالہ جامعہ الرشاد، کے مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے وہ دوسرے رسائل کو نہیں۔ رسالہ کے سب مضامین محققانہ مفکرانہ یا تی سلام پر

نئی کتابیں

معلم القواعد والاعراب حصہ اول

از مولانا محمد مبین صاحب ندوی۔ صفحات ۴۶۔ کتابت وطباعت متوسط
پتہ: مکتبہ دار العلم۔ کوپاگنج۔ ضلع اعظم گڈھ (یوپی)

ابتدائی عربی طلبہ کے لئے اردو زبان میں بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں، اور وہ سب اپنی جگہ پر مفید ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ صرف ونحو کی اردو کتابیں کیا بڑی بڑی عربی کتابیں پڑھنے کے بعد بھی عام طور پر عربی طلبہ کی صرف ونحو کمزور ہی رہتی ہے، اور بہت کم طلبہ ہیں جو رواں عبارت پڑھ پاتے ہیں۔

مولانا محمد مبین صاحب کہنہ مشق استاذ ہیں، وہ ایک مدت تک جامعۃ الرشاد میں ادب ونحو کے استاذ رہ چکے ہیں، اور اب وہ ایک مقامی مدرسہ میں ممتاز استاد کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں، انہوں نے یہ کتاب بالکل جدید طریقۂ تعلیم کے مطابق لکھی ہے، جس میں نحو کے مسائل کو بڑے سلجھے انداز میں ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے، انہوں نے کوشش کی ہے کہ طلبہ صرف ونحو کے قواعد اور اس کی کوئی ایک مثال نہ رٹ لیں، بلکہ انہوں نے ہر قاعدہ کی متعدد مثالیں دے کر پھر ان کی پوری نحوی ترکیب کرکے طلبہ کے ذہن میں اعراب کے مواقع بھی بٹھلاتے گئے ہیں، جس سے ان کو صحیح عبارت پڑھنا آسان ہوجائیگا یہ ساری مثالیں قرآن وحدیث سے ماخوذ ہیں، جو اس کتاب کی خاص خوبی ہے۔ یہ کتاب حصہ اول جو ابتدائی طلبہ کے لئے ہے اور دوسرا زیر طبع حصہ منتہی طلبہ کے لئے ہے، امید ہے کہ یہ کتاب مدارس میں مقبول ہوگی۔

محمد اقبال

میر سید میر شکر۔ ترجمہ: ڈاکٹر کبیر احمد جائسی۔ صفحات ۱۳۶۔ کتابت وطباعت معیاری۔ پتہ: اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، سری نگر۔ قیمت ۱۸/ روپئے۔

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی جدید فارسی زبان کے کہنہ مشق واقف کار ہیں، وہ متعدد فارسی کتابوں کو اردو میں منتقل کر چکے ہیں، ڈاکٹر علی شریعتی کی کتاب "اقبال مصلح قرن آخر" پر الرشاد میں تبصرہ ہے۔ یہ کتاب بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے، یہ کتاب تاجکستان کے مشہور دانشور میر سید میر شکر کے ایک طویل مضمون کا ترجمہ ہے، جس پر ڈاکٹر کبیر احمد جائسی صاحب نے ایک طویل معلوماتی مقدمہ لکھ کر اس کی افادیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے، اقبال پر اب تک دنیا کے دوسری زبانوں کے ساتھ فارسی زبان

جاتی ہے اور اس کی روشنی میں صحیح اسلامی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ادارۃ المصنفین سے شائع ہوا تھا

اہل کتاب صحابہ و تابعین

مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی

اس کتاب میں ان صحابہ اور تابعین کا تذکرہ ہے جو یہودی یا عیسائی تھے اور انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کتاب میں تقریباً سو صفحے کا ایک قیمتی مقدمہ بھی ہے جس سے عرب کے یہود و نصاریٰ کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔

اس پر مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کا دیباچہ بھی ہے۔ اس موضوع پر دنیا کی کسی زبان میں کوئی مکمل کتاب موجود نہیں ہے۔

خطبۂ نکاح

نکاح کے موقع پر جو خطبہ دیا جاتا ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ اور یہ ایک اہم معاشرتی ہدایت اور اصلاح معاشرہ کا پیغام ہے۔ مگر عام طور پر اس کے الفاظ دہرا دیئے جاتے ہیں، اس کا پورا مفہوم لوگوں کے ذہن نشین نہیں ہو پاتا ہے۔ اس کتابچہ میں اس کے ایک ایک لفظ کی ایسی موثر تشریح کی گئی ہے کہ یہ ہر نکاح کے موقع پر تقسیم کرنے کے قابل ہے۔ یہ تشریح مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی کے قلم سے ہے۔ صفحات   قیمت

اہل دل کی باتیں

یہ بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپگڈھی مدظلہ کے ان ملفوظات کا مجموعہ ہے جو وہ اپنی نجی مجلسوں میں اپنی پراثر اور پرسوز زبان سے فرماتے رہے ہیں۔ اسے مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد نے مرتب کیا ہے۔ اس کا بہت سا حصہ ماہنامہ الفرقان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اب یہ جواہر پارے کتابی شکل میں دارالتالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد کی طرف سے شائع کئے جا رہے ہیں۔

فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل

یہ محترم ناظم جامعۃ الرشاد کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو معارف اعظم گڈھ میں شائع ہو چکے ہیں یا مختلف سیمیناروں میں پڑھے گئے ہیں جس میں جدید مسائل کے حل کیلئے وہ بنیادیں فراہم کی گئی ہیں جن کی روشنی میں جدید سے جدید مسائل حل کئے جا سکتے ہیں، یہ کتاب جامعہ ملیہ دلی سے شائع ہوئی ہے اور اس پر اردو اکیڈمی نے مصنف کو انعام بھی دیا ہے۔ قیمت

ملنے کا پتہ:۔ شکیل احمد منیجر مکتبہ جامعۃ الرشاد۔ رشاد نگر شہر اعظم گڈھ۔ یوپی

d. No. R. N. 38937/81 Phone:-461

Monthly Jameatur Rashad

Azamgarh (U. P.)

جامعۃ الرشاد

ایک نظر میں

ادارے کے شعبے

(۱) عربی درجات (۲) درجہ حفظ و قرأت (۳) ابتدائی تعلیم کے مکاتب و جونیر ہائی اسکول (۴) کتابت وجلدسازی

(۵) اسلامی نرسری اسکول (۶) الجماعۃ الشرعیہ اس کے ذریعہ نکاح وطلاق کے مسائل کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ (۷)

شعبہ نشر و اشاعت جس کے تحت کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں

ان تمام شعبوں میں کئی سو طلبہ ابتدائی اور اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ڈیڑھ درجن

لائق اساتذہ کام کر رہے ہیں۔

ادارے کا خرچ

ادارے کا سالانہ خرچ ڈیڑھ لاکھ روپئے سے زیادہ ہے

ادارہ کی اہمیت اور خصوصیت (۱) جامعۃ الرشاد میں اعلیٰ عربی تعلیم کے ساتھ انگریزی زبان اور

جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ (۲) یہاں سے عالمیت پاس کرنے کے بعد بی۔ اے میں براہ راست

داخلہ مل جاتا ہے۔ (۳) سعودی عرب کی بعض یونیورسٹیوں نے ہر کلیہ میں اس کا معادلہ منظور کرلیا ہے

کئی طلبہ داخل ہوکر فارغ ہوچکے ہیں اور اس سال بھی کئی طالب علموں کی درخواستیں بھیجی جارہی ہیں۔ (۴)

Alishat Press Tanda (Faizabad)

دینی تعلیم کے ساتھ بچوں کی [illegible] جو لوگ بچوں کا داخلہ چاہتے

ان کو رمضان المبارک میں خط و کتابت [illegible] کرنا چاہئے۔ مکتب کے بچوں کا داخلہ [illegible] کے بعد شروع ہوجاتا ہے

Vol. 3 No. 29 & 30
جامعہ الرشاد
Dr. Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J. M. I. New Delhi

دارالتالیف والترجمہ کی تصانیف

عبادت و خدمت

مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہ

اس رسالہ میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور عام انسانوں کی خدمت بھی عبادت ہے، اور اس پر اسی طرح اجر و ثواب ملتا ہے جس طرح فرض عبادات پر ملتا ہے۔ اگر فرض عبادات کے اہتمام کے ساتھ ہمارے اندر عام انسانوں کی خدمت کا جذبہ بھی پیدا ہو جائے تو نفرت و حقارت کے بہت دبیز پردے ہٹ جائیں گے اور اسلام سے عام انسانوں کے دلوں میں ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ سائز ۲۲ × ۱۸۔ صفحات ۵۶، قیمت ۵۰ پیسے

دینی مدارس اور ان کی ذمہ داریاں

یہ محترم مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد کی ان تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ ہے جو وہ طلبہ، اساتذہ، منتظمین مدرسہ اور عربی مدارس کے ذمہ داروں کے سامنے کرتے رہے ہیں۔ یہ تقریریں اور تحریریں درد و اثر میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ان میں بعض تقریروں کو محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ نے اپنے تائیدی نوٹ کے ساتھ الفرقان میں شائع فرمایا اور شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب مدظلہ العالی نے ایک بڑے مجمع میں پڑھوا کر سنوایا اور فرمایا کہ اسے ہر استاذ اور طالب علم کو پڑھنا چاہئے۔ سائز ۲۲ × ۱۸۔ صفحات ۱۰۰، قیمت للعہ

اسلامی تعلیم

حصہ اول، دوم، سوم، چہارم

بچوں کو اسلامی مسائل ذہن نشین کرانے کے لئے اردو زبان میں درجنوں رسالے لکھے گئے ہیں، مگر اس رسالہ کا انداز بیان اتنا دلچسپ ہے اور مسائل ایسے آسان طریقے سے سمجھایا گیا کہ بچے اسے قصہ کہانی کی کتاب کی طرح دلچسپی و شوق سے پڑھتے ہیں۔ چار حصوں میں تمام ضروری مسائل آگئے ہیں۔ سائز ۲۰ × ۳۰/۱۶ قیمت حصہ اول ۸ر، دوم ۲۵، سوم ۳۰ر، چہارم ۵۰ پیسے

تبع تابعین حصہ اول

مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہ

کتاب میں ۱۱۹ اکابر تبع تابعین کا مفصل تذکرہ ہے، شروع میں مصنف کے قلم سے ایک فاضلانہ مقدمہ بھی ہے جس سے اسلام کی ابتدائی دو صدی کے دینی، تہذیبی اور سیاسی تاریخ کا

مولانا مجیب اللہ ندوی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے نشاط پریس ٹانڈہ میں چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ سے شائع کیا

جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان

ماہنامہ

جامعۃ الرشاد

سالانہ چندہ
ہندوستان 24/-
چندہ ششماہی 12/-
قیمت فی پرچہ 2/50

سالانہ چندہ
ممالک غیر سے
بارہ ڈالر امریکی
12/-

جلد [illegible] | جون، جولائی ۱۹۸۳ء مطابق رمضان، شوال المکرم ۱۴۰۳ھ | شمارہ [illegible]

فہرست مضامین

معذرت

مرتب کی علالت اور کتابت کی بعض نئی دقتوں کی وجہ سے ہم جون ۱۹۸۳ء کا پرچہ شائع نہیں کر سکے۔ جولائی کا پرچہ ناظرین کی خدمت میں حاضر ہے۔ اسے جون، جولائی ۱۹۸۳ء کا مشترک شمارہ تصور کیا جائے، انشاء اللہ آئندہ ہر ماہ چند صفحات کا اضافہ کر کے اس کی تلافی کر دی جائے گی۔

مطبوعہ: نشاط پریس ٹانڈہ

رشحات

آہ مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

ناظرین " الرشاد " کو اخبارات کے ذریعہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے انتقال کی افسوسناک
خبر مل چکی ہوگی، قاری صاحب بانیٔ دارالعلوم دیوبند مولانا قاسم صاحب نانوتوی کی نسبت حضرت تھانوی
کی خلافت کے ساتھ اپنے علم وفضل اور اعتدال وتوازن کے لحاظ سے بھی طبقۂ علماء میں ایک ممتاز حیثیت
ہی کے مالک نہ تھے بلکہ گل سرسبد تھے، انھوں نے دس بیس نہیں بلکہ پوری نصف صدی دارالعلوم
دیوبند کی جو بے مثال اور بے لوث خدمت کی اس کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا، جس وقت
انکو اہتمام کا عہدہ سپرد کیا گیا تھا، دارالعلوم کے حلقہ کے اندر اور اس کے حلقہ کے باہر بڑی بڑی
شخصیتیں موجود تھیں مگر سب کی نظرِ انتخاب اسی ۲۷ - ۲۸ برس کے نوجوان پر پڑی اور انھوں نے
بزرگوں کے اس حسن ظن کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ آگے چل کر بذات خود ایک بڑی شخصیت بن گئے۔
جس وقت انھوں نے اہتمام سنبھالا دارالعلوم دیوبند ایک متوسط درجے کا مدرسہ تھا جسے انھوں نے
اپنے حسن انتظام سے ہندوستان کا جامع ازہر بنا دیا، انکی غیر معمولی صلاحیت ہی تھی کہ جب وہ کچھ
دنوں کیلئے پاکستان چلے گئے اور وہاں کی شہریت اختیار کرلی تو دارالعلوم دیوبند کے اس وقت
شیخ الحدیث اور صدر مدرس حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ مولانا ابوالکلام آزاد اور
جواہر لال نہرو سے سفارش کرکے انکو دوبارہ ہندوستان واپس لائے۔ جب مولانا آزادؒ نے
مولانا مدنیؒ سے کہا کہ آپ کو کوئی دوسرا قاری طیب نہیں ملتا جو آپ ان کے بلانے پر اصرار کررہے ہیں؟
تو انھوں نے جواب میں کہا کہ ہاں مجھے دوسرا قاری طیب نہیں مل رہا ہے، کاش ان کے خلف الصدق
حضرات نے بھی مولانا مدنی کے اس اعتراف کی آبرو رکھ لی ہوتی۔

وہ ہندوستان کے ان شیریں بیاں ممتاز واعظین میں تھے جنکی مثال ملنی مشکل ہے۔
انکی تحریریں بھی حکمت وموعظت اور اعتدال وتوازن کا بہترین نمونہ ہوتی تھیں، اپنی

نظروں نے ایسی دو باوقار شخصیتوں کو دیکھا ہے کہ جو اپنے پر وقار، نورانی اور معصوم چہرہ کیساتھ جس مجمع میں پہنچ جاتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ رحمت کے فرشتوں کا نزول ہو رہا ہے۔ ایک حضرت الاستاد مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ، دوسرے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ، انھوں نے اپنی طبعی شرافت و مروت اور نرم خوئی کی وجہ سے پوری زندگی میں شاید ہی کسی کے آبگینۂ دل کو ادنیٰ ٹھیس پہنچائی ہو، مگر اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر رحم کرے جنھوں نے ان کے معصوم دماغ کو مجروح اور ان کے بے داغ شیشۂ دل کو اس پیرانہ سالی میں چور چور کر ڈالا، انکی ذات نہ صرف دارالعلوم دیوبند کی آبرو تھی بلکہ ملت اسلامیہ کے لئے عزت و وقار کا سبب تھی، ہمیں افسوس ہے کہ وہ آبرو لٹ گئی اور عزت و وقار کا وہ مجسمہ دنیا سے جاتا رہا اور اعتدال و توازن اور اخلاق و مروت کی چلتی پھرتی تصویر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ إنا لله وإنا إليه راجعون۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔

وفات کے وقت قاری صاحب کی عمر ۸۸ سال سے متجاوز تھی جسے عمر طبعی کہا جا سکتا ہے۔ مگر اس پیرانہ سالی میں انکی نصف صدی کی خدمات کو جس طرح بھلا کر کچھ سیاسی ظالموں اور مجلس شوریٰ کے کچھ "صاحب تقویٰ" ممبران نے ان کے ساتھ جو سلوک روا رکھا وہ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کا سیاہ ترین صفحہ بن گیا۔ کاش یہ لوگ تھوڑے دن صبر کر جاتے تو تاریخ کا یہ صفحہ سیاہ ہونے سے بچ جاتا۔

اللہ تعالیٰ نے انکو علمی و دینی حیثیت کیساتھ دنیاوی وجاہت سے بھی نوازا تھا اسی وجہ سے انکی معاشرتی زندگی میں جو رکھ رکھاؤ تھا وہ بھی بہت سے کم سواد لوگوں کی نظروں میں کھٹکتا تھا اور اس کو ان کا سب سے بڑا عیب بنا کر پیش کرتے تھے۔

کور بختاں با آرزو خواہند　　　مقبلاں را زوال نعمت و جاہ

بہر حال دارالعلوم میں تعلیم ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی اور نظم و انتظام چل رہا ہے اور چلتا رہے گا مگر انکی ذات سے جو اس کو دینی و علمی وقار حاصل ہوا تھا وہ آسانی سے پورا نہیں ہوگا۔

دار العلوم دیوبند سے روحانی تعلق کے علاوہ جامعۃ الرشاد سے ان کا جو خصوصی لگاؤ رہا ہے اس کی بنا پر بھی ہم نے اپنا فرض سمجھ کر جامعۃ الرشاد میں تعزیت کا جلسہ کیا اور ان کے لئے بار بار اجتماعی دعائے مغفرت کی گئی اور پھر جمعہ کے دن جامع مسجد اور دوسری مسجدوں میں راقم الحروف کی تحریک پر متعدد علماء نے ان کے محاسن پر تقریریں کی اور راقم الحروف نے مدرسہ کی مسجد میں خطبہ سے پہلے ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا اور تعزیت کی تجویزیں پاس ہوئیں جو ان کے بڑے صاحبزادے مولانا محمد سالم صاحب کو بھیج دی گئیں۔

جامعۃ الرشاد کی ابتدا ۱۹۶۲ء میں ایک کرایہ کی عمارت اور مسجد میں ہوئی مگر ۱۹۶۵ء میں اس کی جدید عمارت کا سنگ بنیاد جن علماء و صلحاء کے ہاتھوں رکھا گیا ان میں خاص طور پر قاری محمد طیبؒ نے اس کی پہلی اینٹ رکھی، اس موقع پر انھوں نے مدرسہ کی افادیت پر جو مؤثر تقریر کی اس سے متاثر ہو کر شہر اعظم گڈھ جیسے غریب مقام کے باشندوں نے کئی ہزار روپئے کی رسید اسی وقت کٹوائی۔

مولانا قاری محمد طیب صاحب دوسری بار اس وقت تشریف لائے جب جامعۃ الرشاد کیطرف سے مشرقی اضلاع کے عربی مدارس کے ذمہ داروں کی مجلس بلائی گئی تھی، اس وقت مدرسہ کا ہال جہاں بنا ہوا ہے وہاں ایک بڑا چھپر پڑا ہوا تھا اسی چھپر میں مجلس ہوئی، قاری صاحبؒ مجلس سے کئی گھنٹہ پہلے تشریف لے آئے اور مجلس کے بعد بھی کئی گھنٹے اسی چھپر کے نیچے لیٹے رہے اور فرماتے رہے کہ آج اس میں بیٹھ کر بزرگوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ تیسری بار قاری صاحبؒ ۱۹۶۷ء دستار بندی کے جلسہ میں تشریف لائے۔ اسی موقع پر انھوں نے اسلامی ہاسٹل کا بھی معائنہ کیا جو جامعۃ الرشاد کیطرف سے انگریزی طلبہ کی تربیت کیلئے قائم کیا گیا تھا، انھوں نے ہر موقع پر اپنا معائنہ بھی تحریر فرمایا جو انکی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے۔ انکی ہمت افزائی اور اعلیٰ ظرفی جامعۃ الرشاد ہی کے ساتھ مخصوص نہیں تھی بلکہ کسی بھی مدرسہ کیطرف سے جب انکو مدعو کیا جاتا تھا تو وہ اس انشراح کے ساتھ تشریف لے جاتے تھے کہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کے نزدیک اس مدرسہ کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کسی بڑے دار العلوم کی ہے۔

ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی خوبیوں کے عوض ان کو جنت الفردوس

میں اعلیٰ ترین مقام عنایت فرمائے اور ان کے تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے اور
ملت اسلامیہ کی امانت دارالعلوم دیوبند کو ان کا نعم البدل عطا کرے ۔ آمین
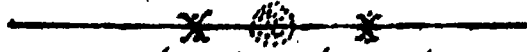
راقم الحروف اس سے پہلے کئی بار عرض کر چکا ہے کہ خواہ حکمراں جماعت ہو یا مخالف پارٹیاں
مسلمانوں سے انکی ہمدردی صرف ووٹ لینے کی حد تک ہے ان میں سے نہ تو کسی کو ان کے مسائل سے
دلچسپی ہے اور نہ انکی جان و مال کے لٹ جانے پر واقعی کسی کو کوئی غم ہوتا ہے ۔ آزادی کے بعد
کی ۳۵ برس کی تاریخ اس پر شاہد ہے ۔ ابھی آسام میں مرکزی حکومت کی پالیسی کیوجہ سے مسلمانوں
کا جو قتل عام ہوا ہے اس پر نہ تو پارلیمنٹ میں کوئی سوال اٹھا اور نہ مخالف جماعت کا کوئی قابل ذکر
لیڈر بہوگنا کے علاوہ واقعی ہمدردی کے لئے وہاں پہونچا ۔ چندر شیکھر صاحب اس وقت کئی مہینے سے
پد یاترا کر رہے ہیں مگر ان کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اپنی پد یاترا کا رخ وہ آسام کیطرف پھیر دیتے اور
مظلوموں کو کچھ تسلی دیتے ۔ مسلمانوں کے قتل عام پر ضیاء الحق اور بعض عرب حکمرانوں نے بیانات
دے دیئے تو وہ ملک کے معاملات میں مداخلت قرار پائی لیکن سری لنکا میں چند سو ہندوستانی
نسل کے لوگ قتل ہو جاتے ہیں تو پارلیمنٹ میں بھی زلزلہ آجاتا ہے اور لنکا کی حکومت کو وزیر اعظم
سے لیکر بڑے بڑے لیڈر دھمکی دینے سے باز نہیں رہتے ۔ اور اس سے کسی دوسرے ملک کے معاملات
میں مداخلت نہیں ہوتی ۔ پنجاب میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے اگر اس کا سوواں حصہ بھی کشمیر میں ہوتا
تو قیامت برپا ہو جاتی ۔ یا یا تیاگی کہہ سکیے پر تو چرن سنگھ اور انکی جماعت کے لوگ جیل بھر سکتے ہیں مگر
آسام کے قتل عام پر وہ آنسو بھی نہیں بہا سکے ۔ افسوس ہے کہ ان جماعتوں میں رہنے والے مسلمانوں
کو اس پر ذرا بھی غیرت نہیں آتی ۔
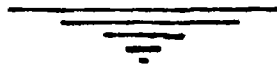
اسلام اور بین الاقوامی تعلقات

(زیر طبع کتاب کا ایک باب)

حبیب اللہ ندوی

بین الاقوامی تعلقات کے سلسلہ میں اسلام نے جو اصول و تصورات دیئے ہیں، ان کی تفصیل سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ مختصر طریقہ پر بین الاقوامی تعلقات کے عام اصول و تصورات کے مفہوم کی وضاحت کر دی جائے۔ اور اس کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔

بین الاقوامی اصول و تصورات کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے یا یہ ہونا چاہئے، کہ وہ اصول و تصورات جو انسان کے ذہن و دماغ اور طرز عمل میں تنگ نظری کے بجائے وسیع النظری، اور محدودیت کے بجائے آفاقیت پیدا کرنے والے ہوں، جو چھوٹی چھوٹی وحدتوں میں تقسیم کرنے والے جذبات کے بجائے انسان کے دل و دماغ میں پوری دنیائے انسانیت اور ہمہ گیر اجتماعیت کے لئے ہمدردی اور بہی خواہی کے جذبات ابھارتے ہوں، اس کو وطنی، قومی، نسلی اور طبقاتی بندشوں اور پستیوں سے آزاد اور بلند کرکے عام انسانی مسائل کو ایک اکائی تصور کرنے اور ان کی الجھنوں کو ختم کرنے کی صلاحیت پیدا کرتے ہوں، خواہ یہ مسائل ماوراطبعی ہوں، یا طبعیاتی و ارضی ہوں، پھر اسی کے ساتھ وہ کچھ ایسی اخلاقی و قانونی ضمانتیں بھی دیتے ہوں کہ اگر ان کو اپنایا جائے تو اختلاف عقیدہ و مسلک کے باوجود ان کے ذریعہ امن عالم کا قیام اور عام انسانی حقوق کی محافظت ہو سکے۔ اور بین الاقوامی تعلقات کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے۔

بین الاقوامیت کی تاریخ

ممکن ہے کہ موجودہ دور میں کچھ لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ جس وقت نقل و حمل اور رسل و رسائل کے ذرائع و وسائل نے دنیا کو ایک گھر بنا دیا ہے، اسی وقت سے بین الاقوامی تصورات و تعلقات کی ابتدا ہوئی ہے، ایک دو صدی پہلے کی انسانی تاریخ اس سعادت سے محروم رہی ہے، اس خیال کے سلسلہ میں صرف اتنا عرض کرنا کافی ہے کہ اس کی تردید دنیا کی اجتماعی اور قومی تاریخیں بھی کرتی ہیں اور مذہبی تاریخیں بھی،

اس تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے کہ دنیا کی مذہبی، قومی اور اجتماعی تاریخ کے کس کس عہد میں بین الاقوامیت کا کتنا چرچا رہا، اور ان کی ترویج میں کن کن عوامل نے حصہ لیا، اس لئے کہ یہ چیز ہمارے موضوع

سے تقریباً خارج ہے، جن لوگوں کو اس کی تاریخ سے دلچسپی ہو، ان کو دنیا کی مذہبی تاریخ، یونانی شہری ریاستوں کے باہمی تعلقات سلطنت روما کے بین الاقوامی قوانین، مکمل اسلامی نظام، اور مسیحی دنیا کے اتحاد و اتفاق کی تاریخ اور ولندیزی مفکر سولن (SOLEN) کی کتاب "قانون امن و جنگ"، اور ہیگ کانفرنس منعقدہ ۱۸۹۹ء و ۱۹۰۶ء کی رو داد کا مطالعہ کرنا چاہئے، اس سلسلہ میں اتنی بات البتہ صحیح ہے، کہ خالص سیاسی ضرورتوں اور معاشی فائدوں کے پیش نظر موجودہ دور میں جو خود غرضانہ بین الاقوامی تصورات اور تعلقات پیدا ہو گئے ہیں، ان کی تاریخ ایک دو صدی سے آگے نہیں بڑھتی، خاص طور پر ۷۰ - ۸۰ برس کے اندر ان تصورات و تعلقات کا تذکرہ و چرچا اور زیادہ بڑھ گیا ہے چنانچہ اسی کے نتیجہ میں ۱۸۶۴ء میں مزدوروں کی بین الاقوامی تنظیم اور بعض دوسری تنظیمیں قائم ہوئیں اور اسی کے نتیجہ میں پہلی جنگ عظیم کے بعد ۱۹۱۹ء میں لیگ آف نیشن (League of Nation) اور دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۴۵ء میں "یونائٹڈ نیشنز آرگنائزیشن" وجود میں آیا۔ لیکن انجمن اقوام چونکہ چند قومی و معاشی اغراض و مقاصد کے ماتحت قائم ہوئی تھی، اس لئے وہی اغراض و مقاصد اس کی موت کا سبب بنے۔ انہی اغراض و مقاصد کو کچھ مزید بین الاقوامی رنگ دے کر یو۔ این۔ او (U-N-O) وجود میں آیا ہے، دیکھئے وہ کب تک زندہ و سلامت رہتا ہے، ان دونوں تنظیموں کی تاریخ اور مقاصد پر ایک سرسری نظر ڈال لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

پہلی جنگ عظیم میں تقریباً دو کروڑ انسان کام آئے تھے۔ اور تقریباً دو کھرب پونڈ جنگی اخراجات ہوئے تھے، اس ہولناک تباہی نے دنیا کی بڑی قوموں کے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا اور وہ ان تدبیروں کے سوچنے پر مجبور ہوئے، جن سے آئندہ ان کو اتنی ہولناک تباہی کا سامنا کرنا پڑے، چنانچہ جنگ کے خاتمہ پر ۱۹۱۹ء میں پیرس میں جو صلح ہوئی۔ اس میں امریکہ کے سابق صدر جمہوریہ امریکہ مسٹر ولسن نے صلح کے چودہ نکات پیش کئے۔ انہی نکات کے اوپر اس انجمن اقوام کی بنیاد پڑی، جس کا مرکز جنیوا قرار پایا، اس انجمن نے بیس برس کے اندر چھوٹی مملکتوں کے بہت سے جھگڑوں کو چکایا، اور بہت سی الجھنوں کو ختم کیا، مثلاً اس نے ۱۹۲۲ء میں سویڈن اور روس کے درمیان جزائر آئرلینڈ کی نزاع کو ختم کیا، ۱۹۲۵ء میں اس نے یونان اور بلغاریہ کے درمیان جنگ کو روکا، لیکن معاملہ جب تک چھوٹی مملکتوں کے مسائل اور نزاعات کا رہا، اس وقت تک انجمن اقوام کی

حد تک کامیاب ہوئی۔ لیکن جب یہ نزاعات خود انجمن کے پاسبانوں میں پیدا ہوئے۔ تو وہ کچھ نہ کر سکی، چین و جاپان دونوں انجمن کے رکن تھے، مگر جب دونوں میں جنگ چھڑی اور جاپان نے منچوریا پر قبضہ کر لیا، تو چین فریاد ہی کرتا رہا، لیکن انجمن کچھ نہ کر سکی۔ ۱۹۳۲ء میں جنیوا میں تخفیف اسلحہ کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں ۵۰ ملک کے نمائندوں نے شرکت کی۔ لیکن بڑی طاقتوں میں سے کوئی بھی اسلحہ کو کم کرنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں اٹلی نے حبشہ پر للچائی ہوئی نگاہ ڈالی، اور اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، حبشہ انجمن سے طاقت کے استعمال کی استدعا کرتا رہا۔ لیکن وہ کچھ نہ کر سکی۔ ان واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۳۵ء میں جرمنی، پھر جاپان نے اپنی اپنی اغراض کے ماتحت انجمن کی رکنیت سے علیحدگی اختیار کر لی، اور بعض دوسرے ملک بھی مایوسی کا شکار ہونے لگے۔ ۱۹۳۹ء تک اس میں زندگی کی کچھ نہ کچھ رمق باقی رہی، یہاں تک کہ ۱۹۳۹ء میں جرمنی نے چیکوسلوکیا، لتھونیا وغیرہ کو یکے بعد دیگرے ہڑپ کرنا شروع کر دیا، اور آخر میں پولینڈ پر اس کی نظر کرم پڑی، اور اس پر بمباری شروع کر دی۔ برطانیہ اور فرانس پولینڈ کی مدد کے لئے دوڑے، جس کا نتیجہ دوسری ہولناک جنگ اور لیگ آف نیشنز کی موت کی صورت میں ظاہر ہوا۔

اوپر انجمن اقوام کی کامیابی و ناکامی کی جو قدرے وضاحت کی گئی ہے، اس کی روشنی میں اگر آپ یو۔ این۔ او۔ کی ۲۸ سالہ تاریخ پر نظر ڈالیں گے، تو اس کی زندگی کی طرف سے بھی آپ پر کچھ مایوسی طاری ہوگی، کیونکہ چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کے معاملات و نزاعات کے طے کرانے میں بڑی بڑی حکومتیں بڑی تندہی دکھاتی ہیں۔ لیکن جب خود ان کا مفاد ٹکراتا ہے۔ تو ایک دوسرے کو یا تو انگیز کرتی ہیں یا پھر اپنے بنائے ہوئے چارٹر اور انسانی حقوق کے منشور کو دریا برد کر دیتی ہیں۔ مثال کے لئے کوریا، جرمنی ہنگری اور الجزائر۔ ساؤتھ افریقہ، ایتھوپیا اور عرب و اسرائیل اور فلسطینوں کے مسائل کو سامنے رکھیے پھر یو۔ این۔ او کے چارٹر اور عالمی منشور پر ایک نظر ڈالئے، تو آپ کو قریب قریب وہی صورت حال نظر آئے گی، جو ۱۹۳۹ء سے پہلے دنیا کی تھی، اس وقت بھی مشرق وسطیٰ میں عرب اسرائیل کشمکش جنوبی افریقہ وغیرہ کے مسائل کے سلسلہ میں یو۔ این۔ او کی جنم داتا بڑی طاقتیں اپنے اپنے اغراض کے تحت کسی طرح ان کو حل نہیں ہونے دینا چاہتیں، خاص طور پر روس، امریکہ، برطانیہ اور فرانس وغیرہ اگر خدانخواستہ کوئی بڑی جنگ چھڑی تو اس کا حشر بھی لیگ آف نیشنز کا ہوگا۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس طرح کے اداروں کا قیام ضروری نہیں ہے، یا وہ مفید نہیں ہیں، بلکہ کہنا یہ ہے کہ موجودہ بین الاقوامیت کی بنیاد کسی بلند و پائیدار تصور حیات اور بے غرض اخلاقی اقدار کے بجائے قومی خود غرضی، وطنی برتری، نسلی عصبیت، اور محض مادی سیاسی اور معاشی فائدوں پر رکھی گئی ہے اس لئے اس سے نہ تو کوئی دیرپا امن قائم ہو پاتا ہے، اور نہ چھوٹی اور بڑی طاقتوں کے حقوق کی یکساں اور مساویانہ حفاظت ہی ہو پارہی ہے۔

موجودہ بین الاقوامیت کی بنیادی خامی، اور اس کی ناکامی | موجودہ بین الاقوامیت کی ناکامی کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے، اس سے ممکن ہے کہ یہ بات محض ایک بے دلیل دعویٰ معلوم ہو، اس لئے چند باتیں وضاحت کے لئے اور عرض کردی جاتی ہیں۔ گو یہ بجائے خود ایک تفصیل طلب موضوع ہے،

موجودہ بین الاقوامیت میں یوں تو بہت سی خامیاں ہیں، لیکن اس کی دو بڑی خامیاں ہیں ایک وطنی و نسلی جذبۂ قومیت دوسرے انسانی بھائی چارہ کے لئے محض انسان کے فکر و ضمیر پر اعتماد۔

قومیت | موجودہ دور کے جو علماء و مفکرین بین الاقوامیت کے حامی و وکیل ہیں، ان کا خیال ہے کہ:

"فرد اور نوع انسانی دونوں کی بہبود کے لئے لازمی ہے کہ عالم انسانی قوموں میں تقسیم ہو، اور اسی تقسیم پر عالمگیر انسانی اخوت کی بنیاد قائم کی جائے۔"

(قومیت و بین الاقوامیت مکتبہ جامعہ ص۶)

ریمزے میور نے لکھا ہے کہ:

"کامیاب قومیت ہی وہ بنیاد ہے جس پر موثر بین الاقوامیت قائم کی جاسکتی ہے۔"

برنارڈ جوزف اس سے بھی دو چار قدم آگے بڑھ کر لکھتے ہیں:

"قوم انسان اور نوع انسان کے لئے لازمی کڑی ہے۔"

قومیت کے عناصر | قومیت کا بنیادی تصور جذبۂ اشتراک سے پیدا ہوتا ہے، یعنی یہ کہ کچھ مشترک مفاد یا مصالح کے تحت کچھ لوگ ایک گروہ بن کر رہیں، اور مشترکہ مصالح اور مفاد میں ایک دوسرے کا تعاون کریں۔ ان کی یہ اجتماعیت ان کے بہت سے کاموں کو آسان بنادیتی ہے۔ قومیت کا یہ سادہ تصور قابل اعتراض نہیں ہے، اور نہ اس میں کوئی خرابی ہے، لیکن قومیت کا یہ سادہ اور معصوم تصور اس وقت داغدار ہو جاتا ہے جب اس میں اپنے گروہ یا اپنی قوم کے لئے عصبیت پیدا ہونے لگتی ہے۔

اب یہ عصبیت جتنی بڑھتی جاتی ہے، اتنی دوسرے گروہ یا دوسرے طرح کے افراد کی اجتماعیت سے بیگانگی پیدا ہونے لگتی ہے، یہاں تک کہ یہی قومی عصبیت حق و ناحق کا معیار بن جاتی ہے، جو اس کی قوم کرے گی، اس کا ہر فرد اسے صحیح سمجھے گا۔ اور جو دوسری قوم کرے گی وہ غلط ہوگا۔

جس اشتراک اور اتحاد سے کوئی قومیت وجود میں آتی ہے، اس کی بے شمار صورتیں ہیں، مگر عام طور پر قدیم زمانہ سے موجودہ دور تک جن عناصر سے قومیت کی تعمیر ہوتی ہے، ان میں اسلامی قومیت کے علاوہ سب میں یہ چیزیں مشترک ہوگئی ہیں، (۱) اشتراک نسل (۲) اشتراک وطن، (۳) اشتراک زبان، (۴) اشتراک رنگ (۵) پیشہ یا معاشی اغراض کا اشتراک۔

قدیم زمانہ سے اس تہذیب جدید کے دور تک آپ اگر قومیت کے بنیادی عناصر کو تلاش کریں گے تو ان میں انہی عناصر میں سے کوئی نہ کوئی عنصر اس کا محرک دکھائی دے گا، اگر اس سے پہلے آریت او صامیت نے انسان کو کئی حصوں میں بانٹا تھا، تو اس کے بطن سے پھر یونانیت، رومیت، اسرائیلیت اور ایرانیت پیدا ہوئی، اور آج اس نے انسان کو اس طرح سیکڑوں، ہزاروں خانوں میں بانٹ دیا ہے، یہ دور جسے بین الاقوامی دور کہا جاتا ہے، اور جس کے اندر یو۔ این۔ او جیسا ادارہ قائم ہے اس میں بھی یہ عصبیت ہی اس کی ناکامی کا سبب بنی ہوئی ہے۔

عصبیت جاہلہ | اوپر اشتراک کی جن صورتوں کی بنا پر قومیت کی تعمیر کا ذکر کیا گیا ہے، اس قسم کی قومیت کا فطری تقاضا ہے کہ وہ انسان میں جاہلانہ عصبیت پیدا کرے، وہ ایک قوم کو دوسری قوم سے مخالفت اور نفرت برتنے پر صرف اس لئے آمادہ کرتی ہے، کہ وہ دوسری قوم کیوں ہے؟ اسے حق، دیانت، صداقت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، صرف یہ بات کہ ایک شخص کالا ہے، گورے کی نظر میں اسے حقیر بنا دیتی ہے، صرف اتنی سی بات کہ ایک انسان ایشیائی ہے، فرنگی کی نفرتوں اور جابرانہ درازدستیوں اور حق تلفیوں کو اس کے لئے وقف کر دیتی ہے، آئن سٹائن جیسے فاضل کا اسرائیلی ہونا اس کے لئے کافی ہے کہ جرمن اس سے نفرت کرے، تشکیدی[1] کا محض سیاہ فام حبشی ہونا اس کو جائز

---

[1] بیچوانا لینڈ کے بامنگ واٹو قبیلہ کا سردار ہے، جس کو چند سال پہلے ایک یورپین پر سزائے تازیانہ جاری کرنے کے جرم میں سلطنت برطانیہ نے حقوق ریاست سے محروم کر دیا تھا، حالانکہ دیسی باشندوں کے ساتھ اس فرنگی شخص کے افسوسناک برتاؤ کا خود برٹش ہائی کمشنر کو بھی اعتراف تھا، بعد میں غریب تشکیدی کو ریاست

کر دیتا ہے کہ یوربین کو سزا دینے کے جرم میں اس کی ریاست چھین لی جائے، امریکہ کے مہذب باشندوں کے لئے یہ قطعاً جائز ہے کہ وہ حبشیوں کو پکڑ کر زندہ جلا دیں، کیونکہ وہ حبشی ہیں۔ جرمن کا جرمن ہونا اور فرانسیسی کا فرانسیسی ہونا اس بات کے لئے کافی ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے نفرت کریں۔ اور دونوں کو ایک دوسرے کے محاسن یکسر معائب نظر آئیں۔ سرحد کے آزاد افغانیوں کا افغان ہونا اور دمشق کے باشندوں کا عرب ہونا، انگریز اور فرانسیسی کو پورا حق بخشتا ہے کہ وہ ان کے سروں پر طیاروں سے بم برسائیں، اور ان کی آبادیوں کا قتل عام کریں، خواہ یورپ کے مہذب شہریوں پر اس قسم کی گولہ باری کتنی ہی وحشیانہ حرکت سمجھی جاتی ہو۔ آج ہمارے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات اسی ذہنیت کا نتیجہ ہیں، اسوقت آسامی اور غیر آسامی کا مسئلہ لے کر آسامیوں نے غیر آسامیوں کا جس طرح قتل عام کیا ہے وہ اس کی تازہ مثال ہے۔ اور اب اس نے فرقہ وارانہ رنگ اختیار کرلیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں ہزاروں مسلمان قتل کر دیئے گئے۔ اسی طرح نہ جانے کتنے جنسی، وطنی اور لسانی مسئلے ہمارے ملک میں سر اٹھا رہے ہیں۔ یہ سب اسی قومی عصبیت جاہلیہ کی پیداوار ہیں۔

غرض یہ جنسی یا وطنی اور لسانی امتیاز وہ چیز ہے جو انسان کو حق اور انصاف کی طرف سے اندھا بنا دیتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے عالمگیر اصول اخلاق و شرافت بھی قومیتوں کے قالب میں ڈھل کر کہیں ظلم اور کہیں عدل، کہیں سچ اور کہیں جھوٹ، کہیں کمینگی اور کہیں شرافت بن جاتے ہیں۔

کیا انسان کے لئے اس سے زیادہ غیر معقول ذہنیت اور کوئی ہو سکتی ہے کہ وہ نالائق، بدکار اور شریر آدمی کو ایک لائق، صالح اور نیک نفس آدمی پر صرف اس لئے ترجیح دے کہ پہلا ایک نسل میں پیدا ہوا ہے۔ اور دوسرا کسی اور نسل میں؟ پہلا سفید ہے اور دوسرا سیاہ؟ پہلا ایک پہاڑ کے مغرب میں پیدا ہوا ہے، اور دوسرا اس کے مشرق میں؟ پہلا ایک زبان بولتا ہے، اور دوسرا کوئی اور زبان؟ پہلا ایک سلطنت کی رعایا ہے۔ اور دوسرا کسی اور سلطنت کی؟ کیا جلد کے رنگ کو روح کی

بقیہ حاشیہ گذشتہ :- صرف اس وقت بحال کیا گیا جب کہ اس نے ہمیشہ کے لئے عہد کرلیا کہ وہ کبھی کسی ایسے مقدمہ کا فیصلہ نہ کرے گا، جس کا تعلق کسی یوربین سے ہو، مگر ایسی کوئی شرط اس عہد نامہ میں نہیں رکھی گئی کہ یوربین حضرات بھی دیسی باشندوں کی جان و مال اور عزت و آبرو سے تعرض نہ فرمائیں گے۔

۱ مسئلہ قومیت صفحہ ۱۲-۱۳)

صفائی و کدورت میں بھی کوئی دخل ہے؟ کیا کوئی صحیح الدماغ انسان یہ تسلیم کر سکتا ہے کہ مشرق میں جو چیز حق ہو وہ مغرب میں باطل ہو جائے؟ کیا کسی قلب سلیم میں اس چیز کے تصور کی گنجائش نکل سکتی ہے کہ نیکی، شرافت اور جوہر انسانیت کو رگوں کے خون، زبان کی بولی، مولد و مسکن کے خاک کے معیار پر جانچا جائے؟ یقیناً عقل ان سوالات کا جواب نفی میں دے گی، مگر نسلیت، وطنیت اور اس کے بہن بھائی نہایت بے باکی کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہاں ایسا ہی ہے۔ راقم کے خیال میں دنیا کے موجودہ قومی و وطنی جذبہ کے ساتھ جو بین الاقوامیت قائم ہوگی، وہ نہ تو بے لاگ انصاف کر سکے گی، اور نہ وہ زیادہ دیر تک اپنا وجود ہی قائم رکھ سکے گی، بلکہ یہ بین الاقوامیت چھوٹی چھوٹی مملکتوں اور کمزور طاقتوں کے لئے ایک اجتماعی ظلم کا پیش خیمہ بن سکتی ہے، بلکہ بن رہی ہے، جب تک قوموں کے درمیان کوئی بے غرض مشترک اخلاقی جذبہ اور روحانی تصور حیات کی کارفرمائی نہ ہو، اس وقت تک ان کے اشتراک اور بین الاقوامیت کی مثال ایسی ہی ہے، جیسے کسی بڑے سیلاب کی زد سے بچنے کیلئے انسان، حیوان، درندے اور سانپ بچھو تک کسی درخت یا ٹیلہ پر پناہ لینے کے لئے اکٹھا ہو جائیں اور جب تک اس کا خوف باقی رہے، سب ایک دوسرے کے لئے بے ضرر بنے رہیں لیکن جوں ہی سیلاب کا زور گھٹنا اور اس کا خوف دور ہونا شروع ہو، ایک دوسرے کے کاٹ کھانے کی فکر میں لگ جائیں۔ اوپر جو مثالیں دی گئی ہیں۔ ان کی روشنی میں آپ غور کیجئے، تو یہ کوئی نرا آفاقی نظریہ نہیں معلوم ہوگا، بلکہ ایک حقیقت اور عینی مشاہدہ معلوم ہوگا۔ علامہ اقبال نے وطنی جذبۂ قومیت کے بارے میں بالکل صحیح کہا ہے:

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے ؛ تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے ؛ کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

فارسی میں انہوں نے اسے اور زیادہ وضاحت سے بیان کیا ہے:

از فریب عصر نو ہشیار باش ؛ رہ فتد اے راہ رو ہشیار باش
آں چناں قطع اخوت کردہ اند ؛ بر وطن تعمیر ملت کردہ اند
تا وطن را شمع محفل ساختند ؛ نوع انساں را قبائل ساختند
مردمی اندر جہاں افسانہ شد ؛ آدمی از آدمی بیگانہ شد

روح از تن رفت و ہفت اندام ماند ؛ آدمیت گم شد و اقوام ماند

عقل وضمیر کا اشتراک | دوسرا ستون جس پر بین الاقوامیت کی فلک بوس عمارت کھڑی کی گئی ہے، وہ عقل و ضمیر کا اشتراک ہے، یو۔ این۔ او کی طرف سے جو انسانی حقوق کا عالمی منشور (Universal Declaration of Human Rights) دسمبر ۱۹۴۸ء کو شائع کیا گیا۔ اس کی پہلی دفعہ میں کہا گیا ہے :

"تمام انسان آزاد اور حقوق و عزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں، انہیں ضمیر و عقل دی گئی ہے، اس لئے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارہ کا سلوک کرنا چاہیے۔"

اس دفعہ میں ضمیر و عقل کے اشتراک کو انسانی بھائی چارہ کا سبب اور اساس قرار دیا گیا ہے، کیا واقعی محض عقل و ضمیر کا اشتراک ہی ایک انسان کو دوسرے انسان کیساتھ بھائی چارہ پر ابھار سکتا ہے۔ ایک قوم میں دوسری قوم کے ساتھ مساویانہ سلوک کرنے کی ترغیب پیدا کر سکتا ہے۔ اور اگر کسی فرد کے خلاف یا کسی قوم سے دوسری قوم کے خلاف انسانی بھائی چارہ کے خلاف کوئی عمل یا قول سرزد ہو جائے تو کیا یہ اشتراک اس کے دل میں شرمندگی اور تلافی کے جذبہ کو بھی نشوونما دے سکتا ہے۔

عاجز کے خیال میں اگر عقل و ضمیر کے پیچھے کوئی اخلاقی محرک نہ ہو تو اس کا نرا اشتراک کوئی پائدار اور ہمہ گیر بھائی چارہ اور مساوات کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ بلکہ اس سے مساوات اور بھائی چارہ کے بجائے تفوق و برتری کا جذبہ ابھرے گا، کیونکہ احساس، وجدان اور علم و فہم کے لحاظ سے ہر انسان کی عقل اور ضمیر میں کچھ نہ کچھ تفاوت ہوتا ہے۔ اور یہ تفاوت لامحالہ زیادہ فہم و ادراک رکھنے والے افراد یا قوم کو تفوق و برتری پر ابھارے گا، کیا واقعی انسانی حقوق کی ضمانت دینے والوں نے ایک دن بھی اپنی بنائی ہوئی دفعہ کے پیش نظر پوری دنیا کو حقوق و عزت کے اعتبار سے برابر سمجھا۔ اور ان کی آزادی اپنی آزادی تصور کیا۔ کیا عقل و ضمیر کے اشتراک کا تقاضا یہی ہے کہ دس سال تک چین کو یو۔ این۔ او کا ممبر نہ بنایا جائے۔

---

[1] یہ مضمون ۱۹۵۹ء میں لکھا گیا تھا، اب چین ۱۹۷۱ء میں جا کر اسکا ممبر بن سکا ہے۔

کیا انسانی بھائی چارہ کا یہی تقاضا ہے، کہ پانچ بڑی طاقتوں کو مستقلاً ویٹو پاور دے دیا جائے کیا جمہوریہ چین، جاپان، ہندوستان اور جرمنی حقوق و عزت کے اعتبار سے برابر نہیں پیدا کئے گئے ہیں، کیا ان کے پاس عقل و ضمیر نہیں ہے؟ کیوں ان کو ہمیشہ کے لئے ویٹو سے محروم کر دیا گیا؟ کیا لیٹل راک برطانیہ اور افریقہ کے ریڈ انڈینس اور سیاہ فاموں کے پاس عقل و ضمیر نہیں ہے؟ کیا الجزائر[له] کے باشندے اور مشرقی یورپ کی جمہوریتیں ہنگری، بلغاریہ، پولینڈ وغیرہ کے باشندے آزاد نہیں پیدا ہوئے ہیں۔ کیا ان کو اپنے مستقبل کے بارے میں ایک نقطۂ نظر کے علاوہ کسی دوسرے نقطۂ نظر سے فیصلہ کرنے کے حق سے محروم نہیں کر دیا گیا ہے۔ غرض یہ کہ جب تک عقل و ضمیر کے پیچھے کوئی بلند اور بے غرض اخلاقی جذبہ نہ ہوگا، اس وقت تک فکر انسانی پر اعتماد کر کے جو تعمیر بھی اٹھائی جائے گی، وہ کبھی پائدار نہیں ہو سکتی، حکیم مشرق نے صحیح کہا ہے:

فکرِ انساں بت پرستے بت گرے ٭ ہر زماں در جستجوے پیکرے

ترجمہ: فکر انسانی بت پرست بھی ہے اور بت گر بھی ٭ ہر زمانہ میں وہ ایک نیا بت تراش لیتی ہے

باز طرحِ آذری انداخت است ٭ تازہ تر پروردگارے ساخت است

" اس نے اس زمانہ میں ایک نئی آذری کی ہے ٭ اور ایک تازہ بت قومیت و وطنیت کا تراش لیا ہے

آدمیت گشتہ شد چوں گوسفند ٭ پیشِ پائے ایں بتِ ناارجمند

" آدمیت کو اس فکر انسانی نے اسی طرح ذبح کر ڈالا ہے جس طرح بت کے سامنے بھیڑ بکری بھینٹ چڑھائی جاتی ہے"

پنڈت جواہر لال نہرو جیسا مادیت پسند آدمی بھی یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ:

"عقلیت پسندی اپنی تمام خوبیوں کے باوجود کسی نہ کسی وجہ سے صرف چیزوں کی سطح کو دیکھتی معلوم ہوتی ہے۔ اور اندر کی اصل چیز نہیں دیکھ پاتی" (تقریر، اکتوبر ۱۹۵۸ء)

غرض یہ عقل و ضمیر کا محض اشتراک کوئی ایسا قابل اعتماد اور مؤثر محرک نہیں ہے، کہ ایک نسل و وطن کا انسان لامحالہ تمام انسانوں کو حقوق و عزت کے اعتبار سے برابر ہی سمجھے،

اسلام کا نقطۂ نظر | اسلام جس طرح زندگی کے ہر معاملہ میں مثبت اور منفی دونوں طرح کے

له اس وقت یعنی ۱۹۵۸ء میں الجزائر اپنی جنگ آزادی کے لئے فرانس سے نبرد آزما تھا، اور ہنگری میں روسی فوجیں وہاں کے باشندوں کو روند رہی تھیں۔

اصول و تصورات دے کر ایک اعتدال قائم رکھتا ہے، اسی طرح بین الاقوامیت کے سلسلہ میں بھی اس نے دونوں طرح کے اصول و تصورات دیئے ہیں۔ لیکن ان اصول و تصورات کی تفصیل سے پہلے دو ضروری باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں، ایک یہ کہ اسلام کے بین الاقوامی تصورات کی بنیاد نہ تو محض چند مشترک مادی اغراض پر ہے، اور نہ ہنگامی اور عارضی حالات نے انہیں جنم دیا ہے، اور نہ اس میں کسی خاص گروہ یا قوم ہی کی سیاسی یا معاشی بہبود پوشیدہ ہے۔ بلکہ اس کے واضع یعنی خدائے قدوس نے اس کی نظرت اور ساخت ہی ایسی بنائی ہے، کہ وہ ہر انسان میں" زندہ رہنے اور زندہ رہنے دینے" کے جذبہ کو ابھارتا ہے۔ وہ زمان و مکان کے قیود سے آزاد ہے، وہ ایک ایسا خالص پاکیزہ تصور ہے جو انسان کو ایک رشتۂ وحدت میں پرو سکتا ہے، خواہ وہ کسی ملک، کسی قوم اور کسی نسل کا فرد ہو، اس کے دیئے ہوئے عقائد، نظام اخلاق، نظام معیشت، نظام سیاست سب کا مزاج آفاقی اور بین الاقوامی ہے۔

دوسری بات یہ کہ زندگی کے خارج میں کوئی انقلاب اس وقت تک رونما نہیں ہو سکتا، جب تک خود اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ پیدا ہو چکا ہو۔ کوئی نئی دنیا خارجی شکل اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسان کے قلب و ضمیر میں متشکل نہ ہو جائے۔ اس لئے اسلام خارج سے پہلے انسان کے داخل میں انقلاب پیدا کرتا ہے، اور اسی کے سہارے پھر خارج کو درست کرتا ہے۔

انہی دونوں خصوصیتوں کے پیش نظر اسلام انسان کی داخلی تعمیر کے لئے ایک خاص تصور کائنات، نظریۂ زندگی، اور خلافت آدم کا آفاقی تصور دیتا ہے، اور پھر اسی تصور کی بنیاد پر اس کے بین الاقوامیت کے کچھ قانونی اور خارجی اصول دیتا ہے۔

اسلام کا تصور کائنات اور اس میں انسان کی حیثیت

اسلام کا کائناتی تصور یہ ہے کہ یہ پوری کائنات اپنے پورے مربوط نظام کے ساتھ ایک خدا کی پیدا کی ہوئی ہے، اور جس طرح وہ اس کا خالق ہے، اسی طرح اس کا مالک، حاکم اور رب بھی ہے، یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں پوری کائنات کا ایک چھوٹا سا حصہ اور جز ہے، جو کائنات کے دوسرے حصوں سے اسی طرح مربوط ہے جس طرح انسانی جسم کے اعضاء آپس میں مربوط ہیں۔ پوری کائنات جس طرح خدا کی محکوم اور مخلوق ہے۔ اسی طرح انسان جو اس کائنات کا سب سے مؤثر عنصر ہے، اس کا محکوم اور مخلوق ہے، خلق و ام

جو تعلق خدا کو پوری کائنات سے ہے، وہی تعلق اس زمین کے بسنے والوں سے ہے۔

وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ

زمین و آسمان میں جو بھی ہیں، چار و ناچار اسی کے مطیع ہیں، اور اسی کی طرف سب کو لوٹنا ہے۔

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ

اسی نے پیدا کیا ہے، اور وہی اسے چلا رہا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

تمام تعریف خدا کے لئے ہے۔ جو تمام کائنات کا پروردگار ہے۔

جس طرح یہ پوری کائنات اور اس کے کروروں، اربوں ستارے اور سیارے اپنے خالق کے نظام اطاعت میں جکڑے ہوئے ہیں، اسی طرح یہ انسان بھی چار و ناچار تکوینی اعتبار سے اسی نظام اطاعت میں جکڑا ہوا ہے، جس طرح زمین، چاند، سورج، اپنی تخلیق، حرکت، اور طلوع و غروب میں ایک کائناتی قانون کے پابند ہیں، اسی طرح انسان بھی اپنی زندگی اور موت، فطری قوتوں اور صلاحیتوں میں اس کے قانون تکوینی کا پابند ہے، خدا نے انسان کامل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں پہلے ہی دن یہ بات اتار دی کہ:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۞

(علق)

پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے کائنات کی تخلیق کی، اس نے انسان کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا، یاد رکھو تمہارے رب کریم نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا، اور انسان جو کچھ نہیں جانتا تھا، اس نے وہ سب اسے سکھایا۔

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ

اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا ہے۔

پھر اس تصور کے ساتھ اسلام انسان کے قلب و ضمیر میں یہ تصور بٹھاتا ہے، کہ نہ تو یہ پوری کائنات کی تخلیق اور اس کا پورا نظام بخت و اتفاق کا نتیجہ ہے، اور نہ انسان کی تخلیق کسی بے جان مادے کے ارتقا سے وجود پذیر ہوگئی ہے، بلکہ پوری کائنات کو ایک علیم و خبیر ذات نے پیدا کیا ہے، اور وہی اس کو چلا رہا ہے، اور جب چاہے گا، وہ اسے فنا کر دے گا، اور فنا کر دینے کے بعد پھر ایک دوسری دنیا آباد کرے گا، جس میں وہ عقل و ہوش رکھنے والے ہر ہر فرد سے اس کے اعمال کے بارے میں پوچھ گچھ کریگا۔

خلافت آدم کا تصور پہلے تصور کو ہم توحید اور دوسرے تصور کو آخرت کہتے ہیں، ان دونوں تصورات کے بعد اسلام خلافت آدم کا تصور انسان کے ذہن نشین کرتا ہے۔ اس کارخانۂ قدرت میں سب سے مؤثر محترم اور فعّال عنصر انسان ہے، اسی کو عقل، ادراک اور ارادہ و اختیار کی دولت ملی ہے۔ اس عالم امکان کے سارے ہنگامے، تو بہ تو حسن آفرینیاں اور جہان رنگ و بو کے سارے نقش و نگار اسی کے وجود کے کرشمے ہیں۔ اور یہ تاثیر اور تخلیقی قوت اور صلاحیت اس کے اندر اس کے خالق نے رکھ دی ہے

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ۝

ہم نے نوع انسانی کو معزز و مکرم بنایا، خشکی و تری میں پھرایا، اور ان کو اچھا رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت دی

(بنی اسرائیل ۴)

صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ اس نے پوری کائنات کو نوع انسان کے لئے خوان یغما بنا دیا ہے، وہ اپنی صلاحیت سے چاہے تو دریاؤں کو اپنے قابو میں لائے، سورج کی تمازت سے دہکتے ہوئے دشت وصحرا کو چاہے تو گل و لالہ میں تبدیل کر دے، چاہے تو سمندروں کو مسخر کرے، اور چاہے تو عناصر کی ترتیب سے نئے نئے انکشافات کرے۔ اور چاہے تو ہواؤں، فضاؤں اور سیاروں پر حکمرانی کرے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَآتَاكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا

(ابراہیم)

اور اس نے تمہارے لئے کشتیاں مسخر کیں، تاکہ اس کے حکم سے وہ سمندر میں رواں دواں ہو، اور تمہارے لئے دریاؤں کو مسخر کیا، اور سورج و چاند کو اس نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے، جو سرگرم عمل ہیں، اس نے دن رات کو تمہارے کام میں لگا دیا ہے، جو کچھ تم نے اس سے مانگا وہ اس نے تمہیں دیا، اگر تم اس کی نعمتوں کا شمار کرو تو ان کو گن نہ سکو گے۔

انسان کی یہی حیثیت اس کو خلافت الٰہی کا مستحق قرار دیتی ہے، اسلام کہتا ہے کہ انسان کی پیدائش اسی ذمہ داری کی ادائیگی کے لئے کی گئی ہے، یہ کوئی دو چار صدی کا نہیں، بلکہ اتنا ہی

پرانا منصب ہے، جتنا خود انسان۔ پہلے انسان کی تخلیق کے وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (بقرہ) میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔

خلافت الٰہی کا مطلب یہ ہے، کہ خالق کائنات نے انسان کو اپنے ارادہ واختیار اور قوائے علم وعمل سے کام لے کر کائنات میں پورے طور پر تصرف واستفادہ کرنے کی جو اجازت دی ہے۔ یہ تصرف واستفادہ آزادانہ نہیں، بلکہ محکومانہ ونائبانہ ہونا چاہئے۔ اگر وہ استفادہ وتصرف میں آزادانہ روی اختیار کرے گا، تو وہ اپنے مرتبۂ انسانیت سے نیچے گر جائے گا، اور وہ خدا کے یہاں سزا پائے گا،

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَہُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ۔ (والتین)

ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا پھر ہم نے اس کو بہت نیچے گرا دیا، مگر جو لوگ ایمان لائے، اور عمل صالح کئے۔ ان کے لئے بے حساب اجر ہے۔

خدا نے پہلے انسان کی تخلیق خلافت ونبوت کی ذمہ داری کے ساتھ کی تھی، اس لئے انسان کے ہر ہر فرد کو چاہئے کہ وہ اس دنیا میں خلافت الٰہی کا فرض ایک فرض شناس کی طرح انجام دیئے، وہ اس کائنات میں خدا بن کر نہیں بلکہ نائب خدا بن کر تصرف کرے، وہ صفات الٰہی کا مظہر بن کر کائنات ارضی کا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لے۔ اس کو تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ کا حکم دیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اس کائنات کے خالق کی نظر جہاں ہست وبود کی پہنائیوں سے بھی زیادہ وسیع ہے، اسی طرح انسان کے قلب ونظر میں وسعت وہمہ گیری ہونی چاہئے۔ جس طرح اس کے رحم وکرم کا فیضان ساری مخلوقات کے لئے عام ہے، اسی طرح اس کے دل میں بھی یہی ہمہ گیر جذبۂ رحم وکرم موجزن ہونا چاہئے۔ اس کا خوان ربوبیت ایک ایسا خوان یغما ہے، جسے وہ اپنے نافرمانوں پر بھی بند نہیں کرتا، انسان کو بھی اپنے اندر ربوبیت عامہ کا یہی جذبہ ابھارنا چاہئے۔ وہ سب کو دیتا ہے، مگر خود کسی سے کچھ نہیں چاہتا، یہی بے نیازی اور بے غرض جذبہ انسان کو اپنے دل کی گہرائیوں میں پیدا کرنا چاہئے، ساری مخلوق خدا کی عیال ہے۔ اس کے ایک ایک فرد سے اس کو محبت ہے۔ اس لئے ایک انسان کو ایک انسان اور دوسری عام مخلوق کے ساتھ وہی برتاؤ کرنا چاہئے، جو اپنے بال بچوں کے لئے وہ پسند

کرتا ہے۔ وہ عادل ہے، اس لئے عدل و انصاف قائم رکھنے کے لئے اسے کبھی سختی بھی کرنی پڑتی ہے۔ انسان کو بھی عدل و انصاف کا منصب ملا ہے۔ اس لئے وہ بھی عدل و انصاف کے وقت، عدل و انصاف کے قائم کرنے کے لئے قوت کا استعمال کر سکتا ہے۔

نائب حق در جہاں بودن خوش است ؛ بر عناصر حکمراں بودن خوش است
نائب حق ہمچو جان عالم است ؛ ہستی او ظل اسم اعظم است
ذات او توجیہ ذات عالم است ؛ از جلال او نجات عالم است

انسان کا یہ منصب اس کی مسئولیت کا سبب بھی ہے، یعنی اگر وہ نیابت الٰہی کے فریضہ کی انجام دہی میں قصداً کوئی غلطی یا آزادہ روی اختیار کرے گا، تو اس کے ہر ہر فرد سے الگ الگ خالق کائنات باز پرس کرے گا، کیونکہ ارادہ و اختیار کے ساتھ کسی کی نیابت خود بخود مسئولیت کی متقاضی ہوتی ہے۔

رسالت و کتاب کا تصور | انسان چونکہ ارادہ و اختیار، عقل و ادراک اور جذبات و خواہشات سے مرکب ہے، اس لئے اس بات کا ہر وقت امکان رہتا ہے، کہ وہ نیابت و امانت کی اس ذمہ داری کو فراموش کر جائے، اور اپنے ارادہ و اختیار پر مغرور ہو کر یا جذبات و خواہشات میں گرفتار ہو کر وہ نائب حق بن کر کام کرنے کے بجائے خود مالک کل بن بیٹھے، اور خود خدائی کا دعویٰ کرنے لگے۔ اس کو اس غلط روی سے بچانے اور اسے صراط مستقیم پر قائم رکھنے کے لئے خدا کی طرف سے انبیاء کی بعثت اور نزول کتاب کا سلسلہ جاری کیا گیا، جو اسلامی عقیدہ کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآن کے نزول کے بعد ختم ہو گیا، جس طرح خدا کی خدائی کسی ایک قوم، کسی ایک گروہ، یا کسی ایک نسل کے لئے مخصوص نہیں ہے، اور جس طرح خدا کی نیابت و خلافت کسی طبقہ یا گروہ کے لئے مخصوص نہیں ہے، اسی طرح اس کے رسول کی بعثت اور نزول کتاب بھی تمام نوع انسانی کا مشترک سرمایہ ہے، جس طرح خدا کی ساری مادی نعمتیں ہر فرد کے لئے عام ہیں، اسی طرح یہ روحانی نعمت بھی تمام مخلوق کے لئے عام ہے۔ نبی کریم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ — ہم نے تم کو تمام عالم کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ — ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لئے انجام

بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۝ — سے باخبر کرنے والا اور خوشخبری دینے والا بنا کر بھیجا

خود قرآن اپنے بارے میں یہ اعلان کرتا ہے کہ

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ — یہ کتاب الٰہی تمام عالم کے لئے نصیحت ہے

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۝ — پاک ہے وہ ذات جس نے حق و باطل میں فرق کرنے والا قرآن اپنے بندہ پر اتارا تاکہ وہ تمام انسانوں کو انجام بد سے ڈرائے۔

دحی حق ببینندہٗ سود ہمہ
حق کا پیغام سب کا فائدہ دیکھتا ہے
درنگاہش سود و بہبود ہمہ
اس کے پیش نظر ہر شخص کا فائدہ ہوتا ہے

ان تصورات کا اثر زندگی پر — اسلام کے بین الاقوامی اصول و تصورات کی اخلاقی و قانونی بنیاد ان ہی مذکورہ بالا فطری اور آفاقی حقائق پر ہے۔ انہی آفاقی تصورات کی بنیاد پر اسلام کی بین الاقوامیت کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ لوگ یہ سوچیں کہ یہ چند جامد تصورات رواں دواں عملی زندگی میں کیا اثر پیدا کر سکتے ہیں۔ اور ان کے ذریعہ موجودہ قومی و نسلی فضا میں کیا انقلاب رونما ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کا یہ سوچنا نہ تو حقیقت کے اعتبار سے صحیح ہوگا، اور نہ تاریخی شہادت کے لحاظ سے۔

جو لوگ انسانی زندگی کی ساخت اس کی حقیقت اور اس کی فطری اثر پذیری پر غور کرتے ہیں وہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ کہ انسان اپنے دور وحشت سے لے کر موجودہ صدی تک ہر زمانہ میں اخلاقی و روحانی تصورات سے جتنا متأثر ہوا ہے، اتنا کسی دوسرے تصورات سے متأثر نہیں ہوا ہے، اس کے داخل و خارج میں جتنا پائدار انقلاب ان تصورات کے ذریعہ برپا ہوا ہے۔ اس سے زیادہ انقلاب کسی دوسرے تصور سے نہیں پیدا ہوا ہے۔ اور نہ ان تصورات سے زیادہ کسی دوسرے تصور نے اس کو سکون و اطمینان دیا ہے، موجودہ دور کے بعض بڑے بڑے سوشلسٹ اور مادیت پسند زعماء بھی اب اس حقیقت کے ماننے پر مجبور ہوتے جا رہے ہیں، خاص طور پر میں اس سلسلہ میں

.... ملک کے ممتاز لیڈر مسٹر جے پرکاش نارائن اور جواہر لال آنجہانی کا نام لیتا ہوں، آج سے چند برس پہلے مسٹر جے پرکاش نارائن اخلاق و روحانیت کا مذاق اڑاتے تھے۔ آزادی کے بعد جب عملی زندگی سے سابقہ پڑا تو اس کی کشاکش نے ان کو اخلاق و روحانیت کا پرچارک اور سب سے بڑا حامی بنا دیا۔ اخباروں میں پنڈت جواہر لال نہرو کی ایک تحریر آج سے پچیس برس پہلے ان کی زندگی میں شائع ہو چکی ہے، جس کا عنوان تھا "بنیادی نقطۂ نظر" یا بنیادی رویہ۔ اس میں انہوں نے صاف صاف اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "میدان طبعیات کا فاتح خود اپنے نفس پر قابو پانے پر قاصر ہے"۔ پھر کہتے ہیں کہ:

"اگر ہم واقعی اپنی زندگی کے ہر شعبے میں اور ہر جگہ جاری و ساری رہنے والے تصورات پر یقین کریں تو اس سے ہم کو نسل، ذات اور طبقہ کی تنگ نظری سے چھٹکارا پانے میں مدد ملے گی، اور ہم زیادہ رواداری اور زندگی کے مسائل میں سمجھ داری سے کام لینے کے قابل ہو سکیں گے"۔

اہل مغرب میں بھی ایسے لوگوں کی ایک بڑی تعداد پیدا ہو گئی ہے، جو یہ سمجھنے لگے ہیں، کہ جب تک افراد میں کوئی اندرونی انقلاب نہیں ہوگا، اس وقت تک بین الاقوامیت بار آور نہیں ہو سکتی خاص طور پر اس سلسلہ میں سی، ای، ام جوڈ، یہودی فلسفی اسکاٹ، سموئیل جیمبس اور مسٹر ٹائن بی، کے نام قابل ذکر ہیں۔

اور آپ اگر دنیا کی مذہبی و روحانی تاریخ اور خاص طور پر اسلامی انقلاب کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے، تو آپ کو یقین ہو جائے گا۔ کہ ان تصورات نے قوم و وطن اور رنگ و نسل کی عصبیت سے انسانوں کو واقعی نجات دینے میں کتنی زیادہ مدد کی ہے۔ اور موجودہ دور میں اس سے نجات پانے کا جو جذبہ بھی دنیا میں پایا جاتا ہے، وہ اسی انقلاب کا رہین منت ہے۔ یہ موضوع ایک طویل بحث چاہتا ہے، اس لئے ہم اسے اس وقت نظر انداز کرتے ہیں۔

بہر حال اسلام پہلے ان ہی آفاقی تصورات کو انسان کے قلب و ضمیر میں اتارتا ہے، اور پھر اس کے ذریعہ ایک عالمگیر بھائی چارے کی فضا قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور اس کے لئے وہ بے شمار اخلاقی و قانونی ہدایتیں دیتا ہے۔

اسلام کے نزدیک بھائی چارہ کی مشترک بنیاد خون کا رشتہ ہے	اسلام محض عقل وضمیر کے اشتراک پر انسانی بھائی چارہ کی بنیاد استوار نہیں کرتا، بلکہ وہ پہلے مذکورہ بالا تصورات ذہن نشین کراتا ہے، او

پھر وہ اس مادی دنیا میں بھائی چارہ کی بنیاد رشتۂ خون پر رکھتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ سارے انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، ان میں ایک ہی ماں باپ کا خون رواں دواں ہے ۔ جس طرح ایک ماں باپ کے لڑکے بھی مختلف رنگ وروپ، مختلف قوت وصلاحیت اور مختلف عقل وضمیر کے ہوتے ہیں، اسی طرح دنیا کے انسانوں میں رنگ ونسل اور قوت وصلاحیت کا اختلاف ہے ۔ لیکن بہرحال ان سب میں خواہ کالے ہوں، یا گورے، عربی ہوں یا عجمی، یوروپین ہوں یا امریکن، ہندی ہوں یا جاپانی، ایک ہی باپ اور ایک ہی ماں کا خون دوڑ رہا ہے ۔ اس لئے جس طرح ایک ماں باپ کے بیٹے اختلاف صورت وسیرت کے باوجود حقوق میں برابر ہوتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ مساویانہ سلوک کرتے ہیں، چھوٹے چھوٹے اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کے شادی وغم میں شریک ہوتے ہیں، اسی طرح دنیا کے تمام انسانوں کو فرداً فرداً بھی اور اجتماعی طور پر بھی ایسا ہی بننے کی کوشش کرنا چاہیئے ۔ قرآن نے اس حقیقت کو بار بار تمام انسانوں کو اور خاص طور پر اپنے ماننے والوں کے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کی ہے ۔

طرح وہ ایک خدا کی مخلوق ہیں ۔ اسی طرح وہ ایک

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا (حجرات)	اے لوگو تم کو ہم نے ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ۔ـــــــــــــ
يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً (نساء)	اے لوگو! اپنے اس رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا، اور پھر اسی سے اس کی بیوی کو پیدا کیا، پھر دونوں کے ذریعہ بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا ۔
وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ	اس کی نشانیوں میں زبان اور رنگ کا اختلاف ہے اسمیں عقل والوں کیلئے بہت نشانیاں ہیں

قرآن نے بارہا اس حقیقت کو ذہن نشین کرایا ہے کہ قبیلوں، قوموں یا زبانوں کا اختلاف ایک تعارف کا ذریعہ اور خدا کی قدرت کی ایک نشانی ہے۔ ورنہ احترام انسانیت کے اعتبار سے سب ایک ہیں۔ اور مادی حقوق کے اعتبار سے ان میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔

اس کی مزید تفصیل آپ کو ارشادات نبوی میں ملے گی، آپ نے بار بار اعلان فرمایا کہ:

الناس کلھم من آدم و آدم من تراب (ابوداؤد، ترمذی)	تمام انسان آدم کی اولاد ہیں، اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

اس تصور کو مزید مؤثر بنانے کے لئے آپ نے فرمایا کہ اس بھائی چارہ کی وجہ صرف یہی نہیں کہ وہ ایک ماں باپ کی اولاد ہیں، بلکہ اس لئے بھی ان میں بھائی چارہ ہونا چاہئے، کہ یہ سب ایک ہی خدا کے بندے ہیں، اور فرداً فرداً سب اس رشتۂ عبدیت میں جڑے ہوئے ہیں۔

کونوا عباد اللہ اخوانا	بھائی بھائی بن کر اللہ کے بندے ہو جاؤ۔

آپ صبح وشام جو دعا فرماتے تھے، اس میں توحید و آخرت کے اقرار کے بعد تیسری چیز یہی عالمگیر بھائی چارہ کا اعلان و اقرار ہوتا تھا۔

اللھم ربنا و رب کل شیء انا شھید ان العباد کلھم اخوۃ (احمد، ابی داؤد)	اے اللہ ہمارے رب اور تمام چیزوں کے رب، میں گواہ ہوں کہ تیرے تمام بندے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اتنا ہی نہیں، بلکہ آپ نے فرمایا کہ اس بھائی چارہ کی وجہ یہ بھی ہے، کہ ساری مخلوق خدا کی عیال ہے اس لئے جو بھی اس کی مخلوقات کے ساتھ حسن خلق سے پیش آئے گا، وہ خدا کے یہاں محبوب ہوگا،

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ احسن الی عیالہ (مشکوٰۃ)	ساری مخلوق خدا کی کفالت میں ہے، تو جو شخص خدا کی مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کرے گا، وہ اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہوگا

شیخ سعدی نے اسی تصور کو ان اشعار میں واضح کیا ہے۔

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند	چو بعضے ز بعضے اگر کمتر اند
سارے انسان ایک دوسرے کے اعضا ہیں	جس طرح ان میں کوئی چھوٹا عضو ہے اور کوئی بڑا

چو عضوے بدرد آید از روزگار ۔ دگر عضوہا را نماند قرار

مگر جب کسی عضو میں کوئی تکلیف ہوتی ہے تو دوسرے اعضا بھی اسکی تکلیف کو محسوس کرتے ہیں،

غور کیجئے! کیا انسانی بھائی چارے کا اس سے زیادہ فطری، مؤثر اور ہر خاص و عام کو اپیل کرنے والا کوئی دوسرا آفاقی تصور ہو سکتا ہے؟ یہی تصور ہے جو ہندوستان کے اچھوتوں کو بیٹل راک کے حبشیوں امریکہ کے ریڈ انڈینوں اور افریقہ کے سیاہ فاموں اور ہندوستان کے اچھوتوں کو برہمنوں اور سفید فاموں ہم مرتبہ بنا سکتا ہے، اور اس نے بنا کر دکھایا ہے،

اسلام نے انسانی بھائی چارہ کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینے اور انسان کو اس صراط مستقیم پر قائم رکھنے کے لئے ہر صنف کے حقوق مقرر کر دیئے ہیں۔ اس نے اس رشتۂ انسانیت کی حفاظت کے لئے ہر شعبۂ زندگی میں مساوات کا درس دیا ہے، اور اسی کو زیادہ سے زیادہ نشو و نما دینے کیلئے اس نے حریت فکر، حریت عقیدہ اور حریت تقریر و تحریر کی ہمت افزائی کی ہے، پھر اس تصور کو ذہن میں تازہ رکھنے کے لئے اس نے ایک ہمہ گیر نظام اخلاق دیا ہے، جو اس کا سب سے مؤثر داخلی نگراں ہے، میں نے جن عنوانات کا اوپر ذکر کیا ہے، ان میں ہر ایک کی تفصیل کے لئے ایک مستقل مضمون درکار ہے، اس لئے اشارات کرتے ہوئے گذر جانا ہی زیادہ مناسب ہے۔ (باقی)

مُصَنَّف عبدالرزاق
اور
جامع معمّر بن راشد

پاریس ۲۶ شعبان ۱۴۰۳

جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب

الرشاد کا شمارہ شعبان ۱۴۰۳ھ (مئی ۱۹۸۳ء) میں موضوع بالا پر ایک مقالہ ہے جو اس بحث کے متعلق ہے کہ اول الذکر کتاب کے اواخر میں جو ابواب ہیں اور جو کتاب الجامع. بسم اللہ الرحمن الرحیم باب وجوب الاستئذان کے الفاظ سے شروع ہوتے ہیں وہ مصنف ہی کا جزء ہیں یا ایک نئی چیز یعنی معمر بن راشد کی کتاب الجامع پر مشتمل ہیں؟

مقالہ نگار (مولانا حبیب الرحمن صاحب) میرے بزرگ ہیں، انھیں پورا حق ہے کہ جاہلوں کو سرزنش کریں۔ از خرداں خطا، از بزرگاں عطا۔

ممکن ہے لفظ اشتباہ کا میں نے بے محل اور غلط استعمال کیا ہو۔ پینتیس (۳۵) سال سے اردو سے کٹا ہوا ہوں اور اسے بھولتا جارہا ہوں کہ اوڑھنا بچھونا دوسری زبانیں ہیں۔

میرا منشا مولانا پر کوئی اعتراض کرنا نہ تھا بلکہ صرف یہ کہ کسی بھی انسان سے بعض وقت نادانستہ ایسی چیزیں ہو جاتی ہیں جو صحیح نہیں ہوتیں۔ اور بتانے پر الحق یعلو ولا یعلیٰ علیہ کے بمصداق بڑے سے بڑا عالم بھی نہ صرف اسے قبول کرتا بلکہ شکرگزار ہوتا ہے۔

جن وجوہ و اسباب سے میں نے اپنی گذارش پیش خدمت کی تھی ان کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) جامع معمر بن راشد کے ترکی میں دو مخطوطے ملے ہیں جن پر نام بھی صرف جامع معمر ہے اور جن میں مندرجات بھی ایک چھوٹی کتاب کے ہیں۔ جلد میں اور کوئی چیز نہیں۔ ان میں ایک جو بہت قدیم ۵۶۲ھ کی تحریر ہے، انقرہ میں ہے۔ دوسرا احمد ثالث نسخہ استانبول

میں ہے۔ ان کا ایڈیشن ایک ترکی رفیق نے اشاعت کیلئے تیار کیا۔ انھیں مصنف عبدالرزاق سے دلچسپی نہ تھی۔ میں نے جامع معمر کے ان دونوں مخطوطوں کے مندرجات کا مصنف عبدالرزاق کے باب کتاب الجامع سے مقابلہ کیا تو پتہ چلا کہ وہ ہو بہو ایک ہی چیز ہیں۔ فرق ہے تو وہی جو عام طور پر ایک ہی کتاب کے دو مخطوطوں میں ہوتا ہے۔ مکرر عرض کرتا ہوں کہ ان دونوں مخطوطوں پر جامع معمر درج ہے۔ جامع عبدالرزاق نہیں۔

(۲) مصنف عبدالرزاق کے جو متداول نسخے دنیا کے مختلف ملکوں میں ملتے ہیں ان میں "کتاب الجامع" کتاب کے آخر میں موجود ہے۔ اگر ایسا ہی ایک نسخہ شیخ سعید سنبل یا حضرت عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہا اللہ کی نظر سے گذرا ہو اور انہوں نے کچھ لکھا ہو اور کچھ خیال آرائی کی ہو تو قصور ان کا نہیں۔ بے خیالی میں ہر کسی سے ایسا ہی ہو سکتا ہے۔ اگر کسی نے انھیں توجہ دلائی ہوتی اور اس کے بعد بھی وہ اپنی رائے پر قائم رہتے تو وہ اہم چیز ہوتی۔ موجودہ صورت حال سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔

(۳) اگر جامع معمر میں، جو مصنف عبدالرزاق کا ضمیمہ بن گئی ہے، چند ایسی حدیثیں ہیں جو عبدالرزاق نے معمر سے نہیں بلکہ کسی اور شیخ سے روایت کی ہوں تو اس سے بھی کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ مصنف کا وہ حصہ جو بلا اختلاف مصنف عبدالرزاق ہے (۹½ دیں جلدیں) انمیں کثرت سے حدیثیں "عبدالرزاق عن معمر" ملتی ہیں اس سے وہ جامع معمر کا جز نہیں بن جاتیں۔ سیرابن ھشام میں دیکھئے۔ ابن ہشام نے کچھ چیزیں حذف بھی کی ہیں۔ کچھ چیزیں اپنی طرف سے بڑھائی بھی ہیں (سیرت ابن اسحاق مطبوعہ مراکش سے اس کا پتہ آسانی سے چل سکتا ہے) ایسا بارہا ہوتا ہے کہ کتاب راوی کیطرف منسوب کردی جائے۔ ابن حبیب کی ایک کتاب ان کے شاگرد اور راوی سکری کیطرف مخطوطے ہیں منسوب ہو گئی ہے۔ ایسی مثالیں کثرت سے مل سکتی ہیں۔

(۴) دمشق کے مخطوطے کو مصر کے فواد سید نے عبدالرزاق کا قرار دیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انقرہ اور استانبول کے مخطوطوں سے واقف نہ تھے۔ ترکی کے فواد

مرگلین جامع معمر کو اشاعت کیلئے تیار کرنے کے بعد دمشق گئے اور وہاں کے مخطوطے کو دیکھا پھر رباط جاکر وہاں کے مخطوطے کو بھی دیکھا۔ وہ اپنی جرمن کتاب تاریخ تالیفات عربی میں لکھتے ہیں کہ جامع کے راوی عبدالرزاق ہیں اور انھوں نے اسے اپنی مصنف کا ذیل بنایا اور اس میں کچھ حدیثوں کا اضافہ بھی کیا ہے اور یہ کہ اصابہ ابن حجر ج ۴ صفحہ ۳۱۱ ، صفحہ ۴۰۳ میں بھی جامع معمر کے اقتباسات ہیں۔

(۵) میری دانست میں پرکھنے کا بہتر معیار یہ ہو کہ داخلی شہادت پر جائیں۔ معمر بہت قدیم مؤلف ہیں ان کے استاد ہمام بن منبہ کے وقت حدیث کے مجموعوں میں کوئی تبویب مطلق نہیں ہوتی تھی معمر گویا تبویب کا آغاز کرتے ہیں لیکن جو زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہے۔ انکے شاگرد عبدالرزاق تبویب کو مزید ترقی دیتے ہیں اور فقہی ابواب پر کتاب الطہارۃ، کتاب الحیض، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الجمعہ، عیدین، جنائز، زکوٰۃ، صیام، عقیقہ وغیرہ حدیثیں مرتب کرتے ہیں اور ان کتابوں کے تحت وہ ذیلی ابواب دیتے جاتے ہیں۔ یہ چیزیں صرف مصنف میں ملتی ہیں، کتاب الجامع میں نہیں ملتیں۔ اس کا نہج بالکل الگ ہے اور تبویب نسبتاً ابتدائی حالت میں ہو۔ مصنف میں کتاب الاشربہ اور کتاب البیوع کی حدیثیں دوبارہ الگ مقام پر (یعنی جامع معمر میں) نہ ہوتیں اگر دونوں ایک ہی کتاب کے اجزاء ہوتے تو دو جگہ ذکر کی ضرورت نہیں تھی۔ یہی حال مصنف میں حضرت عمرؓ کی وصیت کا ہے جو مصنف میں بھی ہے اور جامع معمر میں بھی ہے اور یہ بعض دیگر تفصیلوں پر مشتمل ہے ایسی اور چیزیں بھی ملتی ہیں جو اندرونی شہادت ہیں۔

ممکن ہے کہ اس کے باوجود میں ہی غلطی پر ہوں اور کتاب الجامع کے دو معنی متفرقات کے باب کے ہوں" لیکن اس کے خلاف رائے رکھنے کو استشراق یعنی کفر قرار دیا جا سکتا ہے تو میں علام الغیوب سے استغفار کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اہدنا الصراط المستقیم۔

سیرت النبی کی ایک خاص جلد | الرشاد کے اسی نمبر میں ناچیز کے سفر اعظم گڑھ کا ذکر ہے۔ اس پر چالیس سال گذرے ہوں گے۔ اسی اثناء میں میرا یا مقالہ نگار کا

حافظہ متاثر ہوگیا ہے۔ متعدد چیزیں میری یاد میں اس طرح پیش نہیں آئیں جیسا کہ بیان کی گئی ہیں مگر ان امور کو کوئی علمی اہمیت نہیں۔ اس سے قطع نظر سیرۃ النبی مؤلفہ شبلی و سلیمان ندوی رحمہا اللہ ایک خصوصی جلد مستشرقین کی تردید کے لئے درکار بیان کی گئی ہے اور اس ہیچ مداں کا ذکر ہوا ہے (مجھے اردو کے سوا ہندوستان کی کوئی زبان نہیں آتی) مجھے اس تجویز سے اتفاق نہیں ہے۔ مستشرقین کی تردید کی کوشش سے آپ ان کی اہمیت بڑھاتے اور ان کی سرفرازی کرتے ہیں وہ اس کے مستحق نہیں۔ انکے لغو اعتراضوں سے اعتنا نہ کرنا ہی بہتر جواب ہے۔ میری حقیر تحریروں کے متعلق مرحوم علامہ سید سلیمان ندویؒ کا طرز عمل ذرہ نوازی کا تھا حتی کہ میں خود انکی تردید کرتا تھا۔ (مثلاً کتاب عربوں کی جہازرانی کی تنقید) تو اسے بھی بے تکلف چھاپ دیتے تھے۔ یہ ہے حقیقی بڑائی کا معیار۔ اللہ انکو جنت الفردوس اور اعلائے علیین میں جگہ دے۔ آمین۔

فقط نیاز مند

حمید اللہ
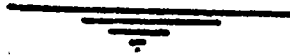
شہاب الدین محمود آلوسی

مجیب اللہ ندوی

تفسیر روح المعانی زیادہ قدیم نہیں ہے بلکہ وہ تیرہویں صدی کے وسط کی تصنیف ہے۔ لیکن مقبولیت کے لحاظ سے اس کو بہت سی متقدم تفسیروں پر بھی فوقیت حاصل ہے۔ یہ کتاب مصنف نے بارگاہِ قدس کے اشارۂ غیبی پر تصنیف کی تھی۔ تفسیر کے مقدمہ میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔

مصنف کے نام اور انکی تفسیر سے تو عام طور سے اہل علم واقف ہیں مگر انکی دوسری تصانیف اور ان کے سوانح حیات سے کم لوگوں کو واقفیت ہے، اس لئے اردو میں ان کے حالات لکھنے کی ضرورت تھی، لیکن افسوس ہے کہ مصنف کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں کی اہمیت کے لحاظ سے ان کے حالات بہت کم ملتے ہیں، تلاش سے جو معلومات حاصل ہو سکے ہیں وہ پیش کش ناظرین ہیں۔

خانوادۂ آلوسیین آلوس عراق میں ایک بستی ہے جو دریائے فرات کے ساحل پر واقع ہے۔ یہ قدیم آبادی ہے، دوسری، تیسری صدی ہجری میں اس کی حیثیت ضلع کے مرکزی مقام کی تھی۔ اس کی جانب بہت سے علماء وصلحاء بھی منسوب ہیں۔ معجم البلدان میں اس کا مفصل تذکرہ موجود ہے۔ لیکن اس وقت اس کی حیثیت ایک قصبہ سے زیادہ نہیں ہے۔ تیرہویں صدی میں یہاں کے ایک خاندان نے علم وفضل میں

---

[1] معجم المطبوعات ج ۱۔ ص ۲۔

بڑی شہرت وناموری حاصل کی۔ اس خانوادہ کو عام طور پر خانوادۂ آلوسیین کہا جاتا ہے۔ یہ خاندان علم وفضل کے لحاظ سے پورے عراق میں ایک خاص حیثیت کا مالک تھا۔ اور پورے اہل عراق کا مرجع علم تھا، صاحب روح المعانی اسی خاندان کے ایک فرد تھے۔

نام ونسب اور ابتدائی حالات | شہاب الدین محمود نام، ابوعبداللہ کنیت تھی۔ ۱۵ شعبان بروز جمعہ ۱۲۱۷ھ کو آلوس میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبداللہ صلاح الدین تھا، جو بڑے صاحب علم وفضل تھے۔ انھیں کی آغوش فیض میں انکی ابتدائی تعلیم وتربیت ہوئی۔ صاحبزادہ کو عربی ادب، فقہ اور منطق کی متوسط تعلیم دینے کے بعد وہ عراق کے دوسرے علماء کی خدمت میں لے گئے جن سے انھوں نے تکمیل کی۔ ان کے اساتذہ کے متعلق صاحب[1] جلاء العینین نے صرف اتنا لکھا ہے کہ

اخذ العلوم عن علماء المحققین واجلاء مدققین (ص ۲۷)	انھوں نے محقق علماء اور اہل نظر فضلاء سے علم حاصل کیا۔

لیکن کسی کے نام کی تصریح نہیں کی ہے۔ الاب لویس شیخو نے اپنی کتاب آداب العربیہ میں ان کے استاذ علاء الدین متوفی ۱۲۲۶ھ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

علاء الدین واحد شیوخ شہاب الدین الوسی	آلوسی کے شیوخ میں ایک شیخ علاء الدین بھی تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اور بھی شیوخ تھے۔

ذہانت اور قوت حافظہ | بچپن ہی سے نہایت ذہین اور فطین تھے۔ حافظہ بھی غیر معمولی پایا تھا۔ جلاء العینین میں ہے۔

وکان ذا حافظۃ غریبۃ وفطنۃ عجیبۃ (ص ۲۸)	عجیب وغریب ذہانت اور حافظہ پایا تھا۔

قوتِ حافظہ کا خود ان کے بیان کے مطابق یہ حال تھا۔

ما استودعت ذهنی شیئا فخاننی[2]	ایسا نہیں ہوا کہ میں نے اپنے ذہن میں کوئی بات رکھی ہو اور ذرہ بھر وہ ذہن سے نکل گئی ہو۔

---

[1] جلاء العینین کے مصنف شیخ آلوسی کے صاحبزادے ہیں۔ [2] جلاء العینین ص ۲۷۔

اسی غیر معمولی ذہانت کا نتیجہ تھا کہ ۱۳ برس کی عمر میں ابن ہشام کی کتاب شرح قطر الندیٰ پر حاشیہ لکھا۔ ابھی بیس برس سے بھی کم عمر تھی کہ مسند درس کے زینت بنے اور اسی زمانے میں صاحب تصنیف بھی ہوئے۔ جلاء العینین میں ہے۔

وقد الف وهو دون العشرين (ص ۲۷) | بیس برس سے کم ہی کے تھے کہ صاحب درس و تدریس و تصنیف ہو گئے۔

تلامذہ | ابتدائے عمر سے لیکر آخر عمر تک افادہ و تعلیم کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس مدت میں ہزاروں تشنگان علم ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے ہوں گے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کا مفصل تذکرہ نہیں ملتا۔ ان کے صاحبزادے کا بیان ہے کہ

وانتفع به خلق کثیر (جلاء ص ۲۸) | ان سے ایک کثیر مخلوق نے استفادہ کیا۔

(۱) ان کے دو صاحبزادے عبدالباقی سعد الدین (۲) خیر الدین ابوالبرکات جو اپنے وقت کے جید علماء میں تھے اور متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ جلاء العینین خیر الدین ابوالبرکات ہی کی تصنیف ہے۔ (۳) شیخ عبدالفتاح شواف زادہ، ان کو حدیث و فقہ اور عربی ادب سے زیادہ دلچسپی تھی، ادب کی تعلیم خاص طور سے انھوں نے شیخ آلوسی سے حاصل کی تھی۔ ان کی متعدد تصانیف ہیں۔ حدیقۃ الورد کے نام سے دو جلدوں میں شیخ آلوسی کی سوانح حیات بھی لکھی ہے۔ کاش یہ کتاب مل جاتی تو شیخ کے مفصل حالات اور کارنامے سامنے آجاتے۔ (۴) محمد الاخفش، یہ شیخ کے خاص تلامذہ میں تھے۔ ان کی تحریری یادگاروں میں شرح الفیہ زیادہ مشہور ہے (۵) عبدالفتاح الاخرس، انھوں نے شیخ سے اور کتابوں کے علاوہ کتاب سیبویہ خاص طور سے پڑھی تھی[2]

افتاء | اس علم و فضل کے باوجود عام مجالس وعظ میں جانا پسند نہیں کرتے تھے۔

---

[1] کتاب العربیہ ج ۱، ص ۸۶۔

[2] یہ پچھلے تین آدمیوں کا ذکر آداب العربیہ میں ہے ج ۱ ص ۹۳ تا ۹۸۔

۵۴۸ھ میں ان کو جامع بغداد میں وعظ کیلئے بلایا گیا تو بہت بار خاطر ہوا، جب زیادہ اصرار کیا گیا تو بکراہت گئے۔ اس وعظ میں والیٔ بغداد بھی موجود تھا۔ وہ بہت متأثر ہوا اور اس کو اسی دن سے شیخ سے ایک خاص عقیدت ہوگئی۔ اور اس کے بعد سے وہ برابر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا اور بعد میں بغداد کے مفتی کی حیثیت سے ان کا تقرر کر دیا، شیخ نے پندرہ برس تک یہ خدمت نہایت حسن وخوبی کے ساتھ انجام دی۔[۱]

وفات | ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۷۰ھ کو ۵۳ برس کی عمر میں وفات پائی اور شیخ معروف کرخی کے پہلو میں سپرد خاک کئے گئے۔ وفات کا صدمہ خواص وعوام سب کو ہوا، آج بھی آپ کی قبر زیارت گاہِ عام وخاص ہے۔ متعدد شعراء نے طویل مرثیے لکھے۔ زندگی میں شعراء نے جو مدائح لکھے اور موت کے بعد جو مراثی کہے گئے ان سب کو ابو الاب لوس نے کتابی شکل میں جمع کر دیا ہے۔[۲]

اولاد و احفاد | ان کے دو صاحبزادوں عبد الباقی اور خیر الدین کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور صاحبزادے عبد اللہ بہار الدین تھے، دوسرے بھائیوں کی طرح یہ بھی صاحبِ علم تھے۔ ان کے صاحبزادے (یعنی شیخ آلوسی کے پوتے) ابو المعالی متوفی ۱۳۴۲ھ نے علم وفضل میں باپ سے بھی زیادہ شہرت حاصل کی، متعدد قیمتی تصانیف یادگار چھوڑیں۔ ان میں بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب بہت مشہور ہے اور چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

اخلاق وعادات | شیخ کے صاحبزادے نعمان نے ان کے ظاہری و باطنی محاسن کا ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

وکان حسن المنظر والمحاضرۃ المفاکہۃ	نہایت خوبصورت اور خوش گفتار، متقی
ورعاً تقیاً عفیفاً (جلاء ۳۷)	اور پرہیزگار اور پاکدامن تھے۔

---

[۱] معجم المطبوعات۔ [۲] جلاء العینین ص۳۔ [۳] آداب العربیہ

صاحب حدیقۃ الورد لکھتے ہیں ۔

کریم الذات بدیع الاخلاق	کریم النفس اور اخلاق میں نادر روزگار تھے

اریخ النجد کے مصنف کا بیان ہے ۔

ولم یسمع بمثلہ فی کافۃ الاقالیم	بہت دنوں سے ان ممالک میں ایسا صاحب علم
منذ سنین عدیدۃ مع تقوی	وفضل سننے میں نہیں آیا۔ اس علم وفضل کے ساتھ
وصلاح ودیانۃ قویۃ وسخاء	صلاح وتقوی، راست بازی اور سخاوت اور
وکرم وصدقات خفیۃ	پوشیدہ صدقات کرنے میں وہ اپنی آپ مثال تھے

(جلد ۱ ص ۲۸)

فضل وکمال | شیخ آلوسی کے علم وفضل کا اندازہ تو ان کی تصانیف ہی سے ہوسکتا ہے لیکن ان کے معاصرین بھی ان کے کمالات کے معترف تھے ۔

لویس شیخو نے لکھا ہے ۔

کلف بالعلوم منذ حداثۃ سنۃ	اوائل عمر ہی سے ان کو علوم سے دلچسپی اور لگاؤ تھا۔
وبذل النفس والنفیس فی	اور علمی جواہر پاروں کے جمع کرنے میں انھوں نے اپنی
جواھرھا فی ان رغبتہ فی طلب	جان ومال ہر چیز لگادی تھی۔ طلب علم کی رغبت وشوق نے
المعارف شغلتہ عن مطامع	انکو اپنی طرف اتنا مشغول کرلیا کہ وہ زخارف دنیوی سے
الدنیا وانسہ ھناء العیش و	اور زندگی کی لذت وآرام سے بھی بے نیاز ہوگئے ۔ اس
ملاذ الحیاۃ وبرز بالعلوم الدینیۃ	ذوق وشوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ علوم دینیہ میں انکو پورا کمال
فصار اماما فی التفسیر والافتاء	حاصل ہوگیا۔ چنانچہ تفسیر اور افتاء میں انکی حیثیت
وکان مع ذلک کاتبا بلیغا [۱]	امام کی ہوگئی، اسی کے ساتھ انشاء پردازی اور بلاغت
	میں بھی کمال حاصل تھا۔

---

[۱] آداب العربیہ ج ۱ ص ۸۵

صاحب حدیقۃ الورد جو ان کے شاگرد ہیں لکھتے ہیں ۔

کشاف رموز الحقائق وغواص	حقائق علم کا راز فاش کرنے والے اور بحر معانی
بحر الدقائق علامۃ الفضلاء	کے غواص تھے، اہل فضل کی نشانی اور بالاتفاق
وحید الدھر بالاتفاق خاتم	نادرۂ روزگار تھے۔ خاتم المفسرین تھے، اور اہل
المفسرین وسعد المحققین وفخر	تحقیق اور علمائے امت کیلئے سعادت اور فخر کا موجب
علماء المسلمین الواصل الی	تھے، ان کو اجتہاد کا رتبہ حاصل تھا۔ تمام
رتبۃ الاجتہاد ذکرہ فی البلاد۔	ممالک میں ان کا چرچا ہے ۔

صاحب اریج الند جو شیخ کے شاگرد ہیں بیان ہے ۔

وکان نادرۃ الاوان حصل العلوم	نادرۂ روزگار تھے، انھوں نے علوم نقلیہ و
النقلیۃ والعقلیۃ فتفرد بھا ودرس	عقلیہ کی تحصیل کی اور اس میں تفرد حاصل کیا
العربیۃ والبیان والحدیث	ادب عربی، معانی و بیان، تفسیر و حدیث کا
والتفسیر ووقف علی غامضۃ	درس دیا، اور ان علوم کی مشکلات حل
العسایں۔۔	کرتے رہے ۔۔۔۔
ولم یسمع بمثلہ فی کافۃ الاقالیم	ان کے جیسا نادرۂ روزگار سننے میں نہیں
(ص ۲۷)	آیا ۔

عربی نظم ونثر | عربی نظم و نثر دونوں پر پوری قدرت تھی، نثر میں ان کی قدرت پر ان کی تصانیف شاہد ہیں۔ صاحب آداب العربیہ ان کی تحریر کے متعلق لکھتے ہیں۔

کان السید محمود سریع الخاطر	شیخ محمود نہایت ذکی الفہم
ونسیج وحدہ فی قوۃ التحریر	اور اپنے انداز تحریر اور
وسھولۃ الکتابۃ ۔	عبارت کی سلاست
(ج ۱ ص ۸۵)	و روانی میں منفرد تھے ۔

جلاء العینین میں ہے۔

والنثر العجیب الذی لم یسبق ایسی اچھوتی نثر لکھتے تھے کہ ان کے
حسن اسلوبہ (ص ۲۸) اسلوب تحریر کی مشکل ہی سے تقلید کیجا سکتی تھی۔

عربی شعر و شاعری کا بھی نہایت اعلیٰ او پاکیزہ مذاق تھا، نثر کیطرح ان کی نظم میں بھی دو خصوصیتیں یعنی رقت و سلاست زیادہ نمایاں ہیں۔ نمونۂ چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔ ایک موقع پر عراق کے چھوٹنے پر کہا ہے۔

اھیم بآثار العراق وذکرہ ۔ و تغدو عیونی من مسر تہا عیری
والثم اخفاقا وطئت ترابہ ۔ واکحل اجفانا بتربۃ العطری
واسھر ارعی فی الدیاجی کواکبا ۔ تمرا ذا سارت علی ساکنی الزورا

بغداد کی تعریف اور اس کے فراق میں کہتے ہیں۔

ارض اذا امرت بھا ریح الصبا ۔ حملت من الارجاء مسکا اذفرا
لا تسمعن حدیث ارض بعدھا ۔ یروی فکل الصید فی جوف الفرا
فارقتھا لا عن رضی وھجرتھا ۔ لا عن قلی ورحلت لا متخیرا
لکنھا ضاقت علی برحبھا ۔ لما رایت بھا الزمان تنکرا

آخری شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ بغداد کو انھوں نے خوشی سے نہیں بلکہ حالات سے مجبور ہوکر چھوڑا۔

علم نحو نحو ان کا خاص فن تھا، اوپر ذکر آچکا ہے کہ کتاب سیبویہ خاص طور سے وہ پڑھایا کرتے تھے، اس فن سے ان کی دلچسپی کا اندازہ ان کی تفسیر سے ہوتا ہے اس میں نحو کے جو مسائل آئے ہیں اگر ان کو الگ کرلیا جائے، تو ایک مستقل کتاب تیار ہوسکتی ہے۔

امر بالمعروف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر علماء کا خاص فریضہ ہے، شیخ آلوسی کو اس فرض کا پورا احساس تھا اور وہ درس میں علمی و دینی خدمت کے ساتھ

اس فریضہ کو بھی انجام دیتے تھے، ان کے صاحبزادے نعمان ان کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

والامر بالمعروف والنھی عن المنکر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور
والذب عن السنۃ (جلاء ص۲۵) سنت نبوی کیطرف سے مدافعت بھی انکی خاص خصوصیت تھی۔

مسلک | پورا خانوادہ آلوسیین شافعی المسلک تھا، اس لئے شیخ آلوسی بھی شافعی تھے، لیکن ان میں تشدد نہیں تھا، چنانچہ بعض مسائل میں وہ حنفی مسلک کے پابند تھے، شاید اس وسعت کا نتیجہ تھا کہ عہدۂ افتار پر ان کا تقرر ایک حنفی مفتی کی حیثیت سے ہوا تھا۔

تصانیف | شیخ کا اصل کارنامہ انکی بیش بہا تصانیف ہیں۔ جن کی اہمیت ان کی کمیت کیوجہ سے نہیں بلکہ معنوی کیفیت کے لحاظ سے ہے۔ اور اس کا اندازہ ان کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، اس لئے اس مضمون میں صرف ان کے نام اور مختصر تعارف پر اکتفار کیا جاتا ہے۔

قیل انہ کان لا یفھرتالیفہ فی الیوم
واللیلۃ عن اقل من ورقتین

صاحب جلاء العینین نے ان کی تصانیف کا ذکر کیاہے ان میں سے تیرہ مطبوعہ ہیں۔

۱۔ الاجوبۃ العراقیۃ عن اسئلۃ الایرانیۃ - ایران کے علمار سے شیعہ نے چند سوالات کئے تھے۔ یہ کتاب اسی کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ ۱۳۰۱ھ میں آستانہ سے شائع ہو چکی ہے۔

۲۔ الاجوبۃ العراقیۃ عن اسئلۃ اللاھوریۃ - یہ بھی چند سوالات کے جواب میں لکھی گئی ہے۔

---

[1] معجم المطبوعات ص ۴۔

لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس کا موضوع کیا ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۲۵۴ھ ہے۔ بغداد سے ۱۳۰۱ھ میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کی ضخامت ۶۵ صفحات ہے۔

۳۔ قطر الندی۔ فن نحو کی کتاب ہے۔ ابن ہشام نحوی متوفی ۷۶۲ھ کی تصنیف ہے، خود اس نے اس کتاب کی شرح بھی لکھی ہے۔ اس کتاب کی صاحب کشف الظنون نے بڑی تعریف کی ہے۔ اس پر متعدد حواشی لکھے گئے ہیں۔ شیخ آلوسی نے بھی اس پر حاشیہ لکھنا شروع کیا تھا مگر وہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچ سکا، صرف باب الحال تک لکھ پائے تھے کہ انتقال ہو گیا، ان کے بعد ان کے صاحبزادے نعمان نے اسے پورا کیا۔ ۱۳۲۰ھ میں بیت المقدس سے شائع ہو چکی ہے۔

۴۔ الخریدۃ الغیبیۃ فی تفسیر قصیدۃ الغیبیۃ۔ عبدالباقی موصلی نے حضرت علی کی مدح میں ایک قصیدہ عینیہ لکھا تھا۔ مصنف نے اس کی تشریح کی ہے، قصیدہ مع تشریح ۱۲۷۰ھ میں مصر سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کی ضخامت ۵۶ صفحات ہے۔

۵۔ سفرۃ الزاد لسفرۃ الجہاد۔ یہ جہاد سے متعلق ہے ۱۲۷۰ھ میں مطبع دارالسلام مصر نے اسے شائع کیا ہے۔

۶۔ الطراز المذہب شرح قصیدۃ الباز الاشہب۔ عبدالباقی عمری کے ایک قصیدہ کی شرح ہے، مطبع جریدۃ الفلاح نے ۱۳۱۳ھ میں شائع کیا ہے۔ اس کی ضخامت ۱۹۶ صفحات ہے۔

۷۔ غرائب الاغتراب و نزہۃ الالباب۔ مصنف نے فلسطین کا سفر کیا تھا۔ اس میں اسی سفر کے حالات ہیں۔ اسی میں ان تمام علماء و صلحاء کے حالات بھی لکھ دیئے ہیں جن سے انھوں نے اثناء سفر میں ملاقات کی تھی، ۱۳۱۷ھ میں بغداد سے یہ سفرنامہ شائع ہو چکا ہے۔ کتاب کے شروع میں احمد شاکر آلوسی کے قلم سے مصنف کا ترجمہ بھی ہے۔ اس کی ضخامت ۱۵۴ صفحے ہے۔

۸۔ الفیض الوارد۔ سید محمد جواد نے اپنے شیخ الشیوخ خالد الکردی

النقشبندی کا ایک طویل مرثیہ دالیہ لکھا تھا۔ یہ اس کی شرح ہے۔ ۱۲۷۰ھ میں مطبع کاستیہ نے شائع کیا ہے۔ ضخامت ۲۶۴ صفحات ہیں۔

۹۔ کشف الطرۃ عن الغرۃ درۃ الغواص فی اوھام الخواص، ابومحمد قاسم الحریری متوفی ۵۱۶ھ کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے خواص کے معائب اور رائج اوہام باطلہ پر بڑی اچھی بحث کی ہے۔ اس کتاب کی متعدد شرحیں لکھی گئیں ہیں، دو شرحیں نظم میں بھی کی گئی ہیں، شیخ آلوسی نے بھی کشف الطرہ کے نام سے اس کی شرح لکھی ہے، یہ کتاب دمشق سے ۱۳۰۱ھ میں شائع ہو چکی ہے۔ کتاب کے شروع میں شیخ کے صاحبزادے نعمان آلوسی کا ایک مقدمہ بھی ہے، کتاب کی ضخامت ۱۷۷ صفحات ہے۔

۱۰۔ المقامات الخیالیۃ۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کتاب کس موضوع پر ہے۔ بغداد یا کربلا سے شائع ہو چکی ہے۔

۱۱۔ نشوۃ الشمول۔ یہ سفرنامہ ہے ۱۲۶۲ھ میں مصنف نے استنبول کا سفر کیا تھا، اس میں اس سفر کے حالات ہیں۔

۱۲۔ نشوۃ المدام فی العود الی مدینۃ السلام۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس کا موضوع کیا ہے۔ غالباً یہ سفر سے واپسی پر بغداد کے متعلق کچھ لکھا ہے۔ واللہ اعلم یہ کتاب دوبار بغداد سے شائع ہو چکی ہے۔

۱۳۔ تفسیر روح المعانی

ان کی زندگی کا اصلی اور سب سے اہم علمی و دینی کارنامہ یہی تفسیر ہے۔ اس کی تالیف ۱۲۵۴ھ میں اختتام کو پہنچی، یہ کتاب دوبار چھپ چکی ہے۔ کتاب کے شروع میں مصنف نے لکھا ہے کہ نوجوانی ہی میں قرآن کے بہت سے حقائق و معارف ان پر منکشف ہونے لگے اور بہت سے دقائق ان کے ذہن میں ایسے آئے جو متداول تفسیروں میں نہیں ملتے، چنانچہ ان کو ان دقائق و معارف کے قلمبند کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ ابھی وہ اس ادھیڑ بن ہی میں تھے کہ ایک رات خواب دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو زمین و آسمان

کے لپٹنے اور اس میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کو پُر کرنے کا حکم دے رہا ہے، اس حالت میں انھوں نے اپنا ایک ہاتھ آسمان کیطرف اور دوسرا زبان کیطرف بڑھایا، اس کے بعد آنکھ کھُل گئی اور تفسیر لکھنے میں ان کو جو تامل و تردد تھا وہ رفع ہو گیا۔ اور انھوں نے اس کام کو شروع کر دیا۔

کتاب کے شروع میں سات فائدے ہیں جن میں تفسیر کے تمام اہم مسائل آ گئے ہیں۔ مثلاً تفسیر و تاویل، تفسیر بالرائے، اسماء قرآن، کلام اللہ غیر مخلوق، حروف سبعہ جمع و ترتیب قرآن، اعجاز القرآن وغیرہ مباحث پر مختصر طور سے اچھی بحث کی ہے، پوری تفسیر ۳۰ حصوں میں ہے۔

اس خاندان کے دوسرے اکابر

شیخ کے صاحبزادوں کا ذکر اوپر آ چکا ہے جن میں ایک صاحب علم و فضل تھا۔ ان کے دو پوتوں نے بھی اس لحاظ سے بڑی ترقی کی۔ ان میں ایک ابوالمعانی محمود شکری ہیں، جن کا تذکرہ اوپر آ چکا ہے۔ دوسرے علی علاء الدین ہیں، جنھوں نے پوری زندگی علم دین کی تدریس میں گذاری، کچھ تحریری یادگاریں بھی چھوڑی ہیں۔ بارہویں[۱۲] اور تیرہویں[۱۳] صدی کے اکابر کا ایک تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا، مگر وہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا، اس کے علاوہ نحو میں ایک کتاب مکمل ہے جو چھپ گئی ہے۔ ۱۲۷۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۴۰ھ میں وفات پائی۔

شیخ آلوسی کے دو بھائی عبدالحمید اور عبدالرحمٰن بھی اپنے زمانہ کے ممتاز علماء میں گذرے ہیں۔ عبدالرحمٰن نہایت فصیح و بلیغ تھے۔ خطابت میں خاص طور سے مشہور تھے، اس کے علاوہ کرخ کی جامع مسجد میں زندگی بھر درس و تدریس کا کام کرتے رہے۔ ۱۲۸۴ھ میں وفات پائی، دوسرے بھائی عبدالحمید نابینا تھے، لیکن اپنے وقت کے بہترین ادباء و شعراء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ نہایت مقبول عوام تھے، ایک آدھ تحریری یادگاریں بھی چھوڑی ہیں۔ ۱۳۲۴ھ میں وفات پائی۔

سرمد اور ان کی رباعیاں

(مجیب اللہ ندوی)

دار المصنفین کی رفاقت کے ابتدائی زمانہ ۱۹۴۵ء میں راقم الحروف نے ایک مضمون "ہندستان کے چند نو مسلم اکابر" کے عنوان سے لکھنا شروع کیا جن میں سرمد بھی تھے، اس مضمون کو مولانا عبدالسلام صاحب ندوی مرحوم نے دیکھا تو پسندیدگی کا اظہار کیا اور کہیں کہیں اصلاح کی، ان ایام میں سید الملت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایک سفر پر تھے، اور معارف کے مضامین وغیرہ کی ترتیب مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی مرحوم کے سپرد تھی، ان کو جب میں نے مضمون دیا تو انہوں نے تھوڑی سی ترمیم کے بعد کاتب کے حوالہ کر دیا، مضمون کی کتابت ہو چکی تھی اور کاپی بھی دیکھی جا چکی تھی، کہ اسی درمیان میں حضرت سید صاحب واپس تشریف لائے۔ انہوں نے شاہ صاحب سے پوچھا کہ اس مہینہ کے معارف میں کون کون سے مضامین دیئے جا رہے ہیں، شاہ صاحب نے دوسرے مضامین کے ساتھ راقم الحروف کے مضمون کا بھی ذکر کیا، سید صاحب نے کہا کہ وہ مضمون کہاں ہے، ان کو جب مضمون دکھایا گیا تو ایک سرسری نگاہ ڈال کر فرمایا کہ اس مضمون کو روک دیجئے، چنانچہ وہ مضمون روک دیا گیا، مجھے جب اس کا علم ہوا تو نوجوانی میں چھپنے چھپانے کا جو شوق ہوتا ہے، اور پھر پہلا مضمون چھپنے جا رہا تھا، اس کی بنا پر قدرے ملال ہوا، سید صاحب جن کی نگاہ ان باتوں پر ہوتی تھی، انہوں نے دوسرے دن مجھے بلایا اور فرمایا کہ تمہارا وہ مضمون (حضرت سید صاحب ہمیشہ آپ کے لفظ سے خطاب فرماتے تھے) میں نے اس لئے روک دیا کہ یہ موضوع بہت وسیع ہے، ابھی اس پر اور پڑھو اور دوبارہ لکھو، اور جس موضوع پر لکھنا ہو اس کے ہر پہلو کا اتنا مطالعہ کرو کہ جس طرح پیالہ بھر جانے کے بعد چھلکنے لگتا ہے، اسی طرح اس موضوع سے متعلق تمہاری معلومات چھلکنے لگیں، اس کے بعد لکھنا شروع کرو، چنانچہ راقم الحروف نے اس کا مطالعہ شروع کیا، اس وقت پورا مضمون مشکل سے ۳۰۔۳۵ صفحے کا رہا ہوگا۔ اب جو پڑھنا شروع کیا تو دوسرے حضرات پر تو نہیں مگر سرمد اور ان کی رباعیوں پر تقریباً ۶۰۔۷۰ صفحے کا مضمون تیار ہو گیا، اور جو معارف کی کئی قسطوں میں شائع ہوا، جس وقت یعنی ۱۹۴۶ء

یہ مضمون معارف میں شائع ہونا شروع ہوا۔ اس وقت سید صاحب نواب بھوپال کے اصرار کی بنا پر ریاست کے قاضی کی حیثیت سے بھوپال تشریف لے جا چکے تھے۔ انہوں نے مضمون دیکھا تو وہاں سے اپنی پسندیدگی اور ہمت افزائی کا خط لکھا۔ خط میں اور باتوں کے ساتھ یہ بھی تحریر فرمایا کہ آئندہ اسی طرح محنت کرکے لکھنے کی کوشش کیا کرو۔

یہ مضمون آج سے تقریباً ۳۰ برس پہلے لکھا گیا تھا۔ اس پر نظر ثانی کرنی شروع کی، تو اس میں زبان کی تو کم اور تحقیق کی بہت سی خامیاں نظر آئیں۔ بحمد اللہ نظر ثانی کے بعد قریب قریب یہ خامیاں دور ہو گئی ہیں، اور اب اسے سرمد کی رباعیوں کے ساتھ الگ کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے، اس کے ابتدائی چند صفحات ناظرین "الرشاد" کی خدمت میں پیش کئے جا رہے ہیں۔

سرمد اسلام سے پہلے یہودی تھے، اور انہوں نے اگلے صحیفہائے آسمانی کا اتنا گہرا مطالعہ کیا تھا کہ ان کا شمار علمائے یہود میں ہوتا تھا، اسلام لانے کے بعد انہوں نے عربی علوم و فنون کا بھی مطالعہ کیا، اور پھر اس میں پورا درک حاصل کیا، جہاں تک ان کے علم و فضل کا تعلق ہے، اس کے بارے میں ان کی زندگی میں اور ان کے قتل کے بعد بھی کسی نے کوئی کلام نہیں کیا، اور خود ان کی ایک ایک رباعی سے نہ صرف ان کے علم و فضل کا ثبوت ملتا ہے، بلکہ ان کی یہ رباعیاں حکمت و عظمت کا بہترین نمونہ بھی ہیں۔ البتہ سرمد کی مذہبی حیثیت ان کی زندگی ہی سے مختلف فیہ رہی، اور یہ اختلاف آج تک باقی ہے، کچھ لوگ ان پر کفر و زندقہ کا الزام عائد کرتے ہیں، اور بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ وہ یہودیت کی ترویج کے لئے ظاہر طور پر مسلمان ہو گئے تھے اور کچھ لوگ انہیں اولیاء اللہ میں شمار کرتے ہیں، خود مولانا ابوالکلام آزاد اپنی سلفیت کے باوجود ان کو ایک برگزیدہ شخصیت سمجھتے ہیں، اور ان کی اباحیت پسندی اور زندقہ کی بنا پر جب عالمگیرؒ نے انہیں قتل کرایا، تو دارا شکوہ سے ان کے گہرے روابط کی وجہ سے وہ اس قتل کو سیاسی قتل سمجھتے ہیں، اور ان کے قتل کو شہادت کا مرتبہ دیتے ہیں، اس مضمون میں ان دونوں پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی واضح کر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ عالمگیر کے نزدیک شخصیت کے مقابلہ میں شریعت کی زیادہ اہمیت تھی، اور جس پس منظر میں ان کو قتل کیا گیا اسے سامنے رکھا جائے تو سرمد کی باطنی برگزیدگی

کے باوجود عالمگیر کے اس شرعی اقدام کو انصاف کے خلاف نہیں کہا جاسکتا، اور نہ ان پر خون ناحق کا الزام لگانا صحیح ہو سکتا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

فارسی رباعی گوئی کی تاریخ

رباعی گوئی کے محرکات گو بہت پہلے شروع ہو چکے تھے، مگر چوتھی صدی ہجری کے شروع میں ایک خاص بحر و وزن کے قیود کے ساتھ موجودہ فارسی زبان میں رباعی گوئی کی ابتدا ہوئی، اور اس صدی کے رباعی گویوں میں سب سے پہلا نام سامانی عہد کے ایک شاعر ابوشکور بلخی کا آتا ہے، عوفی نے لباب الالباب میں اس کی ایک رباعی نقل کی ہے۔

ای گشتہ من از غم فراواں تو پست ؛ شد قامت من ز درد ہجران تو پست
ای شستہ من از فریب دوستان تو دست ؛ خود ہیچ کسے لیست و نشان تو ہست

اس کے بعد یہ صنف برابر ترقی کرتی رہی، اور مشکل ہی سے کوئی حکیم اور صوفی شاعر گذرا ہوگا، جس نے اس صنف میں کچھ طبع آزمائی نہ کی ہو، مثلاً عمارہ مروزی متوفی سنہ ۳۶۰ھ، عسجدی متوفی سنہ ۴۳۲ھ، ابوالحسن خرقانی متوفی سنہ ۴۲۵ھ، بابا افضل الدین کاشی (جو محمود غزنوی کے ہمعصر تھے) وغیرہ، ان میں ہر ایک کی طرف کچھ نہ کچھ رباعیاں منسوب ہیں، لیکن جس طرح سعدی نے غزل کو غزل بنایا اسی طرح رباعی کو جس نے سب سے زیادہ فروغ دیا اور دوسرے اصناف شاعری کے صف میں لا کھڑا کیا، وہ پانچویں صدی کے ایک بزرگ ابوسعید ابوالخیر[۱] (المتوفی سنہ ۴۴۰ھ) ہیں، اور اسی صدی کے آخر کا رباعی گو خیام ہے۔ ان دونوں نے اس صنف خاص ہی کو اپنا موضوع شاعری بنایا، اور خصوصاً خیام تو اس میں ایسا چھپ گیا، کہ اس کے دوسرے کارنامے اس کے سامنے ماند پڑ گئے، بلکہ نصف صدی پہلے رباعی گوئی کا دوسرا نام خیام ہو گیا تھا۔

خیام کے زمانہ اور اس کے بعد کے بہت سے شعراء نے اس نہال سخن کی آبیاری کی، خاص طور سے صوفیہ کی نگہداشت سے تو وہ بہت برگ و بار لایا، مثلاً عبداللہ انصاری (متوفی سنہ ۴۸۱ھ) شیخ فریدالدین عطار جن کی رباعیوں کی تعداد دس ہزار تک بتائی جاتی ہے، جن کا انہوں نے ایک انتخاب بھی کیا ہے، اس کا نام مختار نامہ ہے، اس میں تقریباً پانچ ہزار رباعیاں ہیں۔ لیکن ابوسعید ابوالخیر اور خیام کے بعد جسے صحیح معنوں میں رباعی گو شاعر کہا جاسکتا ہے، وہ سحابی استرآبادی ہے[۲]

---

[۱] شیخ ابوالخیر کی رباعیوں کا ایک مجموعہ شائع ہو گیا ہے جو ۴۵۳ رباعیوں پر مشتمل ہے۔ [۲] ہندوستان میں سب سے پہلے (باقی اگلے صفحہ پر)

سحابی کی رباعیاں تعداد میں خیام کی رباعیوں سے بہت زیادہ ہیں، مگر سحابی کی طبعی عزلت پسندی نے اس کے رنگ کو عام نہ ہونے دیا، اور خیام کی اباحیت پسندی اور رندی و ہوسناکی کے مضامین کی دل کشی اور اس کی فلسفیانہ کجروی کی وجہ سے اہل یورپ کو اس سے دلچسپی پیدا ہوئی اور انہوں نے اس کے فلسفہ وشاعری کو مقبول عام بنانے میں پورا حصہ لیا، استاذ الاساتذہ سید سلیمان ندوی رح نے اپنی کتاب "خیام" میں اہل یورپ کی خیام سے دلچسپی کے اسباب پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

سحابی کی وفات ۱۰۱۰ھ میں ہوئی، اسی صدی کے آخر میں سرمد کا ظہور ہوا، اور انہوں نے بھی اسی صنف خاص کو اپنی سخن وری اور شاعری کا ذریعہ بنایا، سلطان ابوسعید، شیخ ابوالخیر، خیام اور سحابی کے بعد سرمد چوتھے اور ایک معنی میں آخری شخص ہیں، جنہوں نے تمام اصناف شاعری کو چھوڑ کر صنف رباعی ہی کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔

سرمد کی رباعیاں گرچہ تعداد میں خیام اور سحابی وغیرہ کی رباعیوں سے کم ہیں مگر جتنی بھی ہیں وہ عقاید، اخلاق اور تصوف کے دقیق مسائل اور مباحث سے پر ہیں، اور زبان و ادب کے لحاظ سے بھی وہ بہت بلند اور نہایت شستہ و پاکیزہ ہیں، اور یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ فارسی میں اقلیم رباعیات کے آخری تاجدار سرمد ہیں۔

سرمد کے والدین، ان کی تاریخ پیدائش، بچپن کے حالات کے بارے میں تمام تذکرے خاموش ہیں، البتہ تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں دو چار جملے لکھے ہیں۔

قومیت اور وطن | سرمد کی قومیت اور وطن کے بارے میں ارباب تذکرہ میں تھوڑا سا اختلاف ہے مفتاح التواریخ اور مرآۃ الخیال میں ہے:

اصلش از فرنگستان ارمنی بود [1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ارمنی عیسائی تھے، مخزن الغرائب میں صرف اتنا ہے کہ:
"وے ارمنی بودہ [2]"، یعنی وہ ارمنی تھے۔

بقیہ حاشیہ گذشتہ:- مولانا شبلی نے اہل ادب کو سحابی کی شاعرانہ حیثیت سے روشناس کرایا، اس کے بعد ان کے مختصر مطبوعہ مجموعہ نے مزید دلچسپی پیدا کرائی، اور اب عام طور سے لوگ رباعی گوئی میں سحابی کا مرتبہ جاننے لگے ہیں۔

[1] مرآۃ الخیال ص ۲۱۶، مفتاح ص ۴۸۲ [2] ص ۱۸۱۔

صاحب ریاض الشعراء علی قلی خان داغستانی اور صاحب تذکرۂ حسینی کا بیان ہے کہ:

"او از یہودان کاشان بود[1]" یعنی وہ کاشان کے یہودیوں میں سے تھے۔

تذکرۂ حسینی میں ایک جگہ یہ بھی ہے کہ:

بعضے بر آنند کہ از فرنگیان ارمنی ہست،" یعنی بعض لوگوں نے یہ اظہار کیا ہے کہ وہ ارمنی فرنگیوں میں سے تھے

مگر سرمد کے عیسائی ہونے کی روایت صحیح نہیں ہے، تذکرۂ حسینی کے لفظ "بعضے بر آنند" ہی سے اس خیال کی کمزوری کا اظہار ہوتی ہے۔ دبستان المذاہب کا مصنف جو سرمد سے حیدرآباد دکن میں ملا تھا لکھتا ہے:

"او در اصل از نژاد دانشوران یہود است" یعنی وہ یہودی دانشوروں کی نسل سے تھے۔

اس بات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مذہبا سرمد یہودی تھے۔ عیسائی نہیں تھے، مگر یہ بات کہ وہ ارمنی یہودی تھے یا کاشانی یہودی۔ اس کا حل الجھا باقی ہے۔ لیکن ان دونوں رایوں میں کوئی تضاد نہیں ہے اس لئے کہ ایران میں قدیم زمانہ سے ارمنیوں کی آبادی موجود تھی، جو زیادہ تر عیسائی اور کچھ یہودی تھے اس لئے یہ ہو سکتا ہے کہ خود سرمد یا ان کے آباؤ اجداد میں سے کسی نے ایران میں آکر بود و باش اختیار کر لی ہو۔ اور اس بنا پر کچھ تذکرہ نویسوں نے ان کو ارمنی لکھدیا ہو، اور اس سے ان کے قدیم وطن سے ان کو نسبت دیدی ہو، اور جو تذکرہ نویس ان کو کاشانی یا کاشی لکھتے ہیں، وہ ان کے جدید وطن کاشان کی بنا پر لکھتے ہیں۔ جو ایران میں تھا۔ اور اس میں کوئی استبعاد نہیں ہے کہ تاریخ اور تذکرہ کی کتابوں میں بہت سے ایسے نام ملتے ہیں جو کئی کئی مقامات کیطرف منسوب ہیں۔

قبول اسلام | تذکروں سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ یہودی سے مسلمان ہوئے۔ مگر ان کے اسلام لانے کے متعلق کوئی اور تفصیل نہیں ملتی۔ اسلئے اس سلسلہ میں کوئی صحیح اور تاریخی ترتیب قائم کرنا بہت دشوار ہے۔

دبستان المذاہب کا بیان ہے[2]:

"بعد از اطلاع بر عقائد ربانین و قرأت توریت مسلمان شدہ"

---

[1] تذکرۂ حسینی ص ۱۴۵ و ریاض الشعراء قلمی۔ [2] دبستان المذاہب ص ۱۹۴۔ اس میں مصنف نے دنیا کے مختلف مذاہب کے عقائد اور بنیادی تعلیم کی تفصیل کی ہے، یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔

یعنی وہ ربانیین[1] کے عقائد سے واقف ہونے اور توراۃ کے مطالعہ کے بعد مسلمان ہو گئے۔ تذکروں کی ترتیب بیان سے یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندوستان آنے سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے[2] ایک رباعی میں بھی انہوں نے اسلام لانے کا ذکر کیا ہے۔

سرمد تو بسے نکو نام شدی ٭ از مذہب کفر سوئے اسلام شدی۔

نام اور تخلص | ان کے نام کا صحیح پتہ نہیں چلتا، اکثر تذکروں میں سرمد ہی کے نام سے ان کا ذکر ملتا ہے بعض تذکروں میں "سعیدائے سرمد" کے عنوان کے تحت ان کے حالات ملتے ہیں، صاحب ریاض العارفین نے "سرمد کاشی" کی سرخی کے تحت ان کے حالات لکھے ہیں۔ صاحب دبستان المذاہب نے محمد سعید نام لکھا ہے، چونکہ دبستان المذاہب کا مصنف حیدر آباد دکن میں ان سے مل چکا تھا اس لئے اس نے ذاتی واقفیت کی بنا پر یہ نام لکھا ہے۔ اس لئے یہی زیادہ صحیح ہے۔ ان کا تخلص سرمد ہے جس کے بارے میں اہل تذکرہ کا کوئی قابل ذکر اختلاف نہیں ہے۔ صرف طاہر نصیر آبادی نے تخلص کے متعلق لکھا ہے "تخلص گویا کاشت" یعنی ان کا تخلص کاشی ہے جو صحیح نہیں ہے۔ سرمد نے اپنی تمام غزلوں اور رباعیوں میں سرمد ہی تخلص استعمال کیا ہے۔ ان کے کسی ایک شعر یا رباعی میں کاشی تخلص نہیں ملتا۔ درحقیقت کاشی تخلص نہیں بلکہ ان کے وطن کاشان کی جانب نسبت ہے۔ اس نسبت سے بہت سے شعراء اور علماء کے حالات تذکروں میں ملتے ہیں۔ مثلاً ملا حیدر کاشی، افسر کاشی، شاہ باقر کاشی، بابا فغانی کاشی، اور مروزی کاشی وغیرہ ممکن ہے ان میں سے کسی شاعر نے کاشی تخلص بھی استعمال کیا ہو، لیکن اتنا تو متعین ہے کہ سرمد کا تخلص بہرحال کاشی نہیں ہے۔

فضل و کمال | سرمد کے تمام سوانح نگار ان کے فضل و کمال خصوصاً عربی دانی کے قائل ہیں اسلام لانے سے پہلے ان کا شمار علمائے یہود میں تھا۔ وہ توریت کے محرم اسرار تھے توریت کے علاوہ دوسرے صحف آسمانی یعنی زبور و انجیل کا بھی پورے طور پر مطالعہ کیا تھا[3]

صاحب دبستان المذاہب کا بیان ہے کہ میں یہود کے عقائد سے بالکل واقف نہیں تھا حیدر آباد دکن میں جب سرمد سے ملاقات ہوئی، اور ان کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا تو ان کے ذریعہ یہود کے عقائد

[1] ربانیین سے مراد علمائے یہود ہیں۔ [2] دبستان المذاہب ص ۱۹۴ [3] ایضاً ص ۱۹۵ اور دوسرے تذکروں میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

سے واقفیت ہوئی، میں نے توریت کا بہت سا حصہ فارسی میں ترجمہ کرکے سرمد کو دکھلایا، تو انہوں نے اس کی تصویب کی۔ یہ تفصیل تو نہیں ملتی کہ اسلام لانے کے بعد انہوں نے کون کون سے اسلامی علوم حاصل کئے۔ مگر اتنا پتہ چلتا ہے کہ اس وقت کے بڑے بڑے علماء کی خدمت میں رہ کر عربی علوم خصوصاً فلسفہ وحکمت میں جو اس وقت کے خاص علوم تھے دستگاہ بہم پہونچائی تھی۔ دبستان المذاہب میں ہے کہ:

"مسلمان شد وحکمیات درخدمت خردمنداں ایران چوں ملاصدرا و مرزا ابوالقاسم فندرسکی وجمعے دیگر خواند[1]"

یعنی مسلمان ہوئے اور حکمت وفلسفہ علمائے ایران شلاً ملا صدرا اور مرزا ابوالقاسم اور دوسرے بہت سے لوگوں سے حاصل کیا۔ فرحۃ الناظرین میں ہے:

"توریت وانجیل از برداشت بعد از اں کہ بشرف اسلام مشرف شد در اکثر علوم غور کرد وجامع فنون عربیہ گردید[2]"

یعنی توریت وانجیل کو از بر کر ڈالا تھا، اس کے بعد اسلام لائے اور اکثر اسلام فنون میں غور وفکر کیا، اور سارے علوم عربیہ کے جامع بن گئے۔ ریاض الشعراء میں ہے:

"از مکمل اولیائے عصر واز کبار دہر بودہ در فضیلت وعربیت نظیر نداشتہ ودر میدان سخن وری گوئے سبقت از بلغائے زماں می ربودہ[3]"

یعنی اس عہد کے ممتاز اولیاء اللہ میں ان کا شمار ہوتا تھا، عربیت میں ان کا کوئی نظیر نہیں تھا۔ اور شعر وشاعری میں تمام فصحائے زماں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

پیشہ | خاندانی پیشہ تجارت تھا، اسلام کے بعد بھی یہ مشغل قائم رہا، اور اسی سلسلہ میں ہندوستان میں ان کا آنا ہوا۔ اس وقت ایران کی مصنوعات اور وہاں کا سارا تجارتی سامان سندھ کے راستہ سے ہندوستان آتا تھا، اور ٹھٹھہ میں اس کا بہت بڑا تجارتی مرکز تھا، سرمد نے بھی تجارت کی غرض سے ایران سے ہندوستان کا رخ کیا، تو یہی شہر ٹھٹھہ ان کی پہلی منزل اور پہلا تجارتی مستقر بنا،[4] پھر وہ ہندوستان سے اپنے وطن ایران واپس نہیں گئے اور یہیں کے ہو رہے۔

عشق مجازی یا عشق حقیقی | ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ ٹھٹھہ کے زمانۂ قیام میں سرمد کو ابھے چند

---

[1] دبستان المذاہب ص ۱۹۲ [2] اقتباس فرحۃ الناظرین ص ۹۳ [3] ریاض الشعراء قلمی ص ۳۹ [4] مرآۃ الخیال

نام کے ایک ہندو لڑکے سے محبت ہوگئی[1] ممکن ہے کہ یہی تعلق ان کے ٹھٹھہ میں بودو باش اختیار کرنے کا سبب ہو، لڑکے کے والدین کو اس کی اطلاع ہوئی، تو انہوں نے سرمد کو اپنے گھر آنے اور قیام کرنے کی اجازت دے دی۔ ابھے چند نے سرمد کی صحبت میں رہ کر ان سے توریت و زبور اور دوسرے صحف سماوی کو پڑھا اور ان کے فیض صحبت سے چند دنوں کے بعد مسلمان بھی ہوگیا، ابھے چند توریت سے اس قدر واقف ہوگیا کہ اس کے ایک حصہ کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا، چنانچہ صاحب دبستان کا بیان ہے کہ اس نے اس ترجمہ کو سرمد کے سامنے پیش کیا، سرمد نے اس ترجمہ کی پوری تصویب کی۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

"ابھے چند پارہ از توریت بفارسی ترجمہ کردہ نامہ نگاراں را با سرمد مقابلہ کردہ سراسر آیاتش را تصحیح دادہ نشان گذاشتہ[2]"

ابھے چند کی جانب ایک فارسی شعر بھی منسوب ہے:

ہم مطیع فرقانم ہم کشیش و رہبانم
ربی یہودانم کافرم مسلمانم[3]

یہ شعر اور توریت کا ترجمہ فارسی زبان میں ابھے چند کی دستگاہ کا ثبوت ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں یہ بات اب بھی تشنۂ تحقیق ہے کہ سرمد نے تورات کا مطالعہ کس زبان میں کیا تھا، اور ابھے چند نے کس زبان سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا، راقم الحروف کو اس سلسلہ میں کوئی صراحت نہیں مل سکی اگر سرمد نے براہ راست عبرانی یا سریانی زبان کے ذریعہ تورات و زبور پڑھی تھی تو پھر ان کے صحیفۂ علم و فضل میں ایک باب کا اور اضافہ ہو جائے گا، مگر یہ بحث ابھی باقی رہ جاتی ہے کہ کیا ایران کے یہودیوں میں عبرانی زبان عام طور پر سمجھی جاتی تھی؟ جس طرح عرب کے یہودی علماء عام طور پر سریانی زبان کے ذریعہ تورات سے واقف تھے۔

سیاحت | سرمد بغرض تجارت ایران سے ہندوستان آئے، مگر ان کے دل کے اندر عشق و محبت کی جو چنگاری دبی ہوئی تھی، وہ یہاں آکر بھڑک اٹھی اور وہ ایسے مغلوب الحال ہوئے کہ بیخودی کے عالم میں کوچہ و بازار میں عریاں پھرنے لگے۔ اسی مجذوبانہ کیفیت میں صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی کرنے

---

[1] ریاض العارفین میں لکھا ہے کہ یہ واقعہ سورت میں پیش آیا، سرمد ایران سے پہلے سورت آئے، مگر یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ صاحب دبستان اور تمام تذکرہ نویس اس امر پر متفق ہیں کہ یہ واقعہ شہر ٹھٹھہ ہی میں پیش آیا اور وہ پہلے وہیں آئے۔ باقی اگلے صفحہ پر

ہوئے سندھ سے حیدر آباد دکن پہونچے اور پھر آخر عمر تک ظاہری طور پر ان کی یہ وارفتہ مزاجی باقی رہی۔
یہ پتہ نہیں چلتا کہ سرمد کاشان (ایران) سے آکر کتنے روز سندھ میں رہے، اور وہاں سے کب
حیدر آباد پہونچے، ذیل کے واقعات سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۰۵۹ھ سے پہلے حیدر آباد پہنچ گئے تھے۔[1]
حیدر آباد میں اس وقت عبداللہ قطب شاہ کی حکومت تھی۔ قطب شاہ کے ایک مشہور شیخ شیخ محمد خان[2]
تھے، سرمد سے ان کو بڑا تعلق ہوگیا، اور شیخ محمد سرمد کی صحبت کو بیحد پسند کرنے لگے، سرمد نے بھی ان کی
محبت کا حق ادا کیا، اور ان کی مدح میں ایک قطعہ لکھا۔

اے کہ مدار عرش را دائرہ عظیم استی ؛ کردہ بخدمت تو صد، ہمچو سپہر نوکری
نصف نہار وار کن شام من غریب را ؛ گر بجناب قطب چوں نصف نہار بزوری

سرمد کی دو پیش گوئیاں | سرمد کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی ظاہری وارفتہ مزاجی اور مجذوبانہ
کیفیت آخر عمر تک باقی رہی، مگر اس کے باوجود سندھ کے قیام سے لے کر شاہجہان آباد دلی کے زمانہ
قیام تک ان سے بے شمار ایسی باتیں ظہور پذیر ہوئیں۔ اور انہوں نے ایسی حال ایسے ایسے حکیمانہ اشعار
کہے ہیں کہ ان کی ظاہری حالت کو دیکھتے ہوئے اس کی توجیہ اس کے علاوہ سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ تسلیم کرلیا
جائے کہ تجلی الٰہی کی سوزش اور عشق حقیقی کی تپش نے انہیں "دیوانہ بکار خویش ہشیار" بنا دیا تھا۔
صاحب دبستان المذاہب کا بیان ہے کہ ایک روز میں سرمد کی مجلس میں موجود تھا
باجران نامی ایک شخص نے سرمد کے سامنے شیخ محمد کی تعریف کی، سرمد نے مجلس میں افسوس
کے انداز میں کہا کہ شیخ کے پاس جو کچھ اندوختہ ہے وہ عنقریب سفر آخرت کی نذر ہو جائیگا
اور میر محمد سعید میر جملہ جلد ہی کسی بڑے عہدے پر فائز ہوں گے۔ اتفاق سے سرمد کی یہ دونوں

بقیہ حاشیہ گذشتہ: سورت میں آنا اور رک جانا ثابت نہیں ہے۔ ۲ مخزن الغرائب ص ۱۹۵ ۳ چونکہ ایران
میں سند صیت کا اثر ہوگا۔ اس وجہ سے قیس (ق) کو کشش (ک) سے ادا کیا ہوگا۔ حاشیہ صفحہ ھذا
[1] دبستان المذاہب ص ۱۹۵ [2] تذکرہ نصیر آبادی میں ہے کہ شیخ محمد خان شیخ محمد خاتون کے نام سے مشہور تھے، اس
کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان کے اجداد میں کسی کی شادی خاتون شاہی سے ہو گئی تھی، اس لئے ان کی نسل
سے جتنے لوگ ہوئے خاتون سب کے نام کا جز ہو گیا، شیخ محمد اپنے وقت کے نامور فضلاء میں سے تھے
انہوں نے امام نووی کی اربعین کی شرح بھی لکھی ہے، اس کی تفصیل تذکرہ مذکور ص ۱۵۹ میں ملے گی۔

پیشن گوئیاں پوری ہوگئیں۔ شیخ اسی سال ۱۰۵۹ھ[1] میں سفر حج کو روانہ ہوئے، بندرگاہ مخا میں پہنچ کر داعیٔ اجل کو لبیک کہا، اور میر جملہ قطب شاہ سے ناخوش ہو کر عالمگیر کی خدمت میں دہلی چلے آئے۔ عالمگیر نے ان کا بڑا اعزاز کیا، اور منصب پنج ہزاری عطا کیا۔[2]

سرمد شاہجہاں آباد میں | سرمد کی وارفتہ مزاجی نے یہاں بھی زیادہ دنوں سکون سے نہ رہنے دیا، اور وہ افتاں وخیزاں حیدر آباد سے شاہجہاں آباد پہونچے۔

یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ حیدر آباد میں کتنے روز رہے اور کب اس کو چھوڑا۔ وہاں سے براہ راست شاہجہاں آباد پہونچے، یا درمیان میں اور بھی کہیں گئے۔ ۱۰۵۹ھ کے بعد وہ دفعۃً گم ہو جاتے ہیں، اور پتہ نہیں چلتا کہ وہ اس مدت میں کس کس "وادیٔ ایمن" کی سیر کرتے رہے۔ اور ۶-۷ برس گم شدگی کے بعد یکایک شاہجہاں آباد کے کوچہ و بازار میں گھومتے پھرتے نظر آنے لگے۔

غالباً دلی میں ان کی آمد ۱۰۶۷ھ سے پہلے ہو گئی تھی۔ اس لئے کہ وہ شاہجہاں کے زمانہ میں دلی آئے تھے، اور اس نے ان کو قلعہ معلی میں طلب بھی کیا تھا، اور یہ معلوم ہے کہ شاہجہاں ۱۰۶۸ھ کے شروع میں یا ۱۰۶۷ھ کے آخر میں بیمار ہو کر دلی سے آگرہ چلا گیا تھا، جس کے بعد وہ پھر دلی نہیں آیا۔ اس لئے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ سرمد ۱۰۶۷ھ سے پہلے دلی آ گئے تھے۔

دلی آنے سے پہلے ہی یہاں سرمد کی شہرت ہو چکی تھی، چنانچہ جب وہ آئے تو ان کو دیکھنے اور ان کا عارفانہ کلام سننے کے لئے سارا شہر امنڈ پڑا۔ داراشکوہ کو مجذوبوں اور درویشوں سے خاص انس تھا۔ اس لئے اس کو سرمد جیسے مجذوب سے بھی انس پیدا ہو گیا۔ اور اس نے شاہجہاں کے سامنے ان کی تعریف کی، شاہجہاں نے یہ سن کر ایک روز سرمد کو قلعہ میں طلب کیا، اور عنایت خاں کو ان کے حالات اور ان کے کشف و کرامات کی تحقیق کا حکم دیا، عنایت خاں سرمد سے ملاقات

---

[1] اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۰۵۹ھ سے پہلے حیدر آباد پہونچ گئے تھے، [2] دبستان المذاہب ص۱۹۵

میر جملہ سے قطب شاہ کی ناخوشی کی وجہ یہ ہوئی کہ میر جملہ نے کرناٹک کے مضافات میں خود اپنی ایک ریاست قائم کر لی تھی، گو وہ قطب شاہ کی ماتحتی میں تھی، مگر اس کے خدم وحشم اور شان و شکوہ کو دیکھ کر لوگوں نے قطب شاہ کو اس سے بدظن اور برگشتہ کر دیا، اس کے علاوہ بھی کچھ باتیں ایسی ہوئیں کہ وہ دل برداشتہ ہو کر عالمگیر کے پاس دہلی چلا آیا، مآثر الامراء ج ۳ ص ۵۳۰ تا ۵۴۰ میں تفصیل ملیگی۔

کر کے دربار میں واپس ہوا تو بادشاہ کے سامنے یہ شعر پڑھا[1]۔

بسرمد برہنہ کرامات تہمت است   کشفے کہ ظاہر است ازو کشف عورت است

یعنی برہنہ سرمد کیطرف کرامات کی نسبت ایک الزام ہے۔ ان کا ظاہر کشف یہ ہے کہ وہ برہنہ ہیں

شاہ جہاں نے کہا۔

"بیک گز کرپاس دہان خلق را می تواں بست[2]" یعنی ایک گز کپڑا زبان خلق کو خاموش کر سکتا ہے۔

اس سے معلوم ہو گیا تھا خود شاہجہاں کو سرمد سے محبت اور انس ہو گیا تھا اور اس کی خواہش

تھی کہ سرمد برہنہ جسم بر سر بازار نہ پھرتے تو اچھا تھا کہ اس سے خواہ مخواہ لوگوں کو گرفت و

ملامت کا موقع ملتا ہے۔

سرمد کی شہادت | ۱۰۶۹ھ میں عالمگیر تخت نشیں ہوا اور باختلاف روایت[3] اس کے

ایک ہی سال یا دو سال کے بعد سرمد کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ اس کے اصلی اسباب کے

بارے میں قدیم ارباب تذکرہ و تاریخ زیادہ تر خاموش ہیں یا اس کو اس طرح بیان کیا ہے

کہ اصلی اسباب کی تلاش و جستجو اور صحیح نتیجہ پر پہونچنا مشکل ہے۔ صاحب مرأۃ الخیال کا جو

ان واقعات کا دو ایک واسطوں سے راوی ہے' بیان ہے کہ۔

"سرمد را تکلیف لباس کردند او از فرط مالیخولیا تن درنداد و فی شہور سنۃ الف و احدیٰ و

سبعین بہ تیغ امر شریعت غرا مقتول شد و عمدہ در کشتن سرمد ایں رباعی بود از و شائبۂ انکار

معراج لازم می آید[4]"

سرمد کو لباس پہننے کیلئے کہا گیا تھا مگر مالیخولیا کیوجہ سے برہنہ ہو گئے تھے۔ ۱۰۷۱ھ میں شریعت

کے حکم کے تحت قتل کئے گئے۔ پھر وہ لکھتا ہے کہ سرمد کے قتل کا بنیادی سبب درج ذیل رباعی ہے

---

[1] و [2] کلمات الشعراء، تذکرہ حسینی اور تذکرہ نصر آبادی وغیرہ

[3] مرأۃ الخیال کے بیان کے مطابق دو سال بعد ۱۰۷۱ھ میں اور خلاصہ مفتاح التاریخ کے قول کے مطابق

ایک سال بعد ۱۰۷۰ھ میں یہ واقعہ پیش آیا۔ مگر مرأۃ الخیال کا بیان صحیح ہے کہ وہ اسی عہد کا مصنف ہے۔

[4] مرأۃ الخیال ص ۲۱۶

جس سے معراج جسمانی کا انکار ثابت ہوتا ہے۔

آنکہ سر حقیقتش باور شد | خود پہن تر از سپہر پہنا ور شد
ملا گوید کہ بر شد احمد بفلک | سرمد گوید فلک با حمد در شد

گویا صاحب مرآۃ الخیال کے نزدیک عریانی کے ساتھ مذکورہ رباعی ان کے قتل کا سبب اصلی ہے۔ کلمات الشعراء کا جو گیارہویں صدی کے آخر یا بارہویں صدی کے شروع کی تصنیف ہے بیان ہے کہ۔

بسبب الحاد وعریانی بفتوائے علمائے زمان بقتل رسیدہ۔"

اس بیان میں الحاد اور عریانی کو قتل کا سبب ظاہر کیا گیا ہے لیکن الحاد کی کوئی تفصیل نہیں ہے۔ صاحب ریاض العارفین اور صاحب تذکرۂ حسینی اور دوسرے تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ سرمد کے قتل کی اصلی وجہ سرمد سے ملا عبدالقوی اور عالمگیر کی ناراضی تھی۔ اور اس ناراضی کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

ملا عبدالقوی کی ناراضی کی وجہ تو معاصرانہ چشمک کے علاوہ اور کچھ نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ سرمد ایک غیر معمولی شخص تھے اور علم وفضل کے لحاظ سے بھی وہ ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ان سب سے بڑھکر یہ کہ داراشکوہ ان کا عقیدت کیش تھا اور عوام میں بھی بہت سے لوگ ان کے نیازمند تھے۔ ایسی صورت میں قاضی عبدالقوی صاحب کی چشمک کوئی مستبعد بات نہیں ہے۔ صاحب ریاض العارفین کا بیان ہے کہ

" محمد داراشکوہ دم از اخلاص کیشی او قاضی قوی تعاضی شہر را با سرمد کینہ بہم رسید۔"

تذکرہ نویسوں نے عالمگیر کی ان سے ناراضی کی سیاسی وجہ یہ لکھی ہے کہ سرمد نے پیشینگوئی کے طور پر یہ مژدہ سنایا تھا کہ شاہ جہاں کے بعد وہی تخت سلطنت کا وارث اور بادشاہ ہوگا۔ اس لئے جب داراشکوہ کی ناکامی کے بعد عالمگیر تخت نشین ہوا تو اس نے سرمد سے دریافت کیا کہ تم نے داراشکوہ کو بادشاہت کی خوشخبری دی تھی لیکن وہ تو غلط ثابت ہوئی۔ سرمد نے جواب دیا کہ وہ خوشخبری صحیح نکلی کہ اسے ابدی سلطنت کی تاجپوشی نصیب ہوئی۔ قاضی عبدالقوی نے جو پہلے ہی سے ان سے ناراض تھے عالمگیر کی اس ناراضگی سے فائدہ اٹھایا

اور سرمد سے انکی عریانی کے متعلق باز پرس کی۔ ریاض العارفین میں ہے کہ سرمد نے یہ جواب دیا "سرمد چوں مقصود دے برامی دانست گفت شیطان قوی است" اور یہ رباعی پڑھی۔

خود بالائے کردہ چنیں پست مرا — چشمے بدو جام بردہ از دست مرا

او در بغل من است دمن در طلبش — وزد عجیبے برہنہ کردہ است مرا

قاضی صاحب کا نام قوی تھا اس لئے انھوں نے اسے اپنے اوپر طنز سمجھا اور بادشاہ سے سرمد کی شکایت کی اور عریانی کا جرم قائم کرکے ان کے قتل کا مشورہ دیا۔ مگر عالمگیر ان سے ناراض ہونیکے باوجود یہ سمجھتا تھا کہ سرمد کو اس جرم میں قتل نہیں کیا جا سکتا۔ پھر دلی کے بہت سے لوگ ان کے معتقد بھی ہیں۔ اگر بغیر کسی معقول وجہ کے ان کو قتل کیا گیا تو بلا وجہ خون ناحق کا الزام اس پر عائد ہوگا۔ چنانچہ اس نے کہا کہ صرف عریانی وجہ قتل نہیں ہوسکتی۔ تمام علماء اگر جمع ہوکر قتل کا فتویٰ صادر کریں تو اس کی تعمیل کی جائیگی۔ چنانچہ علماء کا اجتماع ہوا۔ سرمد بھی طلب کئے گئے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ کلمہ کا ایک جز یعنی صرف لا الٰہ پڑھتے ہیں اور دوسرا جز نہیں پڑھتے۔ چنانچہ جب دربار میں ان سے کلمہ پڑھنے کیلئے کہا گیا تو[1] انہوں نے اپنی عادت کے مطابق کلمہ کا ایک جز یعنی صرف لا الٰہ پڑھا۔ علماء نے اعتراض کیا کہ یہ جائز نہیں ہے۔ سرمد نے جواب دیا کہ میں ابھی نفی میں مستغرق ہوں مرتبۂ اثبات پر نہیں پہونچا ہوں۔ علماء نے پھر ان سے ستر پوشی اور پورا کلمہ پڑھنے کیلئے کہا تو انھوں نے پھر وہی جواب دیا۔ علماء نے کہا ایسا کہنا کفر ہے

[1] ریاض الشعراء در ریاض العارفین [2] یعنی تذکروں میں ہے کہ جب سرمد دربار میں آئے تو خود عالمگیر نے ان سے عریانی کے متعلق دریافت کیا۔ انھوں نے صرف یہ رباعی پڑھی اور کوئی جواب نہیں دیا۔

آنکس کہ ترا سریر سلطانی داد — ما را ہمہ اسباب پریشانی داد

پوشاند لباس ہر کرا عیبے دید — بے عیباں را لباس عریانی داد

اگر کہنے والا توبہ نہ کرے تو واجب القتل ہے اور ان کے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا گیا[1]
شاہ اسد اللہ علیہ الرحمہ کا جو ایک صاحب دل بزرگ اور سرمد کے پرانے رفیق تھے۔
بیان ہے کہ سرمد کے قتل کا فتویٰ صادر ہونے کے بعد میں ان کے پاس گیا اور کہا کہ آپ کپڑا
پہن لیجئے اور کلمۂ لا الٰہ الا اللہ پورا پڑھ لیجئے تاکہ آپ کی جان بخشی ہو جائے مگر انھوں نے
اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور مجھ پر ایک نظر ڈالی اور یہ شعر پڑھا[2]۔

عمریست کہ آوازۂ منصور[3] کہن شد
من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

سرمد کا مدفن اور مشہد؎ قتل کے فتوے کے بعد جب سرمد کو دربار سے قتل گاہ کی طرف لے چلے
تو ایک ہجوم بھی ساتھ ہو گیا۔ سرمد کو جتنی دیر میں قلعہ سے جامع مسجد تک لے جایا گیا اتنی
ہی دیر میں انھوں نے فی البدیہہ بیسیوں رباعیاں کہہ ڈالیں سرمد اس اطمینان اور
سکون کے ساتھ مقتل کی طرف جا رہے تھے کہ گویا اس فیصلہ کا ان کے قلب پر کوئی اثر نہیں
ہے۔ شہادت گاہ پہنچ کے بعد جلاد جو نہی تلوار لیکر ان کی طرف بڑھا انھوں نے مسکرا کر
یہ شعر پڑھا۔

رسیدہ باز عریاں تیغ ایں دم بہر رنگے کہ آئی می شناسم

اور یہ فقرے کہے۔

ایں جلوہ است کہ دیگر بکار بائی کنی و بر سر پائے من نشینید کہ گردنش را می زند۔
اس کے بعد یہ اشعار پڑھے اور مردانہ وار سر تلوار کے نیچے رکھ کر جان دیدی۔

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

سر جدا کرد از تنم شوخ کہ با یار بود قصہ کوتاہ کرد ورنہ درد سر بسیار بود

---

[1] تذکرۂ حسینی۔ [2] مخزن الغرائب و ریاض العارفین۔ [3] اشارہ ادھر شیخ منصور حلاج ہیں جنکو انا الحق کہنے کے جرم میں قتل کیا گیا

ریاض العارفین اور دوسرے تذکروں میں ہے کہ سرمد نے زندگی میں کلمۂ لا الہٰ سے زیادہ نہیں پڑھا۔ لیکن شہادت کے بعد لوگوں نے سنا کہ اس کے سر کشتہ سے تین بار لَاۤ اِلٰہَ اِلاَّ اللہ کی صدا بلند ہوئی۔ علی قلی خاں والہ داغستانی کا بیان ہے کہ ایک ثقہ جماعت سے سنا گیا ہے کہ سرمد کا سر مقتول بہت دیر تک کلمۂ طیبہ پڑھتا رہا۔

سرمد کی قبر کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جہاں سرمد کی قبر بتائی جاتی ہے وہ ان کا مدفن نہیں ہے۔ مگر بعض تذکرہ نویسوں نے یہ تصریح کر دی ہے کہ۔

" در جنب مسجد جامع گردن او زدند و در ہمانجا دفن کردند "

یعنی مسجد جامع کے پہلو میں جہاں انکی گردن ماری گئی وہیں دفن بھی کئے گئے۔ اس لئے ان کا مشہد و مدفن دو مختلف جگہ نہیں بلکہ ایک ہی جگہ ہے۔ اور وہ آج تک زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ اس منصور ہندی کے مزار کا سبزہ پورے سال ہرا بھرا رہتا ہے ـــ والہ داغستانی نے اس کی کیفیت ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

" راقم الحروف بہ زیارتِ مزار وے مکرر مشرف شدہ ام، در چہار فصل سبزہ زار تربتش کم نمی شود ـــ والحق فیض عجیبے در زیارتِ آں منصور ثانی است۔

مگر اب وہاں نہ سبزہ ہے اور نہ اس کی سرسبزی و شادابی ہے۔ اب ان کے مزار کی حیثیت ایک دوکان کی ہو گئی ہے۔

اخلاقِ سلف

از بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی مدظلہٗ

سلف صالحین کے اخلاق کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ جب محرمات کی پردہ دری ہوتی تو وہ اللہ تعالیٰ کیلئے شریعتِ مطہرہ کی امداد کی خاطر غیرت کھاتے، لہٰذا وہ کوئی کام نہ کرتے اور نہ کسی شخص سے ملتے جب تک انکو یہ معلوم نہ ہو کہ یہ کرنے یا اس سے ملنے سے اللہ تعالیٰ راضی ہے تو دنیاوی غرض کیلئے نہ کسی سے دوستی کرتے نہ دشمنی۔

چنانچہ حدیث میں آیا ہے اَلْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہِ مِنْ اَوْثَقِ عُرَی الْاِیْمَانِ۔ یعنی اللہ کے لئے محبت کرنا اللہ ہی کیلئے دشمنی کرنا ایمان کی مضبوط دستاویزوں میں سے ہے۔ جو شخص ثواب کیلئے جن وانس جتنی عبادات کرے لیکن وہ حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کے موجبِ رضائے الٰہی ہونے سے غافل ہو تو وہ طریق تصوف سے خارج ہے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، جب تیرا کوئی دوست ہو تو اس کی محبت کے بارے میں اس سے نہ پوچھ بلکہ اپنے دل کو دیکھ کیونکہ جو تیرے دل میں ہوگا ویسا ہی اس کے دل میں ہوگا۔ سفیان ثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے، جب کوئی بدعت پیدا کرے اور جو اس کی دوستی کا دعویٰ کرتا ہے پھر اس خیال سے اس سے عداوت نہ رکھے کہ میرا بھائی ہے، تو اس کی محبت اللہ تعالیٰ کیلئے نہیں، کیونکہ اگر اللہ کیلئے ہوتی تو ضرور اس کی نافرمانی پر ناراض ہوتا۔

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں" قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک شخص آئے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے کہے گا، کیا تو نے میرے لئے کسی سے محبت کی ہے کہ میں تجھے اس کے طفیل معاف کروں۔ لہٰذا تم نیک لوگوں سے محبت کرو اور ان پر احسان کرو کیونکہ قیامت میں صاحبِ دولت وہی ہوں گے۔

حسن بصریؒ فرماتے ہیں' فاسق کی مخالفت کرنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے قرب کا سبب ہے میں کہتا ہوں
اس سے مراد اس کے ساتھ دل سے رنجیدہ ہونا ہے اور ظاہراً مخالفت مناسب نہیں کیونکہ اس کو راہ راست
پر لانا چاہئے۔ بغض صرف اس کی صفات فسق کے ساتھ خاص ہونا چاہئے' کیونکہ یہ ہر خدا کی طرف بلانے
والے کی گمشدہ مطلوب چیز ہے۔ اس میں غور کرو۔ واللہ اعلم۔

حسن بصریؒ فرماتے ہیں' جو دعویٰ کرے کہ وہ کسی بندے سے محض اللہ کیلئے محبت کرتا ہے اور
پھر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر اس سے ناراض نہ ہو تو وہ جھوٹا ہے۔ محمد بن حنفیہؒ فرماتے ہیں' جو کسی
کافر سے اس کی کسی خوبی کے باعث محبت کرے تو اللہ اس کو اجر دیتا ہے۔ ایسے ہی اگر کسی نیک
آدمی سے کسی برائی کے سبب دشمنی رکھے تو اللہ تعالیٰ اسے بھی اجر دے گا۔ مالک بن دینارؒ
کے سامنے اگر کتا آ بیٹھا تو اسے نہ دھتکارتے اور فرماتے' برے دوست سے یہ اچھا ہے۔ آدمی
کیلئے برا ہونے کو یہی کافی ہے کہ وہ خود نیک نہ ہو پھر نیک لوگوں کو برا کہے۔

احمد بن حربؒ فرماتے ہیں' انسان کے دل کی اصلاح کیلئے نیک لوگوں سے ملنا اور ان کے
اعمال کو بغور دیکھنا نہایت مفید ہے اور فاسقین کی دوستی اور ان کے اعمال پر نظر رکھنے سے
بڑھ کر اور کوئی چیز مضر نہیں۔ یحییٰ بن معاذؒ فرماتے ہیں اللہ کا ولی زمین میں خوشبو ہے' جب مرید
سونگھتے ہیں اور ان کی خوشبو دلوں تک پہنچتی ہے تو اللہ کے مشتاق ہو جاتے ہیں۔

اے دوست! اپنی حالت پر غور کر' کیا تو کسی سے محض اللہ کے لئے موافقت رکھتا ہے
اور تجھے کسی سے محض خدا تعالیٰ کیلئے عداوت ہے' یا محض نفسانی آرزو کیلئے ہی دوستی کرتا
اور خفا ہوتا ہے' اگر ایسا ہے تو پھر تو اپنے اوپر رو اور دن رات استغفار کر۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ :۔

کیا واقعی سنگھ خاموش ہے؟

:- رجنیش

کیا راشٹریہ سویم سیوک سنگھ سچ مچ خاموش ہے؟ یا وہ خفیہ طور سے اپنی اسکیم کے مطابق کام کر رہا ہے؟ یہ سوال بہت سے لوگ پوچھ رہے ہیں۔ سیاسی پارٹیاں اور ان کے لیڈر اگرچہ آئے دن تنقید کرتے رہتے ہیں پھر بھی اس کی طرف سے کسی طرح کا کوئی ردِ عمل دکھائی نہیں دیتا۔ سنگھ حقیقتاً خاموش ہے لیکن مفلوج نہیں ہے۔ سنگھ کا کام کرنے کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اپنی اسی خوبی کے سہارے وہ زندہ ہے اور شاید اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک ہندوستان میں فرقہ پرست طاقتیں سیاسی برتری کیلئے کام کرتی رہیں گی۔

جنوب میں کنیا کماری سے لیکر شمال میں ہمالیہ اور مغرب میں پنجاب سے لیکر مشرق میں آسام تک سنگھ کا خفیہ جال پھیلا ہوا ہے۔ یہ جال اتنا سخت ہے کہ ہماری حکومت اس کا ایک دھاگہ بھی نہیں توڑ پاتی۔ سنگھ وزیر اعظم کی کرسی کے نیچے بیٹھا ہے۔ راشٹرپتی بھون کی رکھوالی کر رہا ہے۔ اور وزارت داخلہ کی خفیہ فائلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس تہذیبی اتحاد کے پردے میں گہری سیاسی ذمہ داری کا بارگراں اسی کے کندھوں پر ہے۔ سنگھ انتخابات میں حصہ نہیں لیتا۔ لوک سبھا اور اسمبلیوں میں اسے سیٹ نہیں چاہیئے۔ اس کا یہ بھی ارادہ نہیں کہ کوئی حکومت بنے تو اس کے اصولوں کی معاون ہو۔ سنگھ سیاسی بازیگری نہیں کرتا لیکن سیاسی مہروں پر اس کی نظر رہتی ہے۔ یہ سیاسی پارٹیوں اور ان کے لیڈروں سے کام لیتا ہے۔ انھیں کٹھ پتلیوں کیطرح نچاتا ہے۔ لیکن ان پر بھروسہ نہیں کرتا۔ اگر وہ کسی پر بھروسہ کر سکتا ہے تو وہ صرف اس کی پارٹی کے قابل اعتماد ممبر ہیں۔ سیاسی پارٹیاں اپنی مذہبی غیر جانبداری کی دھاک بٹھانے

کیلئے سنگھ کو نشانہ بناتی ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کی ساری ذمہ داری اس کے کندھوں
پر ڈال دی جاتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سنگھ آسام کے فسادات میں چھپ کر بیٹھا ہے۔
وہ پنجاب میں فرقہ واریت کا زہر بونے کا ذمہ دار ہے۔ وہی جموں کشمیر میں ہندو فرقہ
واریت کو ہوا دے رہا ہے۔ وہی کیرالا اور مغربی بنگال کی مارکسوادی سرکاروں کے
خلاف تشدد آمیز تحریک چلا رہا ہے، وہی اور ناچل پردیش میں عیسائیوں کے خلاف
مہم چلا رہا ہے، شمالی ہند میں وہی مسلم کش فسادات کا ذمہ دار ہے۔
اس طرح سنگھ کہاں نہیں ہے یعنی ہر جگہ موجود اور رگ رگ میں سمایا ہوا ہے۔ یہی
سرکاری وغیر سرکاری سیاسی پارٹیوں کا خیال ہے۔ ہندوستان میں شاید ہی کوئی سیاسی
پارٹی ایسی ہو جو مسلم ووٹ حاصل کرنے کیلئے سنگھ کی شکایت نہ کرتی ہو اور اس طرح
سنگھ کی ملک گیر تبلیغ واشاعت میں مدد نہ کرتی ہو۔ حزب مخالف کی تو بات ہی اور ہے
حزب اقتدار بھی سنگھ کی تنقید میں پیش پیش ہے۔ وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی جب
کبھی فرقہ وارانہ مسائل پر اظہار خیال کرتی ہیں تو سنگھ کے تذکرہ کے بغیر اپنی تقریر ختم
نہیں کرتیں۔ یہ کام پنڈت جواہر لال نہرو اور شری لال بہادر شاستری بھی کرتے تھے مگر
وہ لوگ سنگھ کی تنقید کیلئے اپنے آدمی کو بھیج کر معافی مانگ لیتے تھے اور کسی بھی مصیبت
کی گھڑی میں ناگپور مرکز کی مدد مانگنا نہیں بھولتے تھے۔ ہمارے بڑے لوگوں کی سنگھ سے
محبت یا نفرت صرف سیاسی پلیٹ فارم تک محدود تھی۔ شریمتی اندرا گاندھی بھی یہی کرتی ہیں۔
سنگھ سے مدد مانگنا اور پھر کام نکل جانے کے بعد گالی دینا حکمراں طبقے کا یہی کردار رہا
ہے۔ لیکن سنگھ کو اس سے کسی طرح کی کوئی شکایت نہیں ہے۔ سنگھ نے کسی کو نہیں پھنسایا
شریمتی اندرا گاندھی سے لیکر چودھری چرن سنگھ، جگجیون رام وغیرہ سبھی اسکی مدد لے
چکے ہیں اس کے باوجود سنگھ کبھی کسی کے خلاف پرچار نہیں کرتا اور نہ کھل کر کبھی حصہ
لیتا ہے۔ سنگھ وقت کی تیز دھار کو سمجھتا ہے اور اسی کے مطابق اپنی حکمت عملی کا جال
بچھاتا ہے۔ اسی لئے شاید ہندوستانی سیاست پر جتنی مضبوط گرفت سنگھ کی ہے اتنی

اور کسی کی نہیں ہے۔

سنگھ کی خاموشی بے سبب نہیں ہوتی اس کا کوئی گہرا مقصد ہوتا ہے۔ سنگھ خاموش نہیں
ہے وہ اپنا کام اور تیزی سے کر رہا ہے۔ آج کے
کے ماحول میں سنگھ ایک خفیہ سرکار
چلا رہا ہے۔ اس سرکار کا نشانہ انتشار نہیں بلکہ مستحکم قوم پرستی ہے جس کا انتظار سنگھ ایک
لمبے عرصے سے کر رہا ہے۔ انھیں اندھی قوم پرستانہ حرکات اور اصولوں کو تقویت پہنچانے
کے سبب سنگھ کو نازی ازم کا ہم معنی بھی سمجھا جاتا ہے جس کا آخری نتیجہ جرمنی کی شکست
اور تقسیم پر منتج ہوا تھا لیکن سنگھ کا ایسا کوئی مقصد نہیں ہے۔ نازی ازم دنیا کو فتح
کرنے کی بیمار ذہنیت کا مریض تھا مگر سنگھ سرزمین ہند کی حفاظت، سالمیت، وحدت
اور خود مختاری کیلئے قربان ہے۔ سنگھ کمیونزم کا زبردست مخالف ہونے کے باوجود چین
کی تعدیق صرف اس کے مضبوط قوم پرستانہ رجحان کی وجہ سے کرتا ہے۔ اس طرح سنگھ
ایک بہت ہی مضبوط مگر موہوم قوم پرستی کی دیوار پر کھڑے محل کے مانند ہے جو ماضی
کے شاندار افسانوں میں زندہ ہے اور حال کے دردوں سے کراہ رہا ہے۔

فرقہ واریت اور سنگھ

سنگھ ہندو احیاء پرستانہ تحریک ہے۔ اس کا مقصد ہندوستان کو ہندو راشٹر
(قوم) میں تبدیل کرنا ہے۔ اسی زاویہ نظر کی وجہ سے مسلم مخالف ہے۔ سنگھ کا ایک خاص
الزام یہ ہے کہ ہندوستان کا مسلمان خود کو ہندوستانی نہیں سمجھتا۔ اس کی عقیدت اور
محبت کا مرکز ہندوستان نہ ہو کر عرب یا پاکستان ہے۔ سنگھ اس کا انتہائی مخالف
ہے۔ سنگھ کی ہندوستانی قومیت کی تعریف کے ضمن میں اس ملک کا ہر باشندہ
خواہ وہ کسی بھی مذہب میں یقین رکھنے والا کیوں نہ ہو، پہلے ہندوستانی ہے پھر بعد میں اور سب
انتہائی خطرناک فرقہ پرستی ہے جبکہ سنگھ اسے حب الوطنی تصور کرتا ہے۔ یہی اندرونی
مخالفت کا خاص سبب ہے۔ سنگھ سنچالک بالا صاحب دیورس کا کہنا ہے کہ کسی بھی دین
و مذہب کا ماننے والا آدمی سنگھ کا ممبر ہو سکتا ہے اگر وہ دل سے اپنے کو ہندوستانی مانتا ہے۔

اور ہندوستانی تہذیب و طرز حیات سے عقیدت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے گوشے گوشے میں اس کے اراکین مل جائیں گے۔

فرقہ پرستی ایک سیاسی چال ہے۔ سنگھ اس چال کا ایک مہرہ ہے۔ حکومت سنگھ پر قانونی پابندی لگانے کیلئے فرقہ پرستی کا الزام لگاتی ہے مگر ہمیشہ ناکام رہتی ہے۔ پتہ نہیں حکومت کیوں خوف زدہ ہے۔ سنگھ کے علاوہ بھی دوسری کئی فرقہ پرست پارٹیاں ہیں۔ مسلم لیگ، جماعت اسلامی اور سکھوں کا اکالی دل اور کشمیر کی نیشنل کانفرنس بھی ایک طرح کی فرقہ پرست جماعت ہے۔ جب اکالی دل اور نیشنل کانفرنس بھی آر۔ ایس۔ ایس پر پابندی عائد کرنیکی باتیں کرتی ہیں اور سرکار سے مانگ کرتی ہیں تو حالت افسوسناک ہوجاتی ہے۔ ہندو فرقہ واریت ردعمل کی پالیسی کے بطور وجود میں آئی ہے جبکہ سکھ فرقہ پروری اور مسلم فرقہ پرستی کون سی ترقی پسندی کی نشاندہی کرتی ہے کہا نہیں جاسکتا۔ سنگھ فرقہ پرست ضرور ہے مگر غدار وطن نہیں ہے کیونکہ ہندوستان کے باہر اس کی عقیدت و محبت کا کوئی مرکز نہیں ہے۔

سیکولرزم اور سنگھ

ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے۔ اس کی سیکولرزم کی بنیاد یہاں کے باشندوں کی مذہبی رواداری اور ہر مذہب کے ساتھ یکساں سلوک اور اتحاد پر ہے۔ اگر اس ملک میں ہندوؤں کے علاوہ کسی اور مذہب کے ماننے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی تو کم از کم لامذہبیت تو ہرگز نہ ہوتی۔ سنگھ سیکولرزم کے اصولوں کی مخالفت اس بنیاد پر کرتا ہے کہ دوسرے مذاہب کے ماننے والے قومی دھارے کے ساتھ کیوں نہیں چلتے۔ سیکولرزم کے مقاصد کے حصول میں ہماری حکومت ناکام رہی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک مذہبی اور تہذیبی طور پر جکڑے ہوئے ملک میں لادینیت ہو بھی کیسے سکتی ہے؟ جس ملک میں اقلیت تاریخ کے طویل عرصے تک اکثریت پر حاوی رہ چکی ہے اور اس کے تمام انسانی حقوق کی پامالی تلوار کے زور پر کرتی رہی ہے وہاں صرف قانون بنا دینے سے دو فرقوں کی تلخی کم نہیں ہوگی۔ ہندوستان میں فرقہ

وارانہ رواداری قائم کرنے کے سارے عزائم اسی لئے اب تک ناکام ہو چکے ہیں۔

راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ اکثریتی ہندوؤں کی جماعت نہیں ہے۔ اگر اسے ہندوؤں کی پوری حمایت حاصل ہوتی تو اس کی حالت ہی کچھ اور ہوتی۔ یہ سنگھ ہندوؤں کے صرف ایک طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے جو خود قومیت کے مخصوص دھارے میں نہیں ہے وہ دوسروں کو کیسے لا سکتے ہیں۔ سیکولرزم کا لفظ سنگھ کے نزدیک بے معنیٰ ہے اور نہ تو اس کا اسمیں کوئی یقین ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی فرقہ پرست تنظیمیں بھی لامذہبیت کو محض بکواس سمجھتے ہیں۔ کسی ایک یا دوسرے فرقہ کی انتخابی ہمدردی حاصل کرنے کیلئے حکومت بھی مذہبی رواداری کا نام لیتی رہتی ہے۔ ہماری مذہبی رواداری کا ذمہ دار کون ہے؟ اسکا فیصلہ آسانی سے نہیں کیا جا سکتا۔ آج کل یہ الزام آسانی سے سنگھ پر ڈال کر سیاسی پارٹیاں اور ان کے لیڈر خلاصی حاصل کر لیتے ہیں، جو اس سمت میں کچھ نہ کر سکنے کا ہم معنیٰ ہے۔

آسام پنجاب اور سنگھ

آسام میں وسیع پیمانے پر انسانی جان ومال کی ہلاکت اور پنجاب میں موجودہ فرقہ وارانہ کشمکش کو لیکر ایک بار پھر سنگھ کا نام زور وشور سے اٹھایا جا رہا ہے۔ ملک کی وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کو آسام کے فسادات میں سنگھ کا ہاتھ نظر آنے لگا ہے۔ یہ کہنا ضروری نہیں کہ اس کے پیر پنجاب میں دکھائی دے رہے ہیں۔ آسام کے فسادات فرقہ وارانہ تھے یا نہیں اور اس میں سنگھ کا ہاتھ کہاں تک تسلیم کیا جا سکتا ہے جب کہ انھیں کے لفظوں میں آسام فرقہ پرستی کے زہر سے مبرا سرزمین رہی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس کے پہلے آسام میں کبھی کوئی دنگا فساد نہیں ہوا۔ اس فساد میں بھی آسام کے ہندو مسلمان دونوں نے مل کر بنگلہ دیشی نو واردوں کو اپنے غم وغصہ کا نشانہ بنایا۔ اگر آسام میں فرقہ وارانہ فساد ہوتا اور سنگھ کا ہاتھ ہوتا تو وہاں کا مسلمان کیوں ساتھ دینے کیلئے تیار ہوتا؟ اس طرح آسام کے فساد میں جو غیر ملکیوں کو نکال باہر کرنے کی وجہ سے ہوا سنگھ کو کھینچ کر حملہ آور طبقے کے درمیان تقسیم کی لائن کھینچنا اور اقلیتی طبقہ کی حمایت

حاصل کرنے کی سرکاری کوشش ہی مانی جائے گی۔ سنگھ کا کچھ نہیں بگڑتا بلکہ جہاں انکی جڑیں نہیں تھیں وہاں بھی وہ سرکاری..... کے سہارے پہنچ رہے ہیں۔

اب اگر پنجاب کو لیا جائے تو یقیناً وہاں سنگھ اور اکالی دل کے درمیان زبردست کشمکش کا امکان ہے۔ ہندو سنگھ پر اعتماد رکھتا ہے اور پنجاب میں سکھوں کے مقابلے میں اقلیت ہے۔ اسے سنگھ کی لاٹھی کا سہارا ہے۔ اسکے برخلاف سکھ اقلیت ہو کر بھی بری طرح منظم اور لڑنے کیلئے تیار بیٹھے ہیں۔ سکھوں کو پنجاب میں سنگھ سے شدید نفرت ہے۔ سنگھ پنجاب میں سرکار کا ساتھ دینے کیلئے تیار ہے۔ صرف یہی راستہ اس کے سامنے باقی رہ گیا ہے۔

سنگھ کی خاموشی کا سبب

اب سنگھ ایک ایسے چوراہے پر کھڑا ہے جہاں سے اس کو آمنے سامنے کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اگر پنجاب کے مسائل کا حل نہیں نکلا تو شاید یہی میدان بنے گا۔ ابھی تک سنگھ پردے کی آڑ میں چھپ کر کھیلتا رہا ہے لیکن اب وقت بدل چکا ہے۔ پنجاب کی سرزمین پر سنگھ کا سپاہی پہچانا ہوا ہے جبکہ دوسری جگہ وہ زیر زمین طریقے سے کام کرتا ہے۔ سنگھ انھیں وجوہات سے خاموش ہے۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ سنگھ اب اور زیادہ گہری سیاست میں اتر چکا ہے۔ کہیں وہ سرکار کے ساتھ ہے تو کہیں اس کا مخالف ہے، کہیں اس کے لئے نفرت کا رجحان پیدا ہو رہا ہے تو کہیں اسے ہمدردی مل رہی ہے۔ ایک لمبے عرصے سے سنگھ کے سنچالک بالا صاحب دیورس اور ان کے کسی نمائندے کا کوئی بیان ابھی تک نہیں آیا یہ واقعی سنگھ کی خاموشی کی علامت ہے لیکن حقیقت کچھ اور ہی ہے۔

سنڈے ایڈیشن روزنامہ "آج" بنارس

مورخہ ۸ رمئی ۱۹۸۳ء

مضمون نگار :- رجنیش

ترجمہ ماسٹر عتیق الزماں صاحب ایم۔ اے

الرشاد کی ڈاک

۱۸ ؍ مئی ۸۳ء

محترم و مکرم جناب مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،!

بعد از سلام مسنون عافیت طرفین مطلوب۔ بعدہٗ عرض اینکہ بندہ جامعۃ الرشاد میں حاضر ہوا تھا اور ماھنامہ "الرشاد" جاری کرنے کو عرض کرکے گیا تھا۔ اس وقت سے لیکر آج تک الرشاد برابر وقت کی پابندی کے ساتھ ہر مہینے ملتا رہتا ہے۔ اور جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم کے مدرسین کافی دلچسپی کے ساتھ اسے پڑھتے ہیں۔

ماہنامہ "الرشاد" میں شائع ہونے والا مضمون "جامعہ کے شب و روز" ہمیں بہت پسند ہے اور ہم اس کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں اور اس میں سے بہت سی چیزیں اخذ کرکے اپنے جامعہ میں اس پر عمل کرنے کی حتی الامکان سعی اور کوشش کرتے ہیں۔

اور سب احوال ٹھیک ہیں۔

اپنی مخصوص دعاؤں میں جامعہ کو اور ہمیں ضرور یاد فرمادیں۔

والسّلام مع الاحترام

غلام محمد

مدیر الجامعۃ الاسلامیہ اشاعت العلوم
اکل کوا۔ ضلع دھولیہ۔ مہاراشٹر) الہند

خاکہ سامنے آجاتا ہے کہ اس کی روشنی میں صحیح اسلامی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دارالمصنفین سے شائع ہوا تھا

اہل کتاب صحابہ و تابعین

مرتبہ مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی

اس کتاب میں ان صحابہ اور تابعین کا تذکرہ ہے جو یہودی یا عیسائی تھے اور انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کتاب میں تقریباً سو صفحے کا ایک قیمتی مقدمہ بھی ہے جس سے عرب کے یہود و نصاریٰ کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔

اس پر مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کا دیباچہ بھی ہے۔ اس موضوع پر دنیا کی کسی زبان میں کوئی مکمل کتاب موجود نہیں ہے۔

خطبۂ نکاح

نکاح کے موقع پر جو خطبہ دیا جاتا ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور یہ ایک اہم معاشرتی ہدایت اور اصلاح معاشرہ کا پیغام ہے۔ مگر عام طور پر اس کے الفاظ دہرا دیئے جاتے ہیں۔ اس کا پورا مفہوم لوگوں کے ذہن نشین نہیں ہو پاتا ہے۔ اس کتابچہ میں اس کے ایک ایک لفظ کی ایسی موثر تشریح کی گئی ہے کہ یہ ہر نکاح کے موقع پر تقسیم کرنے کے قابل ہے۔ یہ نسخہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی کے قلم سے ہے۔ صفحات ، قیمت ۵/

اہل دل کی باتیں

یہ بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی مدظلہ کے ان ملفوظات کا مجموعہ ہے جو وہ اپنی نجی مجلسوں میں اپنی پر اثر اور پرسوز زبان میں فرماتے رہے ہیں، اسے مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد نے مرتب کیا ہے۔ اس کا بیشتر حصہ ماہنامہ الفرقان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اب یہ جواہر پارے کتابی شکل میں دار التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد کی طرف سے شائع کئے جا رہے ہیں۔

فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل

یہ محترم ناظم جامعۃ الرشاد کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو معارف اعظم گڈھ میں شائع ہو چکے ہیں یا مختلف سیمیناروں میں پڑھے گئے ہیں جن میں جدید مسائل کے حل کیلئے وہ بنیادیں فراہم کی گئی ہیں جن کی روشنی میں جدید سے جدید مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔ یہ کتاب جامعہ ملیہ دہلی سے شائع ہوئی ہے اور اس پر اردو اکیڈمی نے مصنف کو انعام بھی دیا ہے۔ قیمت ۔/۱۰

ملنے کا پتہ:۔ شکیل احمد مہتمم مکتبہ جامعۃ الرشاد۔ رشاد نگر شہر اعظم گڈھ۔ یوپی

دار التالیف والترجمہ کی تصانیف

عبادت و خدمت

مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہ

اس رسالہ میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور عام انسانوں کی خدمت بھی عبادت ہے، اور اس پر اسی طرح اجر و ثواب ملتا ہے جس طرح فرض عبادات پر ملتا ہے۔ اگر فرض عبادات کے اہتمام کے ساتھ ہمارے اندر عام انسانوں کی خدمت کا جذبہ بھی پیدا ہو جائے تو نفرت و حقارت کے بہت دبیز پردے ہٹ جائیں گے اور اسلام سے عام انسانوں کے دلوں میں ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ سائز ۲۲×۱۸۔ صفحات ۵۶، قیمت ۵۰ پیسے

دینی مدارس اوران کی ذمہ داریاں

یہ محترم مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد کی ان تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ ہے جو وہ طلبہ اساتذہ، منتظمین مدرسہ اور عربی مدارس کے ذمہ داروں کے سامنے کرتے رہے ہیں۔ یہ تقریریں اور تحریریں دردو اثر میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ان میں بعض تقریروں کو محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ نے اپنے تائیدی نوٹ کے ساتھ الفرقان میں شائع فرمایا اور شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب مدظلہ العالی نے ایک بڑے مجمع میں پڑھوا کر سنوایا اور فرمایا کہ اسے ہر استاذ اور طالب علم کو پڑھنا چاہئے۔ سائز ۲۲×۱۸۔ صفحات ۱۰۰، قیمت للعہ/۵۰

اسلامی تعلیم

حصہ اول، دوم، سوم، چہارم

بچوں کو اسلامی مسائل ذہن نشین کرانے کے لئے اردو زبان میں درجنوں رسالے لکھے گئے ہیں، مگر اس رسالہ کا انداز بیان اتنا دلچسپ ہے اور مسائل ایسے آسان طریقے سے سمجھایا گیا ہے کہ بچے اسے قصہ کہانی کی کتاب کی طرح دلچسپی و شوق سے پڑھتے ہیں۔ چار حصوں میں تمام ضروری مسائل آگئے ہیں۔

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ قیمت حصہ اول عہ/، دوم عہ/، سوم سہ/، چہارم ۵۰ پیسے

تبع تابعین حصہ اول

مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہ

کتاب میں ۱۱۹ اکابر تبع تابعین کا مفصل تذکرہ ہے، شروع میں مصنف کے قلم سے ایک فاضلانہ مقدمہ بھی ہے جس سے اسلام کی ابتدائی دو صدی کے دینی، تہذیبی اور سیاسی تاریخ کا ایک

مولانا مجیب اللہ ندوی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے نشاط پریس ٹانڈہ میں چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد، رشاد نگر، اعظم گڑھ سے شائع کیا

جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کا ترجمان

:- ماہنامہ :-

جامعۃ

الرشاد

سالانہ چندہ		سالانہ چندہ
ہندوستان ۲۴/-		ممالک غیر سے
چندہ ششماہی ۱۲/-		بارہ ڈالر امریکی
قیمت فی پرچہ ۲/۵۰		۱۲/-

جلد ۳ | اگست ۱۹۸۳ء مطابق ذوالقعدہ ۱۴۰۳ھ | شمارہ ۲

فہرست مضامین

مجلس ادارت

کاتب مطیع الرحمن معروفی   نشاط پریس ٹانڈہ

الرشاد کے پڑھنے والوں میں مختلف خیال کے لوگ ہیں۔ رشحات میں سیاسی و ملی مسائل پر موجودہ حالات کے تحت جو کچھ لکھا جاتا ہے اس کے سلسلہ میں بعض ناظرین الرشاد مرتب کو خط لکھتے رہتے ہیں کہ ایک علمی و دینی پرچہ میں سیاسی مسائل پر لکھنے سے نہ تو کوئی فائدہ ہے اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ اس کی آواز ان لوگوں تک نہیں پہنچ پاتی جن سے متعلق ان مسائل کا حل ہے، اور اگر پہنچے بھی تو وہ اس کا کوئی خاص اثر نہ لیں گے۔ ان حضرات کے جواب میں راقم الحروف جو کچھ لکھتا رہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کی مرکزی یا صوبائی حکومت جب کوئی ایسی پالیسی بناتی ہے یا کوئی ایسا طرز عمل اختیار کرتی ہے جس کا اثر براہ راست یا بالواسطہ مسلمانوں کے دین و ملت یا ان کی زبان و تہذیب پر پڑتا ہے۔ تو اس پر کوئی باغیرت مسلمان کیسے خاموش رہ سکتا ہے؟ کیا ملت اسلامیہ ہندیہ کے ہم لوگ فرد نہیں ہیں؟ اور کیا علمی و دینی پرچہ کا مطلب اتنا ہی ہے کہ جس میں صرف ایسی اخلاقی باتیں لکھی جائیں جن سے کوئی ناخوش نہ ہو اور نہ کوئی خطرہ ہو۔ لیکن جو باتیں دین و ملت کے لحاظ سے مضر معلوم ہوں کیا اپنی فہم کے مطابق ان سے اپنے ہمدردوں کو آگاہ نہ کیا جائے؟ یہ بات الگ ہے کہ ہماری آواز نقار خانہ میں طوطی کی آواز ثابت ہو مگر دینی حمیت اور ملی غیرت کا تقاضا تو یہی ہے کہ ہم اس سلسلہ میں شیطان اخرس بنکر خاموش نہ رہیں۔ اگر ہماری آواز دس بیس آدمی ہی تک پہونچ سکتی ہے تو ہماری غیرت کا تقاضا ہے کہ ہم اسے ان تک پہونچائیں اور اس سلسلہ میں نقصان یا خطرہ پیش آئے تو اسے صبر کے ساتھ برداشت کریں۔ انشاء اللہ یہ مختصر کوشش بھی رائگاں نہیں جائیگی۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۳ء تک ۳۶ سال ہوئے ہیں اور اس طویل مدت میں پورے ہندوستان اور خاص طور پر ہندی بولنے والے صوبوں میں مسلمانوں کو جو جانی و مالی نقصان پہونچا ہے اور ان کی زبان و تہذیب کے ایک ایک خد و خال کو مٹانے کی جو کوشش کی گئی ہیں وہ ہندوستان کے عوام

اور ان کی سیکولر جمہوری حکومت کیلئے ایک بدنما داغ ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ آزادی کے بعد کی تاریخ کا یہ سیاہ ترین صفحہ ہے۔ کیا ہندوستان کا کوئی فرد اس بات سے انکار کرسکتا ہے کہ ۱۹۴۷ء سے لیکر اب تک ہندوستان میں کئی ہزار فسادات نہیں ہوئے ہیں؟ اور کیا ان فسادات میں لاکھوں مسلمان شہید، ہزاروں عورتیں بیوہ اور ہزاروں بچے یتیم نہیں ہوئے ہیں؟ صرف حیدر آباد پولیس ایکشن کے سلسلہ میں پنڈت سندر لال آنجہانی اپنی تقریروں میں ہر جگہ کہا کرتے تھے کہ وہاں لاکھوں بے گناہ مسلمانوں کا قتل ہوا ہے۔ اور ہزاروں عورتوں کی عصمت لٹی ہے۔
کیا اردو زبان کو اسکولوں، کچہریوں، دفتروں اور سارے تعلیمی شعبوں سے دیس نکالا نہیں ملا ہے؟ کیا عثمانیہ اردو یونیورسٹی حیدر آباد کو ہندی یونیورسٹی نہیں بنا دیا گیا؟ کیا مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی چند ظاہری مسلم خصوصیات کو بھی مٹانے کی کوشش نہیں کی گئی؟ کیا انگریزوں کے زمانہ میں جتنا محمڈن لا (پرسنل لا میں قصداً نہیں لکھ رہا ہوں) رائج تھا اس کا ۳/۴ حصہ کالعدم قرار نہیں دیا جا چکا ہے؟ کیا جن سرکاری ملازمتوں میں آزادی سے پہلے مسلمانوں کا تناسب ۲۰، ۲۵ فیصد سے لیکر ۴۰ فیصد تک ہوتا تھا وہ گھٹ کر اب ۱۔ ۲ فیصد بلکہ بعض شعبوں میں صفر نہیں رہ گیا ہے؟ کیا ہمارے دینی احساس اور ملی غیرت کا تقاضا اتنا بھی نہیں ہونا چاہئے کہ ہم اس ظلم کے خلاف زبان کھول سکیں اور قلم کو حرکت دے سکیں؟ کیا ان مسائل کو سیاسی مسائل کہکر کچھ لوگ ہماری دینی حمیت اور ملی غیرت کو ہمیشہ کیلئے مردہ کر دینا چاہتے ہیں؟ بہرحال ہماری آواز چاہے جتنی کیف و کمزور کیوں نہ ہو ہم اسے بلند کرتے رہیں گے۔ خاموشی کی بے غیرتی ہماری ایمانی حمیت برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہے۔

جو لوگ اپنے ذہن میں دین کا محدود تصور رکھتے ہیں انکو غور سے سن لینا چاہئے کہ ہماری زبان، ہماری تہذیب اور اس کے جو امتیازات و تشخصات ہیں اگر وہ باقی نہ رہے تو ہندوستان میں مسلمانوں کی دینی زندگی کی مثال اس درخت کی سی ہوگی جس کا تنا تو کھڑا ہو مگر اس کی شاخیں اور پتیاں تراش دی گئی ہوں جس سے نہ تو درخت کی قسم ہی پہچانی جاسکتی ہے اور نہ اس سے کوئی پھل پھول ہی آسکتے ہیں، اور نہ اس کے سایہ میں کوئی بیٹھ کر دم لے

سکتا ہے۔ بہرحال ہمارا دینی و ملی احساس کسی حال میں مسلمانوں کیلئے یہ بے عزتی برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہے کہ ہم پر ظلم ہوتا رہے اور ہم اس ظلم کے خلاف زبان بھی نہ کھول سکیں۔ قرآن پاک میں جہاں مومنوں کے بہت سے صفات بیان کئے گئے ہیں وہاں ان کی صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے "یُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ" اور حدیث میں ظالم حکمرانوں کے سامنے حق بات کہنے کو سب سے بڑا جہاد قرار دیا گیا ہے۔

کیا ہمارے لئے یہ بے عزتی کی بات نہیں ہے کہ ملک کی چھوٹی چھوٹی اقلیتیں جنھیں مسلمانوں سے زیادہ حقوق حاصل ہیں وہ خود اختیاری نہیں بلکہ خود مختاری کا مطالبہ کریں اور ہم دفعہ ۳۰ میں دیئے گئے دینی و ملی حقوق کے لینے میں بھی بزدلی دکھائیں۔ یہ اسمبلی اور پارلیمنٹ کے باعزت مسلمان ممبران اور حکومت کے مسلمان وزرا، جو مسلمانوں کے نمائندے بن کر منتخب ہوتے ہیں اور اسی نام سے ہر طرح کے فائدے سمیٹتے ہیں انکی ملی حمیت اور غیرت کبھی انھیں کسی اقدام پر مجبور نہیں کرتی بلکہ صورت حال یہ ہے کہ اگر ناگفتہ بہ حالات کی بنا پر کبھی کچھ بولنے یا ایک میمورنڈم دینے کی ضرورت پیش آجاتی ہے تو وہ چور دروازے سے اپنے ناخداؤں سے معذرت کرتے اور معافی مانگتے رہتے ہیں اور اگر کہیں اوپر سے ڈانٹ پڑ گئی تو اسے خدائی ڈانٹ سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اس "غلطی" کی تلافی کیلئے سوسوجتن کرتے ہیں۔ جمعیۃ العلماء کی "ملک وملت بچاؤ تحریک" اور سید شہاب کی سرکردگی میں جو میمورنڈم پیش کیا گیا تھا وہ اس کی تازہ مثال ہے۔ کیا لوگ چاہتے ہیں کہ ہم بھی یہی بے عزتی اختیار کرلیں؟ اور اسے دنیادی جھمیلا اور دینداری اور مولویت کے وقار کے منافی سمجھ کر ان رسواکن واقعات سے آنکھیں بند کرلیں؟ ہم اپنے بزرگوں کے دارورسن کے واقعات بڑے جوش وخروش سے بیان کرتے اور ذوق وشوق سے سنتے ہیں، مگر یہ رتبۂ بلند پانے کی سعادت تو الگ رہی ایک ادنیٰ نقصان کے تصور سے ہم لرزہ براندام ہو جاتے ہیں۔ یاد رکھئے! ایمان ویقین کا رشتہ آزمائشوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ یہ آزمائش ہی ایسی بھٹی ہے جس میں پڑنے کے بعد ایمان کے صدق وکذب کا پتہ چلتا ہے۔

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ

مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَلَيَعۡلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا وَلَيَعۡلَمَنَّ الۡكٰذِبِيۡنَ :

(کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے یہ کہنے کے بعد کہ ہم ایمان لے آئے آزمائے نہ جائیں گے حالانکہ اس سے پہلے اہل ایمان آزمائے جا چکے ہیں اور اس آزمائش کا مقصد یہ ہے تاکہ اللہ جان لے کہ کون اپنے ایمان میں سچا ہے اور کون جھوٹا ہے)

روس کی ظالم کمیونسٹ حکومت نے بھی مسلمانوں کی نماز اور روزہ اور حج پر کوئی پابندی عائد نہیں کی تھی بلکہ اس نے ان کے تعلیمی اداروں اور تہذیبی مراکز کے نہج کو بدل ڈالا جس سے خود مسلمانوں میں ایک ملحد نسل تیار ہو گئی اور سمرقند و بخارا سے ایمان و اسلام کی جو روشنی پھیلی تھی وہ بجھ گئی، وہاں یہ سب کچھ جبر و تشدد سے ہوا تھا اور یہاں سیکولر جمہوریت کے سایہ میں ہو رہا ہے، ہم اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ " رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَآ اِنۡ نَّسِيۡنَاۤ اَوۡ اَخۡطَاۡنَا ... رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلۡنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ "
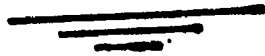
قرآن کریم کے انگریزی تراجم پر ایک نظر

از جناب نیاز قومی صاحب
ایم۔اے (علیگ)

جناب نیاز احمد صاحب ایڈوکیٹ گونڈہ کے ممتاز وکلا میں تھے اور ساتھ ہی ساتھ
سیاسی دلچسپی بھی رکھتے تھے اور سیاست میں ان کا رجحان کیمونسٹ پارٹی کیطرف
تھا اور اس کے ممتاز لیڈروں میں تھے۔ ان کے لئے میں "تھے" کا لفظ اس لئے استعمال
کر رہا ہوں کہ اب وہ وکالت چھوڑ چکے ہیں۔ اور کمیونسٹ پارٹی کو بھی خیر آباد
کہہ چکے ہیں۔ اب ان کا زیادہ تر وقت نہ صرف دینی علوم کے مطالعہ میں گذرتا ہے
بلکہ اب انکو اس سے غیر معمولی شغف ہوگیا ہے۔ اسی شغف کے نتیجہ میں وہ مرتب
سے محبت کرتے ہیں اور اسی وجہ سے دارالمصنفین اعظم گڈھ کیطرف سے
انکو "دین رحمت" کے انگریزی ترجمہ کا کام سپرد کیا گیا ہے۔ اسی کتاب کے
ترجمہ کے درمیان ان کو قرآن پاک کے مختلف انگریزی ترجموں کو دیکھنا
پڑا اور اس درمیان میں انگریزی ترجموں کے بارے میں ان کے دل میں
جو خدشات یا شبہات پیدا ہوئے ہیں انھوں نے اسے کاغذ پر منتقل کر دیا
ہے۔ اس میں انھوں نے جن نکتوں کیطرف اہل علم کی توجہ مبذول کرائی
ہے وہ بہرحال قابل غور ہے۔ خاص طور پر اس دور میں جب کہ غیر مسلموں
میں قرآن کے مطالعہ کا ذوق بہت بڑھ گیا ہے۔ تو ترجمہ کی ادنیٰ غلطی سے
ممکن ہے ان کے ذہن میں کوئی غلط بات بیٹھ جائے اور وہ اسے خدا کا
کلام سمجھ کر قبول کر لیں۔ امید ہے کہ اس سلسلہ میں دوسرے اہل علم بھی

اپنی رائے سے مطلع کریں گے تاکہ ان کی رائے کی روشنی میں ان خدشات اور شبہات کے بارے میں جن کا اظہار اس مضمون میں کیا گیا ہے، کوئی صحیح رائے قائم کی جا سکے۔ اس میں سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی چند آیات کے ترجمہ کے بارے میں ان کے یہ تاثرات ہیں اگر اہل علم کے نزدیک ان کے تاثرات صحیح ہیں تو ضرورت ہے کہ پورے قرآن کے انگریزی ترجموں پر ایک نظر ڈالی جائے۔

(ادارہ)

قرآن پاک کے ترجمے دنیا کی بیشتر زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اور یہ سلسلہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے فارسی میں حضرت شاہ ولی اللہ، اردو میں شاہ عبدالقادر، مولانا اشرف علی تھانوی، انگریزی میں عبداللہ یوسف علی اور جرمن زبان میں لو ندیکی کے اور فرنچ میں ڈاکٹر حمید اللہ کے تراجم سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اپنی تفسیر "تفہیم القرآن" کے دیباچے میں لکھا ہے:۔

لفظی ترجمے کا اصل فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو قرآن کے ہر ہر لفظ کا مطلب معلوم ہو جاتا ہے۔ اور وہ ہر آیت کے نیچے اس کا ترجمہ پڑھ کر جان لیتا ہے کہ اس بات میں یہ کچھ فرمایا گیا ہے۔ لیکن اس فائدہ کے ساتھ اس طریقے میں کئی پہلو نقص کے بھی ہیں جن کی وجہ سے ایک غیر عربی داں ناظر قرآن مجید سے اچھی طرح مستفید نہیں ہو سکتا۔

ایک بڑی اہم وجہ لفظی ترجمہ کے غیر مؤثر ہونے کی یہ ہے کہ قرآن کا طرز بیان تحریری نہیں بلکہ تقریری ہے، اگر تقریر کی زبان کو تحریر کی زبان نہ کیا جائے اور جیوں کا توں اس کا ترجمہ کر ڈالا جائے تو ساری عبارت بکھری ہوئی ہو کر رہ جائے گی۔ انگریزی ترجموں کے اس سے بھی زیادہ بے اثری کا ایک سبب یہ ہے بائبل کے ترجمے کی پیروی میں قرآن کی ہر آیت کا ترجمہ الگ الگ نمبر وار درج کیا جاتا ہے۔

پس منظر اور شان نزول کے ساتھ قرآن کی ان سورتوں کا تعلق اتنا گہرا ہے کہ اگر اس سے الگ کر کے مجرد الفاظ کا ترجمہ آدمی کے سامنے رکھ دیا جائے تو بہت سی باتوں کو وہ قطعاً نہیں سمجھے گا۔ اور بعض باتوں کو الٹا سمجھ جائے گا۔ بلاشبہ ترجمہ اپنی جگہ صحیح ہوگا لیکن ناظرین کہیں مطلب

سے محروم رہ جائیں گے۔ اور کہیں کسی غلط فہمی کا شکار ہوں گے اور کہیں خلجان میں پڑ جائیں گے۔

مارما ڈیوک پکتھال نے اپنے ترجمۂ قرآن کریم (The Meaning of the Glorious Quran)
میں بعض اہم مقامات پر ترجمہ میں ایسے انگریزی الفاظ کا استعمال کیا ہے جو معنوی اعتبار سے صحیح ہوتے
ہوئے بھی اللہ عزوجل کی صفات عالیہ قوت واقتدار کی ملکیت اعلیٰ اور اس کی شان ربوبیت ووحدانیت کو
نمایاں طور پر منعکس نہیں کرتے۔

سورۂ فاتحہ کی تشریح کرتے ہوئے پکتھال صاحب نے خود اعتراف کیا ہے کہ یہ فاتحۃ الکتاب
(Opening of the Scripture) اور ام القرآن (Essence of Quran)
کے نام سے بہ کثرت معنون کیا اور خود قرآن کریم نے اسے سبعًا من المثانی (Seven of the Oft-repeated verses)
فرمایا ہے۔

اس قرآنی پس منظر اور عظمت و اہلیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی پکتھال نے مالک یوم الدین
کا ترجمہ Owner of the day of Judgement کیا ہے۔

بے شک انگریزی زبان میں مالک کا لفظی ترجمہ OWNER ہوگا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی شان
ملوکیت کا شائبہ بھی لفظ Owner سے ظاہر و منعکس نہیں ہوتا۔ انگریزی زبان میں لفظ
Owner اس شخص کے لئے استعمال ہوگا جو کسی مرئی شئے کا مالک ہو مثلاً مکان کا مالک، زمین کا
مالک، جائداد کا مالک، جانوروں کا مالک وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس کے علاوہ تمام انسانی اصطلاح میں
بھی کہیں کہیں لفظ مالک Owner سے مختلف معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک ملازم اپنے آقا
کو بھی مالک کہتا ہے۔ انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ Owner صحیح نہیں ہوگا بلکہ اس کے لئے
Master زیادہ صحیح ہوگا۔ ہر شخص اپنی مرضی کا مالک ہے۔ یہاں بھی مالک کا ترجمہ Owner
نہیں ہوگا بلکہ یہ یوں کہا جائے گا

Every body is free in his will.

ترجمہ محض الفاظ کا چربہ بدل دینے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ اصل مفہوم
کی صحیح ترجمانی ہو۔

مشہور لغت المنجد (عربی سے اردو) میں لفظ مالک کے ضمن میں حسب ذیل الفاظ

معنی ہیں :-

الملک : اللہ تعالیٰ، بادشاہ قوت واقتدار کا مالک۔

المالک: بادشاہ

المُلک۔ ملکیت

املاک } بادشاہی
ملوک }

غالباً پکتھال صاحب نے Owner کا لفظ اسی خیال سے استعمال کیا ہوگا کہ یوم القیامۃ کا یقین، اظہار و اعلان بھی اللہ تعالیٰ کے ہی احاطہ اختیار میں ہے اور وہی اس کا مالک کامل ہے۔ مگر اس طور پر بھی دن۔ وقفہ۔ یا ساعت پر اختیار عنہدہ Owner کے بجائے Command یا Control کے الفاظ سے صحیح سمجھا جا سکتا ہے۔

عبداللہ یوسف علی کے انگریزی ترجمۂ قرآن میں " مالک یوم الدین کیلئے Moster of the day of Judgment لکھا گیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے بھی انگریزی میں کلام پاک کا ترجمہ و تفسیر لکھا ہے۔ موصوف نے مالک یوم الدین کا ترجمہ Sovereign of the day of Judgment کیا ہے۔

اپنی اپنی جگہ MASTER اور SOVEREIGN کے الفاظ کافی حد تک اس مفہوم کی عکاسی کرتے ہیں جو قرآن پاک کے لفظ مالک سے ادا کیا ہے۔ انگریزی کے مشہور و معروف لغت Chumbch's نے ان الفاظ کے معانی اس طور پر بیان کئے ہیں

Owner :- Possessor, Proprieter, captain of a warship.

Master :- One who commonds or controls, a lord or owner, a leader or ruler, Teacher, Employer.

Sovereign :- a supreme ruler or head a monarch on Irish mayor.

Sovereign

انگریزی میں آ رہا ہے
کے ہم معنی ایک لفظ MONARCH بھی واقع ہوا ہے جس کے معانی بذات خود لغات

MONARCH:- a sole head of a state, whether titular or ruling (Chambers's Dict)
:- a sovereign sole ruler of a nation (Standard Diction

انگریزی کا لفظ MONARCH یونانی زبان کے دو الفاظ پر مشتمل ہے -
Menos (alone واحد) + Archo (rule فرمانروائی)

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ کی ذات وحدہٗ لاشریک اور دنیا و مافیہا میں اسکی فرمانروائی کا یکجا مفہوم لفظ MONARCH زیادہ مؤثر طریقے سے ادا کرتا ہے اور اس کی یگانگت ہیبت و قدرت زیادہ وسیع طور پر منعکس ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان ملوکیت اس کے اقتدار و اختیار اس کی وحدانیت، جباریت و قہاریت اور اس کے لطف و کرم کا بیک وقت احاطہ کرتے ہوئے صاحب میزان عدل و دریائے رحمت و بخشش ہونے کا تصور پیش کرنے کیلئے لفظ MONARCH میری رائے میں مذکورہ بالا تینوں الفاظ (owner, sovereign, master ruler) کے مقابلے میں زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے -

یوم الدین کا لفظ بھی سورۂ فاتحہ میں استعمال کرکے اللہ تعالیٰ نے حقائق و اسرار غیبی کے بحر بیکراں کو ایک قطرے میں مرکوز کر دیا ہے - مالک یوم الدین کا ترجمہ اردو میں مشاہیر مترجمین نے یوں کیا ہے۔

- رئیس الفقہاء والمحدثین حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی - خداوند دین جزا کا -
- حضرت مولانا اشرف علی تھانوی —— جو مالک ہیں روز جزا کے -
- سید ابوالاعلیٰ مودودی —— روز جزا کا مالک -

جزا عربی لفظ ہے جس کے معنی لغت میں بدلہ ، عوض ، پھل ، ثواب وغیرہ کے ہیں چنانچہ اردو ترجموں میں روز جزا سے یہ تاثر کافی حد تک پیدا ہوتا ہے اور اس ایمان بالغیب اور یقین آخرت کی نشاندہی بھی ہوتی ہے کہ انسان دنیوی زندگی میں جیسا عمل کرے گا آخرت میں

اللہ تعالیٰ دین حق کی میزان سے اس کو ویسا ہی بدلہ دے گا۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُحْضَرًا (وہ دن آنے والا ہے جب ہر نفس اپنے کیے کا پھل حاضر پائے گا) آل عمران ۵

قرآن کریم نے بار بار اس امر کیطرف اشارہ کیا ہے کہ میدان حشر میں نیک اعمال والے کو داہنے ہاتھ میں اور برے اعمال والوں کو بائیں ہاتھ میں ان کے اعمال نامے تھما دیئے جائیں گے۔ اور وہاں ان کا کوئی شفارسی یا مددگار نہ ہوگا ۔ انگریزی ترجمے میں پکتھال۔ عبداللہ یوسف علی اور مولانا دریابادی سبھی مترجمین نے یوم الدین کیلئے DAY OF Judgment لکھا ہے۔

میری فہم ناقص میں day of judgment سے یوم الدین کی عظمت و وسعت اور اس کے ساتھ وابستہ ایمان بالغیب کی صحیح ترجمانی نہیں ہوئی اور ایک نا واقف دین پر پوری طرح یوم الدین کا وہ تأثر نہیں پیدا کرتا جو قرآن کریم کا مقصد ہے ۔ قرآن پاک کا ترجمہ کتنا ہی عالمانہ، ادیبانہ کیوں نہ ہو، اصل کلام الٰہی کا جو تأثر ایک انسان کے دل و دماغ پر ہوتا ہے دیگر زبانوں کے ترجموں میں وہ تأثر قطعی نہیں پیدا ہو سکتا لیکن پھر بھی مترجمین کا فرض ہے کہ وہ ترجمہ کرتے وقت ایسے الفاظ و محاورات کا استعمال کریں جو منشائے الٰہی اور عظمت کلام سے قریبی مماثلت رکھتے ہوں۔ اگر ترجمہ میں استعمال کئے گئے الفاظ کلام الٰہی کی عظمت اور وسعت کیطرف اشارہ بھی نہیں کر سکتے، بلکہ کہیں کہیں ظاہری معنیٰ کو بھی تنگ کر دیئے ہوں تو ایسے تراجم کی افادیت کیا ہے ۔ اور علم دین کے متلاشیوں کو ان سے کتنی رہنمائی مل سکتی ہے۔

یہ ایک اہم سوال ہے اور علمائے دین کیلئے اس سوال میں دعوت فکر بھی ہے ۔ بخاری میں ایک حدیث ہے کہ رسول کریمؐ نے ابو سعیدؓ سے فرمایا کہ قرآن میں سب سے زیادہ عظمت سورۂ فاتحہ کی ہے۔ یعنی یہ کل قرآن کا لب لباب ہے ۔ یعنی جو احکام کل قرآن میں بالتفصیل موجود ہیں ان سب کا اس میں بالاجمال ذکر ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کئی مقامات پر دنیوی زندگی کے بعد کے منازل کی نشاندہی فرمائی، اجمالی طور پر تصور کرنے سے اس کا تسلسل کچھ اس طرح بنتا ہے ۔

يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ (جب صور پھونکا جاوے گا) إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا

(جب زمین شدت سے ہلا ڈالی جائے گی) اِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ (جب آسمان پھٹ جائے گا)

يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ ۔ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ

(جب انسان پتنگوں کیطرح بکھرے ہوں گے۔ اور پہاڑ رنگ برنگے دھنکے اون کیطرح ہوں گے)

يَوْمُ الْقِيَامَةِ (جب مردے قبروں سے زندہ کھڑے کئے جائیں گے) يَوْمُ الْحَشْرِ (جب سب ایک جگہ جمع کئے جائیں گے) يَوْمُ الْحِسَاب (جب انکی نیکی اور بدی کا حساب لیا جائے گا)

یوم الجزاء (جب انھیں ان کے اعمال کا بدلہ چکایا جائے گا)

دراں حالیکہ اللہ تعالیٰ کا ایک دن ہمارے پچاس ہزار سال کے برابر ہے تو واللہ اعلم بالصواب یہ عرصۂ حشر و نشر اور وقفۂ سزا و جزا کتنا وسیع ہوگا جہاں تک میری ادنیٰ فہم کی رسائی ہے میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام وسعت کا سورۂ فاتحہ میں واقع لفظ "یوم الدین" میں احاطہ کردیا ہے۔

حیات دنیوی اور حیات ابدی کے درمیان کے یہ تمام ترمنازل ایمان بالغیب کے اجزا رہیں جو دین کا جزء لاینفک ہے۔ اس لحاظ سے یوم الدین کیلئے Day of Judgment کا فقرہ محدود اور بے اثر معلوم ہوتا ہے۔

یہ امر مسلم ہے کہ انگریزی زبان کی لاچاری اور کم مائگی بھی مترجمین کی راہ میں حائل رہی ہوگی۔ انگریزی کیا ہے؟ دنیا کی کسی بھی دوسری زبان میں یوم الدین کا وسیع تصور جس کا اجمالی خاکہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ ایک لفظ میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔

ایک اور وجہ بھی بے اثر اور بے روح ترجموں کی یہ ہے کہ اکثر مترجمین نے قرآن کریم کے ترجمے محض سعادت کی خاطر کئے ہیں۔ اسلئے ضرورت سے زیادہ احتیاط بھی برتا ہے۔ لیکن اگر ترجمے تفہیم القرآن اور تبلیغ و اشاعت دین کی خاطر کئے جاتے ہیں تو اس سلسلے میں کچھ کاوشیں بھی شرط ہیں۔

عربی کی مشہور لغت "المنجد" میں الدین کے معنی اسطرح لکھے ہیں۔

الدینُ (مص) حساب (یوم الدین اسی سے ہے)

ملکیت، قدرت، حکم، مذہب، ملت۔

حالت، عادت، تدبیر، تدبیر، نیازمندی، گناہ، مجبوری

پرہیزگاری، فرمانبرداری، بدلہ، قہر، غلبہ۔
قوم دین :۔ اطاعت شعار لوگ۔

القاموس الجدید میں اس کے معنی اسطرح بتائے گئے ہیں
دین (جمع) ادیان: مذہب، عقیدہ، پرہیزگاری، عبادت، جزا، بدلہ۔
سید ابوالاعلیٰ مودودی نے تفہیم القرآن میں لکھا ہے کہ "دین کا لفظ عربی زبان میں اس نظام زندگی یا طریق زندگی کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ جس کے قائم کرنے والے کو مسند یا مطاع تسلیم کرکے اس کا اتباع کیا جائے۔
انگریزی لغات میں Judgment کے معنی فیصلہ ہے۔ عدالت فوجداری یا دیوانی صیغے کے مقدمات میں صادر کئے گئے احکامات کے علاوہ دینیات میں جس معنی میں مستعمل ہے اس کا بالخصوص ذکر اس طور پر ہے۔

Judgment : a Misfortune regarded as sent by Providence in punishment (Chambers)
(بطور سزا غیب سے نازل ہونے والی بدبختی)

" A disaster or affliction regarded as afflicted by God as a punishment for sin.
گناہوں کے عوض خدا کیطرف سے پڑنے والی غضب کی مار
" : The final award of sentence on the human race (بنی نوع انسان کیلئے صادر آخری سزا)
" Misfortune regarded of sentence on the (Standard) displeasure (خدائی ناراضگی کی علامت کے طور پر بدنصیبی)
(Collins gem)

Judgment کا لفظ دینوی اعتبار سے اس فیصلے کیلئے استعمال کیا جائے گا جس میں

فیصلہ صادر کرنے والا قرائن اور شہادتوں کی بنا پر سچائی تلاش کرکے اپنی رائے قائم کرتا ہے ۔
اللہ تعالیٰ کی ذات سمیعٌ بصیرٌ ہے ۔ اس کے علم لامحدود میں سب کچھ ہے ۔
اس کا فیصلہ کسی قرائن، شہادت یا سفارش کا محتاج نہیں ہے ۔
سورہ رحمٰن میں ارشاد ہوا " يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ (رحمٰن)
(گنہگار مجرم لوگ اپنے چہروں سے پہچان لئے جائیں گے۔ ان کو پیشانی کے بال اور پاؤں سے جکڑ دیا جائے گا)
علم مذہبیات اور بالخصوص بائیبل کی زبان میں Day of Judgment کے معنیٰ ہیں وہ دن جب
گنہ گاروں پر عذاب الٰہی کی مار پڑے گی ۔ یہ تصور بھی یکطرفہ ہے ۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے دین کی تکذیب
کرنے والوں کو جہنم میں داخل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی نعمتوں کی یاد دہانی کرائی ہے ۔
هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۔ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ۔ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ
(یہی وہ جہنم ہے جس کو مجرمین جھٹلاتے تھے ۔ اس جہنم میں کھولتے ہوئے پانی کے درمیان وہ گردش کرتے رہیں گے
سو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)
اس لحاظ سے بھی یوم الدین کا وہ تصور Day of Judgment سے عیاں نہیں ہوتا جس میں
اللہ تعالیٰ کی صفات رحمت و بخشش غالب ہو ۔
یوم الدین میں ایک طرف تو آخرت کے منازل کی گوناگوں کیفیات کے درمیان انسان
کیلئے جو سزا و جزا اور رضائے الٰہی نے مقدور و مقرر کر رکھی ہے ۔ اس کے صادر ہونے کا تصور پنہاں ہے
اور دوسری طرف عرصۂ حشر و نشر کا محیط و بسیط وقفہ جس کی طوالت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے ۔ وہ
وسعت ایام بھی مضمر ہے ۔ اس دن کا تصور انسان کے احاطۂ فکر سے باہر ہے اس لئے DAY کے
سپاٹ لفظ سے اس کی صحیح ترجمانی اور تاثر انگیزی نہیں ہوتی ۔
یوم الدین کا مخصوص تصور پیش کرنے کیلئے لفظ یوم کا ترجمہ انگریزی میں DIVINE DAY
زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے ۔ جس طرح یوم کا مخصوص تصور لفظ DAY سے ادا نہیں ہوتا
اسطرح الدین اور Judgment میں بھی معنوی یکسانیت نہیں ہے اور نہ لفظ Judgment
الدین کا مخصوص تصور پیش کرتا ہے ۔ سرسری طور Day of Judgment یوم الدین کا غلط ترجمہ نہیں
کہا جاسکتا کیونکہ یوم الدین کی تمام کیفیتوں میں ایک پہلو Judgment (فیصلہ) کا بھی ہے ۔

مگر اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ انگریزی کا یہ لفظ یوم الدین کا وہ تاثر نہیں پیدا کرتا جو قرآن پاک کا مقصد ہے۔ انگریزی کی زبان میں ایک لفظ DESTINY واقع ہوا ہے۔ لغات میں ان کے معانی یوں ہیں۔

The power that fore ordains — Collins (صدور احکام کی قدرت)

Course of events or person's fate (تسلسل حوادث یا لائحہ تقدیر)

That to which any person is destined (جو کسی شے یا شخص کیلئے مقدور ہو چکا ہو — قسمت، تباہی)

standard) fortune, doom

Inevitable necessity, Divine Decree, fate (موازنات ناگزیر، احکام الٰہی، تقدیر)

The purpose or end to which any person or thing is appointed. (Chambers) (کسی شخص یا شے کی بعثت کا مقصد یا اس کا خاتمہ بالخیر)

Unavoidable fate (تقدیر ناگزیر)

Necessity (ضروری۔ لازمی)

اس کے علاوہ ایک اور لفظ انگریزی زبان کا ہے۔ جو اکثر بائبل کی زبان میں قیامت کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ DOOMSDAY لغتِ انگریزی میں اس کے معنیٰ بالاتفاق حسب ذیل ہیں۔

Fate, Destiny, ruin, Doomsday (تقدیر۔ مقدور۔ تباہی)

The day of last judgment (آخری فیصلے کا دن)

لیکن محاورتی طور پر DOOM لفظ بھی حزن و حرمان نصیبی کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔ جب کہ یوم الدین کے اسلامی تصور میں خوف و رجا دونوں کی آمیزش ہے۔ اس دن اللہ تعالیٰ کی شانِ جباریت و قہاریت کے ساتھ ساتھ اس کے جود و کرم اور رحمت و بخشش کا منظر بھی تمام ہوگا جس کے اعمال نامہ سے جو کچھ بھی اس کے لئے مقدور ہو چکا ہے اس کو عطا کیا جائے گا اور اس کے بعد وہی ابدی زندگی کے حدود میں داخل ہوگا جہاں شب و روز کا پیمانۂ وقت بھی ناپید ہوگا۔

سورۂ فاتحہ میں واقع الفاظ مالک۔ یوم اور دین کے اس معنوی اور دینی تفہیم کے تجزیہ کے ساتھ دیکھا جائے تو مالک یوم الدین کا ایک ترجمہ MONARCH OF THE DIVINE DAY OF DESTINY."

owner, master, sovereign of the day of Judgment بھی ہو سکتا ہے۔ اور غالباً الفاظ کے مقابلے میں زیادہ وسیع المعانی اور قرآن پاک کے مقصد اور مفہوم کے زیادہ قریب ہوگا۔ مزید براں انگریزی تراجم میں شروع سے آخر تک ایک سنگین لفظی غلطی سورۂ بقرہ کی تیسری آیت سے شروع ہو کر آخری قرآن تک بار بار دہرائی گئی ہے۔ کتاب ہدایت اور صحیفۂ ربانی کی تصدیق کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "الٓمّٓ ۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۔ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۔

(الف ۔ لام ۔ میم ۔ یہ اللہ کی کتاب اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے ان پرہیزگاروں کیلئے جو غیب پر ایمان لاتے۔ نماز قائم کرتے ہیں جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں)

بقرہ الآیہ ۳ ۔ لفظ رَزَقْنٰ کے ترجمہ پر توجہ مرکوز کی جائے تو صورت حال یہ نظر آئے گی کہ رزق عطا کرنے والا بھی وہی خدائے واحد ہے۔ جس نے کتاب نازل فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا تصور اور اس کے ساتھ کسی دوسری شے یا طاقت کے شرک سے انکار اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ جو بنی نوع انسان کو ہر طرح کی شعوری اور لاشعوری شرک سے پاک کرتا ہے۔ انگریزی مترجمین نے اس کے ترجمہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات وحدہٗ لاشریک لہ کیلئے لفظ WE استعمال کیا ہے۔

مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

spend out of that We have provided

عبداللہ یوسف علی ۔

spend of that We have bestowed upon them.

پکتھال ۔

سورۂ بقرہ کی ابتدائی رکوعات میں ہی انگریزی مترجمین نے مندرجہ ذیل آیات کے ترجمے میں ذات باری تعالیٰ کیلئے " I " کا بھی استعمال صیغہ واحد متکلم میں کیا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۔ بقرہ

'Behold, thy Lord said to angels " I will create a vicegerent on earth."

عبداللہ یوسف علی

" And when Thy Lord said unto the angels: Lo! I am about to place a viceroy in the earth

(پکتھال)

بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کی گئی نعمتوں اور فضیلتوں کی یاد اس طرح دلائی ہے۔

" یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَ اَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ

انگریزی مترجمین نے اسے یوں لکھا ہے:-

O, Children of Israil! call to mind the favour which I bestowed upon you to all others. (عبد اللہ یوسف علی)

O' children of Israil! Remember my favour wherewith I favoured you, and how I preferred you to (all) others. (پکتھال)

اسی سلسلۂ کلام میں اللہ تعالیٰ نے آگے فرمایا ہے۔

وَ اِذْ نَجَّیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۔ بقرہ ۴۹

جس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے

And remember We delivered you from the people of Pharaoh:- (عبد اللہ یوسف علی)

And (remember) when We did deliver you from Pharaoh's folk. (پکتھال)

مذکورہ بالا آیت ۴۹ سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدم کا ذکر کرتے ہوئے ملائکہ سے خطاب فرمایا تو اپنے لئے صیغۂ واحد متکلم استعمال کیا۔ آیات ۴۷ تا ۴۹ میں مخاطب بنی اسرائیل سے ہے۔ سلسلۂ کلام بھی ایک ہے اور متکلم بھی ایک، وہی ذات باری تعالیٰ وحدہٗ لاشریک۔ لیکن ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے صیغۂ واحد متکلم کا استعمال کیا ہے اور فوراً بعد جہاں ظالم فرعون سے نجات دلانے کا ذکر ہے۔ اپنی اہمیت پر زور دیتے ہوئے صیغۂ جمع متکلم کا انتخاب فرمایا ہے۔

قدیم عربی زبان میں واحد متکلم بھی اپنی اہمیت پر زور دینے کے لئے اپنی ذات واحد کے لئے بھی صیغۂ جمع متکلم کا استعمال کر سکتا ہے۔

فارسی، اردو اور ہندی میں بھی یہ طریقہ بالعموم رائج ہے۔ لیکن انگریزی زبان میں اس طرح کی گنجائش
نہیں ہے کہ ایک فردِ واحد اپنی ذاتِ خاص کیلئے "I" کے بجائے WE کا استعمال کرے۔
البتہ کسی مشترکہ ادارے یا کمپنی کیطرف سے خط وکتابت اور تخاطب کرنے والا WE کا لفظ استعمال
کرتا ہے۔ لیکن اس کے اس طرزِ عمل میں دیگر شرکاءِ کار کی نمائندگی کا جذبہ کارفرما رہتا ہے۔ حکومتوں کے
سربراہ اور ان کی نمائندگی کرنے والا بھی کبھی کبھی اپنے لئے صیغۂ جمع متکلم WE کا استعمال کرتا ہے۔
جب وہ امورِ حکومت سے متعلق یا جملہ افراد وارکین حکومت کی جانب سے کوئی بات کہے گا۔ لیکن جہاں
اس کا تعلق صرف اپنی ذاتِ منفرد سے ہوگا وہاں پر بہر حال لفظ "I" کا استعمال ہوگا۔ انگریزی کتب
میں WE کے حسب ذیل معانی دیئے گئے ہیں۔

WE :- first person plural Pronoun (Collins)

" :- Plural of I, including the speaker and another or others. writer or speaker formal use as by editorial writers, sovereigns etc. (Standard)

" :- Pronoun plural of I. I and others used for I by Monarchs, also by editors etc (Chambers)

مذکورہ بالا معانی کیلئے لحاظ سے امراءِ حکومت اور والیانِ سلطنت بھی WE کا استعمال کرتے
ہیں۔ لیکن اس سے یہ گوشہ بھی نکلتا ہے کہ یہ طرزِ تخاطب شاہانہ حیثیت اور معاملات میں اپنی اہمیت
زور دینے اور دیگر شرکاءِ کار کی نمائندگی کے جذبہ کے تحت استعمال ہوتا ہے۔ وہی شخص جب باپ
یا شوہر کی حیثیت سے انگریزی زبان میں گفتگو کرے گا تو وہ لفظ "I" (واحد متکلم) کا ہی استعمال
کرے گا۔ اصطلاحِ عام میں ایک سے زائد اشخاص کیلئے ہی انگریزی زبان کا لفظ WE استعمال ہوگا۔
دوسرا قابلِ غور نکتہ یہ بھی ہے کہ انگریزی زبان کے موجدین اور لغاتِ انگریزی کے وضع کرنے
والوں میں بیشتر وہی لوگ ہیں جو تثلیثِ خدائی کے قائل ہیں۔ اس لئے ان کی زبان میں خدا بھی WE
کا لفظ استعمال کر کے تخاطب کر سکتا ہے۔ لیکن اسلامی عقیدۂ توحید کی یہ بنیادی خلاف ورزی ہوگی۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اِنَّ ھٰذَا الْعِلْمَ دِیْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ

فَاَنْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِیْنَکُمْ (حدیث) (بیشک یہ علم دین ہے تو تم کو غور کرنا چاہئے کہ اپنا دین تم کن لوگوں سے حاصل کرتے ہو)

عہد رسالت میں بولی اور سمجھی جانے والی قرآن و حدیث کی زبان عربی مبین کے ترجمے کے لئے یہود و نصاریٰ کے وضع کئے ہوئے تو اعد صرف و نحو سے رہنمائی حاصل کرنے ہی سے دینی فہم و ادراک میں گریز کے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔

صیغہ جات واحد اور جمع متکلم کا اطلاق لسانی صرف و نحو کے قواعد کے مطابق کلام بشریت پر ہوتا ہے۔ کلام الٰہی کے الفاظ و معانی میں بشریت کے اصولوں پر تاویل کرنا مناسب نہیں ہوگا۔

مقدمہ احسن التفاسیر اردو کے مندرجہ ذیل اقتباس سے بھی اس مسئلہ پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کی صفات اور مخلوقات کی صفات میں فقط صفات کا نام لیا جاتا ہے۔ اور درحقیقت دونوں صفتوں میں کوئی مشابہت نہیں ہے تو جن متاخرین مفسروں نے صفات الٰہیہ اور صفات مخلوقات میں مشابہت کا گمان دل میں پیدا کر کے آیاتِ صفاتِ الٰہیہ میں طرح طرح کی تاویلیں کی ہیں ان کا یہ طریقہ صحابہ اور تابعین کے طریقہ سے بالکل مخالف ہے۔ کلام پاک میں آیت "لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ" سے اللہ تعالیٰ نے اس بات کو اچھی طرح بتلا دیا ہے کہ جس طرح اللہ کی ذات کی اصلِ حقیقت کسی کو معلوم نہیں اسی طرح اس کی صفات کا حال ہے کیوں کہ جیسی موصوف کی ذات ہے اسی کے شان کے موافق جب تک اس کی صفات نہ ہوں تو جو مناسبت موصوف و صفت میں ضروری ہے وہ باقی نہیں رہتی۔

قرآن پاک میں سورۂ اخلاص کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات یا صفات کا تعارف۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ سے کرایا ہے۔ اس پس منظر میں (اللہ تعالیٰ کی ذات متکلم کیلئے کہیں پر صیغۂ واحد (I) اور کہیں پر جمع (WE) کے الفاظ کا استعمال کر کے انگریزی مترجمین نے خواہ مخواہ ایک خلجان کی گنجائش پیدا کر دی ہے۔ جو مشرکین کے اعتراضات کو تقویت پہونچاتا ہے۔ قرآن پاک کے ترجمے کیلئے کچھ مستند اصول وضع کئے گئے ہیں انھیں ہمیشہ نظر میں رکھنا چاہئے۔

مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ جب تمہیں قرآن کے کسی لفظ میں اشکال پیش آئے تو اشعار عرب میں اس کا لفظ تلاش کرو۔ کیوں کہ عربی زبان کی تعبیر اور اس کے معانی کی تعیین کیلئے اشعار عرب ہی معیار ہیں۔

• امام اللغت ابن الانباری نے اپنی کتاب "لمع الادلہ" میں لکھا ہے: "جو لغت قرآن میں یا حدیث کی روایت متواترہ میں آئے ہیں وہ متواترہ اور قطعی ہیں۔ یعنی جن معانی کیلئے قرآن وحدیث میں مستعمل ہوئے ہیں ان کے وہی معنیٰ یقینی زبان یا زبان کے بدلنے سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے"۔

• مقدمہ المنجد اردو میں علامہ مفتی محمد شفیع صاحب نے مذکورہ بالا اصولوں کی مزید وضاحت کی ہے "لغوی کے لئے لازم ہے کہ وہ اشعار عرب کو یاد کرے اور ان کے معانی و حقائق کو سمجھے۔ کیونکہ اس سے ذریعہ فہم قرآن پر قدرت حاصل ہو سکتی ہے۔

آگے لکھتے ہیں کہ "عربی لغت میں اشتغال صرف ایک زبان کا اشتغال نہیں بلکہ ایک دینی فریضہ کی ادائیگی اور عبادت کی حیثیت رکھتا ہے۔

جس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان صرف زبان کی حیثیت سے مطلوب نہیں ہے جس ادلنے بدلنے کا اہل لسان کو ہر وقت ہمیشہ اختیار ہوتا ہے بلکہ مسلمانوں کیلئے عربی زبان کی اس لئے اہمیت ہے کہ وہ قرآن وسنت کی زبان ہے اور یہ مقصد ظاہر ہے کہ اسی زبان سے متعلق ہے جس میں قرآن نازل ہوا اور جو عہد رسالت میں بولی اور صحیح سمجھی جاتی تھی۔

سید ابو الاعلیٰ مودودی نے تفہیم القرآن کے دیباچہ میں بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔

"قرآن اگرچہ عربی مبین میں نازل ہوا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ اپنی ایک مخصوص اصطلاحی زبان بھی رکھتا ہے۔ اس نے بکثرت الفاظ کو اپنے اصلی لغوی معنیٰ سے ہٹا کر ایک خاص معنیٰ میں استعمال کیا ہے اور بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کو وہ مختلف مواقع پر مختلف مفہومات استعمال کرتا ہے۔ پابندیٔ لفظ کے ساتھ جو ترجمے کئے جاتے ہیں ان میں اس اصطلاحی زبان کی رعایت ملحوظ رکھنا بہت مشکل ہے۔ اور اس کے ملحوظ نہ رکھنے سے بسا اوقات ناظرین طرح طرح کی غلط فہمیوں اور الجھنوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں"

قرآن پاک میں رَزَقْنٰھُمْ، نَجَّیْنٰکُمْ، آتَیْنٰکُمْ یا اس طرح کے صیغۂ جمع متکلم میں ارشاد ربانی اور بالخصوص جہاں لفظ نَحْنُ استعمال ہوا ہے ان سب کے ترجمے میں انگریزی میں لفظ We کے استعمال کے ساتھ اَنَا اور اِنِّیْ وغیرہ الفاظ کے ترجمے میں لفظ I کے استعمال سے اسی طرح کی غلط فہمیاں اور الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ جن کی طرف مودودی صاحب نے اشارہ کیا ہے۔

ایک انگریزی داں مخالف دین اور مشرک ان انگریزی تراجم کا سہارا لیکر قرآن پاک کی آیتوں میں یہ موشگافی کرنے کی گستاخی کرسکتا ہے کہ جہاں ایک خدا نے کلام کیا ہے وہاں لفظ I ہے اور جہاں اسنے نعوذ باللہ دیگر خداؤں کی شرکت میں کلام کیا ہے وہاں لفظ We کا استعمال ہوا ہے۔ قرآن پاک کی تعلیمات اور عقائد اسلامی کی اشاعت سے بے نیاز ہوکر جب مترجمین محض پابندئ الفاظ کے دائرے میں کلام الٰہی کا ترجمہ کریں گے تو ذرا سی نگاہ بصیرت چوکی اور روح قرآن مجروح ہوئی اور اعتراضات و توہمات کے زاویے خواہ مخواہ وجود میں آنے لگتے ہیں۔

یہ تمہیدی اور تجزیاتی موقف قرآن پاک کی فہم و ادراک رکھنے والے علماء دین کو بغرض اصلاح نذر کر رہا ہوں۔ زیادہ ممکن ہے کہ میری کم فہمی کی بنا پر میری نگاہ ان نکات تک نہ پہونچی ہو جہاں تک انگریزی کے مشاہیر، مستند مترجمین کے طائر فکر کی پرواز گئی ہو۔ اس اعتراف کے ساتھ میں خود اپنے نظریے کی اصلاح و تصحیح سے اہل علم حضرات کی رہنمائی کا منتظر ہوں۔

لیکن اگر میرا یہ تجزیہ کسی حد تک درست ہو تو ہم سب کو بہت سنجیدگی کے ساتھ انگریزی ترجموں جو دیگر زبانوں کے مقابلے میں کثیر تعداد میں پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں ان کے دوراس اور گمراہ کن نتائج کے اندیشوں پر بھی نظر رکھنی ہوگی۔

اس کی درستگی کے لئے کچھ ٹھوس اور مفید اقدامات کرنے ہوں گے۔ عالم اسلام کے مفکرین و موحدین بالخصوص عربی اور انگریزی میں برابر کا دخل رکھنے والے علماء کرام کے اجتماعی مشاورت کے ذریعہ ہی اس چمن میں کوئی لائحہ عمل تیار کیا جاسکتا ہے جو نئی روشنی میں پروردہ، اردو عربی سے بے بہرہ اور انگریزی تہذیب و زبان کے دلدادہ مسلمانوں کو دینی گمراہی سے بچا سکے اور قرآن کریم کی بہتر تفہیم ہم پہنچا سکے۔

• وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ •

حمید نسیم رفیع آبادی
ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی
متعلم شعبۂ فلسفہ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

اقبال نے ان دنوں شعور کی آنکھیں کھولیں جب ہر طرف مسلمانوں پر ادبار اور تنزل کے مہیب سائے منڈلا رہے تھے۔ خلافتِ عثمانیہ دگرگوں حالات سے دوچار تھی۔ برصغیر ہند کے مسلمان سیاسی اور اقتصادی زبوں حالی کے علاوہ اخلاقی اور مذہبی لحاظ سے بھی بہت بگڑے ہوئے تھے۔ انگریزی غلامی نے مسلمانوں سے ان کا سب کچھ چھین لیا تھا، انکی دنیا چھینی تھی، ان کی تہذیب برباد کی تھی، ان کی بہادری و جوانمردی کے اوصاف کو تہذیبی جارحیت اور تعلیمی تیزاب کے ذریعے نیست و نابود کر دیا تھا، ہر جگہ مکان پٹ رہے تھے ۱۸۵۷ء کے زخم ابھی تازہ تھے۔ ان کی جان و مال اور عزت غیر محفوظ تھی۔ مغربی تعلیم نے مسلمانوں سے وہ تمام مجاہدانہ اور جرأت مندانہ صفات چھین لئے تھے جو کبھی ان کا طرۂ امتیاز تھے۔ اور اب وہ ان کے لئے قصۂ پارینہ بنکر رہ گئے تھے۔ وہ تن آسانی اور سہل پسندی کی بیماری میں مبتلا ہو چکے تھے انکی دینی حس کمزور اور اخلاقی روح مجروح ہو چکی تھی۔ وہ اپنی تہذیب تمدن روایات ماضی اور مذہب سے کافی حد تک بیگانہ ہو چکے تھے، وہ نام کے مسلمان تھے اور انکی زندگیاں اسلام کی حیات بخش اور انقلابی تعلیمات سے خالی ہو گئی تھیں۔ مسلمان نوجوانوں کو مغربی تعلیم کے تیزاب سے ایسا موم بنا دیا گیا تھا کہ انکو باطل جس طرف ہنکانا چاہتا بلا مزاحمت ہنکا سکتا تھا۔ ان کے اندر جوانمردی اور بلند حوصلگی کے تمام تصورات ختم ہو چکے تھے۔

یہ وہ حالات تھے جبکہ علامہ اقبال امت مسلمہ کی حُدی خوانی کرنے کیلئے میدان میں آئے اور اس ناقۂ بے زمام کو سوئے قطار لے چلنے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ علامہ نے بنیادی طور پر یہ بات محسوس کی کہ مسلمان ایمان، عمل، جدوجہد اور استغنا سے محروم ہو گئے ہیں۔ اگرچہ مسلمان قوم میں کسی نہ کسی درجے میں ایمان موجود تھا مگر جس کو یقین کہا جا سکتا ہے اس سے وہ خالی تھے وہ اسلام کے نظام زندگی ہونے اور اس کے برحق ہونے پر مطمئن نہیں تھے۔ بلکہ یا تو اس کے بارے میں

شک و شبہات میں گرفتار ہو چکے تھے یا ان کے اذعان کی روشنی مدھم ہو چکی تھی جس کی وجہ سے ان میں مومنانہ کردار و فراست را عائی مفقود تھی ۔ دوسری طرف وہ مختلف وجوہات کی بنیاد پر تقدیر کا بہانہ بنا کے عمل سے فارغ ہو چکے تھے ۔ وہ تصوف کے غلط رجحانات سے متاثر ہو کر بے عملی اور تعطلی کے شکار ہو چکے تھے ۔ اگر ان کے اندر عمل کا کوئی جذبہ تھا بھی تو وہ محدود تھا ۔ وہ جہاد کی اسپرٹ سے بالکل بے پرواہ ہو گئے تھے اور جہاد پر آمادہ کرنیوالی جتنی بھی چیزیں تھیں ان سے وہ غافل ہو چکے تھے ۔ فقر و استغنا کے بجائے عیش کوشی و نفس پرستی ان کا خاص امتیاز بن چکا تھا ۔

علامہ اقبال نے انھیں حوصلہ شکن اور پُرفتن حالات میں مسلمانوں کے سامنے خودی کا فلسفہ رکھا اور انھیں زندگی کا شعور عطا کرنے کیلئے تعمیر سیرت کے چند خاص پہلوؤں کو اُجاگر کیا ۔ کیونکہ علامہ کو یہ یقین کامل تھا کہ اس وقت تک مسلمانوں کے تمام مشکلات اور بیماریوں کا علاج ناممکن ہے جب تک نہ انکی سیرت و کردار کی از سر نو اسلامی اصولوں پر تعمیر جدید ہو ۔ ایک بے سیرت اور اخلاقی لحاظ سے پسماندہ قوم یا جماعت سے ہرگز یہ توقع نہیں کی جا سکتی ہے کہ وہ دنیا میں ایک نئے نظام امامت کا بوجھ سنبھال سکے یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے مسلمانوں کی رگوں میں اسلام اور انقلاب کا خون دوڑانے کیلئے انکی سیرت کی تعمیر کیطرف خصوصی توجہ دی ۔ آپ نے خودی کا جو فلسفہ پیش کیا ہے اس کو لوگ معمہ اور چیستان سمجھتے ہیں حالانکہ یہ دراصل مسلمانوں کے نشاۃ ثانیہ کا ایک کارآمد اور مجرب نسخہ تھا ۔ خودی کے فلسفہ کے ذریعہ اقبال نے مسلمانوں کی انفرادی ، اجتماعی ، سیاسی اور بین الاقوامی حیثیت کو از سر نو ابھارنے کی کوشش کی ہے ۔ اور مسلمانوں کیلئے فکر و عمل کی راہوں کو کشادہ کیا ہے ۔ علامہ اقبال کی شاعری اور نثر میں ہمیں تعمیر سیرت کے پہلو اسی نسبت سے ملتے ہیں ۔

انسان کی سیرت میں سب سے اہم چیز انسان کا ایمان اور نظریہ ہوتا ہے یہ چیز انسان کے کردار میں فیصلہ کن ہوتی ہے ۔ انسان کی تعمیر سیرت کیلئے ایمان کا آخری درجہ جس کو یقین کہتے ہیں بہت اہم رول ادا کرتا ہے ۔ انسان کی سیرت و کردار کا انحصار بہت حد تک اس کے عقیدے پر ہوتا ہے ۔ جس قدر یقین مضبوط ہوگا اسی قدر اخلاق و سیرت بھی اعلیٰ و ارفع ہوگی ۔ اور جس قدر اس یقین میں تنزل کے آثار نمایاں ہونگے اسی قدر سیرت و کردار بھی پستی و گراوٹ کا مظاہرہ کرتی رہے گی ۔ چنانچہ قوموں کا صور تگر انسانوں کے درمیان میل محبت پیدا کرنے والا ، ان کو اعلیٰ و ارفع مقاصد کے لئے

ذہنی و جسمانی قربانیوں پر آمادہ کرنے والا، اور ان سے محیرالعقول کارنامے سرزد کرانے والا انسان کا عقیدہ ہی ہوتا ہے۔ اسلام نے مسلمانوں کو جو ایمان دیا ہے وہ علامہ کے نزدیک انکی پوری زندگی کی صورت گری کرتا ہے۔ یہی عقیدہ مسلمانوں کو تمام غلامیوں اور بندھنوں سے آزادی عطا کرتا ہے۔ انسانی عقیدے کے ذریعے سے ہی فکر و عمل کی نئی جہتوں کا سراغ ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اپنی تمام صفاتی جلال و جمال کے ساتھ انسان کے توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔ عقیدے کیوجہ سے ہی انسان کے اندر عزت نفس اور جوانمردی کے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں وہ بدی کی طاقتوں سے مفاہمت اور تعاون کے بجائے ستیزہ کاری کی روش اختیار کر لیتا ہے اور وہ کسی حالت میں بھی غیر اللہ کا سہارا گوارا نہیں کر سکتا۔ اقبال کہتے ہیں کہ جو آدمی خودی شناس ہوتا ہے تو وہ دوسروں کی چوکھٹ پر اپنا سر نہیں جھکاتا۔ وہ ظالموں اور بادشاہوں کے درباروں کا طواف نہیں کرتا، اس کی شخصیت جوانمردی، محبت اور دلربائی کا حسین مرقع پیش کرتی ہے ؎

خودی را مردم آمیزی دلیل نارسائی ہا
تو اے دردآشنا بیگانہ شو از آشنائی ہا

محبت از جوانمردی بجائے می رسد روزے
کہ افتد از نگاہش کار و بار دلربائی ہا

بود گاہ سلاطیں تا کجا ایں جبہ سائی ہا
بیاموز از خدائے خویش ناز کبریائی ہا

ایک اور مقام پر علامہ اقبال فرماتے ہیں مسلمان وہ ہے جو خدا کے سوا ہر شئے سے بے نیاز ہو اور اس کے برعکس تمام دنیا کیلئے خیر و برکت کا سرچشمہ ہو۔ وہ اپنی روزی کمینوں اور ظالموں کے ہاتھ سے لینا گوارا نہ کرتا ہو۔ انسان میں جب عرفان نفس اور خود آگاہی آجاتی ہے تو وہ توحید کے مطابق تمام باطل خداؤں سے اعلانِ برأت ظاہر کرتا ہے، وہ تمام ارباب من دون اللہ سے بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے چنانچہ اقبال فرماتے ہیں ؎

مسلم استی بے نیاز از غیر شو
اہل عالم را سراپا خیر شو

رزق خود را از کفِ دوناں مگیر
یوسف استی خویش را ارزاں مگیر

از پیامِ مصطفیٰ آگاہ شو
فارغ از اربابِ دون اللہ شو

اقبال کا خیال ہے کہ اللہ کا خوف انسان کو تمام قسم کے اندیشوں اور خوفوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ جیسے ایک حدیث میں بھی آتا ہے کہ "اللہ کا خوف پیدا کرو تمام خوفوں سے نجات مل جائے گی" نفسیات کا علم اور تجربہ بھی یہ بتاتا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کا کلمہ مسلمان کو پوری دنیا سے لڑائی مول لینے پر آمادہ کرتا ہے اور وہ ببانگ دہل اس کلمے کے اندر مضمر انقلاب کا اعلان کر دیتا ہے۔ انسان کے اندر مکاری، ہوس، حسد اور خوشامد کے جذبات صرف خوف سے پیدا ہوتے ہیں مگر جب انسان خدا پر ایمان لاتا ہے تو وہ ایک مضبوط سہارا تھام لیتا ہے اور تمام خوفوں اور اندیشوں سے آزاد ہو جاتا ہے ؎

لابہ و مکاری و کین و دروغ
این ہمہ از خوف می گردد فروغ

ہر شرِ پنہاں کہ اندر مکسب است
اصل او بیم است اگر بینی درست

انسان کے اندر جو خوف پیدا ہوتا ہے اس کی بنیاد دراصل انسان کی ان محبتوں میں پوشیدہ ہے جو وہ اپنے مفادات کے ساتھ روا رکھتا ہے۔ سورۂ توبہ میں بھی ان تمام باتوں کا ذکر بڑی تفصیل سے آیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مومن کو اپنے تمام رشتہ داروں، یہاں تک کہ اپنی جان سے بھی اپنا عقیدہ اور مسلک پیارا ہوتا ہے جب وہ عصائے لا الٰہ تھام لیتا ہے تو اس کو تمام خوفوں سے نجات مل جاتی ہے ؎

طرحِ تعمیرِ تو از گِل ریختند
با محبت خوف را آمیختند

خوفِ دنیا خوفِ عقبیٰ خوفِ جاں
خوفِ آلامِ زمین و آسماں

حُبّ مال و دولت و حُبّ وطن
حُبّ خویش و اقربا و حُبّ زن

تا عصائے لا الٰہ داری بدست
ہر طلسم خوف را خواہی شکست

علامہ اقبال ایسے عالم کے حال پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں جو لا الٰہ جیسا انقلابی کلمہ اپنے پاس رکھتا ہے اور اس کو ظاہر نہیں کرتا ہے۔ حالانکہ یہ کلمہ نمرود اور فرعون کے پاس بانگ دہل رکھنے کے قابل ہے کیونکہ توحید کے کلمہ کا یہ خاصہ ہے کہ وہ انسان کو وقت کے جابر و ظالم طاغوتی قوتوں کے سامنے کلمۂ لا الٰہ بلند کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ ؎

اے کہ در حجرہ ہائے سازی سخن
نعرۂ لا پیش نمرودے بزن

کیونکہ توحید کا عقیدہ انسان کے اخلاق و کردار پر زبردست اثرات ڈالتا ہے۔ اس کی تاثیر سے ڈر اور خوف کے احساسات مفقود ہو جاتے ہیں اور طبیعت میں دلیری اور شجاعت کے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں ؎

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

آئین جوانمرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

ایک بھی آدمی کے اندر ایمان کا یقین پیدا ہو جائے اور وہ توحید کا رمز آشنا ہو جائے تو اس کی معمولی پھونک سے بہت سی غیر معمولی واقعات ظہور میں آسکتے ہیں ؎

آگ اس کی پھونک دیتی ہے برنا و پیر کو
لاکھوں میں بھی پیدا ہو اگر صاحب یقیں

ایک مومن کو اگر ایمان لانے کے بعد حقیقت توحید کا احساس ہو جائے تو وہ اپنے آپ کو خدا کا دست قدرت اور خدا کی زبان محسوس کرنے لگے گا کیونکہ وہ اس احساس کے ماتحت خدا کی مرضی

کو دنیا میں جاری وساری کرنے کیلئے عملی جدوجہد بھی کریگا اور دنیا کے تمام غلط اور باطل نظریات اور فلسفوں کے خلاف علم لیکر کھڑا ہو جائے گا ۔

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے
یہی اک شے ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمان غیور
موت کیا شے ہے فقط عالم معنی کا سفر
ان شہیدوں کی دیت اہل کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر

آ اے مسلماں تجھے کیا یاد نہیں
حرف لا تدع مع اللہ الٰہاً آخر

علامہ اقبال ایمان کی اس زبردست قوت کا بیان کرنے کے بعد جب اپنے دور کے مسلمانوں کی بے عملی زندگی اور جمود زدہ ذہنیت کو دیکھتے ہیں تو حسرت اور غم کے ملے جلے انداز بیاں میں مسلمانوں سے مخاطب ہوتے ہیں ۔

اے لا الٰہ کے وارث باقی ہے یہی تجھ میں
گفتار دلبرانہ کردار قاہرانہ
تری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے
کھویا گیا ہے تیرا جذب قلندرانہ

دوسری چیز جس کو علامہ اقبال نے تعمیر سیرت کیلئے بہت زیادہ ابھارا ہے وہ عمل ہے ۔ یہ عمل بھی

دراصل اسلام کے دیئے ہوئے عقیدے کی ہی فرع ہے۔ عمل یعنی بھرپور مسلمانوں کی اجتماعی و انفرادی جد و جہد جہاد اور مجاہدۂ نفس بھی کراتا ہے اس لئے یہ پہلو بہت بھرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر اقبال زندگی کو جہد مسلسل، سعی پیہم اور کوشش اتمام سے عبادت سمجھتے ہیں۔ قرار سکون اور آرام طلبی کو علامہ اشخاص اور قوموں کی زندگی کیلئے زہر ہلاہل جانتے ہیں۔ اقبال انسان کو شاہین کی طرح آزادانہ زندگی گذارنے پر ابھارتا ہے اور اسے ماہ نو کے مانند فضائے نیل گوں میں بلند اور اعلیٰ منزلیں طے کرنے پر اکساتا ہے۔ اقبال انسان کو دنیا میں غالب، کارکشا اور کارساز دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے برعکس اسے مغلوبیت، زبوں حالی، غلامی اور پستی سے کوسوں دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ حریت، جوانمردی اور عزت و خودداری کو اپنانے کا درس دیتے ہیں۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی وسیع و عریض کائنات کی تسخیر کیلئے سورج کی طرح تب و تاب اور عمل کی حرارت پیدا کرنے کا سبق دیتے ہیں۔ ایک سو سال بھیڑ کی زندگی سے بہتر شیر کی طرح صرف ایک لمحہ زندہ رہنا اقبال کے نزدیک زندگی کی عظیم و اعلیٰ علامت ہے ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت سے نہ نوری ہے نہ ناری ہے

در بیابان چون شرار از خود مرد
در تلاش خرمنے آوارہ شو

تاب و تب داری اگر مانند مہر
پا بند در دست آباد سپہر

سینہ داری اگر در خورد تیز
در جہان شاہین بزی شاہین بمیر

زندگی را چیست رسم و دین و کیش
یک دم شیری بہ از صد سال میش

اقبال فرماتے ہیں کہ انسان کو تسخیر کائنات کے ساتھ بلند اخلاق کا حامل ہونا چاہئے وہ ایک

ایسے انسان کی تلاش میں ہے جو پھول کیطرح نرم اور پتھر کیطرح سخت ہو، جو نرم دم گفتگو و گرم دم جستجو۔ جو دوستوں کی محفل میں ریشم کیطرح نرم مگر رزم حق و باطل میں فولاد کیطرح مضبوط ہو، جو گلستاں کیلئے جوئے نغمہ خواں بننے کی صلاحیت رکھتا ہو لیکن جب اس کی راہ میں کوہ و بیاباں حائل ہوں تو وہ تند اور تیز طوفان کا سماں پیدا کرے۔ اقبال ایسے مرد مومن کا متلاشی ہے جو اپنے نفس اور اس کی خواہشات کو قابو میں رکھنے والا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ خود دار و عمل کا پیکر بھی ہو۔ ایک ایسا مرد مومن جو اپنے زور بازو سے ایک نئے زمانے اور ایک نئی تاریخ کو وجود بخشے، جو زمانے کے پیچھے چلنے کے بجائے زمانے کو اپنے پیچھے چلانے کا عزم اور حوصلہ رکھتا ہو، وہ زندگی میں اور موت کے وقت غرض ہر جگہ بہادری اور شجاعت کا مظاہرہ کرتا رہے۔ علامہ کے نزدیک طاقت، مشکلات سے فرار میں نہیں بلکہ ان سے پنجہ آزمائی میں مضمر ہے۔ وہ انسان کو اشرف المخلوقات کے مقام بلند کا احساس دلاتے ہیں اور اس کو منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کچھ اصولوں اور ضابطوں کی پابندی اختیار کر لینے پر رضامند کر لینا چاہتے ہیں۔ افراد اگر خدا کی دی ہوئی صلاحیتوں کو بروئے کار نہ لائیں تو اقبال کے نزدیک انسان کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہونے کے بجائے موت کی آغوش میں ابدی نیند سے ہمکنار ہو جاتی ہیں ؎

سنگ شو اے ہمچو گل نازک بدن
تا شوی بنیادِ دیوارِ چمن

گر نہ سازد با مزاج او جہاں
می شود جنگ آزما با آسماں

در جہان نتواں اگر مردانہ ایست
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

زندگی کشت است حاصل قوت است
شرح رمز حق و باطل قوت است

اے ز آداب امانت بے خبر
از دو عالم خویش را بہتر شمر

گر دعمل کی تمام صلاحیتیں غیروں پر تکیہ کرنے کے بجائے عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ کرتی

ہے اور اس کے لئے قوت و توانائی کے سامان مہیا کرتی ہے لیکن یہ قوت اپنے بقا و استحکام کیلئے محبت اور عشق کے جذبہ کی محتاج ہیں۔ جو انسان کو دنیاوی آلائشوں سے پاک کر کے اس کا رشتہ اپنے خالق کے ساتھ استوار کرنے پر آمادہ کرتا ہے ؎

عالم ہے غلام اس کے جلالِ ازلی کا
ایک دل ہے کہ ہر لحظہ الجھتا ہے خرد سے

آخری شعر میں اسی روح کی نشاندہی کی گئی ہے جو ذہنی عمل میں ہمیشہ موجود ہونی چاہئے اور جس کے بغیر انسان اپنے عمل میں اللہ کی خوشنودی کے ماتحت نہیں رہ سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ اگر خدا کی رضا مطلوب نہ ہو تو صلاح بھی جو بظاہر نیک کام ہے سراسر بدی بن جاتا ہے اور اگر اس کی خوشنودی مطلوب ہو تو لڑائی بھی بلا شبہ نیکی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ہماری زندگی کا ایک ایک عمل صرف اور صرف اس کی منشاء اور مرضی کے مطابق ہونی چاہئے۔ اقبالؔ کا مردِ مومن اپنی شخصیت کی تعمیر کے عمل میں اپنے نفس کی خواہشات سے بھی برسرِ پیکار رہتا ہے ؎

مردِ مومن زندہ و با خود بجنگ
بر خود افتد ہمچو بر آہو پلنگ

اقبالؔ نرم فرشوں اور قالینوں پر بیٹھنے والے لوگوں کو نہیں بلکہ سنگلاخ راستے پر چلنے والے مجاہدوں کو پسند کرتا ہے۔ اور قوت کیلئے کوہ و بیاباں میں چلت پھرت کو حقیقی سکون کا ضامن قرار دیتے ہیں ؎

سرورِ جو حق و باطل کی کارزار میں ہے
تو حرب و ضرب سے بیگانہ ہو تو کیا کہیے

وہ مسلمان کو مردِ سپاہی اور اسلام کا غازی دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کو مسجد کا ملاّ اور ابلۂ مکتب دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اسے ہر دم جد و جہد، سعی و کوشش اور جستجوئے ناتمام میں دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ اسی کی خودی کی تعمیر ہو سکے۔ اسے کسی بھی منزل میں سکون اور راحت پسند نہ ہو بلکہ وہ رختِ سفر باندھے ہمیشہ تیار رہتا ہو، وہ مسلمان کو موم کیطرح نرم اور پارے کیطرح سستا نہیں دیکھنا چاہتے ہیں بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنے مقصد کا پکا حامی ہو اور اپنے دشمنوں کے لئے

فولاد کے مانند سخت ثابت ہو۔ مومن وہ ہوتا ہے جو زمانے کی اور زمانے کی روایات کی پیروی کرنے کے بجائے زمانے کو ہی اپنے پیچھے چلنے پر مجبور کرتا ہو، حالات کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بجائے ان کا رُخ بدلنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اب اگر خدانخواستہ وہ وقت کے دھارے کو اپنے ساتھ بہا کر لے جانے کی قوت نہ رکھتا ہو تو کم از کم وہ اتنا تو کرتا ہی ہے کہ اس کے خلاف برسرپیکار ہو جاتا ہے۔ مومن کی اذان سے شبستانِ وجود میں سحر پیدا ہوتی ہے وہ تند و تیز طوفان کیطرح اور طوفانی ہواؤں کے مانند راستے سے تمام رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اس کی راہ میں کوئی بھی چیز حائل نہیں ہوتی وہ اپنے دوستوں کیلئے سراپا رحمت و شفقت ہوتا ہے۔ اور اپنے دشمنوں کیلئے سراپا قہر ہوتا ہے وہ عمل اور جد و جہد سے کبھی بھی پیچھے نہیں رہتا ہے اور شاہین کیطرح پرواز مسلسل کا عادی ہوتا ہے۔ وہ چرخ نیلی فام سے بھی پرے اپنی منزل تلاش کرتا ہے وہ ایک ایسے کارواں کا مسافر ہے جس کی گردِ راہ ستارے ہوتے ہیں۔

مومن اپنی دینی اور ملی فرائض کی انجام دہی میں بے باک ہوتا ہے، وہ کسی قہر اور ظلم کیوجہ سے حق بات کہنے سے نہیں رکتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی اس کے برعکس اپنی جان پر کھیل کر حق بات کا اعلان کرتا ہے۔ مسلمان حسین کیطرح قافلہ حجاز کا سپاہی ہوتا ہے۔ جو آج بھی یزید کا مقابلہ کرنے کیلئے کربلا کا رُخ اختیار کرنے پر ہمیشہ کمربستہ رہتا ہے، اُس کے مقاصد جلیل ہوتے ہیں اور اس کی امیدیں قلیل ہوتی ہیں وہ دوسروں پر انحصار رکھنے کے بجائے خود دوسروں کا کفیل بننا پسند کرتا ہے۔

اقبال نے مسلمان کو شاہین سے نسبت دیکر یہ بات جتانے کی کوشش کی ہے کہ مومن شاہین کی طرح درویشانہ زندگی بسر کرتا ہے، آرام طلبی، سہولیت پسندی، عافیت کوشی سے دور ہوتا ہے، مسلسل اور انتھک عمل کا حامی ہوتا ہے اور دنیاوی و مادّی آلائشوں سے پاک و صاف ہوتا ہے۔

اسطرح اقبال نے مسلمانوں کی سیرت کی تشکیل و تعمیرِ جدید کے ضمن میں ایمان و یقین اور عمل پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ کیونکہ اقبال کا یہ پختہ ایمان تھا اگر مسلمان دوبارہ ان تین ہتھیاروں سے لیس ہو جائیں گے تو کھوئی ہوئی عظمت رفتہ کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں اور ایک بار پھر دنیا مسلمانوں کے کارہائے نمایاں کا نظارہ بچشم خود کرے گی ؎

آج بھی ہو اگر براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

عورت اور انتظام

(مجیب اللہ ندوی)

مغربی تہذیب نے انسانی معاشرہ کیلئے جو بہت سے غیر فطری مسائل پیدا کئے ان میں ایک مسئلہ مساوات مرد و زن بھی ہے۔ جہاں تک مرد اور عورت کی حیثیت اور حقوق میں مساوات کا تعلق ہے اس سے دنیا کے کسی مذہب یا اخلاقی نظام نے انکار نہیں کیا ہے اور نہ اسلامی نظام میں اس کو نظر انداز کیا گیا ہے بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انسانی معاشرہ میں عورت کو اصلی مقام اسلام ہی نے دیا ہے اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ اس بارے میں شاید دو رائے نہیں ہے کہ بحیثیت انسان عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ خاندانی نظام کو مستحکم کرنے میں بعض حیثیتوں سے اس کا مقام مرد سے اونچا ہے۔ مگر رائے کا اختلاف وہاں سے شروع ہوتا ہے جب مرد و عورت کے دائرہ کار کی بات شروع ہوتی ہے۔ مغربی تہذیب کے دلدادہ اور اس سے متأثر افراد یہ کہتے ہیں کہ عورت اور مرد کا الگ الگ کوئی دائرہ کار نہیں ہے بلکہ جس طرح ایک مرد سیاست معیشت اور نظم و انتظام کے ہر میدان میں رواں دواں ہے۔ اسی طرح اس کے دوش بدوش عورت کو بھی رواں دواں ہونا چاہئے۔

اس کے برخلاف اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بحیثیت انسان عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن نے جہاں تخلیقِ آدم کا ذکر کیا ہے وہیں یہ بھی کہا کہ اسی کے جنس سے ہم نے عورت کو بھی پیدا کیا ہے۔

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (اعراف)	وہی ذات ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اسکا جوڑا بنایا۔

اسی کے جنس سے اس کا جوڑا بنانے کی جو بات کہی گئی ہے اس سے یہ حقیقت ذہن نشین کرانی مقصود ہے کہ عورت کوئی ذلیل اور حقیر مخلوق نہیں ہے بلکہ انسان کی حیثیت سے وہ بھی اس شرف کی مستحق ہے جس کا ایک مرد مستحق ہے۔ قرآن کی اس تعلیم کی اہمیت کا اندازہ اس وقت لگا سکتے ہیں جب آپ اس بات کا مطالعہ کریں گے کہ بعثتِ نبوی کے وقت اور اس سے پہلے عرب ہی نہیں بلکہ پوری دنیا

کے معاشرہ میں عورت کی حیثیت کیا تھی اور نہ صرف مشرکانہ ماحول میں اس کی حیثیت ایک ذلیل
غلام کی تھی بلکہ خدا کی کتاب کے حاملین اہل کتاب کے یہاں بھی وہ ایک ناپاک مخلوق تھی ایام ماہواری
کے زمانہ میں ان کے قریب جانا ان کے نزدیک گناہ تھا۔ نسل آدم کی ساری غلطی کی ذمہ دار عورت
تھی۔ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ اسلام اور دوسری تہذیب میں اختلاف مساوات کے تصور یا انسانی
معاشرہ میں اس کی باوقار حیثیت میں نہیں ہے بلکہ اختلاف یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ عورت کو سیاسی
اور اجتماعی نظم و انتظام میں مردوں کے دوش بدوش رکھے بغیر اس کی باوقار مساویانہ حیثیت قائم رہ سکتی
یا نہیں۔ اور اس کا دائرہ محدود کرنے میں کون سے نقصانات ہیں۔ اس وقت جو لوگ اس کے داعی ہیں
عملاً وہ بھی دستور ساز اداروں میں نظم و انتظام یعنی ایڈمنسٹریشن میں عورت کو کہیں مساویانہ
حیثیت نہیں دیتے ہیں مگر عورتوں کا ووٹ حاصل کرنے یا ان کی سیاسی ہمدردی حاصل کرنے کیلئے یا
یا پھر ان کو اپنی ہوسناکی کا شکار بنانے کیلئے یا مرعوبیت کی بنا پر نعرہ مساوات مرد و زن ہی کا لگاتے ہیں
جہاں اس وقت کوئی عورت ملک کی سربراہ ہے جیسے کہ ہمارے ملک میں بھی ہے وہاں بھی ان کو مذکورہ بالا شعبوں
میں مساویانہ حیثیت نہیں دی گئی ہے۔ نہ تو روس میں کبھی کوئی عورت صدر و وزیر اعظم بن سکی اور
نہ امریکہ و فرانس میں میرے علم میں نہیں ہے کہ کسی ملک نے عورتوں کی فوج کی کوئی پوری ٹبالین بنائی
ہو اور پھر اس نے کسی محاذ پر پہنچ کر ملک کا کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہو ہندوستان میں ایک بار
کچھ لوگ نے عورتوں کو فوج میں بھرتی کے لئے کہا تو جنرل کری آپا جو اس وقت کے کمانڈر انچیف
تھے یہ حکم جاری کیا «دیویو! تم گھر کے کام کاج سنبھالو فوج کے کاموں میں تمہاری کوئی ضرورت نہیں
ہے ہمارے پاس اس کیلئے مردوں کی کمی نہیں ہے پھر ۲۵ جنوری ۱۹۵۰ء کو اس وقت کے گورنر
جنرل نے ایک ہنگامی قانون نافذ کیا جس کے ذریعہ فوج اور ٹریڈ یونینوں ہی شرکت پر پابندی
لگائی گئی (سول اینڈ ملیٹری گزٹ لاہور ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء) اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مردوں
اور عورتوں کے دائرہ کار میں فرق ضرور ہے اور اس کو مشرق و مغرب ہر جگہ عملاً تسلیم کیا جا رہا ہے۔
عورت اور مرد کا دائرہ مقرر کرنے میں یہ بات صاف کر دینا معلوم ہوتا ہے مغربی یا جاہلی تہذیب اور
اسلام کے درمیان ایک فرق پردہ کی وجہ سے بھی ہے پردہ کے نام سنکر بعض تعلیم یافتہ عورتوں
اور جن کے لئے عورتوں کی بے پردگی جنسی تسکین کا سامان ہے وہ حضرات ایک شدید قسم کا

گھٹن محسوس کرنے لگتے ہیں مگر پردہ کے نام سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے اسلام نے یہ قید عورتوں کی حقارت کی بنا پر نہیں لگائی ہے بلکہ اس لئے لگائی ہے کہ اس صنف نازک کی فطری لطافت طبع نہ تو مجروح ہونے پائے۔ اور نہ مرد کو اس کے پرکشش گلشن حیات کو پامال کر دینے کا کوئی بے قید موقع مل سکے۔

دوسری چیز اس سلسلہ میں جو قابل غور ہے وہ یہ کہ کچھ اخلاقی قدریں ایسی ہیں جن کو مرد اور عورت کے تعلقات میں حد فاصل کی حیثیت حاصل ہے۔ خاص کر ہمارے ملک کے نہ صرف مسلمان اس کا لحاظ کرتے ہیں بلکہ دوسرے برادران وطن بھی اس کو دائمی قدر کے طور پر نہ سہی مگر اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ مثلاً مخلوط تعلیم اور بے محابہ مرد و عورت کا اختلاط کو کسی نہ کسی درجے میں ہمارے ملک کا ہر باشندہ تسلیم کرتا ہے: یہی وجہ ہے کہ ملک کے اندر مہیلا اسکول و کالج اور مدرسہ نسواں اور مدرستہ البنات نہ صرف قائم ہیں بلکہ اس میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ اور آج کوئی باعزت آدمی اپنی بیوی یا بیٹی بہن کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ شمع خانہ بننے کے بجائے بے محابہ شمع محفل بنتی پھرے یا وہ ہر شخص کے لئے خوان یغما بنے! ان چند آبرو باختہ لوگوں کا یہاں ذکر نہیں ہے جن کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

یہی وہ اخلاقی حس ہے جس کی وجہ سے آبادی کے تناسب کے اعتبار سے عورتوں کو دستور ساز اداروں اور ایڈمنسٹریٹو شعبوں میں جگہ دینے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں جیسا کہ ابھی ہم، فوجی بھرتی کے سلسلہ میں عرض کر چکے ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارے ملک کی عورتیں ابھی تعلیم میں پیچھے ہیں اس لئے ایسا ہے مگر جہاں سو فیصد تعلیم ہے وہاں بھی یہی فرق موجود ہے۔ عورت اور مرد کے سلسلہ میں ایک اور چیز قابل غور ہے اور وہ ہے بچوں کی پرورش اور تربیت۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ بچوں کو پیدائش کے بعد بچوں کی، حکومت کی بنائی ہوئی پرورش گاہوں میں دے دیا جائے جیسا کہ مغربی ملکوں میں ہے۔ یا پھر اپنے گھر کے ماحول میں اس کی تربیت کی جائے۔ پہلی صورت میں دو سوالات پیدا ہوتے ہیں ایک یہ کہ بچہ کو پیدائش کے بعد تو کسی پرورش گاہ کنڈر گارٹن کے حوالہ کیا جا سکتا ہے مگر پیدائش کے پہلے تو بہرحال اسے بطن مادر ہی میں رہنا ہے۔ ابھی تک کوئی ایسی ایجاد سامنے نہیں آئی کہ بچہ کو بطن مادر میں جانے کی ضرورت ہی نہ پیش آئے پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس پرورش

گاہ میں کام ظاہر ہے کہ مرد تو کرتے نہیں عورتیں ہی کرتی ہیں ایسا بھی نہیں ہے کہ اس میں کام کرنے والی ساری عورتیں خود پیدائش کی صلاحیت سے محروم ہو چکی ہوں گی یا وہ سب بے شوہر ہوں گی۔
ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے تو اس سے آسانی سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اپنے بچوں کی پرورش کے ساتھ دوسرے بچوں کی پرورش بہرحال عورت ہی کرے گی خواہ وہ ماں بن کر کرے یا انا اور نرس بن کر کرے۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں سوچنا ہے کہ بچہ کی بھو تربیت ماں کی گود اور گھر کے ماحول میں اچھی ہوگی یا کنڈرگارٹن میں۔ بچہ کی پرورش کا مسئلہ ایک دوسرے سوال سے جڑا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ خاندانی نظام کو باقی رکھنا انسانی معاشرہ کے لئے مفید ہے یا ختم کر دینا مغرب کا خاندانی نظام چونکہ درہم برہم ہو چکا ہے اور انھوں نے اپنے لئے مفید سمجھا ہے اور ان کے لئے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہے وہ بچہ کو ماں کی مامتا اور باپ کی محبت اور رشتہ کو کوئی اہمیت نہ دیں مشرق میں بھی اس کے کچھ اثرات پڑے ہیں مگر ابھی وہاں خاندانی نظام بالکلیہ پاش پاش نہیں ہوا ہے۔ اس لئے ان کے لئے ایسا ممکن نہیں ہے کہ رشتہ و ناطہ اور مہر و مروت کی جو قدریں انسانی معاشرہ کے لئے مطلوب ہیں وہ اسے یکسر ختم کر دیں اسلام نے جو معاشرتی نظام انسان کو دیا ہے اس میں بھی خاندانی نظام کو بنیادی اہمیت دی ہے یہ خاندانی نظام جتنا پاکیزہ اور مہر و محبت کے رشتوں میں جڑا ہوگا اتنا ہی زیادہ معاشرہ اور اس معاشرہ سے پیدا ہونے والا تمدن پاکیزہ اور پر کشش ہوگا۔

عورت کے سلسلہ میں اگر آپ سنجیدگی سے غور کریں گے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ عورت کی ذمہ داریاں دو طرح کی ہیں۔ ایک اس کی فطری ذمہ داریاں دوسرے اس کی فطری ذمہ داریوں کو معاشرہ کیلئے مفید بنانا۔ اس کی فطری ذمہ داریوں سے مراد یہ ہے کہ عورت کو خدا نے افزائش نسل کا ذریعہ بنایا ہے۔ عورت اس ذمہ داری کو جتنے بہتر طریقے سے ادا کریگی ویسے ہی معاشرہ میں اچھے اور کار آمد افراد پیدا ہونگے اس کی یہ ایسی ذمہ داری ہے جسے کوئی دوسرا نہیں اٹھا سکتا۔ افزائش نسل کے لئے اگر کوئی غیر فطری طریقہ اختیار کیا جائے تو سارے انسان نہ تو ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور نہ اس کے وہ مفید نتائج سامنے آ سکتے ہیں جو فطری طریقہ سے حاصل ہوتے ہیں اور جس سے ہر امیر و غریب یکساں فائدہ اٹھاتا اور اس کے نتائج سے بہرہ اندوز ہوتا ہے۔

عورت کی دوسری ذمہ داری انسانی نسل کو معاشرہ کے لئے مفید بنانا ہے اس سلسلہ میں اس کا سب سے بڑا کام بچہ کی تعلیم و تربیت ہے بچوں کی تعلیم و تربیت کا نظام حمل کے زمانہ سے لیکر جوان ہونے تک چلتا ہے تعلیم و تربیت کا ایک نظام اسکولوں کے ذریعہ بھی چلتا ہے جس میں بچہ بہت کچھ سیکھتا ہے مگر اس مصنوعی اسکول سے پہلے بچہ زمانہ حمل سے لیکر چار برس کی عمر تک ماں کی گود ہی میں رہتا ہے اور جہاں وہ کسی مصنوعی ماں کی گود میں دے دیا جاتا ہے وہاں بھی عورت کی گود ہی میں اسے رہنا ہوتا ہے اسکول کی عمر کو پہونچنے کے بعد بچہ اسکول بھیج دیا جاتا ہے مگر وہاں وہ صرف ۵ - ۶ گھنٹے رہتا ہے بقیہ ۱۸ - ۱۹ گھنٹے وہ ماں کی گود اور گھر کے ماحول میں رہتا ہے یا اسے رہنا چاہئے اس بات کا ہر شخص مشاہدہ کرسکتا ہے جس بچہ کو پہلی درسگاہ میں یعنی ماں کی گود میں اور گھر کے ماحول میں اچھی تعلیم و تربیت و شائستگی نہیں مل پاتی وہ بچے اسکولوں میں اتنے مہذب شائستہ اور کامیاب نہیں ہو پاتے جتنے کہ وہ بچے کامیاب مہذب اور شائستہ ثابت ہوتے ہیں جن کی گھر کی تعلیم و تربیت اچھی ہوتی اور تہذیب و شائستگی کے گھریلو ماحول میں ان کی پرورش ہوئی ہو اسی طرح جس بچہ کی تربیت کسی کنڈرگارٹن وغیرہ میں ہوئی ہو اس میں ماں باپ بھائی بہن اور خاندان کے افراد سے انس محبت لحاظ و پاس شرم و حیا اور ادب و احترام کے وہ لطیف جذبات نہیں پیدا ہو سکتے جو گھر کے ماحول اور خاندان کے اندر تعلیم و تربیت سے پیدا ہوتے ہیں آج مغرب ان لطیف جذبات سے محروم ہو چکا اور مشرق کے کچھ مغرب زدہ لوگ بھی ماں باپ اور خاندان کی مہر و محبت سے ہندوستانی معاشرہ کو محروم کردینا چاہتے ہیں غرض یہ کہ عورت کی دوسری سب سے بڑی ذمہ داری بچوں کی تعلیم و تربیت ہے تعلیم و تربیت کے مفہوم کا ذرا وسیع معنی لیجئے یعنی زمانہ حمل سے پیدائش تک اور پھر پیدائش سے اس کے جوان ہوتے تک اسی کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس کی ہر حرکت کی نگرانی کرے محبت کے ساتھ اسے اچھی عادتوں کا عادی بنائے بری عادتوں سے بچائے جس طرح دودھ پلانے والی مائیں ایسی چیزوں کے کھانے سے بھی پرہیز کرتی ہیں جو بچے کیلئے نقصان دہ ہوں اس کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو اسی طرح انہیں اپنی زبان اور اپنی ان عادات سے پرہیز کرنا لازم ہوتا ہے یا ہونا چاہئے جن سے لڑکے کے عادات و اطوار خراب ہو سکتے ہوں۔

اگر مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی گھر سے نکال کر دفتروں کارخانوں اور سیاسی میدا

میں پہنچا دیں تو کیا ہمارے معاشرہ کا یہ فطری حسن باقی رہ سکتا ہے؟
ان چند تمہیدی باتوں کے بعد اب ہم اس سوال پر ذرا تفصیل سے بحث کریں گے کہ کیا واقعی مرد و عورت اپنی جسمانی ساخت اور ذہنی ارتقاء اور فطری افتاد طبع کے اعتبار سے برابر ہیں یا ان میں کوئی فرق ہے! یہاں چند مستثنیات سے بحث نہیں ہے بلکہ مرد و عورت کی پوری جنس کی عمومی حیثیت سے بحث ہے۔ اگر مرد اور عورت میں مذکورہ بالا حیثیت سے فرق نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں تو پھر مساوات مرد و زن کا نظریہ صحیح ہے لیکن اگر دونوں میں جسمانی اور ذہنی اعتبار سے فرق ہے تو پھر اس نظریہ اور طرز عمل کو غیر فطری کہنے میں جھجک محسوس نہیں کرنا چاہیئے اس کی تھوڑی تفصیل آئندہ صفحات میں پیش کی جاتی ہے۔

رباعیات

جناب رئیس الشاکری صاحب
بمبئی

وہ قوم کہ فرقوں میں جو بٹ جاتی ہے ÷ دنیا میں ہر اک طور سے گھٹ جاتی ہے
تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھو ÷ اک روز بساط ہی الٹ جاتی ہے

یہ سچ ہے ہوا بندھ کے اکھڑ جاتی ہے ÷ ہر انجمن عیش اجڑ جاتی ہے
منہ دیکھ کے رہ جاتی ہے تدبیر بشر ÷ جس وقت کہ تقدیر بگڑ جاتی ہے

یوں نقش انا دل سے مٹایا ہوتا ÷ میں کیا ہوں مجھے کچھ نہ بتایا ہوتا
مختار بنانے کی ضرورت کیا تھی ÷ تو نے مجھے مجبور بنایا ہوتا

شوخی نہیں جادو نہیں اعجاز نہیں ÷ نغمہ ہے مگر سوز نہیں ساز نہیں
ظالم کو جو دیکھا تو یہ کہنا ہی پڑا ÷ اللہ کی لاٹھی میں بھی آواز نہیں

دعویٰ ہے کہ انداز سخن رکھتے ہیں ÷ پھر کس لئے سینے میں جلن رکھتے ہیں
بلبل کی طرح کس کو چہکنا آیا ÷ مشاق تو سب زاغ و زغن رکھتے ہیں

سرمدؔ اور ان کی رباعیاں

مجیب اللہ ندوی

(۲)

سرمد کے قتل کے اسباب اوپر دارا شکوہ اور سرمد کے تعلقات اور اس کے سربراہ حکومت ہونے کی پیشنگوئی اور قاضی شہر قاضی محمد قوی کی سرمد سے ناراضگی اور اس کے قتل کے اسباب کے سلسلہ میں معاصر اور بعد کی تاریخوں اور تذکروں کے بیانات نقل کئے جا چکے ہیں۔ جن میں بعض کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ سرمد کے قتل کا سبب ان کی بے دینی اور آزادروی تھی اور بعض سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے قتل کا اصل سبب دارا شکوہ کیطرف ان کا رجحان تھا۔ انھیں مذکورہ مختلف بلکہ متضاد بیانات کی روشنی میں مولانا ابوالکلام آزاد نے سرمد کے قتل کو سیاسی قتل قرار دیا ہے۔ انھوں نے اپنے مختصر مضمون میں اس بات پر زور دیا ہے کہ سرمد کا قتل مذہبی اسباب سے زیادہ پولیٹیکل اسباب کی بنا پر ہوا۔ یعنی دارا شکوہ کا سرمد سے تعلق اور ان کی طرف عوام کا رجحان۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"لیکن اصل بات یہ ہے کہ عالمگیر کی نظروں میں سب سے بڑا جرم دارا شکوہ کی معیت تھی اور وہ کسی نہ کسی بہانے قتل کرنا چاہتا تھا۔ ایشیا میں ہمیشہ پالیٹیکس مذہب کی آڑ میں رہا ہے اور ہزاروں خونریزیاں جو پولیٹیکل اسباب کی بنا پر ہوئی ہیں انھیں مذہب کی چادر اڑھا کر چھپا یا گیا ہے اور جب کوئی بہانہ نہ ملا تو عریانی اور برہنگی کو جو خلاف رسم شرع ہے بنیاد قرار دیدیا اور مذکورہ بالا رباعی[1] سے یہ نتیجہ نکالا کہ (سرمد) معراج جسمانی کے منکر ہیں"

ہم یہاں سرمد کے قتل پر ذرا تفصیل سے اس لئے بحث کریں گے کہ سرمد کی شخصیت اپنے علم و فضل اور شاعرانہ اوصاف اور مجذوبانہ انداز کیوجہ سے عوام میں ایک برگزیدہ شخصیت بن گئی تھی اس لئے ان کا قتل اس دور کا ایک اہم واقعہ شمار ہونے لگا تھا اور پھر اس حیثیت سے بھی اس پر بحث کرنی ضروری ہے

---

[1] اوپر رباعی کا ذکر آچکا ہے۔ سرمد کی یہ رباعی ان کے الحاد و زندقہ کے سلسلہ میں پیش کی جاتی ہے۔

سرمد بجہاں بسے نکونام شدی ‏ ‏ از مذہب کفر سوئے اسلام شدی

آخر چہ خطا دید کہ از اللہ و رسول ‏ ‏ برگشتہ مرید پچھمن و رام شدی

کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے دامن عصمت کو خون ہائے ناحق کے جن بے شمار دھبوں سے داغدار بنانے کی کوشش کی گئی ہے ان میں سرمد سرمست کے خون ناحق کے چند چھینٹے بھی شامل ہیں۔ علامہ شبلیؒ نے صحیح کہا تھا کہ ؎

تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کش تھا ظالم تھا ستمگر تھا

ممکن ہے کہ اس تفصیل کے بعد عالمگیر کو سرمد کے خون ناحق یا سیاسی قتل کے جرم سے بری قرار دیا جا سکے اور ان کے دامن عصمت کا یہ داغ دھل سکے۔

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ داراشکوہ اپنی ہندو نوازی اور یوگ پرستی یا صلح کل کی پالیسی کی وجہ سے سرمد جیسے آزاد مزاج صوفیوں اور سنتوں کو پسند کرتا تھا اور سرمد بھی اپنی وارفتہ مزاجی کے باوجود داراشکوہ کو اپنے سے قریب سمجھتے تھے اور اپنے مجذوبانہ انداز میں اس کے سربراہ حکومت ہونے کی پیشین گوئی بھی کر چکے تھے اور سرمد بھی شاعرانہ انداز میں ان کی فقیہانہ حیثیت کو مجروح کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے مگر ان واقعات سے مولانا ابوالکلام آزاد یا جن دوسرے لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے قاضی شہر اور عالمگیر نے انکا قتل محض نفسانیت کی بنا پر کرایا اور انکو اپنے اقتدار کے راستہ کا ایک کانٹا سمجھ کر ہٹا دیا۔ اس سے راقم الحروف کو اتفاق نہیں ہے اور نہ اس رائے کی پشت پر کوئی تاریخی ثبوت موجود ہے بلکہ تاریخی حقائق اس کے برعکس ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ سرمد کو عوام میں ایک مذہبی تقدس ضرور حاصل تھا مگر ان کی کوئی ایسی مؤثر شخصیت نہیں تھی کہ وہ عالمگیر کے مقابلہ میں داراشکوہ کو اورنگ حکومت پر فائز کر سکتے تھے اس لئے عالمگیر نے ان کو اپنے راہ کا روڑا سمجھ کر ہٹانا ضروری سمجھا۔ پھر وہ بھی داراشکوہ کی موت کے بعد اگر عالمگیر ان کو اتنا خطرناک سمجھتا تو پھر اس کو شرعی بہانہ تلاش کرنے کی کیا ضرورت تھی وہ بغاوت کے الزام میں ہی ان کا کام تمام کر سکتا تھا اور داراشکوہ کی موت کے بعد ایک یا دو سال اس میں تاخیر کی کیا ضرورت تھی؟ ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ عالمگیر نے عوام کے ہنگامے اور شورش سے بچنے کیلئے شرعی عذر تلاش کیا ہو تو یہ بات بھی واقعات کی روشنی میں صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سے لوگ انکو ایک برگزیدہ شخصیت سمجھتے تھے، مگر ایک بڑا طبقہ ان کی آزادانہ حرکات اور سکنات کو یہی نہیں کہ پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا بلکہ اس پر ان کو ملامت کرتا تھا۔ اوپر ذکر آ چکا ہے کہ داراشکوہ نے شاہجہاں کے سامنے سرمد کی بزرگی کا ذکر کیا تو شاہجہاں نے عنایت خاں کو سرمد کے حالات دریافت کرنے کیلئے ان کے پاس

بھیجا۔ انھوں نے واپس آکر انکے عام طرزِ عمل اور برہنگی کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں دی تو اس پر شاہجہاں نے کہا۔

یک گز کرباس دہانِ خلق را | ایک گز کپڑا مخلوق کے منہ کو
می تواں بست۔ | بند کر سکتا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے عام طور پر خلق خدا ان کی برہنگی کو پسند نہیں کرتی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب ان کی برہنگی کو لوگ پسند نہیں کرتے تھے تو معراج جسمانی کا انکار اور شریعت کے استخفاف کو کیسے پسند کر سکتے تھے۔

حقیقت تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ عالمگیر کیطرف سے بار بار ان سے پوچھ گچھ اس لئے کی جا رہی تھی کہ شریعت کی ظاہری بے حرمتی بھی نہ ہونے پائے اور زبان خلق کو بھی بند کیا جا سکے اور سزا کی نوبت نہ آئے۔ ان کے قتل کا شرعی بہانہ تلاش کرنا ہوتا تو پھر بار بار انکو سمجھانے بجھانے اور راہِ راست پر لانے کی کیا ضرورت تھی؟

دوسری بات یہ کہ ہم کو ذرا تفصیل سے اس پہلو پر غور بھی کرنا ہوگا کہ دارشکوہ یا سرمد سے عالمگیرؒ کے اختلاف یا انتقام کی نوعیت واقعی سیاسی تھی یا اس کے پیچھے نظریات و خیالات کا بھی کوئی بنیادی اختلاف تھا۔

اس سلسلہ میں ہمیں ایک صدی پہلے کی گمراہیوں اور مغل دربار کے اندر اور دربار سے باہر اس کے اثرات پر بھی ایک سرسری نگاہ ڈال لینی ضروری ہے۔

اکبرؔ سے پہلے تصوف اور شریعت کے درمیان یا دوسرے الفاظ میں صوفیاء اور علماء کے درمیان اختلاف کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ مگر ابھی تک یوگ، ہندو مذہب اور فلسفہ کو شریعت کے مدمقابل لانے کی اور برسرعام اس کے اظہار کی کوئی قابل ذکر کوشش نہیں دکھائی دیتی اور نہ شریعت اسلامی کے احکام کی برسر دربار بے حرمتی کی کوئی مثال ملتی ہے۔ مگر اکبرؔ کے عہد کا سب سے بڑا فتنہ یہی تھا کہ اسلامی شریعت کو "دین اسلام مجازی و تقلیدی" قرار دیا جانے لگا اور بہت سے احکام اسلامی پر خط نسخ

---

[1] دین الٰہی کیلئے عہد نامہ تیار کیا گیا تھا اس میں یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ یہ دین پرانا ہو چکا ہے اب اس کی تجدید کی ضرورت ہے۔

پھیرنے کی کوشش کی گئی۔ اور ہندو مذہب اور تہذیب کو اسلام سے برتر ثابت کرنے کی کوشش ہونے لگی اور ہندو تہذیب کے بہت سے خدوخال کو دربار کے اندر اور دربار سے باہر رواج دیا جانے لگا۔ مثلاً (۱) السلام علیکم کی جگہ اللہ اکبر اور اس کے جواب میں جل جلالہٗ کا لفظ استعمال ہونے لگا [۱]۔ (۲) گائے کی قربانی بند کر دی گئی۔ (۳) داڑھی منڈانا ضروری قرار پایا۔ (۴) محل کے اندر نماز با جماعت کی پابندی ترک کر دی گئی۔ (۵) احکام شریعت کے صحیح اور غیر صحیح ہونے کا معیار عقل قرار پائی۔ (۶) سجدۂ تعظیمی ضروری قرار پایا۔ ایک ہزار برس گذر گئے اس لئے اسلامی شریعت کا اختتام اور دوسرے نئے تجدیدی دین کا اجرا ضروری قرار پایا [۲]۔ غرض یہ کہ انھیں باتوں نے آہستہ آہستہ ایک نئے دین یعنی دینِ الٰہی کی منظم صورت اختیار کر لی۔ ابوالفضل اپنی انشا پردازی میں دینِ الٰہی کے خدوخال کو اس طرح نمایاں کرتا ہے کہ اس پر مشکل ہی سے اعتراض پیدا ہو سکے۔ اور اس کے لئے جو محضر نامہ شیخ مبارک نے تیار کیا تھا اس میں اس نے جو اندازِ تحریر اختیار کیا تھا اس کی بھی کوئی نہ کوئی توجیہ کی جا سکتی ہے۔ مثلاً محضر نامہ کے الفاظ ملاحظہ ہوں :۔

"مقصود از تشئید ایں مبانی و تمہید ایں معانی آنکہ چوں ہندوستان صنت عن الحدثان بمیامن معدلت سلطانی و تربیت جہانبانی مرکز امن و امان و دائرۂ عدل و احسان شدہ طوائف انام از خواص و عام خصوصاً علمائے عرفان شعار و فضلائے دقائق آثار کہ ہادیان بادیۂ نجات و سالکان مسالک اوتوا العلم درجات اند، از عرب و عجم روبدیں دیار نہادہ توطن اختیار نمودند، جمہور علمائے فحول کہ جامع فروع و اصول و حاوی معقول و منقول اند، و بدیں و دیانت و صیانت اتصاف دارند، بعد از تدبیر وافی و تامل کافی در غوامض معانی آیۂ کریمۂ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم

---

[۱] بظاہر اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نظر نہیں آتی مگر اکبر کے لفظ سے جو اشتباہ پیدا ہوتا ہے اور اس نے اپنی جو حیثیت قائم کرنے کی کوشش کی اس کی روشنی میں اس میں شرک کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

[۲] یہ تو وہ باتیں ہیں جن کا ذکر ابوالفضل نے اکبر نامہ اور آئین اکبری میں کیا ہے اور اگر ملا بدایونی کی رائے لی جائے تو یہ فہرست اور لمبی ہو جائے گی۔

واحادیث صحیح ان احب الناس الی اللہ یوم القیامۃ امام عادل من یطع الامیر فقد اطاعنی و من یعص الامیر فقد عصانی وغیر ذلک من الشواھد العقلیۃ والدلائل النقلیۃ " قرارداده حکم نمودند کہ مرتبۂ سلطان عادل عند اللہ زیادہ از مرتبۂ مجتہد است و حضرت سلطان الاسلام کہف الانام امیر المومنین ظل اللہ علی العالمین ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ ابدا اعدل واعلم واعقل باللہ اند۔ بنابریں در مسائل دین کہ بین المجتہدین مختلف فیہا است بذہن صائب و فکر ثاقب خود یک جانب را از اختلافات بجہت تسہیل معیشت بنی آدم و مصلحت انتظام عالم اختیار نمودہ بہ آں جانب حکم فرمایند متفق علیہ می شود و اتباع آں بر عموم برایا و کافۂ رعایا لازم و متحتم است وایضاً اگر بموجب رائے صواب نمائے خود حکمے را از احکام قرار دہند کہ مخالف نصے نباشد و نسبت ترفیہ عالمیاں باشد عمل براں نمودن بر ہر کس لازم و متحتم است و مخالفت آں موجب سخط اخروی و خسران دینی و دنیوی است۔ و ایں سطور صدق و فور حسبۃً للہ و اظہار لاجرائے حقوق الاسلام بمحضر علمائے دین و فقہائے مہدیین تحریر یافت وکان ذلک فی شھر رجب سنہ ۹۸۷ سبع وثمانین وتسعمأۃ۔

مگر اس کے ساتھ دین الٰہی کے ماننے والوں کے لئے جو عہد نامہ تیار ہوا تھا اس کی بنیاد صریح طور پر اسلام سے بیزاری پر تھی۔ اس کے چند الفاظ یہ ہیں جسے دین الٰہی قبول کرنے والا بطور حلف نامہ قبول کرتا تھا

" من کہ فلاں ابن فلاں باشم، بطوع و رغبت و شوق قلبی از دین اسلام مجازی و تقلیدی کہ از پدراں دیدہ و شنیدہ بودم ابرا و تبرا نمودم و در دین الٰہی اکبر شاہی در آمدم و مراتب چہارگانۂ اخلاص کہ ترک مال و جان و ناموس و دین باشد قبول نمودم "

یعنی میں اپنے دل کی پوری خواہش اور رغبت سے دین اسلام مجازی و تقلیدی سے جسے باپ دادا سے سنتا آیا ہوں برأت ظاہر کرتا ہوتا ہوں اور دین الٰہی اکبر کو قبول کرتا ہوں اور اس پر اپنی جان اور مال اور دین کو نثار کرتا ہوں۔

اس وقت کے علماء اور امراء جن میں بعض غیر مسلم بھی شامل تھے[1] کی مخالفت کیوجہ سے اس کے

[1] مثلاً ملا یزدی، قطب الدین کوکہ، شہباز خاں کمبو، خان معصوم خاں، راجہ بھگوان داس، راجہ مان سنگھ وغیرہ۔

دینِ الٰہی کو تو فروغ نہ ہوسکا مگر اکبر کے زمانہ میں مذہب کا جو ایک ملغوبہ تیار کیا گیا۔ اور ہند فلسفہ اور تہذیب کو جو فروغ ملا اس کے اثرات بعض مسلمان صوفیوں اور یوگیوں کی وجہ سے بہت دنوں تک باقی رہے۔ خود جہانگیر دینِ الٰہی کو پسند نہیں کرتا تھا مگر ہندو یوگیوں سے وہ بھی متاثر تھا۔ اس نے خود اپنی تزک میں گسائیں جد روپ سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ شاہجہاں خود ہندو سنیاسیوں کا قائل نہیں تھا، مگر اس کی کمی دارا نے پوری کی جسے وہ تمام لڑکوں میں زیادہ محبوب رکھتا تھا۔ مگر اس وحدت دین کے تصور نے داراشکوہ سے پہلے ایک نئے فلسفہ کی حیثیت نہیں اختیار کی تھی۔ داراشکوہ پہلا شخص ہے جس نے جس نے اکبر کے دینِ الٰہی یا دوسرے الفاظ میں وحدت دین کے تصور کو علمی اور فلسفیانہ انداز میں پیش کیا۔ البتہ اکبر اور داراشکوہ میں فرق صرف یہ ہے کہ اکبر کم پڑھا لکھا تھا اس لئے اس کے خیالات زیادہ تر مستعار تھے، اس وجہ سے اس کی بہت سی دینی گمراہیوں کے بارے میں دو رائیں ہوسکتی ہیں۔ مگر داراشکوہ کے خیالات کسی دوسرے سے مستعار نہیں ہیں بلکہ وہ خود صاحب علم و فضل تھا اور بتدریج اس کے دل میں جو خیالات پیدا ہوئے یا دین و مذہب کے بارے میں اس نے جو رائے قائم کی اسے اس نے صفحۂ قرطاس پر منتقل کردیا۔ اس لئے اس کے خیالات کے بارے میں اختلاف رائے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اوپر اکبر کے مذہبی خیالات اور اس کے خود ساختہ دینِ الٰہی کے کچھ پہلوؤں کی وضاحت کردی گئی ہے۔ اب داراشکوہ کے خیالات ملاحظہ ہوں۔

اپنے اظہار خیال کیلئے داراشکوہ نے پانچ کتابیں خود تصنیف کی ہیں اور بعض کتابیں اس کے ایماء سے دوسروں نے لکھی ہیں۔ ان تمام کتابوں پر سیر حاصل بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ مگر اس نے دو تین کتابوں میں اپنے جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان کے کچھ اقتباسات یہاں درج کئے جاتے ہیں تاکہ اندازہ ہوسکے کہ دین کے بارے میں اس کے خیالات کیا تھے۔

اس کی سب سے پہلی تصنیف سفینۃ الاولیاء ہے۔ اس کی تصنیف کے وقت یعنی ۱۰۴۹ھ میں اس کی عمر ۲۵-۲۶ سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس میں اس نے ہندوستان کے ۴۰۰ صوفیاء کے حالات بڑے سلیقے انداز میں لکھے ہیں۔ اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی اس میں اتنا بگاڑ نہیں پیدا ہوا تھا

لہ بعد میں خود جہانگیر اور ان کے عہد کے علماء، امراء اور خاص طور پر شیخ احمد سرہندیؒ کی کوششوں سے اس کے اثرات دب گئے مگر ذہنی بگاڑ بہر حال باقی رہا۔

غالباً اسی وجہ سے شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کا ذکر بھی بڑے اہتمام سے کیا ہے۔ مگر تین سال بعد یعنی ۱۰۴۲ھ میں اس نے سکینۃ الاولیاء لکھی۔ جس میں اپنے پیر ملا شاہ یا ملا شاہ بدخشانی اور ان کے مرشد ملا شاہ کے حالات لکھے ہیں۔ اس میں اس نے اپنے بارے میں لکھا ہے کہ مجھے چوبیس برس کی عمر میں فرشتے نے آواز دی اور چار مرتبہ کہا کہ اللہ تعالیٰ تجھے ایسی چیز عنایت کرے گا جیسے روئے زمین پر کسی بادشاہ کو نصیب ہوگی۔

پھر آگے لکھا ہے کہ اپنے پیر کی مہربانی سے جو روحانی دولت دوسروں کو ایک مہینے میں ملتی ہے وہ مجھے ایک رات میں مل گئی۔

یہاں تک بھی غنیمت ہے۔ مگر آگے چل کر اپنی عمر کے ۴۴ ویں سال یعنی ۱۰۶۵ھ میں اس نے اپنی سب سے اہم کتاب "مجمع البحرین" تصنیف کی جس میں اس نے اسلامی تصوف اور ہندو مذہب کو ایک ہی حقیقت کے دو مظہر اور ایک ہی منبع کے دو چشمے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے ثابت کیا کہ توحید کے شیدائی ان دونوں میں سے جس کی تقلید کریں گے وہ منزلِ مقصود تک پہونچ جائیں گے۔ کتاب کے چند جملے ملاحظہ ہوں۔

"می گوید فقیرِ بے اندوہ محمد دارا شکوہ کہ بعد از دریافت حقیقت الحقائق و رموز و دقائق مذہب حق صوفیہ و فائز گشتن بایں عطیۂ عظمیٰ درصدد آں شد کہ درک کنہ مشرب موحدان ہند و محققان ایں قوم قدیم نماید۔ با بعضے از کاملانِ ایشاں کہ بہ نہایت ریاضت و ادراک و فہمیدگی و غایت تصوف و خدایابی و سنجیدگی رسیدہ بودند مکرر صحبت ہا داشتہ و گفتگو نمودہ جز اختلافات لفظی دریافت و شناخت تفاوتے ندید۔ ازیں جہت سخنانِ فریقین را ہم تطبیق دادہ و بعضے سخناں کہ طالبانِ حق را دانستن ناگزیر و سود مند است، فراہم آوردہ"

اس کتاب میں حواس، صفات الٰہی، نبوت اور عالم برزخ وغیرہ کے بارے میں تصوف اور یوگ کے خیالات جمع کئے ہیں اور انھیں ایک دوسرے کے مطابق ثابت کیا ہے۔

مجمع البحرین کے بعد ۱۰۶۷ھ میں اس نے "سرِ اکبر" مرتب کی یہ اپنشد کے پچاس ابواب کا فارسی ترجمہ ہے، جسے اس نے بنارس کے پنڈتوں کی مدد سے کیا تھا۔ اس میں بسم اللہ کے بجائے

گنیش جی کی تصویر دی ہے اور دیباچہ میں لکھا ہے کہ اصل قرآن مجید یہی ہے۔ اس کی تفصیل سے قصداً گریز کر رہے ہیں ورنہ تنہا یہی کتاب اس کے مشرکانہ عقائد کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔

علامہ شبلیؒ نے "سر اکبر" کے نسخہ کو ۱۹۰۶ء میں ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس منعقدہ بنارس کی علمی نمائش میں دیکھا تھا۔ اس کتاب کے دیباچہ کو پڑھنے کے بعد انھوں نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں ظاہر کئے۔

"عالمگیر نے داراشکوہ کے مقابلہ کا جب قصد کیا تو اس کا سبب یہ ظاہر کیا کہ دارا شکوہ بدعقیدہ اور بد دین ہے اس لئے اگر وہ ہندوستان کا فرمانروا ہوا تو ملک میں بد دینی پھیل جائے گی۔ عام مؤرخوں کا خیال ہے کہ یہ محض ایک فریب تھا، نہ داراشکوہ بے دین تھا اور نہ عالمگیر کی مخالفت کا یہ سبب تھا، دلوں کا حال خدا کو معلوم لیکن اس کتاب کے دیباچہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ داراشکوہ بالکل ہندو بن گیا تھا اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر وہ تخت شاہی پر متمکن ہوتا تو اسلامی شعار اور خصوصیات بالکل مٹ جائے۔

(مقالات شبلی ج ۷، ص ۱۰۱)

علامہ شبلیؒ نے جو بات لکھی ہے وہ کوئی جذباتی تاثر نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی حقیقت ہے داراشکوہ جس کے اظہار میں فخر محسوس کرتا ہے۔ وہ ایک خط میں شاہ دلربا کو لکھتا ہے

الحمدللہ المحمد للہ از برکت محبت ایں طائفہ شریفہ مکرمہ از دل ایں فقیر اسلام مجازی برخاست و کفر حقیقی رو نمود۔ اکنوں قدر کفر حقیقی دانستم، زنار پوش و بت پرست بلکہ خود پرست و دیر نشیں گشتم۔

ع۔ مسلماں گر بدانستے کہ بت چیست
بدانستے کہ دیں در بت پرستی است

(رود کوثر ص ۲۶۹)

خود مولانا ابو الکلام آزاد نے جو عالمگیر کو سرمد کے خون ناحق کا مجرم قرار دیتے ہیں، داراشکوہ کی صفائی میں جو الفاظ لکھے ہیں وہ یہ ہیں۔

"شاہجہانی حکومت کا عہد آخری اور شہزادہ دارا شکوہ ولی عہد سلطنت تھا۔ سلسلۂ مغلیہ میں دارا شکوہ ایک عجیب طبیعت اور دماغ کا شخص گذرا ہے اور ہمیشہ افسوس کرنا چاہئے کہ تاریخ ہند کے قلم پر اس کے دشمن کا قبضہ رہا، اس لئے اصلی تصویر پولیٹیکل چالوں کے گرد و غبار میں چھپ گئی۔ وہ ابتدا سے درویش دوست اور صوفیانہ دل و دماغ کا شخص تھا اور ہمیشہ فقرا اور ارباب تصوف کی صحبت میں رہتا تھا۔ اس کی بعض تحریرات جو دست برد حوادث سے بچ گئی ہیں بتلاتی ہیں کہ ان کا لکھنے والا خود بھی ذوق و کیفیت سے خالی نہیں۔ اس کے صاحب ذوق ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تلاش مقصد میں دیر و حرم کی تمیز اٹھا دی تھی اور جس نیاز کیشی کے ساتھ مسلمان فقرا کے آگے سر جھکاتا تھا ویسی ہی عقیدت ہندو درویشوں کے ساتھ رکھتا تھا۔ اس اصول سے کون صاحب حال اختلاف کر سکتا ہے کیونکہ اگر اس عالم میں بھی کفر و اسلام کی تمیز ہو تو پھر اعمیٰ اور بصیر میں کیا فرق باقی رہ گیا۔ پروانہ کو تو شمع ڈھونڈھنی چاہئے۔ اگر صرف حرم ہی کا شیدا ہے تو شیدا طلبی کامل نہیں"

عاشق ہم از اسلام خرابست و ہم از کفر
پروانہ چراغ حرم و دیر نداند

(رباعیات سرمد ص۱)

مولانا ابو الکلام آزاد کی یہ عبارت پڑھنے والا یقیناً سب سے پہلے اس حیرت میں پڑ جائے گا کہ کیا اس عبارت کا لکھنے والا وہی شخص ہے کہ جب وہ "الہلال" میں پرشور دینی مضمون لکھتا تھا تو محسوس ہوتا تھا کہ وہ فاران کی چوٹی سے بول رہا ہے اور جس نے تذکرہ لکھ کر مجدد دین ملت کے کارناموں کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا تھا اور شرک و بدعت کے جو پردے دین مبین کے اوپر پڑ گئے تھے انکو تار تار کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اب نیشنلزم کی وادی تیہ میں پہونچکر کفر و اسلام اور دیر و حرم کی تفریق مٹا دینے اور وحدت ادیان کی تبلیغ کر رہا ہے۔ پھر یہ عبارت دارا شکوہ کی صفائی میں لکھی گئی ہے مگر افسوس اس سے سرمد کے سیاسی قتل کا دعویٰ کمزور ہو جاتا ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سرمد کے قتل کی بنیاد سیاسی نہیں بلکہ مذہبی تھی اس لئے کہ سرمد اور ان کے قماش کے آزاد خیال صوفیا دارا شکوہ کے ان گمراہ کن خیالات

جن میں کفر و اسلام کو ایک سمندر اور دھارے سے ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی تھی عوام تک پہونچانے کا کام کر رہے تھے اور انکی وجہ سے ایک مذہبی انارکی پیدا ہورہی تھی جس کا سدباب ضروری تھا۔

دارا شکوہ کے پیر ملا شاہ کے واسطے سے اس کے گرد جو آزاد قسم کے لوگ جمع تھے ان میں سرمد کے ساتھ اور متعدد مسلمان صوفیوں اور ہندو یوگیوں کے علاوہ دبستان المذاہب کا مصنف بھی ہے اور یہی کتاب سرمد کے حالات کا سب سے بڑا ماخذ بھی ہے۔ اس کتاب کے مصنف کے صحیح نام اور وطن کے بارے میں بھی معلومات کم ملتے ہیں۔ یہ بھی نہیں پتہ چلتا کہ یہ کتاب کہاں تصنیف کی گئی۔

عام طور پر اسے ملا محسن فانی کی تصنیف سمجھا جاتا ہے اور مآثر الامراء کی رائے کے مطابق یہ کتاب ذوالفقار خاں اردستانی کی تصنیف ہے۔ (مقالات شبلی ج ۵ ص ۹۳)

یہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب ہے جس میں مشرقی دنیا کے تمام قابل ذکر مذاہب اور ان کے عقائد و خیالات کی تفصیل ملتی ہے، پارسی مذہب کی جس قدر اس نے تفصیل دی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس فرقے سے اس کا بڑا قریبی تعلق رہا ہے۔ اسی طرح اس نے نانک پنتھوں، بیراگیوں وغیرہ کے بارے میں کافی تفصیلات درج کی ہیں۔ ایک باب میں اس نے ایسے صوفی نما فرقوں کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق نہ ہندو مذہب سے تھا اور نہ مسلمانوں سے۔ اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خوش اعتقاد اور صوفی نما عوام کے خیالات میں عجیب و غریب انتشار پیدا ہو چکا تھا۔ اس نے بیراگیوں کے بارے میں جو عجیب و غریب تفصیلات دی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں ایک مذہبی انارکی پیدا ہو چکی تھی۔ مثلاً ان کے حلقہ میں جو مسلمان داخل ہوتے تھے وہ وشنو کی بھی پرستش کرتے تھے۔ اس کی عبارت ملاحظہ ہو۔

" از ہندو مسلم وغیرہم ہر کس خواہد بہ کیش ایشاں در آید مانع نہ شود، در پزیرند و گویند، مسلماناں نیز بشن (وشنو) را می پرستند، چہ بسم اللہ این معنی دارد یعنی بشن و بسم بشن را گویند "

یہ بشن اور بسم کا جاہلانہ لطیفہ بھی خوب ہے

اس حلقہ میں صرف جاہل مسلمان ہی نہیں بلکہ بعض خواص بھی شامل ہو گئے تھے۔

" جمع کثیر از مسلماناں بکیش ایشاں در رفتہ اند مانند مرزا صالح و مرزا

"ہندوکہ از نہالئے مسلمانانند، براگی شدند" (رود کوثر ۴۵۶)

اس نے سرمد کی برہنگی کے بارے میں لکھا ہے کہ سرمد کہا کرتے تھے کہ یہودی مذہب میں برہنگی عیب نہیں ہے۔ حضرت اشعیا بھی آخری عمر میں برہنہ رہتے تھے اور صحیح تو یہ ہے کہ یہ برہنگی ہندو سادھوؤں کی تقلید کی جا رہی تھی۔ پروفیسر والٹر۔ جے فشل کی رائے ہے کہ سرمد آخر تک یہودی ہی رہے صرف ظاہری طور پر اسلام قبول کر لیا تھا، بالکل بے بنیاد نہیں کہی جا سکتی اس لئے کہ ان کی رباعیات میں، تو ان کے اسلامی خیالات کی جھلک ضرور ملتی ہے، مگر اس کے علاوہ ان کی زندگی کے عام طرز عمل سے اسلام کا کوئی مظاہرہ نہیں ہوتا اور شاعری کا جہاں تک تعلق ہے منشی چندر بھان برہمن جو دارا شکوہ کے خاص شاعر تھے، کی شاعری بھی اس سے خالی نہیں ہے اور یہی چندر بھان اور ولی رام ولی ہندوؤں میں اس روحانی وحدت کو فروغ دینے کا کام کرتے تھے۔ چندر بھان کا یہ شعر تذکروں میں ملتا ہے۔

مرا دلے است بکفر آشنا کہ چندیں بار

بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

صاحب دبستان المذاہب نے اپنی کتاب میں ایک خیالی مباحثہ بھی لکھا ہے، اس مباحثہ کے درمیان شیعہ، سنی، یہودی، نصرانی اور ہندو عقائد پر بڑے سخت اعتراضات ہوتے ہیں اور سارے مذاہب کے ترجمان ان اعتراضات کا جواب نہیں دے پاتے اور ایک حکیم فلسفی جو "عقل علیہ السلام" کا معتقد ہے سب پر غالب آجاتا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود مصنف کسی مذہب کا پابند نہیں تھا بلکہ وہ بھی سرمد کیطرح ایک آزاد خیال صوفی تھا جو مذہب کی گرفت کو کمزور کرنے کا کام کر رہا تھا۔ اسی بناء پر سرمد اور دارا شکوہ سے اس کے تعلقات ہو گئے تھے، غالباً اسی لئے جب دارا شکوہ کا ذکر کرتا ہے تو وہ اس کے لئے حضرت محی الدین محمد خداوند مکان و مکین و صاحب زمان و زمین کے القاب استعمال کرتا ہے۔ دارا شکوہ اور اس دور کی مذہبی گمراہیوں کی جو تھوڑی بہت تفصیل کی گئی ہے اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر دارا شکوہ تخت شاہی پر بیٹھتا تو ملا شاہ بدخشی، ملاجیو، سرمد اور دبستان المذاہب کے مصنف جیسے لوگوں کے ذریعہ گمراہیوں کے نہ جانے کتنے دروازے کھل جاتے اور اسلامی شعار اور خصوصیات ایک ایک کر کے اگر مٹ نہیں جاتے تو ان پر شرک و بدعت کے ایسے دبیز پردے

پڑجاتے کہ ان کا پہچاننا مشکل ہو جاتا۔

ظاہر ہے کہ عالمگیر نے جہاں ہندوستان کے بہت سے سیاسی فتنے مٹائے وہاں اس نے مذہبی گمراہیوں کے مٹانے میں بھی اپنا فرض انجام دیا۔ اس کے ان اقدامات کو سیاسی انتقام قرار دینا ایک تاریخی حقیقت کی غلط تعبیر ہے۔ اس کو سیاسی انتقام کے بجائے مذہبی انتظام کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اسی مذہب انتظام کا تقاضا تھا کہ داراشکوہ اور سرمد جیسے لوگوں کو مذہبی انار کی پھیلانے کا موقع نہ دیا جائے۔ ممکن ہے کہ یہاں ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ ان کے دوسرے ہم مشربوں سے یہ سلوک کیوں نہیں کیا گیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ سرمد اور داراشکوہ کے علاوہ ان کے دوسرے ہم مشربوں کو اتنی سخت سزا اس لئے نہیں دی گئی کہ وہ لوگ شریعت اسلامی کی ظاہری بے حرمتی میں قدرے محتاط تھے۔ اور سرمد تمام قیود سے آزاد ہو کر اپنے خیالات کو برسرِ عام پھیلانے کی کوشش کرتے تھے۔

دبستان المذاہب کا مصنف بھی داراشکوہ کو محی الدین محمد خداوند مکان و مکین و صاحب زمان و زمین لکھتا ہے مگر برسرِ عام کوئی بات وہ قابلِ گرفت نہیں کرتا تھا۔ اسی طرح ملا شاہ بدخشی بھی تھے۔ اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) اکبر کے عہد میں یوگ اور ہندو فلسفہ کو اسلام کے مقابل لا کر اس کی آمیزش سے وحدت دین یا ایک جدید دین کا جو تصور پیدا کرنے کی کوشش شروع ہوئی اسے داراشکوہ نے علمی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی۔

(۲) داراشکوہ کے گمراہ کن خیالات خواص تک اس کی کتابوں کے ذریعہ پہنچ رہے تھے اور سرمد وغیرہ اسے عوام میں پھیلا رہے تھے۔

(۳) سرمد کا قتل کسی سیاسی انتقام کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ ان کے ذریعہ جو مذہبی انار کی پھیل رہی تھی اس کی وجہ سے ہوا۔

تصانیف | سرمد کے علم و فضل اور کمال عربیت سے توقع تھی کہ وہ عربی و فارسی میں کچھ تصانیف چھوڑ گئے ہوں گے لیکن سرمد جس عالم مدہوشی و سرمستی میں تھے وہاں اس دفترِ بے معنی کا گذر کہاں۔ اس لئے رباعیوں کے ایک مختصر سے مجموعہ کے علاوہ جس میں درحقیقت ان کے نورِ باطن کی جلوہ انگیزیاں دکھائی دیتی ہیں انکی اور کوئی علمی یادگار نہیں ہے۔ اس مضمون میں ہم اس مجموعہ پر اس حیثیت سے نظر ڈالنا چاہتے ہیں کہ سرمد مدہوش نے ہوش و خرد کی کیا باتیں کی ہیں۔

سرمد نے رباعیات کے علاوہ کچھ غزلیں بھی کہی ہیں۔ خود ایک رباعی میں اپنی غزل گوئی کے بارے میں کہتے ہیں کہ میں غزل میں حافظ کا اور رباعی میں خیام کا پیرو ہوں ؎

با فکر و خیال کس نباشد کارم — در طور غزل طریق حافظ دارم

اما بہ رباعی ام مرید خیام — بہ جرعہ کش بادۂ او بسیارم

لیکن ان کی غزلوں کے کسی مجموعہ کا راقم الحروف کو علم نہیں ہے۔ صرف شیر خاں لودی نے مرآۃ الخیال میں ان کی ایک غزل نقل کی ہے اور بعض تذکروں میں انکی مختلف غزلوں کے جستہ جستہ اشعار پائے جاتے ہیں۔ جو حسب ذیل ہیں ؎

سوخت بے وجہم تماشا را بہ بیں — کشت بے جرم مسیحا را بہ بیں

زندہ کش جاں نباشد دیدۂ — گر ندیدستی بیا ما را بہ بیں

اے کہ از دیدار یوسف غافلی — داغ یعقوب و زلیخا را بہ بیں

اے کہ از روز بدم در حسرتی — یکزماں ایں روئے زیبا را بہ بیں

شاہ و درویش قلندر دیدۂ

سرمد سرمست و رسوا را بہ بیں[1]

ہمچو دور افتادہ کاخر رسد بر پائے خود — دست تا در گردن من کرد تیغش خوں گریست

گرم عتاب چوں شود دیدہ بپوشم از رخش

پردہ کشند مرداں چوں شود آفتاب گرم[2]

اے گل شوخ در روزے بحیا باش کہ سرد

شد جوانی و ندانست کہ باز ار کجا است[3]

---

[1] مرآۃ الخیال

[2] تذکرہ نصر آبادی

[3] ایضاً

درش در آغوش شبنم خفتن اے گل تا سحر
ناز بر بلبل مکن دیگر کہ تردامن شدی[1]

لیکن صرف غزل کے ان چند اشعار سے ان کی غزل گوئی پر کچھ لکھا نہیں جاسکتا ہے اور نہ ان کے متعلق کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ لیکن ان چند اشعار میں حافظ کی غزلوں کی گرم جوشی کچھ ضرور دکھائی دیتی ہے۔ البتہ رباعیات کا مجموعہ ہمارے سامنے ہے۔ اس پر ہم کسی قدر تفصیل سے بحث اور خیام سے اس کا موازنہ بھی کریں گے۔

غزل

جناب رئیس الشاکری صاحب
بمبئی

کبھی مجبور ہوئے ہیں کبھی مختار ہوئے
اپنی پہچان میں ہم جب سے گرفتار ہوئے

زندگی کیسے کہیں جب سے ترا ساتھ ہوا
غم پہ غم آتے ہیں آزار پہ آزار ہوئے

سر تسلیم کسی جسم پہ باقی نہ رہا
دل زدوں میں یہ تماشے تو کئی بار ہوئے

وقت مجھ پر نہ پڑا کوئی یہ اچھا ہی ہوا
جب سے احباب مرے کاٹھ کی تلوار ہوئے

آسمانوں کی بلندی بھی خمیدہ دیکھی
فکر کے بوجھ سے ہم جب بھی گرانبار ہوئے

لذت غم سے زمانہ ہوا محروم ہوں میں
جیسے یگ بیت گیا ہو اسے غمخوار ہوئے

داغ دامن کے چمک اٹھے ہیں جیسے خورشید
میرے چھلکے ہوئے آنسو جو طرفدار ہوئے

میں نے بازار سخن میں یہی دیکھا ہے رئیس
جھوٹے لفظوں کے بت لوگ خریدار ہوئے

---

[1] اقتباسات نزہۃ الناظرین۔

تاریخ اسلامی کی تشکیل جدید

از ڈاکٹر شاکر ایم عبدالمنعم

:- ترجمہ ماسٹر عتیق الزماں صاحب شعبۂ انگریزی جامعۃ الرشاد

اس وقت اسلامی تاریخ کو دوبارہ لکھنے کی تحریک بعض لوگوں کی طرف سے ہونے لگی مگر اسلامی تاریخ کو دوبارہ لکھنے کے خیال کے ساتھ ہی مختلف النوع سوالات پیدا ہونے لگتے ہیں اس کوشش میں کیا ہمیں ماضی کی عظمتوں اور فتوحات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا چاہئے یا بغیر کسی تعصب کے اسلامی تاریخ کے ہر پہلو کو من وعن پیش کرنا چاہئے ؟ کیا تاریخ کے جدید ترین ذرائع تحقیق و تفتیش نیز تطہیر و تصحیح کی مطابقت میں اپنی تحقیقات کی بنیاد رکھنی چاہئے ؟ کیا ہمیں مستشرقین کے حقارت آمیز اتہامات کا بطلان کرنا چاہئے ۔ اور اسلامی تاریخ کے سلسلہ میں ان کی ارادی یا غیر ارادی فریب کاریوں سے نجات حاصل کر لینی چاہئے ؟ کیا تاریخی واقعات وحقائق کو موجودہ حالات کے پس منظر میں دکھایا جانا چاہئے۔ یا ٹھیک ویسے ہی جیسے غیر ضروری جوش و خروش سے تعلیمی ادارے خالص مطلب براری کے مقاصد سے پہلے ہی سے دکھاتے چلے آرہے ہیں ؟

اسلامی تاریخ کی تدوین جدید بلاشبہ ایک ہمہ جہتی مسئلہ ہے ۔ لیکن اگر ہم آمادہ ہوں تو ایسے سوالات کی کافی حد تک وضاحت ہو جاتی ہے ۔ میرے خیال میں پریس نہ صرف اسلامی تاریخ کی تدوین بلکہ دوسرے اسلامی علوم و آداب کی زوردار تشہیر کی خوبی سے متصف ہے ۔ اکثریت کا یہی احساس ہے کہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ایمان خالص کی راہ سے افسوس ناک حد تک ہٹ چکی ہے ۔ جس کے نتیجہ میں انھوں نے اپنے آپ کو ثقافتی یورش اور اخلاقی انتشار کے خطرات میں مبتلا کر لیا ہے ۔

اگر تاریخ کو از سر نو لکھنے سے ہماری مراد مستشرقین کے الزامات کا بطلان ہی ہے تو پھر تو دوسرے لوگوں نے صدیوں میں جو عمارت تعمیر کی ہے موجودہ دور کے مسلم مؤرخین اسی کو منہدم کرنے کی کوشش میں الجھ کر رہ جائیں گے ۔ اس کے بعد حقائق اور دستاویزی ثبوتوں کی بنیاد پر وہ جدید خیالات کو مرتب کر سکیں گے میرے خیال میں مستشرقین کے الزامات کے بطلان کی کوششوں میں

الجھنے سے صرف وقت اور صلاحیتوں کی بربادی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا زندگی بہرحال بہت مختصر ہے
اسے ایسے کام میں برباد نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کے برعکس ہمیں دستاویزی اور قابل اعتبار مواد پر تاریخی
واقعات و حقائق کی بنیاد رکھنے کیلئے انتھک اور مسلسل جدوجہد کر کے محدثین کے اصولوں کی پیروی کرنی
چاہیئے ایسی صورت میں غیر اسلامی تاریخی مطالعہ ذہن و ضمیر دونوں کو زیادہ جارحانہ محسوس ہوگا ہمیں
مستشرقین کی تاریخی کجروی کو برا ماننے میں اپنا وقت صرف نہیں کرنا چاہیئے۔ اسلام کے دشمن اس کے دشمن
ہی رہیں گے۔ اسلامی عقائد کے سلسلہ میں ان کے رویئے میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ مجھے خوف ہے کہ
کہیں تاریخ اسلامی کی تدوین جدید کرتے ہوئے لوگ تاریخ کو جھٹلانے یا ان میں ہیر پھیر کرنے کی کوشش
نہ کرنے لگیں۔ تاریخ نہ تو حال سے متاثر ہوئی ہے اور نہ ہی حالیہ واقعات کی ہو بہو عکاسی ہوتی ہے۔
تعلیمی اداروں نے جس قسم کی موضوعی تحریروں سے خود کو وابستہ کر رکھا ہے، خالص علمی حلقوں کی
پسند سے وہ قابل لحاظ حد تک جداگانہ ہے۔

میرے خیال سے اسلامی فن تاریخ نویسی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث
سے رہنمائی حاصل کی تھی۔ سفیان ثوریؒ کا مشہور قول ہے کہ "جب رواۃ نبی کریمؐ کی حدیث کو
جھٹلانے لگے تو ہم دستاویزی طور پر تصدیق کرنے لگے"۔

اپنی تنقید و بیان میں راویان حدیث نے ایک حیرت انگیز طریقہ اختیار کیا۔ وہ متن
اور سند کے اصول کو مستند ماننے لگے۔ ہمیں اپنی یونیورسٹیوں کے تاریخ کے طلباء کی حوصلہ افزائی کرنی
چاہیئے کہ وہ راویان حدیث کے نقش قدم پر چلیں انہیں تاریخی حقائق پر خصوصی توجہ دینی چاہیئے۔
اور صلاحیتوں اور وقت کو جدید تاریخ نویسی کی فضول اور بے مقصد کوششوں میں برباد نہیں کرنا چاہیئے۔
اگر ہم مسلمانوں کی قدیم تاریخ کو دوبارہ لکھنا ہی چاہتے ہیں تو ہمیں قرآن و حدیث پر پوری طرح بھروسہ
کرنا چاہیئے۔ بعد کے لوگوں نے کون سا طریقہ اختیار کیا اس کا مکمل مطالعہ اور اس کی خوب تحقیق کریں
اب تک کی جو یہ روایات رہی ہیں ہم مستشرقین کے اتہامات کے رد میں اپنا وقت برباد کرتے رہے بیک
قلم موقوف ہو جانا چاہیئے۔ ورنہ ہم اسلامی تاریخ پر ان کے شرارت آمیز الزامات و اتہامات کی گردان ہی
کرتے رہ جائیں گے۔ ہماری تاریخی تحریریں مدلل اور تعمیری ہونی چاہیئیں حقائق ہی ہمارا ہدف ہوں
اس طرح ہم اپنے مشترکہ قیمتی اور عظیم ثقافتی ورثہ کی حفاظت کے قابل بن سکیں گے۔

الرشاد کی ڈاک

(۱)

مکرمی و معظمی — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہوں۔

آنجناب سے رخصت ہوکر بخیریت گھر واپس آگیا ہوں۔ جامعۃ الرشاد کے دوران قیام آنجناب کے خلوص وحسن سلوک نے بے پناہ متاثر کیا۔

میں آپ کی بلند اخلاقی وعظمت علمی پر تہنیت ومبارک باد پیش کرنے کی جسارت تو اپنے اندر نہیں پاتا کیوں کہ آپ کی ذات ان تمام چیزوں سے ماورا ومستغنی ہے۔ آپ کو صرف خدا اجر دے سکتا ہو۔ تن تنہا مصائب ومسائل کی بھور میں (اعظم گڑھ جیسے شہر میں) ایک عظیم ادارہ کی تاسیس اور پھر بہترین نظم ونسق کے ساتھ اس کو چلانا یہ صرف آپ کا حصہ ہے اور آپ کی بلند حوصلگی، جواں ہمتی اور عزم واستقلال کا جیتا جاگتا نمونہ۔

تعلیمی ادارہ کے ساتھ ساتھ تالیف، تصنیف، بحث وتحقیق کے ادارہ کو قائم کرنا، ماہنامہ "الرشاد" کا اجراء کرنا، اس کے ذریعہ ملی مسائل کا تجزیہ کرنا، مسلمانوں کی رہنمائی کیلئے خطوط کار متعین کرنا، علمی مباحث پر تحقیقی مواد فراہم کرنا، ہر انسان کے محسوس ہونے والے روحانی خلا کو پُر کرنا، جدید تہذیب اور عصرِ نو کے پیدا کردہ کرب واضطراب سے چھٹکارہ ونجات کی راہوں کا تعین کرنا۔ کتنا عظیم کام ہے!!

یہ کام اس بات کی دلیل ہے کہ خدا نے آپ کو اپنے ان بندوں میں شمار کیلئے انتخاب کرلیا ہے جن سے وہ ہر دور میں قیادتِ صالحہ کا کام لیتا چلا آیا ہے۔

آپ سے ایک مختصر سی ملاقات رہی لیکن کیف ومستی، سرور وانبساط روحانی کی حیثیت سے ایک طویل ملاقات کہا جا سکتا ہے۔ اہل علم کا آپ کے پاس آنا جانا اس بات کا

واضح مظاہرہ ہے کہ آپ مرجع خلائق ہیں۔

احقر سراج الدین ندوی مدرسہ احیاء العلوم سرکڑہ چکر اجمل ضلع بجنور (یوپی)

---

(۲)

نئی دھلی　　　محترمی و مکرمی قبلہ عالیجناب حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب　　　8-8-83

السلام علیکم : قوی امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ میں بھی بفضل اپنی خیریت سے ہوں۔ آج مدت کے بعد آپ سے شرف ملاقات حاصل خط کے ذریعہ کررہا ہوں۔ اس سے قبل ملاقات رمضان میں ہوئی تھی۔ دلی واپس آنے کے بعد ماہنامہ "ارشاد" خوب غور سے پڑھا اور مجبور ہوگیا کہ اس کو اپنے علمی اور ادبی حلقے میں متعارف کرایا جائے، سو ایسا ہی کیا۔ لوگوں نے بہت پسند کیا۔ خاص کر چند مضامین۔ مثلاً مئی کے شمارہ میں آپ کا وہ مضمون جس کا عنوان "حضرت فضل بن عیاض" ہے اور زکوٰۃ، نہایت ہی پسند کیا گیا ہے۔ مضامین کا اتار چڑھاؤ اور طرز تحریر تو کوئی آپ جیسے پختہ اور کہنہ مشق انسان سے ہی سیکھے۔ اور اپریل کا شمارہ تو کہنا ہی کیا۔ خاص کر "حدیث نبوی کا تحقیقی مطالعہ"، "وحدت امت"، اور "تواضع" تو بہت ہی خوب ہے۔ آپ جیسے ذی علم حضرات کی تعریف کرنا حماقت ہے سو اس کی جرأت نہیں ہوئی۔ میری اور میرے احباب کی جانب سے ایک علمی دینی اور ادبی پرچے کے اجراء پر دلی اور پُرخلوص مبارک باد قبول کیجئے۔ اگر ہر ماہ پرچہ بھیجدیا کریں تو کرم ہوگا۔ اس سے میری استعداد میں اضافہ ہوگا۔ امید ہے کہ ایسا ضرور کریں گے۔ رشحات کا تو جواب ہی نہیں اتنا بے باک اور بے لاگ تبصرہ اور تنقید صرف آپ ہی جیسے لوگوں کا کام ہے اتنی جرأت دوسرے علماء میں کہاں ہے۔ کاش کہ یہی جرأت ہمارے علماء میں پھر سے آجائے تو ماحول ایکبارگی تبدیل ہوجائے اور اس مظلوم قوم کو ایک نئی زندگی مل جائے۔ خدا کرے یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے اور میری دیرینہ خواہش پوری ہو۔

ایک خواہش اور ہے، وہ یہ کہ آپ اسلامی فلسفہ اور تصوف پر بھی گاہے گاہے علمی اور تحقیقی مقالے شائع کرتے رہیں۔ ذاتی مطالعہ کے بعد خاص کر "رشحات" میں ملت کی دکھتی اور کمزور رگ کو پکڑنے اور اجاگر کرنے کی جو سعی آپ نے کی ہے یا کر رہے ہیں قابل ستائش ہے۔ ملت کے اندر اتحاد کا جذبہ پیدا کرنا بھی آج ایک عبادت ہے اور کسی طرح

سے بھی یہ جہاد اکبر سے کم نہیں ہے۔

حضرت مولانا میرے اس خط کا تعلق کسی خوشامد سے نہیں ہے بلکہ یہ ایک تاثر قلبی ہے۔ اس کے اظہار پر میں اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں۔

"الرشاد" کے سارے مضامین محققانہ، مفکرانہ ہوتے ہیں۔ خدا آپکے سایہ کو برقرار رکھے۔ آمین۔

احقر۔ شمس الآفاق سی ۲۹۷ اسکوائر
گول مارکیٹ نئی دہلی (۱۱۰۰۰۱)

باب الاستفسار والجواب

مکرمی و محترمی جناب مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہٗ

السلام علیکم

بستی ضلع کے کچھ مسلمان وکلاء نے اس سال ہولی میں نہ صرف رنگ رلیاں منائیں بلکہ اس میں باقاعدہ رقص بھی کیا۔ ان کو جب اس پر ٹوکا گیا تو وہ شرمندہ ہونے کے بجائے مولویوں کو ملامت کرنے لگے اور جواب میں کہنے لگے کہ شریعت میں اس کی کہاں ممانعت ہے؟ اگر ہو تو دکھائیے۔

آپ کی خدمت میں یہ عریضہ اس غرض سے لکھ رہا ہوں کہ آپ اس کا شرعی نقطہ نظر سے جواب عنایت کریں۔

محمد سمیع اللہ فیضی۔ لوگرا ہ بستی۔

برادرم!

السلام علیکم

آپ نے جو بات تحریر کی ہے اب اس نے ایک وبا کی صورت اختیار کر لی ہے۔ خاص طور پر وہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ جس کی ابتداء میں کوئی دینی تعلیم و تربیت نہیں ہوئی ہے۔ وہ اس طرح کی آزادانہ اور بے باکانہ روش اختیار کر کے پورے معاشرہ کو بگاڑ رہا ہے ایسے لوگوں کا جواب تو ان کا معاشرتی بائیکاٹ اور فلیفہ (؟) بیدہ ہے۔ لیکن آپ نے چونکہ شرعی نقطہ نظر دریافت کیا ہے۔ اسلئے چند باتیں

لکھ دی جاتی ہیں۔

(۱) سب سے پہلی بات یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جس طرح ہر قوم اور ہر مذہب و ملت کے ماننے والوں کے کچھ شعار اور تہذیبی امتیازات ہوتے ہیں اسی طرح ہر قوم کے تہوار بھی شعار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسلام کے ماننے والوں کے بھی کچھ شعار و امتیازات ہیں اب اگر کوئی مسلمان اپنے شعار کے بجائے دوسری کسی قوم کے شعار و امتیازات کو اختیار کرتا ہے یا ان کے تہواروں میں بغیر کسی قید و تحفظ کے شریک ہوتا ہے تو وہ اپنے شعار کی اہمیت کم کرتا ہے اور دوسروں کے زمرہ میں اپنے کو شامل کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اسلام نے مسلمان مردوں اور عورتوں کے سلسلے میں بھی لباس اور آرائش اور بعض معاشرتی امتیازات قائم کئے ہیں یہی مفہوم ہے اس حدیث نبوی کا جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" اسی بنا پر آپ نے بالکل زرد یا ریشمی لباس مردوں کیلئے ناپسند فرمایا۔

ہولی وغیرہ ہندؤں کے جو تہوار ہیں ان کی حیثیت شعار کی ہے۔ اگر ہم اس میں حصہ لیتے ہیں تو ان کے شعار کو اختیار کرتے ہیں۔ ایک شرکت تو یہ ہے کہ ہم ان کو ان کے تہواروں پر مبارکباد دیں، ان سے گلے مل لیں یا ان کو تحفہ پیش کر دیں۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسی کو میں نے قید و تحفظ کے لفظ سے ادا کیا ہے۔ لیکن ہم رنگ کھیلیں، ابیر لگائیں یا رقص و سرود میں شریک ہوں یا بھنگ پی کر سڑکوں پر گالی بکتے پھریں۔ یہ کسی طرح جائز نہیں۔ بلکہ یہ معصیت اور مشرکانہ شعار کے اختیار کرنے کے مرادف ہوگا۔

مدینہ منورہ میں انصار جاہلیت میں سال کے دو دن یعنی نوروز اور مہرجان کے دن کھیل کود کرتے تھے اور خوشی مناتے تھے۔ کوئی مشرکانہ بات اس میں نہیں ہوتی تھی مگر آپ نے جب انصار کو یہ کرتے دیکھا تو دریافت فرمایا کہ یہ کیا کرتے ہو؟ انصار نے جواب میں کہا کُنَّا نَلْعَبُ فِيهِمَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ، یعنی ہم لوگ جاہلیت میں ان دو دنوں میں کھیل کود کیا کرتے تھے۔ تو آپ نے فرمایا ابدلکم اللہ بھما خیرا منھما یوم الاضحیٰ و یوم الفطر یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان دو دنوں کے بدلے اس سے بہتر دو دن عطا کیا ہے وہ دونوں دن یوم عید الاضحیٰ اور یوم عید الفطر ہیں۔ یعنی آپ نے جاہلیت کی اتنی یادگار کو بھی باقی رکھنا پسند نہیں فرمایا۔ اس روشنی میں آپ غور کریں تو ان حضرات کا یہ فعل کتنا شنیع اور گھناؤنا بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو ان آفات سے محفوظ رکھے۔

والسلام — مجیب اللہ ندوی

مکرمی و محترمی ادام اللہ فیوضکم   السلام علیکم و رحمۃ اللہ

سوال :۔ جونپور میں ہمیشہ عید اور بقرعید کی نماز عیدگاہ میں ہوتی رہی ہے۔ پچھلے عید کے موقع پر شہر کے کچھ لوگوں نے اعلان کرا دیا کہ اٹالہ مسجد میں بھی عید کی نماز ہوگی۔ اس پر مسلمانوں میں بڑا اختلاف ہوا یہاں تک کہ حکام کو بھی مداخلت کرنی پڑی۔ اور کسی طرح نماز ایک جگہ ہوئی۔ اس سلسلہ میں قریب کے ایک مدرسہ کے مفتی صاحب نے اٹالہ کی مسجد میں نماز عید کے جواز کا فتویٰ دیدیا جس سے دو جگہ عید کی نماز کرنے والوں کو موقع مل گیا۔

آپ سے درخواست ہے کہ اس سلسلہ میں شریعت کی روشنی میں اپنی رائے عنایت کریں۔

ڈاکٹر محمد سعید

ڈھالگر ٹولہ جونپور

جواب :۔ جہاں تک عید کی نماز کے کئی جگہ ہونے کی بات ہے اس کو کوئی بھی مفتی ناجائز نہیں کہہ سکتا۔ مگر کئی جگہ نئے سرے سے نماز کے جواز کا فتویٰ دینا یہ قابل غور ہے۔ عید کی نماز کے سلسلہ میں نبی کریمؐ کا جو اسوہ رہا ہے اور اس سلسلہ میں آپ کے جو ارشادات ہیں اس کو اگر سامنے رکھا جائے تو عید کی نماز کسی جامع مسجد یا پنجوقتہ نماز والی مسجد میں بغیر کسی عذر کے صحیح نہیں ہے۔ مسجد نبوی میں ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے برابر ملتا ہے۔ مگر آپ مدینہ منورہ کے دس سالہ قیام کے دوران ایک بار بارش کی وجہ سے مسجد نبوی میں نماز ادا فرمائی۔ درنہ ہمیشہ آپ پچاس ہزار کا ثواب چھوڑ کر میدان میں (عیدگاہ) میں نماز ادا کرنے کیلئے تشریف لیجاتے تھے۔ اور یہی تعامل پوری امت کا رہا ہے۔ اس کا ایک بڑا مقصد اسلامی شان و شوکت کا اظہار بھی ہے اس لئے راستہ بدل کر جانے کا حکم دیا گیا ہے اور بلند آواز سے یا آہستہ تکبیر کہتے ہوئے جانے کیلئے آپؐ نے فرمایا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ عید کے دن فخریہ انداز میں فرشتوں سے فرماتا ہے کہ "ثم خرجوا یعجون الی الدعاء" پھر وہ گھروں سے نکلتے ہیں اور بلند آواز سے تکبیر کہتے ہوئے نماز کیلئے جاتے ہیں۔ اگر عید کی نماز کو بھی کئی حصوں میں بانٹ دیا جائے تو حضورؐ کی سنت جاریہ ترک ہو جائیگی۔

اور اس کے جو دوسرے اجتماعی فائدے ہیں وہ سب ختم ہو جائیں گے۔ عام طور پر ایسے اقدامات کچھ لوگ نفسانیت یا اقتدار کی بنا پر کرتے ہیں یہ خود ناروا بلکہ معصیت کی بات ہے۔

غرض یہ کہ راقم الحروف کے نزدیک بغیر کسی شدید عذر شرعی کے جماعت میں انتشار پیدا کرنا جائز نہیں ہے۔ تمام مسلمانوں کو عیدگاہ میں نماز پڑھنی چاہیے۔ افسوس ہے کہ نماز عید سے زیادہ اہتمام کی چیز پنجوقتہ فرض نماز میں ہیں مگر ان کے اہتمام کی اتنی فکر لوگوں کو نہیں ہوتی جتنی کہ واجب یا سنت مؤکدہ نمازوں کی ہوتی ہے۔

والسلام

حبیب اللہ ندوی

نئی کتابیں

۱۔ بیمہ اور اسکی شرعی حیثیت
۲۔ سنی و بدعی طلاق کا حکم
۳۔ اوضح المسالک الی احکام المناسک
۴۔ اسلام میں غریبی کا علاج

پتہ :۔ الدار السلفیہ۔ ۱۲ محمد علی روڈ بھنڈی بازار۔ بمبئی ۳۔
کتابت وطباعت معیاری

یہ چاروں کتابیں الدار السلفیہ محمد علی روڈ، بھنڈی بازار۔ بمبئی سے شائع ہوئی ہیں یہ چاروں کتابیں تین ممتاز عرب علماء کی لکھی ہوئی ہیں جنھیں مولانا مختار احمد صاحب ندوی نے اردو کا جامہ پہنا کر شائع کیا ہے پہلی اور دوسری کتاب کے مصنف شیخ عبداللہ بن زید المحمود رئیس محاکم شرعیہ قطر ہیں پہلی کتاب کا ترجمہ مولانا نصیر احمد علی صاحب نے کیا ہے۔ دوسری کتاب کا ترجمہ خود مولانا مختار احمد صاحب ندوی نے کیا ہے۔ تیسری کتاب کے مصنف عبدالعزیز المحمد السلمان ہیں اور ترجمہ مولانا مختار احمد صاحب ندوی نے کیا ہے۔ چوتھی کتاب کے مصنف مشہور عالم ڈاکٹر یوسف القرضاوی ہیں اور اس کا ترجمہ مولانا نصیر احمد علی صاحب نے کیا ہے۔ چاروں کتابیں عالمانہ تحقیقی اور قابل مطالعہ ہیں۔

زندگی کے بیمہ کی شرعی حیثیت کے بارے میں اس سے پہلے شیخ ابو زہرہ مرحوم اور ڈاکٹر مصطفیٰ زرقا

صاحب کا مباحث بھی اتا ہیں فی الشریعۃ الاسلامیۃ چھپ کر آج سے بیس برس پہلے اہل علم کے ہاتھوں میں پہونچ چکا ہے۔ اس سلسلہ میں دوسری تحقیقی تصنیف ہے۔ شیخ ابو زہرہ اس کے عدم جواز کے قائل تھے اور شیخ مصطفیٰ زرقا جواز کے۔ شیخ عبداللہ بن زید بھی اس کے عدم جواز کے قائل ہیں اور اسکے ناجائز و حرام ہونے کے بڑے ٹھوس شرعی دلائل دیتے ہیں۔ دوسری کتاب میں مصنف نے امت کے ایک اجماعی مسئلہ کے خلاف ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقوں کو ایک طلاق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے پہلے الرشاد میں سعودی عرب کے علماء کا فتویٰ کا ہم نقل کر چکے ہیں کہ وہ ایک مجلس کی تین طلاق کو تین ہی طلاق سمجھتے ہیں۔ اور پورے دلائل کے ساتھ ایک طلاق ماننے والوں کی تردید کی ہے۔ راقم الحروف کا بھی ایک مفصل مضمون طلاق ثلاثہ کے عنوان سے بیس برس پہلے معارف میں شائع ہو چکا ہے عربی میں طلاق سنی و بدعی کا لکھنا تو صحیح ہے مگر اردو ترجمہ میں یہ لفظ ذوق سلیم پر کچھ بار محسوس ہوتا ہے اور اس سے کچھ مسلکی شدت پسندی بھی معلوم ہوتی ہے۔

تیسری کتاب حج کے مسائل سے متعلق ہے۔ یہ بھی تحقیقی کتاب ہے۔ بعض مسائل میں احناف کا مسلک مصنف سے مختلف ہے۔ مگر بہرحال کتاب قابل قدر ہے۔ چوتھی کتاب میں "اسلام میں غریبی کے علاج" پر ڈاکٹر یوسف القرضاوی صاحب نے مفصل بحث کی ہے یہاں کی دوسری کتابوں کی طرح محنت و تحقیق کا بہترین نمونہ ہے مصنف وسیع النظر عالم ہیں اور بعض مسائل میں وہ اپنی مجتہدانہ رائے رکھتے ہیں۔ مگر ان کی تمام رایوں سے ضروری نہیں کہ اتفاق کیا جائے خاص طور پر ہندوستان کے علماء کو ان کی بہت سی رایوں سے اتفاق نہیں ہے۔ بہرحال چاروں کتابیں قابل مطالعہ ہیں۔

گلشن صادق

مؤلف: میر وارث علی ابن میر ہدایت علی پیرزادہ گلشن آبادی۔ ناسک۔
صفحات ۱۵۲۔ کتابت و طباعت معمولی۔ پتہ درج نہیں۔

ہندوستان میں اسلام کی روشنی پھیلانے میں سب سے زیادہ صوفیہ نے حصہ لیا۔ مشکل سے ہندوستان کوئی خطہ ہوگا جہاں ان کے قدم نہ پہونچے ہوں۔ افسوس ہے کہ ان کے بعد ان کے ماننے والوں نے ان کے کارناموں کے بجائے ان کے مزاروں کو تھام کر بیٹھ گئے۔ انہی صوفیا میں مہاراشٹر کے ایک بزرگ سید شاہ محمد صادق حسینی سرمست ہیں۔ اس کتاب میں انہی کے حالات اور کشف و کرامات درج ہیں۔ ساتھ ہی اس میں ناسک کی اسلامی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور بعض دوسرے بزرگوں کا تذکرہ بھی اس میں کیا گیا ہے۔ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے اور قابل مطالعہ ہے۔

فاکہ سامنے آجاتا ہے کہ اس کی روشنی میں صحیح اسلامی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن
دارالمصنفین سے شائع ہوا تھا

اہل کتاب صحابہ و تابعین

مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی
اس کتاب میں ان صحابہ اور تابعین کا تذکرہ ہے جو
یہودی یا عیسائی تھے اور انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کتاب میں تقریباً سو صفحے کا ایک قیمتی مقدمہ بھی ہے جس سے
عرب کے یہود و نصاریٰ کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔
اس پر مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کا دیباچہ بھی ہے۔ اس موضوع پر دنیا کی کسی زبان میں کوئی مکمل
کتاب موجود نہیں ہے۔

خطبۂ نکاح

نکاح کے موقع پر جو خطبہ دیا جاتا ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے
اور یہ ایک اہم معاشرتی ہدایت اور اصلاح معاشرہ کا پیغام ہے۔ مگر عام طور پر اس
کے الفاظ دہرا دیئے جاتے تھے، اس کا پورا مفہوم لوگوں کے ذہن نشین نہیں ہو پاتا ہے۔ اس کتابچہ میں اس کے
ایک ایک لفظ کی ایسی موثر تشریح کی گئی ہے کہ یہ ہر نکاح کے موقع پر تقسیم کرنے کے قابل ہے۔ یہ تشریح مولانا
حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی کے قلم سے ہے۔ صفحات ، قیمت ۔

اہل دل کی باتیں

یہ بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپگڈھی مدظلہ کے ان
ملفوظات کا مجموعہ ہے جو وہ اپنی نجی مجلسوں میں اپنی پرانہ اور پر سوز زبان سے
فرماتے رہے ہیں، اسے مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد نے مرتب کیا ہے۔ اس کا بیشتر حصہ
ماہنامہ الفرقان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اب یہ جواہر پارے کتابی شکل میں دارالتصنیف و ترجمہ
جامعۃ الرشاد کی طرف سے شائع کئے جا رہے ہیں۔

فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل

یہ محترم ناظم جامعۃ الرشاد کے ان مضامین کا مجموعہ ہے
جو معارف اعظم گڈھ میں شائع ہو چکے ہیں یا مختلف سیمیناروں میں پڑھے گئے ہیں جن میں جدید مسائل کے حل
کیلئے وہ بنیادیں فراہم کی گئی ہیں جن کی روشنی میں جدید سے جدید مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔ یہ کتاب جامعہ ملیہ
دلی سے شائع ہوئی ہے اور اس پر اردو اکیڈمی نے مصنف کو انعام بھی دیا ہے۔ قیمت للعہ
ملنے کا پتہ: شکیل احمد منیجر مکتبہ جامعۃ الرشاد۔ رشاد نگر اعظم گڈھ۔ یوپی

ستمبر - اکتوبر ۸۳

جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان

ماہنامہ

الرشاد

جامعۃ

مرتبہ

مجیب اللہ ندوی

دار التالیف و الترجمہ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ (یوپی)

دار التالیف والترجمہ کی تصانیف

عبادت و خدمت

مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہٗ

اس رسالہ میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور عام انسانوں کی خدمت بھی عبادت ہے، اور اس پر اسی طرح اجر و ثواب ملتا ہے جس طرح فرض عبادات پر ملتا ہے۔ اگر فرض عبادات کے اہتمام کے ساتھ ہمارے اندر عام انسانوں کی خدمت کا جذبہ بھی پیدا ہو جائے تو نفرت و حقارت کے بہت سے دبیز پردے ہٹ جائیں گے اور اسلام سے عام انسانوں کے دلوں میں ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ سائز ۲۶×۱۸۔ صفحات ۵۶، قیمت ۷۵ پیسے

دینی مدارس اور ان کی ذمہ داریاں

یہ محترم مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد کی ان تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ ہے جو وہ طلبہ، اساتذہ، منتظمین مدرسہ اور عربی مدارس کے ذمہ داروں کے سامنے کرتے رہے ہیں۔ یہ تقریریں اور تحریریں دردو اثر میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ان میں بعض تقریروں کو محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہٗ نے اپنے تائیدی نوٹ کے ساتھ الفرقان میں شائع فرمایا اور شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب مدظلہ العالی نے ایک بڑے مجمع میں پڑھوا کر سنوایا اور فرمایا کہ اسے ہر استاذ اور طالب علم کو پڑھنا چاہئے۔ سائز ۲۲×۱۸۔ صفحات ۱۰۰، قیمت ۱/۵۰

اسلامی تعلیم

حصہ اول، دوم، سوم، چہارم

بچوں کو اسلامی مسائل ذہن نشین کرانے کے لئے اردو زبان میں درجنوں رسالے لکھے گئے ہیں۔ مگر اس رسالہ کا انداز بیان اتنا دلچسپ ہے اور مسائل ایسے آسان طریقہ سے سمجھایا گیا ہے کہ بچے اسے قصہ کہانی کی کتاب کی طرح دلچسپی و شوق سے پڑھتے ہیں۔ چار حصوں میں تمام ضروری مسائل آ گئے ہیں۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت حصہ اول ۱۲/، دوم ۱۲/، سوم ۵۵/، چہارم ۷۵/

تبع تابعین حصہ اول

مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہٗ

کتاب میں ۱۴۹ اکابر تبع تابعین کا مفصل تذکرہ ہے، شروع میں مصنف کے قلم سے ایک فاضلانہ مقدمہ بھی ہے جس سے اسلام کی ابتدائی دو صدی کے دینی، تہذیبی اور سیاسی تاریخ کا ایسا

مولانا مجیب اللہ ندوی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے نشاط پریس ٹانڈہ میں چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

سالانہ چندہ	جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان	سالانہ چندہ
ہندوستان -/24	ماہنامہ	ممالک غیر سے
چندہ ششماہی -/12	جامعۃ	بارہ ڈالر امریکی
قیمت فی پرچہ 2/50	الرشاد	-/12

جلد [illegible] | ستمبر و اکتوبر ۱۹۸۳ء مطابق ذی الحجہ و محرم ۱۴۰۳ھ ۱۴۰۴ھ | شمارہ [illegible] 3

مجلس ادارت

رشحات

شیخ سعدی نے آج سے صدیوں پہلے کہا تھا :-

تو کار زمین را نکو ساختی ‏ ‏ ‏ ‏ کہ با آسمان نیز پرداختی

کیا تم زمین کا کام اچھی طرح نپٹا چکے کہ اب آسمان کو سنوارنے اور اس کی دیکھ بھال کی فکر میں لگ گئے ہو۔
اگر آپ غور کریں تو نظر آئے گا کہ اس وقت ساری دنیا اسی مرض کا شکار ہے۔ موجودہ دور کے
ترقی یافتہ ممالک جو دنیا کی غربت و افلاس کو دور کرکے اس کو امن و اماں سے ہمکنار کر سکتے تھے وہ دنیا کو فتنہ
اور فساد کی آماجگاہ بنائے ہوئے ہیں۔ یہ طاقتور ملک کمزور ملکوں کو اوپر اٹھانے کے بجائے اپنی سیاسی برتری
کے لئے ان کو اور کمزور کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ دنیا اس وقت دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔
ایک طرف جمہوری ممالک ہیں جن کی سربراہی امریکہ کے ہاتھ میں ہے اور دوسری طرف کمیونسٹ ممالک
ہیں جن کی سربراہی روس و چین کے ہاتھ میں ہے۔ ان کو بالکل اس کی فکر نہیں ہے کہ دنیا کے ۲/۳ حصہ کا انسان
آج بھی غریبی کی سطح پر زندگی گذار رہا ہے۔ ان کے بچوں کو نہ پیٹ بھر کھانا میسر ہے اور نہ انہیں اعلیٰ تعلیم کے
مواقع حاصل ہیں اور نہ دوا علاج کی بہتر سہولت میسر ہے۔ مگر یہ چاند اور مریخ پر اپنا راکٹ بھیجنے کی فکر میں لگے
ہوئے ہیں۔ وہ انسانی زندگی جو ان کے سامنے کراہ رہی ہے وہ ان کے درد کا تو کوئی علاج نہیں سوچتے اور اگر
سوچتے ہیں تو سیاسی استحصال کے لئے۔ مگر اپنی فوجی برتری کے اظہار کے لئے چاند و مریخ میں زندگی کی کھوج کے لئے
ہر سال کھربوں روپیہ برباد کر رہے ہیں اور اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کی ریس
میں بعض ترقی پذیر ممالک بھی "ان ہنسوں کی چال اختیار کر رہے ہیں"۔ ہمارے ملک ہندوستان میں ایک
کروڑ آدمی بے روزگار ہیں اور ۷۰ - ۵۰ فیصدی لوگ غریبی کی سطح پر زندگی گذار رہے ہیں۔ جہاں امن
وامان مفقود ہے، جہاں اخلاقی زوال اپنی انتہا کو پہونچا ہوا ہے۔ جہاں انسانوں کے ساتھ وہ معاملہ کیا جاتا ہے
جو آدمی جانوروں کے ساتھ بھی روا رکھنا پسند نہیں کرتا، اس غریب ملک کا اربوں روپیہ ایشیاڈ اور راکٹ
کے بنانے پر خرچ کیا گیا ہے۔ کیا اسے عوامی بھلائی اور انسان دوستی کہا جا سکتا ہے۔ امریکہ میں فی کس سالانہ آمدنی کا

یورپ ۵۵ ہزار ہے اور روس اور جرمنی کا ۵۵ اور ۲۴ ہزار ہے۔ اور ہمارے ملک میں فی کس سالانہ آمدنی کا اوسط ۵۰۰ سو روپے ہے۔ ان ترقی یافتہ ملکوں کی ریس میں اس غریب ملک کا اربوں روپیہ تفریحات اور بے مقصد کاموں میں محض اپنے تشخص کے اظہار کے لئے صرف کرنا، کیا اسے ملک کو خوشحالی کی طرف لے جانے کی کوشش کہا جا سکتا ہے یا اسے اور زیادہ پیچھے لے جانے والی حرکت ہی کہا جا سکتا ہے۔ بہرحال اس وقت کا انسان اپنے داخل سے زیادہ اپنے خارج کی فکر میں ہے اس کو اپنے بگاڑ کا کوئی غم نہیں ہے مگر دوسرں کے بگاڑ پر فرضی اظہار غم کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ اسی طرح موجودہ دور کی حکومتیں اپنے سیاسی مفاد کے لئے اپنے ملک کے اندر ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا خون بہا سکتی ہیں اور ان کو اس پر کوئی شرمندگی نہیں ہوگی۔ مگر دوسرے ملک میں دس بیس آدمی اگر کسی حادثہ کے شکار ہو جائیں، یا سیاسی جرم میں نظر بند ہو جائیں تو انسان دوستی کے اظہار کے لئے گھڑیال کے آنسو بہانے میں پیش پیش رہینگی، گویا ہر طرف کار زمین را نکو ساختی کے بجائے باآسمان کا منظر نظر آرہا ہے۔

اس صورت حال کی بڑے پیمانے پر اصلاح کی اگر کچھ توقع ہو سکتی تھی تو دنیا کی اسلامی حکومتوں اور ہمارے دینی طبقہ سے۔ مگر اسلامی ممالک خود آپسی اختلاف اور اخلاقی زوال کا شکار ہیں وہ خود دھڑوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان کی نہ کوئی آزاد سیاست ہے اور نہ رائے۔ وہ اس مصرعہ کے مصداق ہیں ؎ "آنچہ استاذ ازل گفت ہمان گویم" اور محدود پیمانہ پر یہ کام ہمارا دینی حلقہ کر سکتا تھا مگر ہمارے دینی حلقے بھی شیخ سعدیؒ کے مذکورہ شعر کے پورے مصداق بنے ہوئے ہیں۔ ہمارے اردگرد کے ماحول میں دینی حلقہ کے لئے بے شمار کام پھیلے ہوئے ہیں جن کا تقاضہ ہے کہ وہ اپنی ساری توانائی اسی پر صرف کر دیں مگر سیاسی لوگوں کی طرح اردگرد کے ماحول کے لئے مشکل سے وہ وقت نکال پاتے ہیں مگر یورپ اور امریکہ میں جا کر اسلامی سنٹر میں دو چار تقریریں کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ سارا مغرب بس حلقہ بگوش اسلام ہو جائے گا امریکہ اور یورپ میں لوگ اور کرشنا مشن سے ہزاروں آدمی متاثر ہوئے ہیں مگر وہ دو چار تقریروں سے نہیں بلکہ کچھ لوگوں نے ہر طرح کے پروپیگنڈے اور شہرت سے اپنا دامن بچا کر اس کے لئے اپنی زندگیاں کھپائی ہیں تب کہیں جا کر انہیں کامیابی ہوئی ہے۔ ہمارے بزرگوں کا یہی طریقہ رہا ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے اپنے قریبی ماحول کو اپنی جدوجہد کا میدان بنایا پھر اس کے ذریعہ اپنے کام کو آگے بڑھایا اور پھر اسی کے لئے اپنی پوری زندگی صرف کر دی۔ کہنے کی غرض حاشا وکلا کسی کی تنقیص نہیں ہے بلکہ عام طور پر جو صورت حال ہے اس کی عکاسی کرنی مقصود ہے ورنہ ہمارے دینی حلقوں میں اب بھی بے شمار لوگ ہیں جو "باآسمان نیز پرداختی کے بجائے "تو کار زمین را نکو ساختی" کے مصداق بنے ہوئے ہیں خاص طور پر تبلیغی جماعت کے افراد میں بڑی حد تک یہ خوبی دکھائی

بقیہ صفحہ ۱۶ پر

مجیب اللہ ندوی

دنیا میں ہر انسان کو کبھی نہ کبھی ایسا موقع ضرور پیش آجاتا ہے کہ اس کو خود اپنی چیز یا اپنے روپے پیسے یا سامان وغیرہ کی حفاظت کے لئے دوسروں سے مدد لینی پڑتی ہے، اس موقع پر ہر انسان کا اخلاقی فرض ہوتا ہے کہ جب اس سے مدد مانگی جائے تو وہ اس سے دریغ نہ کرے بلکہ خندہ پیشانی سے اس کے روپے پیسے یا سامان کی حفاظت کی تکلیف کو گوارہ کرلے کیونکہ یہی ضرورت اس کو بھی پیش آسکتی ہے اس کو شریعت میں امانت و ودیعت کہتے ہیں۔

امانت و ودیعت میں فرق

امانت و ودیعت میں تھوڑا اصطلاحی فرق ہے، ودیعت میں قصد و ارادہ کا پایا جانا ضروری ہے، اور امانت قصد و ارادہ کے ساتھ بھی ہوتی ہے اور بغیر قصد و ارادہ کے بھی، مثلاً آپ راستہ میں کوئی چیز پڑی پائیں تو یہ چیز آپ کے ہاتھ میں امانت ہوگی، اس کو ودیعت نہیں کہیں گے لیکن اگر کوئی چیز دوسرا آپ کے پاس حفاظت کی غرض سے رکھ جاتا تو اس کو ودیعت بھی کہہ سکتے ہیں اور امانت بھی، غرض یہ کہ ہر ودیعت کو امانت کہہ سکتے ہیں مگر ہر امانت کو ودیعت نہیں کہہ سکتے، امانت کے مفہوم میں چونکہ ودیعت کا مفہوم بھی شامل ہے، اس لئے قرآن میں امانت و ودیعت دونوں کے لئے امانت ہی کا جامع لفظ استعمال ہوا ہے، مگر حدیث میں دونوں لفظوں کا استعمال ایک دوسرے کے مفہوم میں ہوا ہے کہیں امانت کو ودیعت کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور کہیں الگ الگ مفہوم میں اسی بنا پر فقہاء نے دونوں لفظوں کو عام طور پر علیحدہ علیحدہ مفہوم میں استعمال کیا ہے اور ایک مفہوم میں بھی۔

امانت کا مفہوم قرآن و حدیث میں

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ کسی دوسرے کی کوئی چیز اگر بغیر قصد و ارادہ بھی ہاتھ لگ جائے تو وہ امانت ہوگی، اگر آپ نے کوئی چیز یا رقم پڑی پائی یا بطور رہن رکھی یا مانگ کر لائے یا آپ نے

کوئی چیز کرایہ کی، یا اس نے خود آپ کی نگرانی و حفاظت میں دی۔ یا آپ کو کسی چیز کا ذمہ دار یا ولی یا وکیل بنادیا، غرض ان تمام صورتوں میں آپ اس چیز یا رقم کے امین ہی کہے جائیں گے، یعنی آپ کو اس کی اسی طرح حفاظت کرنی چاہیئے، جس طرح اپنی ذاتی چیز کی کرتے ہیں، یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ اپنی چیز کی حفاظت تو آپ بکس میں یا الماری یا کمرہ میں بند کرکے کریں، اور دوسرے کی چیز کو کھلی جگہ رکھ دیں۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو یہ امانت میں خیانت ہوگی، امانت کے معنی ہیں ماموں و محفوظ ہونا یعنی وہ چیز امین کے ہاتھ میں پہنچ کر محفوظ و ماموں ہو جاتی ہے، اگر وہ محفوظ نہ ہوئی تو خیانت ہوگی شلاً ایک یتیم کی جائداد یا ایک لاوارث کے مال کا آپ کو ذمہ دار بنایا گیا تو آپ کی ذمہ داری کا تقاضہ ہے کہ آپ ٹھیک ٹھیک اس کی دیکھبال کریں جس کا جو حق ہو اس تک پہنچا دیں، اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ خائن کہے جائیں گے، قرآن مجید میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا	اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ امانتوں
الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (نساء)	اور حقوق کو ان کے مالکوں تک پہنچادو۔

مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، کہ

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ	جو لوگ اپنے ذمہ لی ہوئی امانتوں
رٰعُوْنَ (مومنون)	اور اپنے عہد کا پاس و خیال رکھتے ہیں۔

اس کے برخلاف خیانت کرنے والوں کی بڑی مذمت کی گئی، فرمایا گیا کہ:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ	خدا تعالیٰ خیانت کرنے والے
كَفُوْرٍ۔	ناشکرے کو پسند نہیں کرتا۔

یہودیوں کے بارے میں فرمایا کہ ان میں بعض تو ایسے ہیں کہ اگر ایک خزانہ ان کے پاس امانت رکھ دیا جائے تو وہ واپس کر دیں گے، اور بعض ایسے ہیں، کہ ایک دینار بھی ان کے پاس رکھ دو تو جب تک سر پر سوار نہ ہو واپس نہ کریں گے۔ بلکہ خیانت کر بیٹھیں گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس میں امانت داری نہیں ہے اس کا دل ایمان سے خالی ہے، لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهُ قرآن نے امانت داری مومن کی خصوصیت بتائی ہے، اسی کی تفسیر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خیانت کو منافق کی نشانی بتائی ہے۔ فرمایا کہ منافق کی پہچان

تین باتوں سے ہوتی ہے ان میں ایک بات یہ ہے کہ:

وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ اِدِّ الْاَمَانَةَ اِلٰی مَنِ ائْتَمَنَكَ وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ۔	جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے (آپ نے فرمایا کہ جو تمہارے پاس امانت رکھتے ہیں اس کی امانت ادا کردو اور اگر تمہاری خیانت کوئی کر بھی لے تو تم اس کی خیانت نہ کرنا۔

آخری جملہ خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اگر خائن آدمی بھی تمہارے پاس کوئی امانت رکھے تو تم اس کے ساتھ بھی خیانت نہ کرو کیونکہ اس نے اپنی ذمہ داری ادا نہیں کی تو یہ چیز خیانت جیسی غیر ذمہ دارانہ حرکت کے لیے دلیل نہیں بن سکتی۔

امانت کا حکم ۱۔ امانت ایک اخلاقی فریضہ اور حسن سلوک کا نام ہے، اسی لیے قانوناً کسی کو امانت رکھنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور اگر کسی اتفاقی حادثہ کی وجہ سے وہ امانت ضائع ہو جائے تو امین پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی، البتہ اگر اس نے قصداً اس کو ضائع کرنے کی کوشش کی ہے یا اس نے اس کی حفاظت میں غفلت برتی ہے تو اس صورت میں اس کو تاوان دینا پڑے گا، مثلاً کسی نے راستہ میں کوئی پڑی چیز پائی تو اگر وہ جانتا تھا کہ فلاں کی ہے اور اس نے اس کو واپس کرنے کے خیال سے اٹھا لیا تو یہ چیز اس کے ہاتھ میں امانت ہوگی، اب اگر وہ اتفاقی طور پر ضائع ہوگئی تو اس پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے لیکن اگر وہ اس چیز کے مالک سے واقف نہیں ہے تو وہ اس کا حکم لقطہ، یعنی پڑی ہوئی چیز کا ہے۔

لقطہ کا حکم ۲۔ لقطہ یعنی اگر کسی نے کوئی پڑی ہوئی چیز پائی تو اس کا حکم یہ ہے کہ وہ اس چیز کو امانتہ اپنے پاس رکھے، اور برابر ایک سال تک یہ اعلان کرتا رہے کہ فلاں چیز میں نے فلاں جگہ پائی ہے جس کی ہو وہ لے جائے، جب اس کا مالک مل جائے تو فوراً اس کے حوالے کر دے، اگر اس نے اس کو ضائع کر دیا تو اس کو اس کا تاوان دینا پڑے گا۔ اگر وہ کہتا ہے کہ میں نے قصداً ضائع نہیں کیا تو اس سے قسم لی جائے گی۔ اگر وہ قسم کھالے تو پھر اس پر تاوان نہیں ہے۔

اگر ایک سال تک کوئی مالک نہ ملے تو بیت المال میں جمع کر دے اگر اسلامی بیت المال نہ ہو تو پھر اس کو صدقہ کر دے اپنے استعمال میں نہ لائے۔ البتہ اگر وہ خود مفلس ہے تو استعمال کر سکتا ہے۔

امانت کا وسیع مفہوم

امانت کا مفہوم صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ کسی نے چند روپے یا کوئی سامان ہماری حفاظت میں دے دیا اور ہم نے اسے واپس کر دیا بلکہ اس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ قرآن کی آیت ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا اور قرآن پاک کی دوسری آیت انا عرضنا الامانۃ علی السموات والارض اور اسوہ نبوی کی روشنی میں مفسرین نے امانت کو بہت وسیع معنی میں لیا ہے۔

فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن طلحہ سے جو کعبہ کے کلید بردار تھے کعبہ کی کنجی منگائی اور پھر اس کے اندر تشریف لے گئے پھر جب باہر تشریف لائے تو وہ کنجی عثمان بن طلحہ کو حوالہ کرتے ہوئے آیت ان تؤدوا الامانات الی اھلھا تلاوت فرمائی۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے امانت کو اس ذمہ داری کے مفہوم میں استعمال فرمایا جو عثمان بن طلحہ کی سپرد تھی جس کو کچھ دیر کے لیے آپ نے لیا تھا۔

بعض حضرات نے اس اسوہ نبوی کو اس آیت کا سبب نزول قرار دیا ہے گو یہ آیت اس واقعہ کا سبب نزول نہیں ہے لیکن آپ نے اس موقع پر اس آیت کی تلاوت فرمائی اس سے امانت کی وسعت کا پتہ چلتا ہے چنانچہ امام طبری لکھتے ہیں۔

واما الذی قال ابن جریج من ان	اور ابن جریج کی یہ بات کہ یہ آیت عثمان
ھذہ الایۃ نزلت فی عثمان بن طلحۃ	بن طلحہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی تو یہ ممکن ہے کہ
فانہ جائز ان تکون نزلت فیہ واریدبہ	ان کے بارے میں نازل ہوئی ہو اور ابن جریج
کل مؤتمن علی امانۃ فدخل فیہ ولاۃ	کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر امانت جس کی ذمہ
امور المسلمین وکل مؤتمن علی امانۃ	داری لی جائے وہ اس میں داخل ہے تو اس
فی دین اودنیا ولذلک قال من قال	میں حکومت کے ذمہ دار بھی داخل ہیں اور
عنی بہ قضاء الدین ورد حقوق الناس	دین دنیا کی ہر امانت اس کے تحت (ذمہ
(تفسیر الطبری ج ۵ ص ۱۴۶)	داری اور حق) آتی ہے۔ اسی لئے بعض لوگوں
	نے کہا ہے کہ اس میں دین (قرض اور دوسرے لوگوں کا)
	کی ادائیگی اور لوگوں کے حقوق کی ادائیگی دونوں شامل ہے

بعض صحابہ اور تابعین نے اس آیت کے مخاطب حکومت کے ذمہ داروں کو قرار دیا ہے۔ اور اس

کا تعلق اگلی آیت سے جوڑ دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اپنا حق ادا کریں تو اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے تحت ان کی اطاعت کرو ورنہ ان کی اطاعت ضروری نہیں۔

امام طبری نے اسی قول کو ترجیح دیا ہے وہ اس کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

فتأويل الآية اذن اذ كان الأمر على
ما وصفنا ان الله يأمركم يا معشر ولاة
أمور المسلمين ان تؤدوا ما ائتمنتكم
رعيتكم من فيئهم وحقوقهم واموالهم
وصدقاتهم اليهم على ما امركم الله
بأداء كل شئ من ذلك الى من هو له
بعد أن تصير في ايديكم لا تظلموها
اهلها ولا تستأثروا بشئ منها
ولا تضعوا شيئا منها في غير موضعه
ولا تأخذوها الا ممن أذن الله لكم
بأخذها منه قبل ان تصير ايديكم
ويأمركم اذا حكمتم بين رعيتكم أن
تحكموا بينهم بالعدل والانصاف وذلك
حكم الله الذي انزله في كتابه وبينه
على لسان رسوله لا تعدوا ذلك
فتجوروا عليهم۔

اگر اس کو ولاۃ امر یعنی حکومت کے ذمہ داروں سے متعلق مانا جائے تو
آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ حکومت کے ذمہ داروں
سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ تم
جو کام تمہارے سپرد ہیں اور حکومت
کی جو آمدنی، اور عوام کے جو حقوق تمہارے
ہاتھ میں ہیں تم ٹھیک ٹھیک ان تک پہنچا دو، نہ
کوئی ظلم کرو اور نہ ان کے مقابلہ میں اپنے کو ترجیح
دو اور نہ ان کو غیر محل اور بے موقع خرچ کرو۔
اور تم عوام سے اتنا ہی مطالبہ کرو جتنا کہ اللہ تعالیٰ
نے حکم دیا ہے قبل اس کے کہ تم اس پر قابض ہو جاؤ، اور
اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ جب ان کے
درمیان فیصلہ کرو تو عدل و انصاف کا دامن نہ چھوٹنے
پائے جیسا کہ اگلے ٹکڑے میں ذکر ہے واذا حکمتم بین
الناس ان تحکموا بالعدل یہ اللہ اور اس کے
رسول کا حکم ہے اگر اس میں کسی طرح کی کمی یا زیادتی کروگے
تو پھر عوام پر ظلم ہوگا۔

(تفسیر الطبری ج ۵ ص ۱۴۶)

ان تفصیلات کی روشنی میں غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ مسلمان کی حیثیت سے امانت داری کا تقاضہ ہے کہ زندگی کی ہر چیز کو اور اس کی ہر ذمہ داری کو وہ امانت سمجھے اور اگر اس نے اس میں کوئی کوتاہی کی تو یہ خیانت ہے مثلاً اگر کوئی کسی ادارے میں یا کسی دفتر میں یا کسی کام پر مقرر ہے تو جتنی چیزیں یا اس

کے چارج اور قبضہ میں ہیں مثلاً فرنیچر، کاغذ، قلم، دوات یا چپراسی وغیرہ وہ سب چیزیں اس کے ہاتھ میں امانت ہیں ان کو اپنے ذاتی استعمال میں نہ لانا چاہیئے یا جس وقت کی وہ تنخواہ پاتا ہے اس وقت میں اپنا ذاتی کام نہ کرنا چاہیئے اگر کرے گا تو خائن قرار پائے گا اور اس سے تاوان بھی لیا جا سکتا ہے، اسی طرح جو وقت کام کے لئے مقرر ہے وہ بھی ایک امانت ہے اس میں عوضانہ کام کرنے کے بجائے گپ لڑانا، تفریح کرنا یا وقت گذاری کرنا یہ سب وقت کی امانت میں خیانت ہے۔ اگر امانت کی اس ذمہ داری کو حکومت کے تمام ذمہ دار اس کے کارکن، کارخانے کے اور دوسرے اداروں کے ملازمین محسوس کرلیں تو پھر کم وقت میں کام بھی زیادہ ہونے لگے، اور ہر حکومت، ہر کارخانے اور ادارے کے ہزاروں لاکھوں روپے بچ بھی جایا کریں مگر افسوس ہے کہ موجودہ مادی نظاموں نے ان اخلاقی تصورات سے پیچھا چھڑا لیا ہے، جو ان کے لئے مادی حیثیت سے بھی مفید ہے۔

ودیعت کی تعریف

اوپر ذکر آچکا ہے کہ امانت اور ودیعت دونوں لفظاً ہم معنی بھی ہیں اور دونوں الگ مفہوم و حکم بھی رکھتے ہیں، ودیعت کی تعریف شریعت میں یہ کی گئی ہے۔

اِحَالَۃُ الْمَالِكِ مُحَافَظَۃَ مَالِہٖ لِآخَرَ — اپنی کسی چیز یا مال کو حفاظت کی غرض سے دوسرے کے حوالے کرنا۔

مقصد یہ ہے کہ جو چیز ودیعت رکھی جائے، وہ ودیعت رکھنے والے کی ملک بھی ہو اور اپنے قصد و ارادہ سے وہ کسی کے سپرد کردے تب ودیعت کا انعقاد صحیح ہوگا۔

ودیعت کا حکم

جس کے پاس امانت و ودیعت رکھی جا رہی ہے اگر وہ اس کو منظور کرلے تو اب دونوں میں گویا ایک معاہدہ ہوگیا، اب امین جب تک اس کو اپنی امانت میں رکھے گا، اس کی حفاظت اس کے اوپر اپنے مال کی طرح واجب ہوگی اگر اس نے اس کی حفاظت میں کوتاہی کی تو اس کا تاوان دینا پڑے گا۔

معاہدۂ ودیعت کے ختم ہونے کی مدت

دو صورتوں میں معاہدہ ودیعت ختم ہو جاتا ہے (۱) ایک یہ کہ جتنے دن کے لئے اس نے امانت رکھی تھی وہ ختم ہوگئی (۲) دوسرے امین یا مُودِع یعنی امانت رکھنے والے میں سے کوئی معاہدہ فسخ کردے کیونکہ ان دونوں کو ہر وقت اختیار ہے کہ وہ اس کو جب چاہیں ختم کردیں۔

چند اصطلاحیں

ودیعت اور امانت رکھنے کو شریعت میں ایداع اور ودیعت رکھنے والے کو مودِع یا مستودِع (دال کو زیر کے ساتھ) اور جو امانت رکھ لے اس کو امین یا مستودَع (دال کو زبر کے ساتھ) کہتے ہیں ۔

ودیعت دو طرح سے ہوتی ہے

ودیعت دو طرح سے رکھی جاتی ہے ایک تو صراحتہً مودع کسی سے یہ کہے کہ میرا یہ مال امانت رکھ لیجئے اور امین نے ہاں کر لیا تو اب وہ امین بن گیا دوسرے یہ کہ ایک آدمی نے کسی دوکان پر اپنی کوئی چیز رکھ دی اور دوکاندار نے رکھتے ہوئے دیکھا، مگر کچھ بولا نہیں یا ایک شخص پلیٹ فارم پر یا ریل و موٹر میں یہ کہہ کر کسی ضرورت سے چلا گیا کہ ذرا میرا سامان دیکھتے رہئے گا اور دوسرا آدمی کچھ بولا نہیں تو وہ چیز اس کی امانت میں آگئی اب اس کی نگرانی اس پر لازم ہوگی ، اگر اس نے چھوڑ دیا اور وہ چیز چوری ہوگئی تو مودع (سپرد کرنے والا) میں اس سے تاوان لینے کا حق رکھتا ہے ۔

ودیعت کے شرائط

(۱) اسی چیز کا بطور امانت رکھنا صحیح ہوگا جس پر امین کا قبضہ ہو سکے اگر کسی نے ہوا کے پرندے ، تالاب کی مچھلیاں ، یا دوسرے کے قبضہ میں جو چیز ہو اس کی حفاظت کے لئے کہا تو یہ صحیح نہیں ہے خواہ امین قبول کرے یا خاموش ہو جائے ۔

(۲) مودِع اور امین دونوں عاقل یعنی لین دین کے معاملات کی سمجھ رکھتے ہوں بالغ ہونا شرط نہیں ہے ، ناسمجھ بچے اور پاگل نہ تو کوئی چیز امانت رکھ سکتے ہیں نہ رکھوا سکتے ہیں ، یعنی نہ تو وہ امین ہو سکتے ہیں اور نہ مودع ۔

(۳) ودیعت کی مدت میں اس سے جو کچھ فائدہ حاصل ہوگا وہ مودِع کا ہوگا مثلاً کسی نے ایک جانور امانت رکھا ، اگر وہ بچہ دے یا اس کا اون کاٹا جائے یا دودھ ہو وہ سب مودِع کا ہوگا ۔ امین اگر بغیر اجازت ان میں سے کوئی چیز استعمال کرے گا تو اس کو خیانت کرنے کا گناہ بھی ہوگا اور اس کو تاوان بھی دینا پڑے گا ۔

امین کی قانونی ذمہ داریاں

(۱) امین کو امانت کی اسی طرح حفاظت کرنی چاہئے ، جس طرح وہ اپنی چیز کی کرتا ہے ۔

(۲) امین چاہے خود اس کی حفاظت کرے چاہے گھر کے ان افراد سے کرائے جن سے خونی یا دائمی رشتہ

ہے مثلاً ماں باپ بیٹے، بیٹی، بیوی، بہن یا گھر میں ہر وقت آنے والے نوکر چاکر سے اس کی دیکھ بھال کرائے اس کو دونوں باتوں کا اختیار ہے لیکن اس کے ساتھ یہ شرط ہے کہ ان میں سے کوئی خائن نہ ہو، اگر ان میں سے کوئی غیر ذمہ دار یا خائن ہے تو اس کی نگرانی میں اس کو نہ دینا چاہیئے، اگر وہ دے گا اور وہ امانت ضائع ہو جائے گی تو اس کو تاوان دینا پڑے گا

۳۔ امین اگر امانت کو کسی غیر آدمی کے پاس حفاظت کے لئے رکھ دے یعنی وہ دوسرے آدمی کو اس امانت کا امین بنا دے تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ امین نے مُودِع سے دوسرے کے پاس رکھنے کی اجازت لے لی ہے، دوسری یہ کہ وہ ایسا آدمی ہے، جس کے یہاں وہ خود اپنی چیزیں رکھ دیا کرتا ہے تو ان دونوں، صورتوں میں کسی غیر آدمی کو امین بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اگر ان دو صورتوں کے علاوہ اگر وہ امانت کسی دوسرے کے پاس حفاظت کے لئے رکھے گا تو پھر اس کی ذمہ داری امین پر ہوگی یعنی اگر امانت ضائع ہو جائے گی یا اس میں خرابی آ جائے گی تو اس کا تاوان امین اوّل کو دینا پڑے گا، برخلاف دونوں صورتوں کے ان میں اس کو تاوان نہ دینا پڑے گا۔

۴۔ امانت کی چیز کو امین نہ تو استعمال کر سکتا ہے، اور نہ اس کو اپنی چیز کے ساتھ ملا سکتا ہے، البتہ اگر مودِع اس کی اجازت دیدے تو پھر جائز ہے، مثلاً کسی نے سو روپے امانت کے رکھے، تو بعینہ وہی روپیہ اس کو واپس کرنا چاہیئے، اگر امین نے اس خیال سے خرچ کر ڈالا، یا اس کو کسی تجارت میں لگا دیا، کہ جب اس کو ضرورت ہوگی اپنے روپے سے دے دیں گے تو یہ امانت میں خیانت ہوگی اور امین گنہگار ہوگا، اسی طرح کسی نے کپڑا، زیور یا جوتا امانت رکھا تو اس کا پہننا گناہ ہے اسی طرح کسی نے کرسی، میز یا پلنگ یا برتن امانت رکھ دیا تو ان میں سے کسی چیز کے استعمال کا حق نہیں ہے۔ اگر مودِع اجازت دیدے تو اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۵۔ جہاں امین نے امانت لی ہے اس کو وہیں ادا کرنا ضروری ہے، مودِع اس کو دوسری جگہ وصول کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا، کسی نے لکھنؤ میں امانت رکھنے کے لئے دی ہے تو ان کو یہ حق نہیں کہ وہ دلی میں اس سے مانگے البتہ امین نے یہ کہہ دیا ہو میں اس کو دلی میں رکھوں گا تو پھر مودِع کو لکھنؤ میں مانگنے کا حق نہیں ہے۔

۶۔ اگر کئی آدمیوں کو ایک چیز کا امین بنا دیا جائے تو یہ بھی صحیح ہے، اگر سب نے اقرار کر لیا ہے تو اب سب اس کے ذمہ دار ہوں گے، ان کو باری باری یا جس طرح ہو امانت کی حفاظت کرنی چاہیئے۔

امین اجرت بھی لے سکتا ہے | امین کو اگر امانت کی دیکھ بھال کے لئے کچھ وقت یا محنت صرف کرنی

کرنی پڑتی ہے تو وہ اجرت بھی لے سکتا ہے، یا نہیں؟ اس بارے میں ائمہ فقہ میں تھوڑا سا اختلاف ہے، بعض ائمہ اس کی اجازت نہیں دیتے اور بعض دیتے ہیں، مگر کچھ شرائط کے ساتھ، حنفی فقہ کی متداول کتابوں میں صراحۃً تو اس بارے میں کوئی جزیہ راقم کو نہیں ملا، مگر مجلۃ الاحکام میں یہ دفعہ ملی، جس سے پتہ چلتا ہے کہ ودیعت پر اجرت لی جا سکتی ہے اس میں ہے کہ:۔

اذا اودع رجل مالہ عند آخر واعطاہ اجرۃ علی حفظہ فضاع المال بسبب یمکن التحرز منہ کالسرقۃ یلزم المستودع الضمان[1]

اگر کسی نے اپنا مال کسی کے پاس امانۃً رکھا، اور اس امانت کی دیکھ بھال کی اجرت بھی اس کو دیتا ہے، ایسی حالت میں اگر وہ ضائع ہو جائے تو اگر ایسی حالت میں ضائع ہو جائے کہ اس کا بچاؤ ممکن تھا، مثلاً چوری ہو گیا تو اس کو تاوان دینا پڑے گا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بھی اس شرط کے ساتھ اجرت لینے کی اجازت دیتے ہیں کہ جب امین کو اس کے لئے کوئی جگہ دینی پڑتی ہو یا اس میں کچھ خرچ کرنا پڑتا ہو۔

موجودہ زمانہ میں اس کی ضرورت اتنی عام ہو گئی ہے کہ اس کے بغیر چارہ کار نہیں ہے، مثال کے طور پر آلو کے بیج کو لیجئے کہ آلو کے تاجر، اگر آلو کے بیج بڑے گوداموں اور کولڈ اسٹوریج کے حوالہ کر کے ان کی حفاظت نہ کرائیں، تو اس کی کاشت کے وقت اس کے بیج کا ملنا دشوار ہو جائے اسی طرح بے شمار چیزیں بچائی جاتی ہیں، غرض یہ کہ ایسا کرنا اسلامی شریعت کے اعتبار سے صحیح ہے۔

بینک و ڈاک خانہ میں اجرت دیکر امانت رکھی جا سکتی ہے

موجودہ بینک اور ڈاک خانے میں بھی اجرت دے کر روپے پیسے زیور اور دوسری قیمتی چیزیں امانۃً رکھی جا سکتی ہیں، مگر خود اس سے سود لے کر روپے یا کوئی چیز جمع کرنا حرام ہے، اوپر تصریح آ چکی ہے۔

---

[1] بعد میں صاحب ہدایہ کی اس ضمنی تشریح پر بھی نظر پڑی فیضمنہ کالودیعۃ اذا کانت باجر یعنی مشترک کے پاس جو چیزیں ہوتی ہیں وہ ان کا اسی طرح ضامن ہوتا ہے، جس طرح امانت کی ضمانت دینی پڑتی ہے جس کی اجرت امین لیتا ہو۔

امانت میں تجارت

امانت کے روپے میں تجارت کی جا سکتی ہے یا نہیں، اس بارے میں فقہائے احناف کی تصریحات تو نہیں مل سکیں، البتہ صحابہؓ کے دور میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ امانت کے روپے سے تجارت کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ وہ یتیموں کے والیوں کو، ان کے مال سے تجارت کرنے کی ترغیب اس لئے دیا کرتے تھے کہ زکوٰۃ دیتے دیتے ان کا مال ختم نہ ہو جائے[1]

خود صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ یُقْرِضُ الْقَاضِیْ اَمْوَالَ الْیَتَامٰی۔ قاضی کو چاہیئے کہ وہ یتیموں کے مال کو قرض میں لگا دیا کرے تاکہ وہ ضائع ہونے سے بچ جائے مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم نے بدلائل لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ امانت کے روپے سے تجارت کیا کرتے تھے۔

(امام صاحب کی سیاسی زندگی)

اس بنا پر راقم کا خیال ہے کہ امانت کے روپیہ سے باجازت تجارت کی جا سکتی ہے۔

اجازت ہونی چاہیے

لیکن اس سلسلہ میں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ مودع کی اجازت کے بغیر امانت کا روپیہ تجارت میں لگانا صحیح نہیں ہے، اجازت سے لگایا جا سکتا ہے، اس صورت میں یہ روپیہ امین کے ہاتھ تو ہوگا مگر اس کی حیثیت امین ہونے کے ساتھ ساتھ مضارب کی بھی ہو جائے گی۔ یعنی اگر وہ اس روپے سے تجارت کرتا ہے تو نفع میں بھی مُودِع کو شریک کرنا چاہیئے اگر کوئی آدمی کسی یتیم کا ولی ہے تو اس کو بھی چاہیئے کہ وہ سارا نفع خود نہ سمیٹ لے بلکہ اس میں یتیم کا بھی حصہ لگائے

تاوان کے واجب ہونے یا نہ ہونے کی صورتیں

امانت اگر امین کی غفلت یا تساہلی کے بغیر ضائع ہوگئی تو امین کے اوپر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے لیکن اگر اس نے تفریط یا تعدی کی یعنی اس کی حفاظت میں تساہلی کی یا مُودِع کی ہدایت کے خلاف اس نے کوئی قدم اٹھایا یا مودع کی اجازت کے بغیر استعمال کر لیا تو ان تمام صورتوں میں اس کو اس کا تاوان دینا پڑے گا، اسی طرح جب اس نے امانت رکھنے کی اجرت لے لی، تو اب اس پر تاوان بھی واجب ہو گیا مثال کے لئے چند صورتیں تاوان کے واجب ہونے اور نہ ہونے کی لکھی جاتی ہیں۔

---

[1] امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ یتیم کے مال میں زکوٰۃ کے قائل ہیں اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یتیم کے مال پر زکوٰۃ واجب ہی نہیں ہے۔ [2] یہ صورتیں [illegible] ہیں۔

(۱) اگر کسی نے امانت کا روپیہ یا چیز استعمال کر لی اور اس کے بعد وہ چیز خراب ہو گئی، یا ٹوٹ گئی یا روپیہ چوری ہو گیا تو اس کو تاوان دینا پڑے گا مثلاً کپڑے یا زیور کو پہن لیا، گھڑی تھی اس کو کلائی پر لگا لیا، یا وقت دیکھنے کے لیے جیب میں رکھ لیا یا دیوار پر لٹکا دیا، یا سائیکل یا موٹر تھی اس پر سواری کر لی، فرنیچر تھا اس کو استعمال کر لیا۔ تو اب استعمال کے بعد اس میں جو نقص آئے اس کا تاوان اسی کو دینا پڑے گا، البتہ اتفاق سے اس نے استعمال کر لیا پھر ندامت ہوئی اور حفاظت سے اس کو رکھ دیا اور اس کے بعد وہ چیز نقصان ہو گئی یا ٹوٹ گئی یا چوری ہو گئی۔ تو پھر اس پر تاوان نہیں ہو گا۔

(۲) جو چیز بکس، تجوری یا کمرے کے اندر رکھنے کی ہے، اس کو بے احتیاطی سے باہر رکھ دیا یا باہر چھوڑ دیا اور وہ ضائع ہو گئی یا خراب ہو گئی تو تاوان دینا پڑے گا، مثلاً روپیہ پیسہ کو بکس یا تجوری میں رکھا اور ضائع ہو گیا، تو تاوان نہیں، لیکن اگر اس کو بکس یا تجوری کے باہر چھوڑ دیا، یا رکھ دیا تو اس پر تاوان ہو گا، البتہ اگر وہ اپنے روپے زیور وغیرہ بکس کے بجائے طاق وغیرہ پر رکھتا ہے، یا اس کے گھر میں کوئی محفوظ جگہ نہیں ہے تو پھر اس پر نقصان کی ذمہ داری نہیں ہو گی۔

(۳) غلطی سے بکس کا قفل کھلا رہ گیا، اور اس کی وجہ سے امانت کا مال چوری ہو گیا، یا اس کو چوہے نے کاٹ دیا یا اور کوئی نقصان پہنچ گیا، تو اسے تاوان دینا پڑے گا۔

(۴) خریدار دوکاندار کی اجازت سے شیشے کا گلاس اٹھا کر دیکھنے بھالنے لگا، اگر وہ ٹوٹ گیا تو اس کو تاوان نہیں دینا پڑے گا، لیکن اگر بغیر اجازت کوئی چیز اٹھا کر دیکھے گا اور ٹوٹ جائے گی یا خراب ہو جائے گی تو تاوان دینا پڑے گا۔

(۵) اگر مُودِع نے کوئی ایسی شرط لگائی جس کا پورا کرنا ممکن ہو اور اس کے خلاف امین نے کیا تو اس کو تاوان دینا پڑے گا، لیکن اگر اس کا پورا کرنا اس کے لیے ممکن نہ ہو تو پھر تاوان نہیں دینا پڑے گا۔ مثلاً اس نے کہا کہ تمہارے علاوہ گھر کا دوسرا آدمی امانت کی حفاظت نہ کرے، تو یہ شرط لغو ہے، کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک آدمی ہر وقت اس کی نگرانی کرتا رہے۔

(۶) ناگہانی حادثہ کی وجہ سے اگر امانت کا مال یا چیز ضائع ہو جائے تو امین پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، مثلاً گھر میں آگ لگ گئی، سیلاب میں مکان گر گیا، یا ڈاکہ پڑ گیا۔

لہ اگر حفاظت کے خیال سے جیب میں رکھے یا دیوار پر لٹکا دے تو پھر یہ تعدی و تفریط نہیں ہو گی۔

۷۔ اگر مُودع یہ شرط لگادے کہ میری امانت گھر والوں کے علاوہ کسی دوسرے کے پاس نہ رکھی جائے، تو اس کو اس شرط کے لگانے کا حق ہے، اگر امین اس کی خلاف ورزی کرے گا، تو نقصان کی ذمہ داری اس پر ہوگی لیکن اگر کسی ناگہانی صورت میں اس نے دوسری جگہ امانت رکھ دی اور ضائع ہوگئی، تو پھر اس پر تاوان نہیں ہے۔ مثلاً گھر میں آگ لگ گئی یا سیلاب آگیا تو امین صورت میں قصداً دوسری جگہ منتقل نہ کرے اور نقصان ہوجائے تو اس کو تاوان دینا پڑے گا۔

ودیعت کی واپسی کا اختیار اوپر ذکر آچکا ہے کہ (۱) امین اور مودِع دونوں میں سے ہر ایک کو یہ اختیار ہے کہ وہ امانت کا معاہدہ جب چاہیں فسخ کر دیں (۲) اسی طرح جب امانت کی مدت ختم ہوگئی تو خود بخود معاہدہ فسخ ہوگیا، ان دونوں صورتوں میں امین کو فوراً امانت مُودِع کے حوالہ کر دینی چاہیئے۔

(۳) ان میں سے کسی کا انتقال ہو جائے تو اس صورت میں بھی یہ معاہدہ فسخ ہوجائے گا اب مُودِع کے ورثہ کو اپنی امانت واپس لے لینی چاہیئے اور امین کے ورثہ کو واپس کر دینی چاہیئے، اگر ان کو پھر امانت رکھنی ہے تو دوسرا معاہدہ کرنا چاہیئے۔

ودیعت کی واپسی سے انکار (۱) اگر مُودِع نے کسی وقت اپنی امانت واپس مانگی، یا مدت ختم ہوگئی، اور اس نے کہا میری امانت واپس کر دو، تو اس کو فوراً واپس کر دینا چاہیئے، اگر اس نے کہا اچھا کل لے جانا اور کل تک وہ چیز ضائع ہوگئی تو اس کی دو صورتیں ہیں، اگر یہ کہ مُودِع خوشی سے واپس چلا گیا اور کل تک وہ چیز ضائع ہوگئی تو اس پر تاوان نہیں ہے دوسری صورت یہ کہ مُودِع اسی وقت واپسی امانت چاہتا تھا مگر امین کے ٹال مٹول کی وجہ سے ناراض ہو کر واپس ہوگیا، اور اس صورت میں وہ ضائع ہوگئی، تو امین ذمہ دار ہوگا، کیونکہ پہلی صورت میں گویا مُودِع نے اپنی خوشی سے ایک دن کے لئے اس کو اور امین بنا دیا اس لئے امین ذمہ دار نہیں ہے اور دوسری صورت میں اس لئے کہ امانت کو ناخوشی سے اس کے پاس چھوڑ دیا تھا گویا اس نے اس کو امانت کی ذمہ داری سے معزول کر دیا تو اب امین کو اپنے پاس امانت کا مال یا چیز رکھنے کی اجازت نہیں تھی، مگر رکھا اس لئے تاوان دینا پڑے گا۔

۲۔ اگر مُودِع نے کسی دوسرے آدمی کو بھیجا کہ فلاں امانت فلاں آدمی کے یہاں سے لے آؤ تو امین کو اختیار ہے کہ وہ اسے دے یا نہ دے اگر دے گا اور وہ آدمی اس میں خیانت کر جائے گا تو امین ذمہ دار ہوگا۔

امانت پر گواہ (۳) امانت دیتے اور لیتے وقت بہتر ہے کہ دو آدمیوں کو گواہ بنا لیا جائے قرآن میں ان مواقع پر شاہد بنانے کی تاکید آئی ہے چنانچہ ناسمجھوں اور یتیموں کے مال کی واپسی کے وقت یہ حکم دیا گیا ہے۔

فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۔ جب ان کا مال ان کے حوالے کر دو تو
فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ (نساء) ۔ ان پر گواہ بنا لو۔

تحریر اگر کسی کی موت کے بعد اس کے بہی کھاتہ میں یہ لکھا ہوا ہے کہ فلاں کا اتنا روپیہ یا فلاں چیز میرے یہاں امانت ہے اور اس کا علم اس کے ورثہ یا منشی وغیرہ کو نہ ہو تو امین کے ورثہ کو اتنا مال یا وہ چیز تحقیق کے بعد واپس کر دینی چاہیئے۔

امانت تھی یا خود میت کا کوئی اقرار نامہ مل جائے، یا وہ کسی سے کہہ گیا ہو، اگر ورثہ کو خود علم ہو تو پھر بغیر تحقیق کے جس کی چیز یا مال ہے اس کے حوالہ کر دینا چاہیئے۔

تاوان کی مقدار جس صورت میں امین پر تاوان واجب ہوگا۔ اس میں تاوان کی ادائیگی کس طرح اور کس اندازہ سے ہوگی، اس کے بارے میں فقہا نے لکھا ہے کہ اگر امانت نقد رقم نہیں بلکہ کوئی جنس ہے، مثلاً گھڑی برتن میز کرسی وغیرہ ہے، تو اس کو اسی طرح کی چیز تاوان میں دینی چاہیئے اور اگر نقد رقم یا قیمت والی چیزیں ہوں مثلاً سونا چاندی یا ان کے بنے ہوئے زیور تو اتنی ہی نقد رقم یا اتنی ہی قیمت کا زیور یا اس کی قیمت دینی ہوگی، اسی طرح اگر جنس میں کوئی ایسی چیز ہے جس کا ملنا دشوار ہے تو پھر اس کی قیمت کا اندازہ کر کے دینا ہوگا، مثلاً ویسٹرن گھڑی امانت تھی، اور وہ ضائع ہو گئی تو ویسی ہی گھڑی منگا کر اس کو دینا چاہیئے، اگر وہ بازار میں نہ مل سکے تو پھر قیمت بھی دی جا سکتی ہے۔

(۶) تاوان میں وہی قیمت لی جائے گی جو اس چیز کی، تاوان کے دن تھی، مثلاً اگر کسی نے دسمبر کی پانچ، تاریخ کو، کوئی چیز ضائع کی، تو وہ دسمبر کو بازار میں اس کی جو قیمت تھی وہی دینی پڑے گی، خواہ دیتے وقت وہ سستی ہو یا مہنگی۔

(بقیہ شذرات) دیتی ہے۔ کاش یہ حضرات بڑے بڑے اجتماعات کا سلسلہ جس نے ایک رسم کی حیثیت اختیار کر لی ہے کم کر دیتے تو بڑی نیک فالی کی بات ہوتی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں نمود و نمائش سے بچا کر سب سے پہلے اپنے قریبی ماحول میں کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اسلام اور بین الاقوامی تصورات

(۲)

از مجیب اللہ ندوی

(سلسلہ کیلئے دیکھئے جون جولائی کا پرچہ)

مساوات انسانی وطنی یا لسانی قومیت کا موجودہ تصور جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے اور جس کے اوپر موجودہ بین الاقوامیت کی عمارت کھڑی کیگئی ہے، جس کو انسانی زندگی کا ایک جزء لاینفک سمجھ لیا گیا ہے اور جس کا شکار صرف یورپ ہی نہیں بلکہ وہ ممالک بھی ہیں جو کبھی اخلاق و روحانیت کے دعویدار رہ چکے ہیں، اسلام کا اس سے نہ تو کوئی تعلق ہے اور نہ وہ ان تقسیموں کو کبھی حقیقی اور ناگزیر تقسیم تسلیم کرتا ہے، وہ اس کے بجائے انسان کو ایک عالمگیر وحدت کے رشتہ میں پروتا اور اس کو ایک اکائی تصور کرتا ہے، وہ اتنی بات مانتا ہے کہ اجتماعی زندگی کے ارتقاء اور نشوونما کیلئے قوموں اور گروہوں کا وجود ایک معاشرتی اہمیت ضرور رکھتا ہے مگر یہ عارضی اہمیت حق و ناحق کا معیار نہیں ہے اور نہ اس کی محبت یا حمیت اور عصبیت اس درجہ ہونی چاہئے کہ دوسروں کی حق تلفی، ظلم اور جارحیت کا سبب بن جائے اور جو آیات قرآنی نقل کی گئی ہیں ان سے بھی موجودہ قومی اور وطنی عصبیت کی نفی ہوتی ہے، ان کے علاوہ بھی متعدد آیات اور بے شمار احادیث ہیں، جن سے قومی و وطنی عصبیت کی جڑ پر ضرب لگتی ہے اور مساوات عامہ کا جذبہ ابھرتا ہے۔ قرآن میں ہے کہ یہ عارضی تقسیم خدا کی ایک نشانی ہے۔

وَاخْتِلَافَ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ ۔	تمہاری زبانوں اور رنگوں کے اختلاف میں جاننے والوں کیلئے بڑی نشانی ہے۔

مختلف خطوں اور آب و ہوا کے اختلاف کی وجہ سے جو انسانوں کی بیشمار زبانیں بن گئی ہیں ۔

خالق کائنات کی قدرت علامتیں اور نشانیاں ہیں مگر یہ نشانی تعارف و ملاقات کا ذریعہ ہے انسان انسان میں تفریق و تقسیم کی بنیاد نہیں ہے۔

وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ۔
(حجرات)

ہم نے تم کو قبیلوں اور گروہوں میں اس لئے بانٹ دیا ہے کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اللہ کے نزدیک یہ چیزیں عزت کا سبب نہیں ہیں بلکہ اس کی بارگاہ عزت کی پرہیزگاری ہے۔

یعنی اس سے یہ پتہ چل سکے کہ فلاں آدمی فلاں زبان کا بولنے والا ہے یا وہ فلاں خطہ کا رہنے والا ہے۔ تاکہ ایک زبان بولنے والے یا ایک خاص خطہ کے رہنے والے اس سے اسی اعتبار سے اپنا رشتہ اخوت استوار کر سکیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بہترین مثال دی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ

اَلنَّاسُ سَوَاسِيَةٌ كَأَسْنَانِ الْمُشْطِ الْوَاحِدِ لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِأَسْوَدَ عَلٰى أَحْمَرَ وَلَا لِأَحْمَرَ عَلٰى أَسْوَدَ إِلَّا بِالتَّقْوٰى۔
(مشکوٰۃ)

تمام انسان آپس میں کنگھی کے دندانوں کیطرح برابر ہیں نہ تو کسی عربی کو عجمی پر اور نہ کسی عجمی کو عربی پر فی نفسہٖ کوئی فضیلت ہے، نہ کسی کالے کو گورے پر اور نہ گورے کو کالے پر کوئی فوقیت ہے مگر اخلاق و کردار کی پاکیزگی کی وجہ سے فضیلت ہوگی۔

آپ نے صرف مثبت طور پر مساوات اور بھائی چارہ کی تعلیم نہیں دی بلکہ منفی طور پر ہر طرح کی عصبیتوں کی جڑ بھی کاٹ دی تاکہ انسانی مساوات اور بھائی چارہ میں کوئی رخنہ نہ پڑنے پائے۔

آپ نے ایک بار بڑے سخت انداز میں فرمایا۔

مَا مِنَّا مَنْ دَعَا إِلٰى عَصَبِيَّةٍ وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ قَاتَلَ عَصَبِيَّةً وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ مَاتَ عَلٰى عَصَبِيَّةٍ۔
(مشکوٰۃ)

وہ شخص مسلمان نہیں ہے جو تعصب کی دعوت دے اور وہ شخص بھی مسلمان نہیں ہے جو کسی عصبیت کیوجہ سے جنگ کرتا ہے اور وہ بھی ہم میں سے نہیں ہے جو کسی عصبیت پر مرے۔

"لَيْسَ مِنَّا" کے جملہ پر غور فرمائیے۔ یہ جملہ آپ اس وقت فرمایا کرتے تھے جب کوئی کام کفر سے

تربیت اور ایمان کے منافی ہوتا تھا، ایکبار کسی نے قومیت و وطنیت کا نعرہ لگایا تھا، تو آپ نے فرمایا کہ

دعوھا فانھا خبیثة ۔ (بخاری) اسے چھوڑ دو یہ بڑی خبیث چیز ہے ۔

کسی نے آپؐ سے پوچھا کہ عصبیت کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ

اَنْ تُعِیْنَ قَوْمَكَ عَلَى الظُّلْمِ (ابوداؤد) ظلم میں اپنی قوم کی مدد کرنا عصبیت ہے۔

ایک بار کسی نے پوچھا کہ

اَمِنَ الْعَصَبِيَّةِ اَنْ يُحِبَّ الرجلُ قَوْمَهُ؟ کیا یہ عصبیت ہے کہ آدمی جن لوگوں کیساتھ رہتا سہتا ہے محبت کرے؟

آپؐ نے فرمایا:-

لَا وَلٰكِنَّ الْعَصَبِيَّةَ اَنْ يَنْصُرَ الرَّجُلُ قَوْمَهُ عَلَى الظُّلْمِ ۔ (احمد، ابن ماجہ) نہیں یہ عصبیت نہیں ہے، بلکہ عصبیت یہ ہے کہ آدمی ظلم میں بھی اپنی قوم کی مدد کرے ۔

آپؐ نے اس کی ایک اور تمثیل بیان فرمائی ۔ فرمایا کہ جو شخص ظلم پر اپنی قوم کی مدد کرتا ہے وہ اس اونٹ کے مانند ہے جو ایک گہرے کوئیں میں گرپڑا ہو اور پھر اس کی دم پکڑ کر اسے کھینچا جا رہا ہو ۔

ان تعلیمات پر نگاہ ڈالتے وقت چھٹی صدی عیسوی کے جذبۂ عصبیت اور قومی و نسلی تفاخر پر ایک نظر ڈال لیجئے، دنیا جس وقت خاندان، برادری اور زیادہ سے زیادہ ایک نسل اور قوم کی پگڈنڈیوں میں بھٹک رہی ہو اس وقت قرآن نے انسان کو رفاقیت کی یہ روشنی دکھائی پھر غور کیجئے اس تصور نے اس عہد، سوسائٹی میں کتنا انقلاب پیدا کیا، اسی تصور نے بلال حبشیؓ کو حضرت عمر کی زبان سے "سیدنا بلال" کہلوایا۔ اسی نے صہیب رومی کو، عمار بن یاسر اور زید بن اسامہ کو وہ رتبہ دیا جو ایک قریشی کا تھا اور اسی نے سلمان فارسی کو اہل بیت نبوی کا ایک فرد بنادیا، سَلْمَانُ مِنَّا ۔

یہ واقعہ تاریخ میں ہمیشہ یاد کیا جائے گا کہ آستانۂ فاروقی پر حضرت بلالؓ اور قریش کے سردار حضرت ابوسفیان دونوں حاضر ہیں اور اندر آنے کی اجازت طلب کر رہے ہیں۔ اجازت لینے والے نے پہلے حضرت سفیان، پھر حضرت بلال کا نام لیا۔ حضرت عمرؓ نے ڈانٹا کہ پہلے بلال کا نام لو۔ حضرت بلال کو اندر آنے کی اجازت دیدی اور حضرت ابوسفیان کو ملاقات کے بغیر واپس جانا پڑا۔

حکیم مشرق نے اسلام کی بالکل صحیح ترجمانی کی ہے۔

جوہر ما با مقامے بستہ نیست	بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
اسلامی جذبہ کسی مقام کا پابند نہیں ہے	اور اسکے شراب کی سرمستی کسی جام کی پابند نہیں ہے۔
ہندی و چینی سفال جام ماست	رومی و شامی گلِ اندام ماست
ہندی، چینی سب ایک ہی مٹی سے بنے ہیں	رومی اور شامی سب کی تخلیق ایسی ہوئی ہے
قلب ما در ہند و روم و شام نیست	مرز بوم او بجز اسلام نیست
ہمارا دل ہندوستان، یورپ اور عرب کا پابند نہیں ہے	ہمارا وطن تو سرزمین اسلام ہے
عقدۂ قومیت مسلم کشود	از وطن آقائے ما ہجرت نمود
ہماری قومیت کا عقدہ آپ نے اسطرح حل کیا کہ وہ	اپنے وطن سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے
صورت ماہی بہ بحر آزاد شو	یعنی از قید مقام آزاد شو
مچھلی کیطرح سمندر میں آزاد رہو	یعنی کسی مقام کی پابندی قبول نہ کرو

اسلام نے زندگی کے بارے میں جو ہدایتیں دی ہیں، ان سب میں مساوات عامہ اور عالمگیر بھائی چارہ کی اسپرٹ کارفرما ہے، وہ کہتا ہے کہ اگر کوئی انسان کسی کو ناحق قتل کر دیتا ہے تو اس نے ایک انسان کی گردن پر چھری نہیں چلائی بلکہ پوری انسانیت کو زندگی سے محروم کیا۔

اَنَّہٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ	جس نے کسی کو قتل یا زمین میں فساد برپا کرنے
فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا	کے بغیر قتل کیا تو اس نے گویا تمام انسانوں کو
وَمَنْ اَحْیَاھَا فَکَاَنَّمَا اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا	قتل کر دیا اور اگر اس نے اس کو زندہ کرنے کی
(مائدہ)	کوشش کی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخشی۔

اسی طرح معیشت، معاشرت، سیاست، اخلاق، عقائد، عبادات میں یکساں ہدایتیں دیتا ہے ان میں سے کسی میں بھی آپ کو خاص قوم، ملک یا کسی خاص طبقہ کی عصبیت نظر نہیں آئے گی۔

اسلامی اخلاق کی ہمہ گیری | مثال کیلئے آپ اسلامی اخلاق کو لیجئے، اسلامی اخلاق کا مطلب

یہ نہیں ہے کہ وہ زندگی کے بہت سے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے، جس کا تعلق کسی خاص وقت، خاص موقع و محل یا خاص قوم سے ہو، بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہے، وہ ایک شعبہ کا نہیں، پوری زندگی کا داخلی نگران اور خارجی معیار ہے، وہ جس طرح ایک انسان کو گھر، خاندان اور کنبہ کے اندر خوش اخلاق دیکھنا چاہتا ہے، اسی طرح میدان سیاست میں بھی دیکھنا چاہتا ہے، وہ جس طرح اسے قومی و ملکی معاملات میں خوش معاملہ بنانا چاہتا ہے، اسی طرح بین الاقوامی معاملات میں بھی، غرض یہ کہ وہ نہ تو کاروباری اخلاق کی تعلیم دیتا ہے، اور نہ قومی و ملکی اخلاق کی بلکہ ایک ہمہ گیر اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اور پھر اخلاق و معاملات میں اسلام ہر انسان کو جو اس کا ماننے والا ہو یا نہ ماننے والا ہو ایک نظر سے دیکھتا ہے، آگے اس کی تفصیل آئے گی۔

اسلامی نظام اخلاق کی ہمہ گیری کا اندازہ کرنے کیلئے آپ اس کی اخلاقی ہدایات کے چند عنوانات پر ایک نظر ڈال لیں، رحم و کرم کرنا، عفو و درگذر کرنا، غریبوں اور پڑوسیوں کے ساتھ نیکی کرنا، امانت داری برتنا، وعدہ کا ایفاء کرنا، عہد کا پورا کرنا، لوگوں میں محبت پیدا کرنا، حق اور انصاف پسندی سے کام لینا، سچی گواہی دینا، نرمی سے بات کرنا، زمین پر اکڑ کر نہ چلنا، صلح پسندی، انسانی برادری کے ساتھ نیک سلوک کرنا، جانوروں کے ساتھ رحم کا برتاؤ کرنا، دشمنوں کو معاف کرنا،

پھر صرف محاسن اخلاق کی تعلیم نہیں دی ہے، بلکہ ان رذائل سے منع بھی کیا ہے جو ان انسانی تعلقات کو بگاڑنے کا سبب بنتے ہیں

جھوٹ نہ بولنا، فخر و غرور نہ کرنا، کسی کو برا نہ کہنا، ناپ تول میں بے ایمانی نہ کرنا، فساد برپا نہ کرنا، دوسروں کی حق تلفی نہ کرنا، بدگمانی نہ کرنا، ریا و نمائش نہ کرنا ظلم نہ کرنا، معاملات میں بددیانتی نہ کرنا، حرص نہ کرنا، سیکڑوں اخلاقی تعلیمات میں سے یہ چند اخلاقی محاسن و رذائل کا ذکر کر دیا گیا ہے، اس سے اندازہ کیجئے کہ اسلام اخلاق کے ذریعہ انسان میں کتنی ہمہ گیری پیدا کرنا چاہتا ہے، اور اس کے داخل و خارج کو کتنا سنوارتا ہے۔ اور دوسرے کو برداشت کرنے کی کتنی صلاحیت پیدا کرتا ہے،

سیاسی دنیا میں آئے دن ایسے واقعات سامنے آتے رہتے ہیں افراد یا ایک ملک کے ذمہ دار اپنے سیاسی مفاد کے لئے بڑے بڑے جرم کے ارتکاب سے بھی دریغ نہیں کرتے مگر آگے کے واقعات نقل کئے جائیں گے جس سے اندازہ ہوگا کہ زمانہ امن ہی میں نہیں بلکہ مسلمانوں نے حالت جنگ میں بھی اپنے دشمنوں سے غدارانہ ظلم کو پسند نہیں کیا ۔

عدل وانصاف مثال کے لئے آپ عدل واحسان کو لیجئے ، خدا عدل احسان کا حکم دیتا ہے اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ لیکن یہ عدل واحسان کسی خاص فرد یا کسی خاص قوم اور ملک کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ انسان کے ہر طبقہ اور گروہ کیلئے وسیع ہے اس کا فیضان دوست دشمن ہر ایک کے لئے یکساں ہے حتی کے جانوروں کے ساتھ بھی عدل واحسان کا حکم دیا گیا ہے ، یہ صرف اخلاقی اپیل نہیں ہے بلکہ قانون کی ایک دفعہ بھی ہے ، اگر کوئی شخص عدل وانصاف اور احسان اور بھلائی کی حد توڑتا ہے تو اسلامی قانون اس کا ہاتھ پکڑے گا ، حتی کے جو لوگ اسلام کو دنیا سے مٹا دینے کی فکر میں لگے رہتے ہیں ، ان کے بارے میں بھی مسلمانوں کو یہ ہدایت دی گئی ہے ۔

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۔	تمہیں کسی قوم کی دشمنی عدل وانصاف سے انحراف پر نہ ابھارے ہر حال میں عدل وانصاف سے کام لو یہی چیز پرہیز گاری سے زیادہ قریب ہے ،

آگے اس کی مزید تفصیل آتی ہے ۔

اسلام نے رحم وکرم کی تعلیم دی ہے ، اس کی ہمہ گیری پر غور کیجے ، آپ کو کہیں بھی یہ نظر نہیں آئے گا ، کہ اس نے یہ جذبہ کسی خاص فرد ، کسی خاص نسل کے لئے مخصوص رکھا ہو ، بلکہ اس کا فیضان نہ صرف یہ کہ انسان وحیوان بلکہ ہر ذی حیات کے لئے عام ہے ، ایک مسلمان کو دن میں نہ جانے کتنی بار بسم اللہ الرحمن الرحیم اور الحمد للہ رب العلمین ، الرحمن الرحیم کے ورد کا حکم دیا گیا ہے ، تاکہ یہ جذبہ ہر وقت تازہ رہے ، پھر بھی نہیں بلکہ یہاں تک کہدیا گیا ، کہ مخلوق کے اوپر رحم کے نتیجہ میں تم خالق کے رحم وکرم کے مستحق ٹھہرو گے ۔

اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ	جو لوگ زمین میں رہتے بستے ہیں ان پر رحم

مَنْ فِی السَّمَاءِ (مشکوٰۃ) — رحم کرو، خدا تم پر رحم کرے گا

ایک بار حضرت عمرو بن العاص کے صاحبزادے کسی قبطی غلام کو مار رہے تھے، کہ حضرت عمر کا گذر ہوا، آپ نے دیکھا تو بے چین ہو گئے، اور فرمایا

مَتٰی تَعَبَّدْتُمُ النَّاسَ قَدْ وَلَدَتْهُمْ اُمَّهَاتُهُمْ اَحْرَارًا ۔ — تم نے ان کو کب غلام بنالیا ہے حالانکہ وہ اپنی ماؤں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوتے ہیں

پھر آپ نے صرف اخلاقی ہدایت دیکر خاموشی نہیں اختیار کرلی، بلکہ بھرے مجمع میں ابن عاص کے صاحبزادے کو اسی قبطی سے پٹوایا،

غور کیجئے، معاملہ ایک فرد کے ساتھ بے رحمی اور بے انصافی کا تھا، مگر آپ نے اس موقع پر جو ہدایت دی، وہ ایک فرد اور ایک گروہ کے لئے نہیں دی، بلکہ یہ فرمایا کہ تم میں انسانوں کے خدا بننے کی خواہش کب سے پیدا ہو گئی ہے، جبکہ تم کو اس کے خلاف تعلیم دی گئی، اس سے معلوم ہوا کہ عام انسانوں کے ساتھ بے رحمی اور بے انصافی اسلام میں محض اخلاقی نہیں بلکہ قانونی جرم بھی ہے۔

ایفائے عہد پھر ایفاء عہد کو لیجئے، جس طرح وہ ایک فرد سے عہد کے پورا کرنے کا حکم دیتا ہے، اسی طرح وہ ایک قوم سے حتیٰ کہ اپنے دشمنوں سے بھی عہد کے پورا کرنے کا حکم دیتا ہے اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا وہ حکم دیتاہے کہ جس طرح تم اپنے بھائی سے سچ بولو، اسی طرح اجنبیوں سے بھی بولو جس طرح ایک ملکی تاجر سے سچائی کا معاملہ کرو، ایک غیر ملکی تاجر سے بھی سچائی اور دیانت داری برتو وہ کہتاہے قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا یعنی ہر شخص سے خواہ اپنا ہو یا غیر اچھی بات کرو۔

پھر اسلام کے اخلاق کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انسان کو حکم دیتا ہے، کہ یہ سب کچھ کسی غرض و مصلحت یا مادی منفعت اور دکھاوے کے لئے نہ کیا جائے،

---

۱ طبری ج ۲ ص ۳۲۵ بحوالہ نظام الحکم فی الشرع والتاریخ ۔

بلکہ اس میں جس قدر بے غرضی اور خدا کی خوشنودی کا جذبہ ہوگا، اسی قدر اخلاقی صفات کی قدر ہوگی اور پھر اس قدردانی کی توقع کسی انسان سے نہیں، بلکہ اپنے خالق سے کرنی چاہئے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ یہ محض ایک درخواست اور اپیل نہیں ہے، اور نہ محض کوئی نظری و فلسفیانہ بات ہے بلکہ جب بھی صحیح خطوط پر اسلامی حکومت قائم ہوگی وہ قانوناً ہی ان کا پاس کریگی اور اگر وہ پاس نہیں کرتی ہے تو وہ صحیح اسلامی حکومت نہیں ہے، آگے چل کر ہم اس کی کچھ مثالیں دیں گے اسی کے اور آپ دوسرے محاسن اخلاق اور رذائل کو قیاس کر سکتے ہیں

انسانی حقوق کی ہمہ گیری اور انسانیت کا احترام جس طرح اسلام نے ایک ہمہ گیر اخلاقی نظام دیا ہے، اسی طرح اسنے ہر ہر صنف اور ہر ہر طبقہ کے حقوق بھی مقرر کر دیئے ہیں تاکہ انسانی بھائی چارہ اور مساوات میں رخنہ نہ پڑے، اسلام نے انسان کو جو حقوق دیئے ہیں ان کی فہرست بڑی لمبی ہے۔ اس میں قریب سے قریب اور دور سے دور ہر شخص کے حقوق اور اور اس کے حدود مقرر کر دیئے گئے ہیں حتیٰ کہ جانوروں اور جانی دشمنوں کے حقوق بھی مقرر ہیں۔ اگر آپ حقوق کی فہرست پر ایک سرسری نظر بھی ڈالیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ حقوق کی ادائیگی میں اسلام نے قومی، وطنی اور طبقاتی عصبیت کا نام ونشان تک مٹا دیا ہے، اگر کہیں اس نے کسی حق میں کمی کی ہے، تو اسی اعتبار سے فرائض میں بھی کمی کر دی ہے، انسانی حقوق کی ادائیگی کے سلسلہ میں وہ مسلمانوں کیلئے جو معیار مقرر کرتاہے وہ یہ ہے کہ

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یحب للناس مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ۔ (مسند ج ۳ ص ۲۷۲)	آدمی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک انسانوں کے لئے وہی کچھ نہ پسند کرے جو اپنی ذات کیلئے پسند کرتا ہے،

اس سے معلوم ہوتاہے کہ جب تک سارے انسانوں کی بھلائی کا جذبہ انسان کے دل میں نہ ہو، وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔

فکر و خیال کی آزادی ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کو فکر و خیال کی آزادی ہو اس کو اپنے عقیدے کی قول و عمل کی آزادی ہو، اس کی جان، اس کی عزت و آبرو، اس کا مال محفوظ ہو، اس نقطۂ نظر سے آپ اسلامی نظام پر نظر ڈالیں گے، تو ان حقوق کے ادا کرنے میں اسلام کا سینہ دنیا کے

دوسرے ادیان و مذاہب کے نظاموں سے زیادہ کشادہ نظر آئے گا۔ اگر آپ ایک طرف یو۔ این۔ او۔ کے منشور انسانی حقوق (۱۰ – ۱۲ – ۴۸) کا منشور پڑھیں اور پھر حجۃ الوداع کا آپ کا وہ آخری خطبہ پڑھیں جو آپ نے جزیرۃ العرب کے سوا لاکھ سے زیادہ بڑے مجمع کے سامنے دیا تھا، اور پھر تاریخی واقعات کی روشنی میں دونوں کا جائزہ لیں تو آپ کو ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا ہم آپ کے خطبے کے چند جملے نقل کرتے ہیں حمد و ثنا کے بعد آپ نے فرمایا اے لوگوں میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں اللہ سے ڈرنے اور تقویٰ کا راستہ اختیار کرنے کی اور اس کی اطاعت کی ترغیب دیتا ہوں اے لوگوں! تمہارا خون اور تمہارا مال آپس میں اسی طرح محترم ہے جس طرح آج کا دن محترم ہے اور یہ شہر مکہ محترم ہے عنقریب اللہ کے حضور حاضر ہونگے وہ تم سے تمہارے ان اعمال کے بارے میں جس کا میں نے حکم دیا ہے پوچھے گا تو جس کے پاس کوئی امانت ہے وہ امانت کو اہل امانت تک پہنچا دے اس کے بعد آپ نے عورتوں کے ساتھ سلوک کی ہدایت کی فرمایا کہ ان کو اچھے طریقے پر کھانا کپڑا دو اور یہ تمہارے قبضہ میں دی گئی ہے وہ تمہارے ہاتھوں میں اللہ کی امانت ہیں ان کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک رکھنا اے لوگوں! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارے باپ آدم بھی ایک ہی تم سب آدم کے بیٹے ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے تم میں معزز وہ ہے جو پاکباز ہو کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ عجمی کو عربی پر مگر پاکبازی اور تقویٰ کی وجہ سے پھر آپ نے مجمع سے مخاطب ہو کر (۱) کہ کیا میں نے خدا کا پیغام تم تک نہیں پہنچا دیا؟ اے اللہ تو گواہ رہنا مجمع نے کہا کہ ہاں آپ نے پہنچا دیا (ابن ہشام طبرانی ابن اثیر حجۃ الوداع)

عقیدے کی آزادی | ہر انسان کو چونکہ خدا نے عقل و تمیز دی ہے، پھر اپنے وحی کے ذریعہ اس کو صحیح زاویہ نظر اختیار کرنے کی طرف راہنمائی بھی کر دی ہے، اس لئے ہر شخص کو اس بات کی آزادی ہے کہ وہ صراط مستقیم پر چلتا رہے یا غلط عقیدہ قائم کرکے چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں میں بھٹکتا پھرے بہرحال اس دنیا میں اسے کوئی نظریہ یا عقیدہ قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا،

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۔

دین کے بارے میں کوئی جبر نہیں ہدایت گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے،

قرآن پاک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے ہر انسان کو متنبہ کرتا ہے، کہ

لالها انهارا وجعل لها رواسی وجعل بین
البحرین حاجزا ءَاِلٰهٌ مع الله بل اکثرهم
لا یعلمون۔ امّن یجیب المضطر اذا دعاه
ویکشف السوء ویجعلکم خلفاء الارض
ءَاِلٰهٌ مع الله قلیلا ما تذکرون۔ امّن
یهدیکم فی ظلمات البر والبحر ومن
یرسل الریاح بشرا بین یدی رحمته
ءَاِلٰهٌ مع الله تعالی الله عما یشرکون۔

(المومنون)

سے خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں کیا وہ
ذات نہیں جس نے زمین کو جائے قیام بنایا اور اس
کے بیچ میں نہریں بنائیں اور اس کے لئے پہاڑ
کھڑے کئے اور بنائیں دو سمندروں کے
درمیان حد فاصل بنائی۔ کیا اس کے علاوہ بھی
اور کوئی معبود ہے۔ بلکہ اکثر ان میں سمجھتے نہیں ہیں
کون ذات ہے جو پریشان حال جب پکارتا ہے تو اس
کی دعا سنتا ہے اور اس کی تکلیف کو دور کرتا ہے
اور وہی ہے جو تم کو یکے بعد دیگرے زمین کا مالک بناتا ہے
کیا اس کے علاوہ کوئی اور مالک ہے بہت کم تم لوگ نصیحت
حاصل کرتے ہو کون ہے جو تم کو خشکی اور سمندر میں رہنمائی کرتا
ہے اور کون ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت سے بشارت بنا کر
بھیجتا ہے کیا اس کے علاوہ کوئی قدرت رکھنے والا ہے اللہ تعالیٰ

دوسری جگہ ہے۔

اِنَّ فی خلق السموات والارض واختلاف
اللیل والنهار لآیات لاولی الالباب
(آل عمران)

بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور دن رات
کے الٹ پھیر میں عقل والوں کے لئے بے شمار
نشانیاں ہیں۔

اس کے مقابلہ میں جو لوگ اپنی عقل کو محض آباؤ اجداد کی اندھی تقلید کا پابند بنا لیتے ہیں قرآن
ان کے طرز عمل کو غلط قرار دیتا ہے اور اس پر سخت تنقید کرتا ہے۔

واذا قیل اتبعوا ما انزل الله قالوا بل
نتبع ما الفینا علیه آباءنا اولو کان آباؤهم لا یعقلون

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے نازل کئے ہوئے احکام کا اتباع کرو
تو وہ کہتے ہیں ہم نے تو جس پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے اسی کے
پیچھے چلیں گے کیا یہ لوگ ایسا ہی کریں گے چاہے ان کے باپ دادا نے عقل سے کام نہ لیا ہو۔

غرض دین کے ہر حکم کے ماننے یہاں تک کہ توحید کے سلسلہ میں بھی قرآن پاک نے آزادانہ غور و فکر
کی دعوت دی ہے۔ وہ اس کے نہ ماننے والوں کو دین کے ماننے پر مجبور نہیں کر سکتا ہے چنانچہ
پوری اسلامی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ کبھی جبراً اسلام کی دعوت نہیں دی گئی اور غیر مسلموں کو ہمیشہ مذہبی
آزادی حاصل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ پہنچ کر آپ نے یہود سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں ان کو بھی

آزادی کا صاف ذکر تھا۔ اس معاہدہ کا پورا متن ہم آگے نقل کریں گے۔ اس میں یہود سے متعلق کہا گیا ہے

"یہود کو ہر طرح کی مذہبی آزادی ہوگی۔ مذہبی امور سے کوئی تعارض نہیں کیا جائے گا۔ مسلمان اپنے دین پر اور یہود اپنے دین پر رہیں گے" (دفعہ ۲۵)

قرآن و سنت کی انہی تعلیمات کے تحت فقہاء نے یہ قاعدہ بنایا ہے۔

امرنا بترکھم وما یدینون	ہم کو حکم دیا گیا ہے کہ جس کا مذہب اس سے
(العلاقات الدولیہ)	ہم کوئی تعارض نہیں کریں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب ایلیا (فلسطین) کے یہود سے معاہدۂ صلح کے لیے تشریف لے گئے تو انہوں نے ان کے ہیکل یعنی عبادت گاہ کو دیکھا کہ اس پر ہر طرف گرد اٹی ہوئی ہے۔ آپ نے اپنے رومال سے جھاڑنا شروع کیا۔ یہ دیکھ کر تمام مسلمان لگ گئے اور آن کی آن میں گرد صاف ہوگئی اور وہ بالکل ظاہر ہوگیا۔ اسی سفر میں نماز کا وقت ہوگیا آپ نے ہیکل سے باہر نکل کر نماز پڑھی۔ لوگوں نے پوچھا کہ کیا ہیکل میں نماز جائز نہیں تھی۔ انہوں نے اسلامی روح کے پیش نظر یہ حکیمانہ جواب دیا:

خشیت ان اصلی فیھا فیتخذھا المسلمون من	میں ڈرا کہ اگر میں اس میں نماز پڑھوں گا تو،
بعدی ویتخذونھا مسجدا۔	میرے بعد آئندہ مسلمان ہیکل کو گرا کر اس
(العلاقات الدولیۃ) (البدایہ والنہایہ)	کی جگہ مسجد بنا لیں۔

جس طرح ہر شخص کو عقیدے کی آزادی ہے، اسی طرح وہ اپنے تمام مراسم عبادت میں بھی آزاد ہے۔ جیسا کہ اوپر کی تفصیلات سے اندازہ ہوا ہوگا۔

فکری آزادی

اسلام نے ہر شخص کو نہ صرف فکری آزادی دی ہے۔ بلکہ اس نے اس پر ابھارا ہے، وہ انسان کا مادۂ فکر بیدار کرتا اور ہر چیز کو خود فکر کی میزان میں تولنے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ آفاق و نفس میں بار بار غور کرنے اور اس سے نتائج اخذ کرنے کی ترغیب دیتا ہے، وہ اوہام و خرافات اور بے سوچے سمجھے کسی چیز کو مان لینے پر مجبور نہیں کرتا، حتیٰ کہ اسلام کے بنیادی عقائد توحید و آخرت جن کو اصول مسلّم کی طرح مان لینا چاہیے ان کے لیے بھی دلائل فراہم کرتا ہے اور ان کی اجازت دیتا ہے [illegible] کائنات کی کسی چیز کو چاہے اپنے تحقیق و تفتیش [illegible] بنائے، [illegible] یا سیاروں پر آباد ہونے کا پروگرام طے کرے اسلام کوئی پابندی عائد نہیں کرتا۔ البتہ اس فکری آزادی کو اخلاقی ذمہ داری کا پابند کرتا ہے، اخلاقی ذمہ داری کا

مطلب یہ ہے کہ فکری آزادی سے وہ کام لیا جائے۔ جو دوسروں کے لئے مفید ہو اس میں کسی پر ظلم، کسی کی حق تلفی، اور کسی قوم کی برتری کا جذبہ کارفرما نہ ہو، چنانچہ جہاں اس نے یہ کہا ہے کہ ہم نے انسان کے لئے کائنات کی ہر چیز کو مسخر کر دیا ہے، وہاں لکم کی قید لگی ہوئی ہے، یعنی یہ تسخیر فائدہ اٹھانے اور فائدہ پہنچانے کے لئے ہو اس سے دوسروں کو نقصان مقصود نہ ہو، پھر نبی صلی اللہ علیہ کا ارشاد ہے،

خیر الناس من ینفع الناس بہترین شخص وہ ہے جو دوسروں کے لئے مفید ہو،

قول و رائے کی آزادی

آزادی رائے کے سلسلہ میں موجودہ علمائے قانون دو طرح کا خیال ظاہر کرتے ہیں ایک گروہ کہتا ہے کہ بغیر کسی قید کے حریت قول اور حریت رائے کی، اجازت ہونی چاہیئے، وہ اس وقت کچھ پابندی عائد کرنے کے حق میں ہے، جب آزادی رائے عام نظم پر اثر انداز ہوتی ہو، دوسرا گروہ آزادی رائے کو اس حد تک مقید و محدود کرتا ہے، کہ برسر اقتدار طبقہ یا اسٹیٹ کے خلاف کوئی رائے نہیں دی جاسکتی۔

پہلا گروہ چونکہ اخلاقیات کا قائل نہیں ہے، اسلئے اس کی بے اخلاق آزادی رائے بغض و حسد ظلم و ستم، بے راہ روی، سازش، پارٹی بازی جیسے جذبات کے ابھارنے کا سبب بن جاتی ہے، جو لامحالہ امن عامہ اور نظم و نظام میں خلل ڈالنے کا سبب ہوگی۔ دوسرے گروہ کی رائے کو مان لیا جائے۔ تو پھر انسان کی فطری صلاحیت ٹھٹھر کر رہ جائے گی، یا پھر اس کا نتیجہ تشدد اور بدنامی کی شکل میں ظاہر ہوگا۔

اسلام آزادی رائے کا سب سے زیادہ حامی ہے، حتیٰ کہ اگر وقت کا باقتدار فرد دار بھی کوئی غلط بات کرتا یا کہتا ہے تو ہر انسان کو یہ حق ہے کہ اس کو ٹوک دے، اور اس کو قائل و معقول کر کے اس سے باز رکھنے کی کوشش کرے، بلکہ وہ کسی ظالم کو ظلم سے روک دینے کو ایک بڑی عبادت قرار دیتا ہے، وہ ہر شخص کو اپنے، عقیدے کے مطابق تبلیغ، اشاعت اور پروپیگنڈے کی اجازت دیتا ہے، خواہ تقریر کے ذریعہ یا تحریر کے ذریعہ، لیکن چونکہ اسلام ایک با اخلاق نظام حیات ہے، اس لئے اس سلسلہ میں وہ کچھ اخلاقی و قانونی پابندیاں بھی عائد کرتا ہے، مگر وہ محض عام انسانوں کی عزت و آبرو، ان کے عقیدہ و مسلک، ان کی جان و مال کی حفاظت کے لئے لگاتا ہے وہ کہتا ہے کہ تقریر یا تحریر کے ذریعہ کسی کی عزت نہ اتاری جائے، کسی پر تہمت نہ لگائی جائے بے اعتمادی نہ پھیلائی جائے، کسی گروہ کسی خاندان یا کسی پیشواؤں کو برا بھلا نہ کہا جائے، اپنے عقیدہ و مسلک کی طرف دانائی اور خیر خواہی کے ساتھ بلایا جائے، قرآن کی ہدایت ملاحظہ ہو۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔
اور گالی مت دو ان کے بتوں کو جن کی وہ خدا چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں۔

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ۔
اور اللہ کے راستہ کی طرف حکمت کے ساتھ اور اچھے انداز میں بلاؤ۔

تحفظ جان و مال

اسلام ہر انسان کی جان اور اس کے مال کی حفاظت کی تاکید کرتا ہے۔ تحفظ جان کے سلسلہ میں قرآن کی آیت اوپر گذر چکی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ جس شخص نے قصاص یا فساد کے علاوہ کسی دوسری صورت میں کسی کو قتل کیا، تو وہ پوری انسانیت کا قاتل ہے اور جس نے ایک انسان کی جان کو بچایا، اس نے پوری انسانیت کو زندگی بخشی۔

من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا ومن احیاها فکانما احیا الناس جمیعا۔
جو کسی شخص کو قتل کرے بغیر اس کے کہ مقتول نے کسی کو قتل کیا ہو، یا زمین میں فساد پھیلایا ہو تو گویا اس نے سب انسانوں کو قتل کر دیا، اور جس نے کسی شخص کو زندگی بخشی (قتل سے بچایا) تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری حج میں جو اعلان فرمایا تھا اس میں بھی جان و مال کی حفاظت کا کھلا ہوا اعلان تھا۔

ان دماءکم واموالکم حرام علیکم کحرمة یومکم هذا۔
تمہارے خون اور تمہارے مال تمہارے لئے اسی طرح محترم ہیں جس طرح حجۃ الوداع کا دن محترم ہے۔

آپ نے ایک مومن کی یہ پہچان بتائی ہے۔

المومن من امنه الناس علی دماءهم واموالهم۔
مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنے مال اور جان کے بارے میں مامون اور بے خوف ہوں۔

عزت و ناموس کی حفاظت

اسلام ہر انسان کی عزت و آبرو کو برابر سمجھتا ہے، اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں، کہ اسلام اخلاقی برتاؤ اور انسانی حقوق میں کسی فرد، کسی طبقہ یا کسی گروہ کی جانب داری نہیں کرتا۔ آپ نے حجۃ الوداع میں جان و مال کے ساتھ عزت و آبرو کی حفاظت پر بھی خاص طور پر زور دیا تھا، واعراضکم حرام علیکم چنانچہ تمام علماء متفقہ طور پر غیر مسلموں کے بارے میں

لکھتے ہیں،

ویجب کف الاذی عنہ وتحریم غیبتہ کالمسلم

مسلمان کی طرح غیر مسلم کو تکلیف سے بچانا واجب اور اس کی غیبت کرنا حرام ہے۔

میں نے جو کچھ عرض کیا، وہ محض نظریہ نہیں ہے، بلکہ اسلام اپنی پوری اسپرٹ کے ساتھ دنیا میں عملاً با اقتدار رہا ہے، تو اس نے یہ حقوق انسانوں کو دیئے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اسوہ ہم یہاں، نقل کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوگا، کہ اسلام اقتدار میں آنے کے بعد بھی انسان کی ان فطری آزادیوں میں کوئی مداخلت نہیں کرتا۔

جزیرۃ العرب میں عیسائیوں کے مختلف مراکز تھے، جن میں سب سے بڑا مرکز نجران تھا۔ جب پورا جزیرۃ العرب دائرۂ اسلام میں داخل ہوگیا۔ نجران اور دوسرے علاقے کے عیسائیوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس معاہدۂ صلح کے لئے اپنا وفد بھیجا، اس وقت مسلمان اس پوزیشن میں تھے، کہ وہ چاہتے تو چند دن میں ان مقامات کو زیر نگیں کر لیتے ہیں، لیکن آپ نے ان کے علاقوں کا رخ نہیں کیا اور ان کو اپنے مذہب و مسلک پر رہنے کی پوری آزادی دے کر ان سے صلح کرلی، آپ کا یہ صلح نامہ تاریخ کی کتابوں میں آج بھی درج ہے، ہم صرف اہل نجران کے معاہدہ صلح کے چند ٹکڑے یہاں نقل کرتے ہیں۔

لنجران ذمۃ اللہ وذمۃ محمد النبی
صلی اللہ علیہ وسلم لا یفتنون عن
دینہم ولنجران وحاشیتہا جوار
اللہ وذمۃ محمد النبی رسول صلی
اللہ علیہ وسلم علی انفسہم
وملتہم وارضہم واموالہم و
شاہدہم وغائبہم وبیعہم
وسلم لا یغیر ما کانوا علیہ ولا
بغیر حق من حقوقہم ......
لا یفتن اسقف عن اسقفیتہ ولا
راہب من رہبانیتہ ولا یوخذ منہم

نجران کے عیسائیوں کے لئے خدا اور اس کے
رسول کی یہ ذمہ داری ہے کہ انکو انکے دین سے
زبردستی پھیرنے کی کوشش نہیں کی جائیگی، نجران
اور ان کے ہمسایوں اور پاس پڑوس کے لئے
خدا کی اور اس کے رسول کی یہ ذمہ داری ہے
کہ ان کی جان، ان کی ملت، ان کی جائداد،
ان کا مال، ان کے موجود اور غیر موجود تمام،
افراد [illegible] ان کے [illegible] اور ان کی تجارت،
الکی ہم اور ان کے مثل جو کچھ [illegible]
ہوں گے، جس حیثیت میں [illegible]
[illegible] ان کے [illegible] لئے دین پر آزادی سے

رجل بظلم آخر — رہیں گے ان کو اس سے پھرا نہیں جائے گا اور ان میں سے
(فتوح البلدان) — کسی شخص کے ظلم و زیادتی کی وجہ سے دوسرا شخص نہیں پکڑا جائے گا،

اس صلح نامہ سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں، کہ اسلام نے جو بین الاقوامی اصول و تصورات دیئے ہیں وہ فلسفیانہ یا نرے آفاقی تخیلات نہیں ہیں بلکہ وہ عملی جذبات پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں، جن پر سب سے پہلے خود اسلام کے قبول کرنے والوں نے عمل کرنے کی کوشش کی ہے،

ان حقوق سے صرف چند صورتوں میں کوئی انسان محروم ہو سکتا ہے،

(۱) جاسوسی کے سلسلہ میں (۲) اسلامی حکومت کی اطاعت سے بالکلیہ انکار (۳) یا سودی کاروبار کرنے کی صورت میں۔

فکری آزادی کی تاریخ

موجودہ دور میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ انسان کو مذہبی سیاسی اور انفرادی آزادی سب سے پہلے امریکہ کے دستور نے دی یا پھر اس کا سہرا فرانس اور برطانیہ کے باندھا جاتا ہے مگر اوپر کی تفصیلات سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اسلام نے آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے انسان کو فکر و عقیدے کی آزادی اس وقت بخشی جب دنیا میں بادشاہی نظام کو خدائی تقدس حاصل تھا جس میں کچھ لوگ دائمی طور پر آقا تھے اور کچھ محکوم تھے اور کچھ مستقل طور پر غلام تھے،

اوپر قرآن پاک کی جو آیات اور احادیث نبوی نقل کی گئی ہیں ان کی روشنی میں فقہا نے ہر انسان کے لئے پانچ بنیادی حقوق مقرر کر دیئے ہیں جس کا لحاظ اس وقت تک کرنا ضروری ہے جب تک وہ خود کسی حق تلفی کا مرتکب نہ ہو انسان کے پانچوں بنیادی حقوق کی رعایت انفرادی زندگی سے لے کر بین الاقوامی تعلقات تک کرنی ضروری ہے انسان کو ان سے نہ تو انفرادی زندگی میں محروم کیا جا سکتا ہے اور نہ ملکی اور بین الاقوامی معاملات میں انہیں چھینا جا سکتا ہے وہ بنیادی ضرورتیں یہ ہیں۔ مجموع الضروریات خمسة حفظ الدین والنفس، انسان کی بنیادی ضرورتیں پانچ ہیں۔ والنسل والمال والعقل موافقات شاطبی (ج۲) اس کے دین و مذہب کی حفاظت، اس کی جان اس کے مال کی حفاظت اور اس کی عقل و فکر کی حفاظت ضروریات کی تفصیل کرتے ہوئے فقہا نے لکھا ہے کہ اگر ان کی رعایت نہیں کی جائے گی تو اس کی وجہ سے، انسان کی انفرادی زندگی میں بھی فساد و بگاڑ پیدا ہوگا اور ملکی اور بین اقوامی معاملات میں بھی کشیدگی پیدا ہوگی اس اصول کے تحت ایسے تمام طریقے اختیار کرنے سے روکا جائے گا جس سے انسان کے دین و مذہب اس کی جان و مال یا اس کی نسل اور عقل کو نقصان پہونچتا ہو یا اس میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو ایسی تمام صنعتیں اور آرمس فیکٹریاں ممنوع قرار دی جائیں گی جس سے نسل انسانی کی بقا کو خطرہ لاحق ہو، ایسے تمام کام پر پابندی ہو گی جس سے انسان کی ان بنیادی ضرورتیں متاثر ہوتی ہوں۔

بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی
کا
ایک وعظ

اَلحمدُ للّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَستعینُہٗ وَ نستغفرہٗ وَ نؤمنُ بہٖ وَنتوکّلُ علیہِ ونعوذُ باللّٰہِ من شرورِ انفسِنا ومن سیّئاتِ اعمالنا من یّھدہِ اللّٰہُ فلا مُضلّ لہٗ ومن یُّضللہٗ فلا ھادی لہٗ ونشھدُ ان لّا الٰہَ اِلّا اللّٰہُ وحدہٗ لاشریک لہٗ ونشھدُ انّ سیّدنا ومولانا محمّدًا عبدُہٗ ورسولُہٗ، صلّی اللّٰہُ علیہِ وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلّم تسلیمًا کثیرًا کثیرًا۔

اَمّا بعدُ:۔ فاعوذُ باللّٰہِ من الشّیطٰنِ الرّجیم۔ بسمِ اللّٰہِ الرّحمٰنِ الرّحیم۔ قَالَ اللّٰہُ تبارکَ وتعالیٰ۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ، ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَیُدْخِلْکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ وَمَسٰکِنَ طَیِّبَۃً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو کیا میں تم کو ایسی سوداگری نہ بتلاؤں جو تم کو ایک دردناک عذاب سے بچالے۔ وہ یہ ہے کہ تم اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو، یہ تمہارے لئے بہت ہی بہتر ہے اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو۔ اللہ تمہارے گناہ معاف کریگا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور عمدہ مکانوں میں داخل کریگا کہ جو ہمیشہ رہنے کے باغوں میں ہوں گے۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔

آج کل ہم لوگوں کی عجیب حالت ہوگئی ہے ہم نے اپنے اسلاف کی اور صحابہ کرام رضؓ کی سیرت کو بالکل بھلا دیا ہے اور ہم اس قدر غافل ہوگئے ہیں کہ ہم میں انکی کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی ہے۔ نہ ہمارے اندر ایمانی جذبہ ہے نہ ہمارے ایمان میں وہ قوت ہے نہ اللہ و رسولؐ کی وہ محبت و عظمت ہے جو صحابہ کرام میں تھی۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے قلوب اللہ تعالیٰ کی عظمت اور فکر

دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت سے خالی ہیں۔ اسی طرح ہمارے اندر نہ آخرت کا یقین ہے نہ اللہ کے کلام کی عظمت ہے، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کی اور آپ کے ارشادات کی اہمیت ہے پھر اس کا جو کچھ نتیجہ ہوگا وہ ظاہر ہے۔

ابھی آپ نے بیان شروع ہونے سے پہلے جو نعت سنی وہ اسی حقیر کی ہے۔ اگر آپ کے سامنے اسی کی شرح بیان کروں تو کچھ حقیقت معلوم ہو اور یہ بات واضح ہو جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں کس لئے تشریف لائے تھے، اور آپ کی بعثت کا کیا مقصد تھا؟ ابھی آپ نے سنا ہے کہ ؎

جب زباں پر محمد کا نام آگیا
دوستو! زندگی کا پیام آگیا

یعنی لوگوں کے قلوب مردہ ہو چکے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے اور آپ کی پاک صحبت سے، اللہ تعالیٰ کی کتاب مقدس سے مردہ دل زندہ ہو گئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ دل کی موت اور اس کی حیات کیا چیز ہے؟ فرمایا کہ اللہ کی یاد سے جو غافل ہے اللہ کے ذکر سے جو خالی ہے، وہ دل مردہ ہے مشکواۃ شریف میں حدیث آئی ہے۔

عن ابی موسیٰ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثل الذی یذکر ربہ والذی لایذکر مثل الحی والمیت۔ متفق علیہ (مشکوٰۃ باب ذکر اللہ۔ ج ۱ ص ۱۹۶)

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ " مثال اس آدمی کی جو اپنے رب کا ذکر کرتا ہے اور اس کو یاد کرتا ہے اور اس آدمی کی جو اپنے رب کو نہیں یاد کرتا بلکہ بھولا ہوا ہے زندہ اور مردہ کی سی ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا، اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنے والا، اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کرنے والا، اللہ تعالیٰ کا نام رٹنے والا زندہ ہے اور اس کا دل زندہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو بھول جانے والا، اس کی زندگی سے جی چرانے والا، اس کی یاد سے غافل رہنے والا مردہ ہے اس کا دل بھی مردہ ہے۔

حقیقت میں دنیا کی زندگی فانی اور مٹ جانے والی ہے اور دنیا کی بہار چند روزہ ہے

جس پر ہم قربان ہو رہے ہیں۔ اللہ کے بندوں! اس دنیا سے دل ست لگاؤ اور آخرت کی طرف قدم بڑھاؤ۔ آخرت باقی رہنے والی ہے وہاں کی راحت جاودانی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے اپنی طرف بلانے کے لئے حضرات انبیاء علیہم السّلام کو مبعوث فرمایا اور اپنے اپنے زمانہ میں تمام پیغمبروں نے اللہ کا پیغام بندوں تک پہنچایا اور دین کی تبلیغ فرمائی اور اس میں انھوں نے طرح طرح کے مصائب برداشت کئے تکلیفیں جھیلیں اخیر زمانہ میں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا اور نبوت کا سلسلہ آپ پر ختم ہو گیا۔ آپ خاتم النبیین ہیں آپ کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا اس لئے تا قیامت اب آپ ہی کی تعلیمات پر عمل کرنا ہوگا۔

قرآن پاک خدا تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ توراۃ انجیل، صحف ابراہیم، وصحف موسیٰ اور زبور داؤد سب کو اللہ تعالیٰ نے منسوخ فرما دیا ہے اس لئے اب اگر نجات و فلاح ہوگی تو اسی کتاب پر عمل کرنے اور اسی کا اتباع کرنے سے ہوگی۔ کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کے خلاف جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے گا وہ ضلالت اور گمراہی کا طریقہ ہوگا۔ ہدایت تو بس اسی میں منحصر ہے

قرآن کی عظمت کا ہم کو اندازہ ہی نہیں اور ہم کو یہ معلوم ہی نہیں کہ اس میں کتنا وزن ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ کے چہرے سے اس کے آثار نمایاں ہوتے تھے، پیشانی مبارک سخت سردی کے باوجود پسینہ سے تر بتر ہو جاتی تھی بسا اوقات آپ اونٹ پر سوار ہوتے اور اس وقت وحی نازل ہونے لگتی تو اونٹ اس کے بوجھ سے بیٹھ جاتا تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تأثر کا پوچھنا ہی کیا صحابہ اکرام پر آیات قرآنی کا ایسا اثر ہوتا تھا کہ بعض وقت اسکی وجہ سے کئی کئی روز بیمار رہتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ گشت کو نکلے اتفاق ایک مسلمان کے گھر کے پاس سے آپ کا گذر ہوا تو وہ قرآن پاک پڑھ رہے تھے آپ کھڑے ہو کر ان کی تلاوت سننے لگے انھوں نے سورۂ طور پڑھی، جب اس آیت پر پہنچے

إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ مَا لَهُ مِنْ دَافِعٍ ۝ يَوْمَ تَمُورُ السَّمَاءُ مَوْرًا وَتَسِيرُ الْجِبَالُ سَيْرًا

جس کا ترجمہ یہ ہے کہ، قسم ہے طور کی اور اس کتاب کی جو کھلے ہوئے کاغذ میں لکھی ہے اور بیت المعمور

کی اونچی چھت کی اور دریائے شور کی جو پُر ہیکہ بیشک آپ کے رب کا عذاب ضرور ہو کر رہے گا کوئی اس کو ٹال نہیں سکتا اور یہ اس روز واقع ہوگا جس روز آسمان تھرتھرانے لگے گا اور پہاڑ اپنے جگہ سے ہٹ جائیں گے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان آیات کو سن کر فرمایا کہ قسم ہے پروردگار کعبہ کی یہ قسم حق ہے۔ پھر اپنی سواری سے اترے اور دیوار کے ساتھ تکیہ لگایا اور دیر تک ٹھہرے رہے پھر اپنی جگہ کو لوٹ آئے اور گھر پہنچ کر ایک ماہ تک بیمار رہے۔ لوگ دور دور سے ان کی مزاج پرسی کو آتے اور یہ نہ سمجھتے تھے کہ ان کی بیماری کیا ہے۔ کسی کو یہ پتہ بھی نہ تھا کہ حضرت فاروق اعظم رضؓ کا کیا حال ہے اور ان کے دل پر کیا گذر رہی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک قرآن پاک کی کیسی عظمت تھی، ہم بھی تلاوت کرتے ہیں اور تلاوت سنتے ہیں مگر ہماری وہ کیفیت نہیں۔ آج ہم لوگ اپنے حالات میں غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی عظمت ہمارے دلوں میں باقی نہیں اس لئے ہم محروم ہیں اور جو لوگ تھوڑی بہت تلاوت کرتے بھی ہیں تو اس پر عمل کرنے والے کہاں ہیں۔ اللہ کی یہ وہی مقدس اور مبارک کتاب ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بڑی شان سے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے۔ اس کتاب کی عظمت کا کیا پوچھنا۔ ہم تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ

یعنی اگر اس قرآن کو ہم کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔

اللہ تعالیٰ تو یہ فرما رہے ہیں کہ پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا لیکن ہم پر جو اللہ کے کلام کا اثر نہیں ہوتا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے قلوب سخت ہو گئے ہیں اور ان پر ایسا زنگ لگ گیا ہے کہ بڑی سے بڑی اثر کرنے والی چیز بھی اس پر کچھ اثر نہیں کرتی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے پھر اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو وہ نقطہ مٹ جاتا ہے اور اگر توبہ نہیں کرتا اور گناہ کرتا ہی رہتا ہے تو وہی سیاہی بڑھتی رہتی ہے حتیٰ کہ پورا قلب سیاہ ہو جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ گناہ سے دل میں تاریکی پیدا ہوتی ہے اور یہی تاریکی دل کا زنگ ہے۔ نیز معلوم ہوا کہ توبہ نہ کرنے کی وجہ سے قلب کی سیاہی بڑھتی ہی جاتی ہے یہاں تک کہ سارا قلب سیاہ ہو جاتا ہے اور ایسے ہی دل کو مردہ دل کہتے ہیں۔ ہمارے قلوب تاریک ہو چکے ہیں لیکن ہم لوگوں کو اس کا احساس نہیں ہوتا مگر اللہ والوں کو قلب کی تاریکی کا بھی احساس ہوتا ہے اسی طرح حق تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری سے جو نور پیدا ہوتا ہے اس کو بھی اللہ والے محسوس فرماتے ہیں۔ اگر ہم ان کے پاس جاتے اور ہمارے دلوں کا زنگ دور ہو جاتا تو ہم کو بھی قلب کی تاریکی اور اس کا نور محسوس ہونے لگتا۔

تو اللہ کی یہ مقدس کتاب ہمارے پاس موجود ہے، یہ وہی کتاب ہے جس کی تبلیغ و دعوت کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے اور اس کی دعوت دیتے رہے اور اسی دین کو پہنچانے کی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضؓ کو طرح طرح کی تکلیفیں دی گئیں مصیبتیں پہنچائی گئیں اور اس کو انھوں نے برداشت کیا، ہم تو اس کو سمجھ بھی نہیں سکتے ہمارے اندر وہ استقامت نہیں جو صحابہؓ کے اندر تھی انھوں نے جب اللہ کا نام لیا اور اللہ پر ایمان لائے تو ان کی کیفیت کچھ اور ہو گئی تھی۔ وہ جبلِ استقامت ہو گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ٥

یعنی جن لوگوں نے اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر مستقیم رہے ان لوگوں پر فرشتے اتریں گے اور کہیں گے کہ تم نہ اندیشہ کرو اور نہ رنج کرو اور تم جنت کے ملنے پر خوش رہو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

یہ ان لوگوں کے لئے ہے جنھوں نے اللہ کے پروردگار ہونے کا اقرار کر لیا اور اسی پر استقامت اختیار کر لی اور مرتے دم تک اس اقرار سے ہٹے نہیں، بلائیں آئیں تو بیماریاں آئیں تو، فقر و فاقہ ہوا تو خوشحالی ہوئی تو ہر حال میں وہ اللہ کے در پر ڈٹے رہے اللہ تعالیٰ کا نام لینے والے اللہ کے در کو کسی حال میں چھوڑنے والے نہیں اور اس کی بندگی و فرماں برداری سے ہٹنے والے نہیں ہوتے۔ اسی کو استقامت کہتے ہیں جس کا ذکر اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ ایسے لوگوں کے لئے

مرتے وقت فرشتے یہ خوشخبری سناتے ہیں کہ

اَنْ لَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝

یعنی تم نہ اندیشہ کرو اور نہ رنج، اور تم جنت پر خوش رہو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ یہ خوشخبری موت کے وقت بھی سنائی جاتی ہے۔ قبر میں بھی سنائی جاتی ہے اور قیامت کے دن بھی سنائی جائے گی۔ اس مقام پر ایک نکتہ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ مومن دنیا میں ہر وقت اللہ سے ڈرتا رہتا ہے اور ساری زندگی اس پر یہی خوف طاری رہتا ہے کہ معلوم نہیں بعد مرنے کے کیا معاملہ پیش آنے والا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے موت کے وقت ہی گویا اس طرح مطمئن کر دیا جاتا ہے کہ تم دنیا میں بہت ڈر چکے اور زندگی بھر ڈرتے ہی رہے اب تمہارے خوف کا وقت گذر چکا، لہذا اب تم نہ ڈرو نہ رنج کرو بلکہ جنت کی بشارت حاصل کرو۔ پس معلوم ہوا کہ یہ بشارت انہیں کے لئے ہے جو دنیا میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں۔ مگر ہمارا یہ حال ہے کہ آج ہمارے اندر نہ جنت کا یقین ہے، نہ جہنم کا یقین۔ ہمارے قلوب میں اللہ کا خوف باقی نہیں رہا صحابہ کرام کا یہ حال تھا کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو سنکر وہ لرز جاتے تھے وہ تلاوت کے وقت ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ فاروق اعظمؓ اور صدیق اکبرؓ کا یہ حال تھا کہ جب تلاوت کرتے تو آنسوؤں کا تار لگ جاتا تھا اور خود حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے خوف کا یہ عالم تھا کہ آپ اتنی عبادت کرتے تھے جس سے پائے مبارک ورم کر آتے تھے۔ جب آپ سے کہا جاتا کہ آپ تو اللہ کے محبوب ہیں، آپ گناہوں سے معصوم ہیں پھر آپ اتنی عبادت کیوں کرتے ہیں تو فرماتے

اَفَلَا اَكُوْنُ عَبْدًا شَكُوْرًا (کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گذار بندہ نہ بنوں)

صحابہ کرامؓ کا یہ حال تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اس قدر شکر ادا کرتے تھے۔ اور ہم لوگ اللہ کی بیشمار نعمتیں کھاتے پیتے اور استعمال کرتے ہیں پھر بھی شکر نہیں ادا کرتے بلکہ کفران نعمت کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں پر بڑی عنایت اور محبت ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ماں، باپ کو جتنی محبت اپنے اکلوتے بیٹے سے ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے اس سے ننانوے گنا زیادہ محبت ہے۔ ان کی صفت رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ہے، اپنے بندوں پر وہ بہت زیادہ مہربان ہیں، ان کی نعمتوں بے شمار ہیں اگر ہم ان کا شمار کرنا چاہیں تو کر نہیں سکتے۔

اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں۔ " وَإِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا "
یعنی اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرو تو اس کا احصار نہیں کر سکتے۔
اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں کو ہم استعمال کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور پھر بھی نافرمانی کرتے ہیں کسقدر تعجب کی بات ہے۔ یاد رکھئے! اللہ تعالیٰ نے امم سابقہ کو جو تباہ کیا اور ان پر عذاب آیا وہ اسی وجہ سے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، حق تعالےٰ کی نعمتوں کی ناقدری اور ناشکری کی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان کے واقعات کا باربار ذکر فرمایا ہے مگر ہم لوگ توجہ سے نہیں سنتے اور ایسے غافل ہیں کہ ان واقعات سے عبرت نہیں حاصل کرتے۔
سنئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔
فَكَأَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَقَصْرٍ مَّشِيدٍ ۝
غرض کتنی بستیاں ہیں کہ جن کو ہم نے ہلاک کیا جن کی یہ حالت تھی کہ وہ نافرمانی کرتی تھیں سو اب یہ کیفیت ہے کہ وہ اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں اور بہت سے بیکار کنوئیں اور بہت قلعی چونے کے محل جو اب شکستہ ہو گئے ہیں یہ سب ان بستیوں کے ساتھ تباہ ہوئے۔

از مجیب اللہ ندوی

خیام کے نزدیک انسانیت کی تکمیل معرفت الٰہی کے بغیر نہیں ہو سکتی، اگر انسان کو معرفت الٰہی حاصل نہیں تو اس میں اور حیوان میں کوئی فرق نہیں۔ جس کو جسقدر زیادہ معرفت حاصل ہوگی قیامت میں اسی کے بقدر اس کا درجہ قائم ہوگا، اس خیال کو اس نے کئی رباعیوں میں ظاہر کیا ہے۔ ایک رباعی کا ایک شعر ہے۔

روزے کہ جزا ہائے ہر صفت خواہد بود

قدرے تو بقدر معرفت خواہد بود

ایک دوسری رباعی میں یہ خیال اس سے زیادہ صاف طریقہ پر ہے ؎

ساقی بے معرفت مرا کرمت است — در حشر بے معرفتاں معصیت است

بے معرفت آدمی چہ کار آید ہیچ — مقصود تر آدمی ہمیں معرفت است

سرمد بھی اس بارے میں خیام کے ہم خیال ہیں۔ اور انھوں نے اس کو اپنی متعدد رباعیوں میں ادا کیا ہے ؎

ہرگز بخدا زہد ریائی نہ کنم — غیر از در معرفت گدائی نہ کنم

شاہی کنم و ملک فراغت گیرم — پیوستہ بہ میخانہ جدائی نہ کنم

لیکن سرمد کے بیان میں جو زور ہے، وہ خیام کے بیان میں نہیں ہے، ہو بھی نہیں سکتا تھا، کہ دونو کے مراتب میں بڑا فرق ہے۔

خیام کا خیال ہے کہ خدا کی معرفت کلی انسان کی دسترس سے باہر ہے چنانچہ موت کے وقت اس کی زبان پر یہ دعا تھی۔

اَللّٰھم تعرف انی عرفتک علیٰ مبلغ — اے خدا تو واقف ہے کہ میں نے اپنے امکان بھر تجھے

الٰہی فاغفرلی فان معرفتی ایاک وسیلتی الیک — خدایا پس میری مغفرت کر اس لئے کہ تیری معرفت ہی تیری طرف میرا وسیلہ ہے۔

ایک رباعی میں اس نے اس مفہوم کو اسطرح ادا کیا ہے۔

کنہ خردم درخور اثبات تو نیست ⁂ واندیشۂ من بجز مناجات تو نیست
من ذات ترا بواجبی کے دانم ⁂ داننۂ ذات تو بجز ذات تو نیست

سرمد بھی اس میں خیام کے ہم خیال ہیں۔

افسوس کہ کنہش بخیالم نہ رسید ⁂ اندیشہ دریں بادیہ بسیار دوید
بر روئے خیال خام حیران شدہ ام ⁂ سر پردۂ عنکبوت صورت کہ کشید

ایک دوسری رباعی میں کہتے ہیں۔

آساں نہ بود بفہم فہمیدن او ⁂ مشکل بدل و دیدہ بود دیدن او
دیوانہ بدل و دیدہ بے حیران است ⁂ دریافتن و دیدن و سنجیدن او

خیام کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وصف رحمت و غفران کے ظہور کیلئے گناہ ضروری ہے۔

خیام ز بہر گنہ ایں ماتم چیست ⁂ وز خوردن غم فائدہ بیش و کم چیست
آں را کہ گنہ نکرد غفراں نبود ⁂ غفراں ز برائے گنہ آمد غم چیست

سرمد بھی خیام کے ہم خیال ہیں، مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ خیام اس وادی میں عقل و حکمت کی راہ سے داخل ہوتا ہے اور سرمد عشق و محبت کی راہ سے جب وہ محبوب کے لطف و کرم پر توجہ کرتے ہیں تو ان پر امید و رجاء کا غلبہ ہوجاتا ہے اور بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں

من معنی احسان و کرم فہمیدم ⁂ حیران تامل شدم و سنجیدم
چشم کرمش عاشق ہمن گنہ است ⁂ آنجا سخنے نیست مکرر دیدم

دریائے عنایتش نہ دارد پایاں ⁂ در شکر زباں قاصر و دل ہم حیران
ہر چند گنہ بیش از در رحمت بیش ⁂ کردیم شناوری بہ بحر عصیاں

لیکن وہ خیام اور اس کے ہم نواؤں کیطرح ارتکاب گناہ میں بے باک نہیں ہوجاتے۔

بلکہ انھیں ہر وقت اپنے اعمال کی باز پرس کا خطرہ بھی دامن گیر رہتا ہے۔

ہر شام و سحر ز غم افعال خودم ۔۔۔ دل خستہ و شرمندہ احوال خودم
آیا چہ بود مآل کارے کہ نشد ۔۔۔ پیوستہ در اندیشۂ اعمال خودم

انسان کے بارے میں خیام کا خیال ہے کہ وہ فانی شئے ہے اس لئے اس کو دنیا سے جلد سے جلد فائدہ اٹھا لینا چاہئے، چنانچہ وہ کہتا ہے۔

ہر چیز بیا نیاز بہر دل ما ۔۔۔ حل کن بجمال خویشتن مشکل ما
یک کوزۂ مے بیار تا نوش کنم ۔۔۔ زاں پیش کہ کوزہا کنند از گل ما

اے دل چو زمانہ می کند غمناکت ۔۔۔ ناگہ برود ز تن روان پاکت
بر سبزہ نشیں و خوش تری روزے چند ۔۔۔ زاں پیش کہ سبزہ بر دمد از خاکت

لیکن سرمد کا تخیل اس کے بالکل برعکس ہے، وہ کہتے ہیں کہ دنیا ایک مہمان سرا ہے وہاں لطف و راحت اٹھانا بالکل بیکار ہے ؎

ہر کس کہ نبات دہر سنجیدہ بود ۔۔۔ فصل گل و ایام خزاں دیدہ بود
مائل نہ شود برنگ و بوئے گل و مل ۔۔۔ نادیدہ شمارد آنچہ را دیدہ بود

اندیشۂ مال و جاہ دنیا غلط است (۲) ۔۔۔ لے وہم و خیال فکر بیجا غلط است
در خانۂ تن وطن نہ باشد ہرگز ۔۔۔ از بہر دو روز ایں تمنا غلط است

ایں مال جہاں تمام رنج است و ملال (۳) ۔۔۔ اندیشہ مکن ببیں کہ وہم است و خیال
کارے کہ نبود و دستش رنج و ملال ۔۔۔ مالست زحمتش و بال است مآل

ان اشعار سے واضح ہو گیا کہ سرمد کہاں تک خیام کے ہم خیال اور کن امور میں اس سے اختلاف رکھتے ہیں۔

جبر و قدر وغیرہ کے متعلق بھی خیام و سرمد کے خیالات بہت ملتے جلتے ہیں، مگر خیام کا تصوف مذہبی نہ تھا، بلکہ حکیمانہ تھا، اس لئے وہ انسانیت کی تکمیل حکمت کی راہ سے کرنا چاہتا ہے، مگر سرمد کا تصوف کسی قدر مذہبی تھا، اس لئے وہ تکمیل انسانی کا ذریعہ ثبوت

کو سمجتے ہیں، یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے دونوں کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں، اس کی تفصیل آئندہ سطور میں آئے گی۔

سرمد حافظ و خیام کے علاوہ مولانا روم سے بھی متأثر معلوم ہوتے ہیں اور سلوک کے اکثر مسائل میں انکی اور مولانا روم کی تعبیر ایک ہی ہوتی ہے مثلاً وحدۃ الوجود کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں۔

گر ہزاراں اند یک کس بیش نیست | جز خیالات عدد اندیش نیست
بحر وحدانی است جفت و زوج نیست | گوہر ماہیش غیر موج نیست
ایں دوئی اوصاف دید احول است | ورنہ اول آخر، آخر اول است

سرمد کہتے ہیں۔

عاشق و عشق بت و بتگر و عیاری کیست | کعبہ و دیر و مساجد ہمہ جا تاریکیست
گر در آئی بہ چمن وحدت یکرنگی بیں | غور کن عاشق و معشوق و گل و خاریکیست

سلوک کے دوسرے مسائل مثلاً فنا، بقا، رضا وغیرہ میں بھی سرمد اور مولانا روم کے خیالات بہت حد تک ملتے جلتے ہیں، لیکن اس کی تفصیل طویل ہے۔

یہاں تک تو سرمد کی رباعیوں پر اس حیثیت سے بحث تھی کہ وہ خیام اور مولانا روم وغیرہ سے کس قدر متأثر ہیں، اور انھوں نے ان کا کس قدر تتبع کیا ہے، اس سے اجمالاً یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ خیام اور سرمد کے تصوف میں بنیادی نقطۂ اختلاف کیا ہے، آئندہ یہ دکھانا ہے کہ انھوں نے اپنی رباعیوں میں عقائد، عبادات، اور اخلاق و تصوف کی کیا کیا تعلیمات دی ہیں۔ اور اسلامی نقطۂ نظر سے ان تعلیمات کی حیثیت کیا ہے؟ نفس شاعری کے اعتبار سے ان کی رباعیوں کا کیا مرتبہ ہے؟ اور ان میں شاعرانہ حیثیت سے کیا خوبیاں ہیں؟

اس میں شبہ نہیں کہ سرمد کی متعدد رباعیاں جو انھوں نے غلبۂ حال میں کہی ہیں، دینی حیثیت سے ضرور نگاہ میں کھٹکتی ہیں مگر ان کے علاوہ عقائد و سلوک کے تقریباً تمام مسائل پر ان کی رباعیاں موجود ہیں، اور ان میں ہر مسئلہ میں انھوں نے وہی خیال اور طرز ادا اختیار کیا ہے جو محققین صوفیہ کی مسلمہ روش ہے، چنانچہ آئندہ سطور میں ہم ان صوفیانہ عقائد و مسائل کے متعلق جو اپنی تعبیری نزاکتوں کی وجہ سے مختلف فیہ بن گئے ہیں، سرمد کی رباعیاں پیش کریں گے۔

توحید یا وحدۃ الوجود
اور
وحدۃ الشہود

توحید یا وحدۃ الوجود کے معنی میں جو کچھ اختلاف ہے وہ تمامتر نزاع لفظی ہے، توحید کے معنی یہ ہیں کہ ایک خدا کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں، اس کی ذات وصفات میں کوئی شریک نہیں، وہ اپنے قوت وارادہ اور وجود میں کسی کا محتاج نہیں، تمام عالم اسی کے وجود سے قائم ہے اور اس کی مرضی کے بغیر عالم کا ایک ذرہ اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا۔ انھیں باتوں کا یقین جب حال بن جائے تو یہی وحدۃ الوجود یا وحدۃ الشہود ہے۔ مختصر الفاظ میں توحید اور وحدۃ الوجود کی تعبیر یہ کی جا سکتی ہے۔ کہ ایک کا تعلق قال سے ہے اور دوسرے کا حال سے۔ اہل ظاہر جس کو صرف زبان سے کہتے اور علمی تحقیق کا جامہ پہناتے ہیں، اہل باطن چشم بصیرت سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں، اور ان کے قلب پر اس کے اذعان و یقین کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

چشم اگر بینا بود در ہر طرف دیدار ہست — دل اگر دانا بود در ہر طرف دیدار ہست
در زباں گویا بود در ہر سخن اسرار ہست — گوش اگر شنوا بود جز ذکر حق کے بشنود

تمام محققین و اکابر صوفیہ اسی وحدۃ الوجود کے قائل ہیں، اور اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں سمجھتے، البتہ اتحاد[1] الوجود کا عقیدہ یقیناً گمراہی ہے، جو ہندوؤں کے ویدانت سے ماخوذ ہے۔

حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی ؒ نے ایک مرتبہ مولانا ابراہیم سیالکوٹی ؒ مرحوم سے جو ممتاز علمائے اہل حدیث میں ہے، پوچھا کہ وحدۃ الوجود کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے، مولانا نے فرمایا کہ

"وحدۃ الوجود کے بغیر چارہ نہیں"

مولانا کا مقصد وہی تھا جس کی اوپر تعبیر کی گئی ہے مگر چونکہ اس زمرہ میں اہل و نااہل دونوں طرح کے لوگ داخل ہو گئے ہیں۔ اس لئے توحید کی اس فلسفیانہ تعبیر سے گریز کرنا اور قرآن پاک کا سادہ انداز اختیار کرنا ہی زیادہ بہتر ہے۔

سرمد بھی وحدۃ الوجود کے قائل ہیں اور اس بارے میں ان کا مسلک انکی رباعیوں سے وہی معلوم ہوتا ہے جو محققین صوفیہ کا ہے۔ انھوں نے متعدد رباعیوں میں اس خیال کو ادا کیا ہے، اور ہر رباعی کا اسلوب و طریقۂ تعبیر جدا ہے، بعض رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

---

[1] یعنی دو چیزوں کا اس طرح مل جانا کہ دونوں میں کوئی فرق باقی نہ رہے، علماء نے اسکی تردید کی ہے۔

جبر و اختیار | عقائد کے مسائل میں جبر و اختیار کا مسئلہ بہت ہی نازک ہے، اگر یہ کہا جائے کہ انسان مجبور محض ہے اور اس کے افعال میں اس کے ارادہ و اختیار کو بالکل دخل نہیں ہے یا یہ کہ وہ مختار کل ہے، اور جو کچھ کرتا ہے اپنے ارادہ و اختیار سے کرتا ہے، تو دونوں صورتیں عقلی و مذہبی حیثیت سے قابل تسلیم نہیں ہیں۔

اگر انسان کو مجبور محض مان لیا جائے تو عقلی حیثیت سے افعال کی اچھائی اور برائی کا وہ ذمہ دار نہیں ہو سکتا کہ ذمہ داری تو اختیار و ارادہ پر ہے، جبر پر نہیں ہے۔ اگر کسی کے منہ میں زبردستی شراب ڈال دی جائے اور اس کے حلق سے نیچے بھی اتر جائے تو وہ شراب نوشی کا مجرم نہیں گردانا جا سکتا اس لئے کہ وہ مجبور ہے۔

اس کے علاوہ ہم بداہۃً دیکھتے ہیں کہ انسان صاحب اختیار ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں وہ اپنے اس اختیار سے کام لیتا ہے، مولانا روم نے ان اشعار میں اسی طرف اشارہ کیا ہے:

جملۂ عالم مقر در اختیار　　امر و نہی ایں بیار و آں میار

اور یہ ایسی بدیہی چیز ہے کہ جانوروں کو بھی اس کا شعور ہے۔

ہم چنیں گر بر سگے سنگے زنی　　بر تو آرد حملہ گردی منثنی
گر شتربان اشترے را می زند　　آں شتر قصد زنندہ می کند
خشم اشتر نیست با آں چوب بر او　　پس ز مختاری شتر بردہ است بو
عقل حیوانی چو دانست اختیار　　ایں مگو! اے عقل انسان شرم دار!

اسی طرح اگر انسان کو مختار کل تسلیم کر لیا جائے تو یہ بھی عقلاً خلاف واقعہ ہے۔

بے شبہ خدا نے انسان کو ارادہ و اختیار عطا کیا ہے وہ نیکی و بدی کی راہ منتخب کرنے میں مختار ہے، وہ اپنے اندر اخلاقی صفات پیدا کرنے میں آزاد ہے لیکن بعض حیثیت سے مجبور بھی ہے کہ جب وہ کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں کہ وہ اس کام کے کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ہر قرعہ کہ زد حکم در بارۂ ما　　کردیم نبود غیر آں چارۂ ما

بہر حال دونوں پہلو عقلی لحاظ سے مستبعد اور خلاف واقعہ ہیں اور جبریہ اور قدریہ دونوں

اس لحاظ سے انتہا پر ہیں، رہی مذہبی حیثیت تو اس لحاظ سے بھی انکی غلطی واضح ہے
اگر ان کو بالکل مختار تسلیم کر لیا جائے تو وہ آیات و احادیث صحیحہ جن میں ہر کام کی نسبت
اللہ تعالیٰ کیطرف کی گئی ہے بے معنی ہو جائیں گے ۔

وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ — تم بدوں خدائے قدوس کے جانے کچھ نہیں
إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ — چاہ سکتے ۔ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے ۔

حدیث میں ہے ۔
حَقَّ الْقَلَمُ مَا شَاءَ اللَّهُ كَانَ وَمَنْ لَمْ — جو ہونے والا ہے وہ لکھا جا چکا جو اللہ
يَشَاءُ لَمْ يَكُن (مشکوٰۃ) — چاہتا ہے وہ ہوتا ہے جو نہیں چاہتا نہیں ہوتا ۔

اسی طرح اگر اس کو مجبور محض تسلیم کر لیا جائے تو جد و جہد کی ترغیب کی جتنی آیات و احادیث ہیں
وہ سب بے سود ہو جائیں گی ۔

"فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ — سو جس نے دیا اور اللہ سے ڈرا اور اچھی بات
فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ — کو سچا سمجھا تو ہم اس کی راحت کی چیز کیلئے
وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَىٰ ۔ — سامان دیدیں گے اور جس نے بخل کیا اور
(لیل - ۱) — اچھی بات کو جھٹلایا تو ہم اس کو تکلیف کی
چیز کیلئے سامان دیدیں گے ۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا — واقعی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی (اچھی) حالت
مَا بِأَنْفُسِهِمْ ۔ — میں تغیر نہیں کرتا جب تک کہ وہ لوگ اپنی
(رعد - ۲) — حالت کو نہیں بدلتے ۔

حدیث میں ہے کہ صحابہ نے آپ سے دریافت کیا کہ
يَا رَسُولَ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم — یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہم
أَفَلَا نَتَّكِلُ — لوگ تقدیر پر بھروسہ نہ کر لیں ۔

تو آپ نے ارشاد فرمایا
إِعْمَلُوا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ — عمل کئے جاؤ، ہر شخص جس لئے پیدا کیا گیا ہے
اس کیلئے وہ آسان ہو جائے گا ۔

غرض ان دونوں میں جو پہلو بھی تنہا اختیار کیا جائے، خطرہ سے خالی نہیں ہے، اس لئے درمیان کی راہ یہ ہے کہ انسان مجبور بھی ہے مختار بھی، خدا کی وسعت، قدرت و اختیار کے سامنے اس کے قوت و اختیار کی کوئی حقیقت نہیں اس لئے وہ مجبور ہے، مگر جمادات کے مقابلہ میں اسے اپنے اعمال کیلئے جو شعور اور قوت و اختیار دیا گیا ہے اس کے لحاظ سے وہ با اختیار بھی ہے۔

طبعی اور قدرتی قوانین کے لحاظ سے دوسری مخلوقات کیطرح انسان بھی مجبور ہے لیکن اسے قوت ارادی اور شعور بھی عطا کیا گیا ہے، جس کا خاصہ اختیار ہے، اس لحاظ سے وہ نیکی و بدی کی راہ اختیار کرنے اور اپنے اندر خدائے قدوس کی صفات کمالیہ پیدا کرنے میں مختار ہے۔

وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (بلد-۱) — اور ہم نے انسان کو برائی بھلائی دونوں کی راہیں دکھلا دیں

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا — انسان اور اس کی قسم جس نے اسے درست کیا

فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا۔ (شمس-۱) — اس کو بدکاری و پرہیزگاری دونوں سمجھا دیں۔

مختصر الفاظ میں اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ تخلیقی اور تقدیری اسباب کے لحاظ سے وہ مجبور ہے، اور اپنی طبعی استعداد اور تدبیر اعمال کے لحاظ سے مختار ہے۔

لیکن اکثر صوفیہ کیطرح سرمد کا میلان بھی جبر کیطرف معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے متعدد رباعیوں میں اس خیال کو ظاہر کیا ہے۔

ہر نیک و بدے کہ ہست در دست خدا ست

ایں معنی پیدا و نہاں در ہمہ جا ست

باور نہ کنی اگر دریں جا بنگر

ایں ضعف من و قوت شیطاں ز کجا ست

مگر جبریہ کیطرح وہ اختیار کے بالکل منکر نہیں ہیں بلکہ انسان کو مختار تسلیم کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ انسان با اختیار ضرور ہے، مگر خدا کی قوت و اختیار کے سامنے اس کی قوت و اختیار کی کوئی حقیقت نہیں ہے، اس لئے چاہئے کہ اپنے اختیار کو مختار حقیقی کے حوالے کر دے اور اپنی قوت و اختیار پر مغرور نہ ہو اور اسے اہمیت نہ دے۔

سررشتۂ اختیار بایار بگذار — خود را ز غم و محنت بے ہودہ برآر
ایں عمر گرامی کہ تمامی ہوس است — بایار بسر بر بغفلت مسپار (۱)
افسوس بہ تقدیر نہ بردیم تباہ — زاندیشۂ و تدبیر شد احوال تباہ
مغرور مشو بہ قوت و قلت خویش — لاحول ولاقوۃ الا باللہ (۲)

لیکن اس کے باوجود وہ انسان کی قوت عمل کو بالکل بیکار کرنا نہیں چاہتے بلکہ جد وجہد اور سعی و عمل کی بھی ترغیب دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اندیشۂ تدبیر میں گو خطرات بہت ہیں مگر اس کے باوجود تم تدبیر ہی کو قوی اور تقدیر کو ضعیف سمجھو کیونکہ تدبیر تمہارے اختیار کی چیز ہے اور تقدیر اس سے باہر ہے۔

اندیشۂ تدبیر تو پایست بسنگ — در بیشۂ تدبیر نہاں است پلنگ
تدبیر قوی بداں و تقدیر ضعیف — ایں قوت و ضعف را بینداز بجنگ

مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انہوں نے اعتقاداً یہاں تقدیر کی اہمیت کو گھٹا دیا ہے بلکہ ان کا مقصود صرف سعی، عمل کی ترغیب ہے۔ جو عین مصلحتِ شرع ہے۔ اس لئے انھوں نے پہلے شعر میں متنبہ کر دیا ہے کہ یہ راہ بہت ہی پرخار ہے، اس میں دامن بچا بچا کر چلنے کی ضرورت ہے۔

غرض اس بارے میں سرمد کا مسلک قدرے معتدل ہے کہ وہ تقدیری امور کے لحاظ سے تو انسان کو مجبور سمجھتے ہیں، اور تدبیری امور کے لحاظ سے مختار۔

عقائد کے علاوہ تصوف کے مسائل پر بھی بکثرت سرمد کی رباعیاں ہیں اور انھوں نے تصوف کے تمام مسائل و مقامات کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ذیل میں ہم ان میں سے چند کی تشریح کرتے ہیں۔

محبتِ الٰہی تصوف کا اصلی مقام مقامِ عشق و محبت ہے۔ اس عالم میں خار و گل کی تمیز اٹھ جاتی ہے، ہر چیز میں اسی کا جلوہ نظر آتا ہے، ہر چیز سے محبت کی بو آتی ہے، ہر جگہ اس کا چرچا سنائی دیتا ہے، جو چیز اس سے خالی ہوتی ہے اس میں کوئی کشش نہیں معلوم ہوتی، سرمد کی رباعیوں کا یہ حصہ ان کی شاعری کی جان ہے۔ جب وہ عشق و محبت کے مضامین بیان کرتے ہیں تو سرتاپا اس میں ڈوب جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسروں پر بھی یہی کیفیت طاری ہو جائے۔

ہر چند گل و خار دریں باغ خوش است — بے یار دل از باغ از زاغ خوش است
چوں خون دلم لالہ بہیں در رنگ است — ایں چشم و چراغ نیز با داغ خوش است

مگر یہ مقام ہر شخص کو نہیں ملتا، سوز عشق پروانہ کا حصہ ہے مگس کا نہیں۔ جو شمع و پروانہ کیطرح جلانہ جانے اسے وصال دوست اور سوز عشق نصیب نہیں ہوتا۔

سرد غم عشق بوالہوس را نہ دہند — سوز دل پروانہ مگس را نہ دہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار (۱) — ایں دولت سرمد ہمہ کس را نہ دہند
تا نیست نگردی رہ ہستت نہ دہند — ایں مرتبہ با ہمت پستت نہ دہند
چوں شمع قرار سوختن تا نہ دہی (۲) — سررشتۂ ایں روشنی بدستت نہ دہند

غرض عشق ایک پسندیدہ، قوی اور زندہ چیز ہے، اسی لئے وہ ان ہی اوصاف کے آدمی کو اپنا بسمل بناتا ہے۔

در مسلخ عشق جز نکو را نکشند — لاغر صفتاں و زشت خو را نکشند
تو عاشق صادقی ز کشتن مگریز — مردار بود ہر آنکہ او را نکشند

وہ خود اپنا حال بیان کرتے ہیں۔

از منصب عشق سرفرازم کردند — و ز منت خلق بے نیازم کردند
چوں شمع دریں بزم گدازم کردند — از سوختگی محرم رازم کردند

عیسائی کا اصل مفہوم

ترجمہ ماسٹر عتیق الزماں صاحب ایم۔اے استاذ شعبہ انگریزی جامعۃ الرشاد

قرآن پاک نے کچھ مذاہب کے متبعین کو ایک ممتاز درجہ عطا کیا ہے۔ انہیں وہ اہل کتاب کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ بعض حالتوں میں یہ درجہ مسلمانوں سے تعلقات کے باب میں خصوصی اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ مثلاً اہل کتاب کے یہاں کھانا مسلمانوں کیلئے حلال ہے۔ مسلمان مردوں کو بھی اجازت ہے کہ وہ اہل کتاب میں سے خوبیوں والی عورتوں سے چاہیں تو شادی کر لیں مسلمانوں نے عام طور سے عیسائیوں کو اہل کتاب سمجھ رکھا ہے۔ یہ خیال کئی صدیوں سے متفقہ طور سے مسلمہ چلا آرہا ہے۔ حالانکہ اس یقین کا قوی سبب موجود ہے کہ یہ بات بالکل سچی نہیں ہے۔ عیسائیوں اور عیسائیت کے بارے میں عرصہ دراز سے مسلمانوں کے جو خیالات رہے ہیں حضورؐ کے زمانہ کے نصاریٰ سے ان کا سلسلہ ملتا ہوا نہیں معلوم ہوتا۔

عیسائیت کی پہچان میں مسلمان آج کل دانستہ بہت سی غلطیاں کر رہے ہیں انھوں نے عیسائیوں کو نصاریٰ سمجھ رکھا ہے اور عہد نامہ جدید کو بھی انجیل مقدس مان لیا ہے۔ ان دونوں موہومات کا تنقیدی جائزہ لیا جانا چاہئے اور اگر ضروری سمجھا جائے تو انہیں چیلنج کیا جائے۔

عہد نامہ جدید تو انجیل مقدس ہرگز نہیں ہے جیسے مسلمان کئی وجوہات سے وہی سمجھے ہوتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ عہد نامہ جدید کا متن کسی طرح بھی وہ نہیں ہے جو کتاب اللہ کا ہونا چاہئے مسلمانوں کے خیال میں کچھ بھول چوک سے اس میں تھوڑی سی تحریفات ہو گئی ہیں مگر عہد نامہ جدید کی کسی کتاب سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ قرآن کی طرح یہ اللہ کی کتاب، اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت عیسیٰ پر نازل ہوئی ہے۔ بلکہ حضرت عیسیٰ کی حیات اور ان کے پیغام کا بیان ایک تماشائی کی حیثیت سے ان چاروں کتابوں میں موجود ہے۔

متن کے اختلاف کا موازنہ اسلوب کے اختلاف سے کیا جاتا ہے۔ خدا کی کتاب جیسا ہونا

چاہئے ویسا چاروں میں سے کوئی کتاب نہ تو دعویٰ کرتی ہے اور نہ ہی وہ حضرت عیسیٰؑ کی زبان میں ہے بلاشبہ چند عبرانی کلمات جو ان میں واقع ہیں ان پر بہت زور دیا گیا ہے لیکن صاف ظاہر ہے کہ عہدنامہ جدید کے مصنفوں نے کس قدر غیر معمولی اور غیر متوقع طور پر انہیں بھرتی کیا ہے۔

جب ہم ان تینوں موجودہ صورت حال پر گہری نظر ڈالتے ہیں تو مناسب اسلوب کی کمی اور بھی کھلنے لگتی ہے۔ ان میں سب سے پہلی بات وہ تاریخی حقیقت ہے جس کا دوسری کتابیں دعویٰ کرتی ہیں کہ انجیل مقدس تھی اور حضرت عیسیٰؑ کی زبان میں تھی۔ چرچ کے باضابطہ ریکارڈ سے اس حقیقت کی اور بھی تصدیق ہو جاتی ہے ایماندارانہ اور عاقلانہ اعتراف کی کمی کے باوجود وہ کتابیں آج بھی غائب نہیں ہوئی ہیں جنہیں کلیسا نے سنگین ترین سزاؤں کے بل بوتے پر دانستہ طور سے تلف کرنے کی کوشش کی تھی۔ عبرانی کتابوں کی قیمت پر عہدنامہ جدید کی سوچی سمجھی تخلیق اپنی ایک دوسری ہی کہانی رکھتی ہے۔ اس حقیقت کی شہادت خود پال کے خطوط دے رہے ہیں کہ اسکی ہی وہ شخصیت ہے جس نے اس عمل کو جاری کیا اور اس مقصد کے لئے وہ اپنی ذاتی حاکمانہ شخصیت کے علاوہ اور کسی پر اعتبار نہیں کرتا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنے ان نام نہاد مکاشفات پر بھروسہ رکھتا تھا جو حضرت عیسیٰؑ کا دنیاوی مشن ختم ہونے کے بعد اسے حاصل ہوئے جو تجربات اور معمولی دنیاوی یا انسانی ہدایات سے حاصل نہیں کئے جاسکتے۔

حضرت عیسیٰؑ کے طبعی دنیاوی مشن کے دوران پال نے نہ انہیں کبھی دیکھا، نہ ان سے کبھی بات کی اور نہ ان سے کبھی کوئی بات سنی۔ عیسائی جو چاہیں سوچیں۔ قرآن اور مسلمان یقینی طور پر انہیں ان ذرائع کی حیثیت نہیں دے سکتے جن کے ذریعہ خود حضرت عیسیٰؑ دوسروں تک پیغامات پہنچایا کرتے تھے اور نہ ہی وہ اس طرح پیغام پہنچانے پر مامور تھے حالانکہ مسلمان بھی اس مکاشفات کی اہمیت کو تسلیم کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں لیکن یہ ایک بالکل ہی دوسری بات ہے۔

پال اس بات پر مصر ہے کہ وہ یہودی تھا اور یہودیوں کے عقائد سے کماحقہ آگاہ تھا۔ اس لئے وہ حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے ناواقف نہیں ہو سکتا۔ اس کے پاس یا اسکے دوستوں اور سرد کاروں کے پاس متن کے تحفظ اور اسے خالص رکھنے کے ذرائع کی بھی کوئی

کی نہیں تھی اس لئے کہ خود پال کے خطوط اور فرمودات حقیقی صورت میں آج بھی موجود ہیں۔ وہ لوگ حضرت عیسٰی کے پیغام کو ان کی ہی زبان میں محفوظ رکھنے پر پوری طرح قادر تھے۔ کاش کہ ان لوگوں نے ایسا کرنا پسند کیا ہوتا!

لیکن پال نے پوری دیدہ دلیری کے ساتھ یہ کوشش کی کہ اس کا کارنامہ اسکے عبرانی حریفوں کے کام پر غالب آجائے۔ بہرکیف اسکے اس کام کی مقبولیت نے اس کو پیغمبری کے درجے تک پہنچا دیا۔ اسلام اور مسلمانوں کی نگاہ میں انجیل مقدس صرف اس کتاب کا نام ہو سکتا ہے، جو حضرت عیسٰی پر نازل ہوئی نہ کہ پال پر۔ کوئی بھی چیز جو کوئی صاحب اقتدار تسلیم کر لے بالاحضرت عیسٰی کے، وہ انجیل مقدس ہرگز نہیں ہو سکتی۔ قرآن کا بھی یہی بیان ہے۔

پال صرف یہی نہیں کہ ایک ممتاز کتاب عہد نامہ جدید کو وجود میں لایا بلکہ اسنے نمایاں طور پر ایک الگ مذہب اور اپنے معتقدین کی ایک بالکل جداگانہ جماعت قائم کی۔

پال کا مذہب حضرت عیسٰیؑ کے مذہب سے الگ ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے سے بالکل مخالف تھا۔ یہ حضرت عیسٰیؑ کی الوہیت اور تثلیث کی بات نہیں ہے صرف جس نے دونوں کو منقسم کر دیا تھا بلکہ وہ اپنے روزمرہ کے اخلاق میں بھی اسی طرح مختلف تھے جس طرح نظریاتی موقف۔ مزید یہ کہ یہ اختلاف نہ تو صرف وقتی تھا اور نہ ہی غیر متوقع۔ بلکہ اس پر کافی غور و خوض کیا جا چکا تھا۔ یہ بیک وقت حقیقی بھی تھا اور دائمی بھی۔

جہاں حضرت عیسٰیؑ نے قانون کی بالاتری اور غور و فکر کی افادیت پر زور دیا ہے وہیں پال نجات اور رحمت پر مصر ہے۔ جہاں حضرت عیسٰیؑ نے کسی پر کسی طرح کا جھوٹا الزام لگانے کی اور اپنے قریب ترین عزیزوں تک کے لئے بھی کسی قسم کی جھوٹ کی سخت مذمت کی ہے وہیں پال نے صاف اعلان کر دیا کہ حضرت عیسٰیؑ کا نام لے لینا ہی نجات کے لئے کافی ہے۔ جبکہ حضرت عیسٰیؑ حکومت وقت کے مخالف بھی تھے اور اس سے نفرت بھی کرتے تھے پال نے اس کی بھی تقدیس پر مہر ثبت کر دی اور بغیر کسی چوں و چرا کے حکومت وقت کی اطاعت لازمی کر دی۔ حضرت عیسٰی کا پیغام تو صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے نام تھا اسکے برعکس پال کا خطاب بلا شرکت غیرے تمام غیر مختونوں

کے لئے عام تھا وہ اپنے ہی علاقے ایشیا میں نامقبول ہوتے جبکہ پال مغرب میں انتہائی مقبول و محترم ہو گیا ۔ مشرق کے اسی اختلاف نے آج ساری دنیا کو بتلایا ہے کہ عیسائیت کو وجود میں لانا کس قدر معنی خیز ہے ۔

یہ صورت حال حقیقی معنوں میں بنیادی عیسائیت کے سرچشموں کے بارے میں واضح طور سے تسلیم کی جاتی ہے Antioch کے Acts میں کھلم کھلا یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ سب سے پہلے پال ہی کے متبعین کو "عیسائی" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے ۔ جس عیسائیت کی تخلیق پال نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کی اور اس کے متبعین جس پر عمل پیرا ہے ۔ اس میں اور حضرت عیسیٰؑ کے مذہب کے درمیان یہ نیا نام واضح طور سے خط تفریق کھینچ دینے کے رجحان کی غمازی کرتا ہے ۔ اسلام کے آنے کے بعد بھی یہ تفریق صدیوں تک برقرار رہی ۔ اس دراڑ کو بند کرنے کی کوشش تطابق اور تصفیہ کے انداز میں نہیں کی گئی بلکہ مغرب کے پادریوں اور رومی سلطنت کے ہتھیاروں کی طاقت کے بل بوتے پر کی گئی ۔ یہ تفریق کبھی بھی ختم نہیں ہوئی یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ کے متبعین یا تو اسلام میں ختم ہو گئے یا پھر ترقی پذیر مغربیت سے مرعوب ہو کر اس کی رو میں بہ نکلے ۔

نصاریٰ جن کے بارے میں قرآن خبر دیتا ہے یا جن سے ابتدا میں مسلمانوں کا مقابلہ ہوا تھا وہ لوگ پال کو رد کر چکے تھے اور پال انہیں رد کر چکا تھا ۔ ان لوگوں نے پال عیسائیت کی یورش کا مقابلہ اصولی ، اخلاقی ، معاشرتی ، تہذیبی ، سیاسی اور فوجی میدانوں میں کیا یہ خوب سوچی سمجھی اور مسلسل جنگ تھی اس میں کسی کو کوئی شبہہ یا اختلاف نہیں ہے ۔

مسلمان محض اس وجہ سے دھوکہ کھا گئے کہ عیسائیوں نے اپنا مطلب نکالنے کے لئے نصاریٰ کو عیسائیوں ہی کا ایک فرقہ کہنا شروع کر دیا جو سراسر غلط بات ہے ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نصاریٰ ایک بالکل ہی جداگانہ عقیدہ کے حامل تھے ان کو اور عیسائیوں کو بعد کے ان مسلمانوں نے جنھوں نے اسلام کو مستشرقین سے سیکھا ایک ہی ایک ہی سمجھنا شروع کر دیا ۔ عیسائی طرز فکر کی یہ غلامانہ پیروی کوئی حیرت کی بات نہیں ہے لیکن اب مسلمانوں کو عقیدہ اور عمل کے استحکام کیلئے اپنے اور دوسروں کے بارے میں زیادہ حقیقی اور تحقیقی معلومات کی ضرورت ہے ۔

بَابُ الاستفسَارِ وَالجوابُ

دو حل طلبُ مسئلے

اس عنوان کے تحت جناب حکیم شکیل احمد صاحب شمسی لکھنؤ کا ایک مراسلہ "صدق جدید" ۸ اگست ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا ہے۔ انہوں نے دو مسئلوں کے بارے میں اہل علم کی رائے طلب کی ہے۔ ہم یہاں ان کا مراسلہ نقل کرتے ہیں اور پھر شریعت کی روشنی میں اپنی فہم کے مطابق کچھ عرض کرنے کی کوشش کریں گے۔

مراسلہ

"مولانا عبد الماجد صاحب مرحوم و مغفور کی حیات میں صدق جدید میں اپنے مراسلات کے ذریعہ مجھے اپنے شکوک رفع کرنے اور معلومات میں اضافہ کرنے کا موقع اکثر مل جاتا تھا۔ مولانا کی وفات کے بعد اب ذہن میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات تشنۂ جواب ہیں۔ کیونکہ عوامی اخبارات اور رسائل کے لئے یہ مسائل غیر موزوں ہیں اور مخصوص دینی و علمی پرچوں میں روایت پرستی اور قدامت کی تصویب اور مدافعت کا رجحان اس قدر زیادہ ہے کہ ذہن سلیم اس سے مکدّر ہو جاتا ہے۔ مرحوم مولانا کی خصوصیت تھی کہ کسی مصلحت کوشی کے بغیر نادمانہ اور محققانہ طور پر اپنی رائے کا اظہار کرتے اور قدامت کی طرف پورا رجحان رکھنے کے باوجود معقول بات کو مسترد نہیں کرتے تھے۔

چونکہ "صدق جدید" کا حلقۂ اشاعت عام طور پر صاحب علم و فضل، ذہین، وسیع النظر، سلیم الطبع اور تنقیدی و اجتہادی صلاحیتیں رکھنے والوں کا حلقہ ہے اس لئے ایسے مسائل میں ان سے رجوع کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ اس سلسلہ میں تعاون فرما سکیں گے۔ یہ میرے انفرادی مسائل نہیں ہیں۔ ملت کے بھی افراد سے تعلق رکھتے ہیں۔

سر دست دو مسئلے حل طلب ہیں اور اصحاب نظر سے ان کے حل کی استدعا ہے۔

۱۔ غیر سودی یا اسلامی بینک جو مختلف ممالک میں قائم ہوئے ہیں ان کے بارے میں بھی واقف حال کچھ روشنی ڈالیں اور یہ بتائیں کہ موجودہ بنکوں اور ان بینکوں کے طریقہ کار میں کیا فرق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مضاربت ہوتی ہے یعنی سرمایہ میں شرکت کے ذریعہ تجارتی نفع و نقصان میں حساب دار شریک ہوتے ہیں اور ختم سال

پر بجائے کسی متعین رقم کے بعد میں منافع تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات اتنی سیدھی نہیں ہے۔ بینکوں کا خاص کام تو روپیہ کا ہی لین دین ہوتا ہے تو کیا یہ بینک جب قرضے دیتے ہیں تو اس پر کوئی متعین منافع (انٹرسٹ) نہیں لیتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر انہیں منافع کہاں سے ہوتا ہے۔ اور اگر لیتے ہیں تو کیا قرضدار سے شرکت مضاربت کرتے ہیں، یہ ایک ناممکن طریقہ کار ہے اور اس میں نقصان کے ہی امکانات زیادہ ہیں۔ پھر دوسرے ملکی اور غیر ملکی بینکوں سے جو لین دین ہوتا ہے، بین الاقوامی تجارتوں میں جو روپیہ آتا جاتا ہے وہ سب تو بین الاقوامی تسلیم شدہ اصولوں پر ہی ہوتا ہے، کیا آپس میں انٹرسٹ یا ربوا کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے تو صرف حصّہ داروں کی مضاربت سے یہ تمام سرگرمیاں غیر سودی کیسے ہو جائیں گی۔

٢- دوسرا مسئلہ نصاب زکوٰۃ کا ہے۔ ٥٦ تولہ چاندی اور ۷½ تولہ سونا میں تو قیمت اس وقت مساوی رہی ہوگی جب فقہائے کرام نے یہ مقدار متعین کی تھی لیکن اب دونوں میں کئی گنا کا فرق ہے تو ایک کو گھٹا کر یا دوسرے کو بڑھا کر مقدار کا تعین کیوں نہیں کیا جاتا۔ ایک عام آدمی کے لئے یہ بڑی الجھن ہے۔ وہ کہتا ہے کہ احتیاطاً اس میں ہے کہ نیچے والی مقدار کو معیار بنایا جائے۔ قانونی بات نہیں ہے۔ قانون صاف اور دو ٹوک ہونا چاہیئے۔ اگر بیت المال کا سرکاری نظام موجود ہوتا تو وہ لوگوں کی ذاتی پسند اور احتیاط پر مبنی نہ ہوتا۔ آج کل بین الاقوامی طور پر کرنسی کی قیمت کے لئے سونا ہی معیار ہے۔ لہٰذا اس کو اختیار کر کے یہ دوعملی ختم کر دی جائے تو کیا مضائقہ ہے؟ براہ کرم اصحاب علم توجہ فرمائیں۔"

جواب:- جہاں تک پہلے مسئلہ کا تعلق ہے اس سلسلہ میں متعدد اہل علم نے کتابیں لکھی ہیں۔ خاص طور پر ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے نہ صرف اسلامی بینکنگ پر مستقل کتابیں لکھی ہیں بلکہ وہ سعودی عربیہ میں عملی طور اسی کام کے لئے بلائے گئے ہیں۔ راقم الحروف ان کی کتاب نہیں دیکھ سکا ہے مگر مضاربت کی بنیاد پر یہ بینک قائم ہونگے اس لئے اس سلسلہ میں اپنی معلومات کی حد تک چند باتیں عرض کی جاتی ہیں

اسلامی بینکنگ کے سلسلہ میں دو بات ذہن میں رہنی چاہیئے ایک یہ کہ موجودہ دور میں ساری دنیا میں چونکہ ایک سسٹم جاری ہے اس لئے دوسرے کسی نئے سسٹم کے جاری کرنے میں کچھ دقتیں اور نقصانات کا پیش آنا اور اس سلسلہ میں شبہات کا پیدا ہونا ایک[٢] . انہوں نے سودی کاروبار کو بھی رضامندی کا ایک لین دین سمجھا تھا۔ اسلئے قرآن نے اس کے جواب میں بس اتنا کہا کہ "اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا" پھر آگے مزید اطمینان کے لئے کہا کہ "يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ" "اللہ تعالیٰ ربو کو گھٹاتا اور زکوٰۃ بڑھاتا

[٢] فطری بات ہے۔ اسلام نے جس وقت سودی کاروبار کو حرام کیا تھا اس وقت بھی یہی شبہات پیدا ہوئے تھے۔

۳ اس لئے ایک مومن کے اطمینان کے لئے اتنا کافی ہے کہ موجودہ سودی بینکنگ سسٹم چاہے جتنا مفید اور آسان تر معلوم ہوتا ہو اور اسلامی سسٹم میں چاہے کتنی ہی دشواری اور نقصانات نظر آتے ہوں مگر پہلے طریقے کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے اور دوسرے طریقہ کو حلال کیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اگر کسی ملک کا پورا بینکنگ نظام بدل دیا جائے اور سارے لوگ اسی کے مطابق اپنا سرمایہ بنکوں میں جمع کرنے لگیں تو جو دقتیں

۴ اس وقت نظر آرہی ہیں وہ تھوڑے سے نقصان اور اس فیصلے کے بعد ایک مفید صورت اختیار کر لیں گی۔

۴ موصوف کی یہ بات قابل غور ہے کہ بینک تو ایک متعین منافع پر سرمایہ دیتے ہیں اور مضاربت میں نفع متعین نہیں ہوگا تو اس بات کا امکان ہے کہ بینک میں منافع کی رقم اس مقدار میں نہ آئے جو خود اس کو چلانے کے لئے کافی ہو۔ مگر اس سلسلہ میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیئے کہ جب پورے معاشرہ کے ذہن میں یہ بات رہے گی یاد رکھی جائے گی کہ یہ بینک ان کا ہی ایک رفاہی ادارہ ہے، اگر کسی کے کاروبار میں واقعی گھاٹا ہو جائے گا تو اس میں ایسے فنڈ بھی ہوں گے جس سے کسی رقم کی واپسی کی شرط کے بغیر ان کی مدد کی جائے گی۔ اور حکومت کے پاس بھی ایسے فنڈ ہوں جس سے کاروبار میں نقصان کی تلافی ممکن ہوگی۔ جب ہر آدمی کو یہ اطمینان ہو گا کہ نقصان کی تلافی کی صورتیں بھی موجود ہیں تو وہ اپنی منفعت کا مقررہ حصہ ضرور حوالہ کرنے پر راضی ہو جائے گا اس کے لئے کچھ قانونی بندشیں بھی لگائی جا سکتی ہیں۔ مثلاً (۱) حکومت تمام تجارتی شعبوں کی چھان بین کے لئے، ایک مستقل بندوبست کر سکتی ہے، جو مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ، ملکی پیداوار، بین الاقوامی تجارت، کارکنوں کی کارکردگی اور پیدائش دولت کی لاگت وغیرہ کے بارے میں معلومات فراہم کرے اور پھر اسے ایک رپورٹ کی شکل میں وہ برابر شائع کرتی ہے اور پھر اس کے ذریعہ ہر کاروبار میں اوسط منافع کی ایک شرح مقرر کر دی جائے۔ یعنی نہ تو بہت زیادہ کامیاب آجر کا معیار ہو اور نہ تن آسانی اور بے سلیقہ اجر کا معیار منافع ہو بلکہ درمیان کی صورت اختیار کی جائے گی۔ (۲) بینک کے سرمایہ کی واپسی کے وقت جو آجر اس اوسط منافع کی شرح سے کم منافع کا اعلان کرے اس کی چھان بین کی جا سکتی ہے۔

(۳) اس سلسلہ میں آجر اور بینک کے درمیان اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے اسلامی حکومت محکمہ احتساب مقرر کر سکتی ہے اور وہ فیصلہ کر سکتا ہے جس میں غلط حساب پیش کرنے والوں کو سزا بھی دی جا سکتی ہے اور سرمایہ کا نقصان اس کے ذمہ ڈالا جا سکتا ہے۔ بین اقوامی تجارت میں ہر وقت ان ملکوں کے لئے مزید دقت ہے مگر وہ اس کے لئے الگ بین اقوامی بینک قائم کر کے یا کوئی اور صورت اختیار کر کے عام ملکی بینکوں کو ربا سے محفوظ کر سکتی ہے اور بین الاقوامی تجارت کے لین دین کا تعلق انہی مخصوص بینکوں کے سپرد کر سکتے ہیں

کچھ دنوں کے بعد ممکن ہے کہ دوسرے ملک بھی اس غیر سودی بینکنگ سسٹم کو اپنانے پر راضی ہو جائیں یا کم از کم ان ملکوں کے کاروبار کرنے میں اس کا لحاظ کرنے لگیں۔

بہرحال یہ مضاربت کے فقہی اصولوں کو سامنے رکھ کر چند باتیں عرض کر دی گئی ہیں جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے۔ بلاسودی بینک کاری کے سلسلہ میں نجات اللہ صدیقی صاحب کی کتاب کے علاوہ پاکستان میں بلا سودی بینک کاری پر دوسرے اداروں نے بھی کتابیں شائع کی ہیں۔ خاص طور پر پاکستان کے مشہور ماہر معاشیات محمد اکرم خاں کی مختصر کتاب میں بھی اس کے ہر پہلو پر گفتگو کی گئی ہے جس کو "مرکز تحقیق لاہور" نے شائع کیا ہے جس کے ڈائرکٹر مولانا محمد متین ہاشمی صاحب ہیں۔

---

(۲) دوسرے مسئلہ کے سلسلہ میں عرض ہے کہ جہاں تک چاندی کے نصاب کا تعلق ہے اس سلسلہ میں یہ عرض ہے کہ اس پر امت ہمیشہ متفق رہی ہے اور صحیح اور مشہور احادیث میں چاندی ہی کے نصاب کا ذکر ہے۔ مہر وغیرہ میں بھی درہم کا ذکر آیا ہے جو چاندی کا سکہ تھا پھر اس میں غریبوں کا فائدہ بھی ہے اس لئے اسی کو فقہا نے معیار نصاب مقرر کیا ہے۔ مگر موجودہ دور کے بعض علما مثلاً شیخ ابوزہرہ، شیخ عبدالوہاب خلاف، اور یوسف قرضاوی وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ چونکہ سونا ہی موجودہ دور میں معیار قرار دے دیا گیا ہے اس لئے اسی کو معیار نصاب بنایا جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر چاندی کو معیار بنانے میں غریبوں کا فائدہ ہے تو اس میں ارباب مال کے ساتھ ناانصافی بھی ہے اور احادیث سے سونے کو معیار نصاب ہونا بھی ثابت ہے

راقم الحروف کے خیال میں کوئی بھی اسلامی حکومت چاندی یا سونے میں سے جس کو چاہے معیار مقرر کر سکتی ہے۔ یہ کسی نص صریح کے خلاف نہیں ہوگا۔ البتہ جب تک اس کی کوئی قانونی صورت نہیں ہو پاتی اس وقت تک ہم سونے یا چاندی میں جسے بھی معیار نصاب بنائیں گے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ البتہ سونے کو چاندی میں ضم کرنے کی جو صورت فقہا تجویز کرتے ہیں وہ قابل غور ہے صاف بات تو یہ ہے کہ اگر چاندی کا نصاب پورا ہے تو اس سے زیادہ زکوٰۃ ادا کی جائے اور اگر سونا پورا ہے تو سونے سے زکوٰۃ ادا کی جائے، ایک دوسرے کے ساتھ ضم کرنے کی بات کچھ زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتی اور نہ اسوۂ صحابہ سے اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔ البتہ کسی کے پاس سونے یا چاندی کی شکل میں زیور یا کوئی چیز نہیں ہے مگر کاغذی سکہ موجود ہے تو اوپر اسی کے بارے میں عرض کیا گیا ہے کہ دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی اختیار کی جائے گی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ واللہ اعلم بالصواب

محترم جناب مولانا حبیب اللہ صاحب ندوی

ایڈیٹر، الرشاد، اعظم گڈھ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے بخیر و عافیت ہونگے۔ ہمارے یہاں کچھ لوگوں نے چند سال پہلے سے مدرسوں پر چرم قربانی دینا بند کردیا ہے یہ لوگ اپنے اعزاء واقارب کو بھی منع کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنا چرم قربانی جمع کرکے کسی غریب کو دیدیتے ہیں وہ غریب اس کی قیمت کی کل رقم یا اکثر تعمیر مسجد میں صرف کردیتا ہے۔ مدرسہ کے لوگ اس صورت کو غلط اور ناجائز قرار دے کر اس کی مخالفت کرتے ہیں مگر سوء اتفاق امسال عوام میں ہمارے یہاں کے مدارس سے کچھ بیزاری پیدا ہوگئی ہے جس کی وجہ سے کچھ لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ مدرسہ کی طرح مسجد پر بھی چرم قربانی دیا جاسکتا ہے چنانچہ وہ لوگ مسجد ہی کے نام پر چرم قربانی وصول کرنے لگے بعض لوگوں نے کہا ہم خود اپنے لئے مانگتے ہیں مگر اس کی رقم ہم اپنی مسجد میں لگائیں گے یہ لوگ اپنے جواز میں مظاہر العلوم سہارنپور کا ایک فتوی پیش کرتے ہیں جس کی نقل درج ذیل ہے۔

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ زید بغرض تحصیل چرم قربانی بکر خالد وغیرہ کے پاس گیا، خالد نے کہا ہم نے چمڑا مسجد پر دیدیا ہے۔ چنانچہ متولی مسجد کے پاس چمڑا بھیجدیا متولی مسجد نے چمڑا فروخت کرکے اس کی قیمت اپنے پاس رکھ لی۔ سوال یہ ہے کہ اگر متولی مسجد اس رقم کو کسی غریب کو ہبہ کردے اور وہ غریب اپنی خوشی سے اس رقم کو تعمیر مسجد میں لگادے تو یہ شکل شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب:- حامداً ومصلیاً - تملیک کرنے سے مذکورہ رقم تعمیر مسجد میں خرچ کرنا درست ہے۔"

والسلام

ابو عمار اصلاحی، بہادر گنج غازی پور

۱۲ر ذی الحجہ سنہ ۱۴۰۳ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ھوالمصوب ۔ اس طرح مسجد یا مدرسہ کی تعمیر یا تنخواہ میں چرم قربانی کا لگانا بالکل صحیح نہیں ہے جن حضرات نے اس صورت کو صحیح اور جائز کہا ہے ان کے پیش نظر یہ ہبہ کی صورت ہے۔ یعنی جس طرح قربانی کرنے والا قربانی کے چمڑے کو اپنے ذاتی استعمال میں لانا چاہے تو وہ لا سکتا ہے اسی طرح وہ کسی کو ہبہ بھی کرسکتا ہے۔

الرشاد کی ڈاک

(۱)

مکرم بندہ، کرم فرمائے من
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جناب والا کی عنایت سے "الرشاد" میرے پاس آتے ہوئے تقریباً ۱½ سال ہوگیا ہے۔ میں ہر شمارے کا بغور مطالعہ کرتا ہوں۔ اس کے مضامین، خصوصاً آپ کے فرمودات، میرے لئے علم وہدایت کا ایک سرچشمہ ہوتے ہیں اور میں ان سے برابر استفادہ کرتا رہتا ہوں۔ آپ کے بعض مضامین کا انگریزی ترجمہ اپنے سہ ماہی مجلہ (اسلامک اینڈ کمپریٹو لا کوارٹرلی) میں شائع کرنے کا بھی ارادہ ہے۔ اور جلد ہی ان شاء اللہ اپنے بعض اردو مضامین آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا۔ شاید آپ "الرشاد" کے لئے پسند فرمائیں۔

اعظم گڈھ سے متعلق دو مشہور ہستیاں، شبلی نعمانی مرحوم اور سید سلیمان ندویؒ۔ دونوں بزرگوں کے "فقہی موقف اور خدمات"۔ ان دنوں میری نگرانی میں میرے دو شاگردوں کا موضوع تحقیق ہیں۔ اس سلسلہ میں ان دونوں کو جلد ہی اعظم گڈھ آپ کی اور دیگر اہل علم کی خدمت میں بھیجنے کا ارادہ ہے۔

میرے لائق جو بھی خدمت ہو ضرور تحریر فرمائیں۔

آپ کا کفش بردار

طاہر محمود

صدر شعبۂ قانون

ادارہ علوم اسلامیہ ہندیہ (دہلی)

---

(۲)

محترمی و مکرمی متعنا اللہ تعالیٰ بطول حیاتکم آمین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بمنہ تعالیٰ مع الخیر والعافیت ہوں۔ نامۂ گرامی موصول ہو کر باعث افتخار ہوا۔ احقر کی دیرینہ تمنا یہی ہے کہ شمائل ترمذی کا ترجمہ "آپ کے گراں قدر حواشی سے مزین ہو کر جلد از جلد منصۂ شہود پر آجائے۔

ہیں۔ ہر ممکن تعاون کے لئے ہر تن مستعد ہوں ان شاء اللہ تعالیٰ۔ "الفرقان" کے وہ تمام پرچے بحمد و محفوظ ہیں
لیکن باوجود تلاش کے اس وقت نہیں ملے ان شاء اللہ تعالیٰ جلد ہی خدمت منیفہ میں کسی کے ہاتھ روانہ کر دوں گا۔
حضرت والا سے دعا کی درخواست ہے۔

حاضرین مجلس سے بھی سلام مسنون کہیئے۔ والسلام دعاجو
ظفر احمد صدیقی کان اللہ تعالیٰ لہٗ
محلہ ملا ٹولہ۔ شہر جون پور۔ یوپی ہند

---

(۳)

قابل صد احترام حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب

السلام علیکم

بعد سلام مسنون۔ امید ہے کہ مزاج اقدس بخیر ہوں گے "الرشاد" برابر وصول ہوتا رہتا ہے۔
ہر ماہ پورے شوق کے ساتھ انتظار رہتا ہے الرشاد کے تمام مضامین ماشاء اللہ پر مغز ہوتے
ہیں اہل علم کی نظر میں رسالہ مقبول ہے۔ اور ہونا بھی چاہیئے کیونکہ مضامین بہت مدلل اور جامع ہوتے ہیں تازہ
شمارہ میں حکیم الاسلام مولانا محمد طیبؒ پر جو اداریہ تحریر فرمایا کافی پسند آیا آپ نے اچھی بات تحریر فرمائی کہ کچھ
مدت کے واسطے توقف کرتے تو یہ صفحہ سیاہ دار العلوم کی تاریخ سے چسپاں نہ ہوتا آج یہ درسگاہ شروع ہے
مگر اس کا بنایا ہوا وقار اور وزن جو برسوں کی جد و جہد سے بنا تھا ختم ہو گیا اللہ تعالیٰ ان حضرات کو صحیح سمجھ عطا فرمائے۔
حضرت مہتمم صاحب مرحوم کے لئے ایصال ثواب کیا گیا ساتھ ہی ساتھ اپنے اس عظیم رہنما کو خراج عقیدت پیش کرنے
کے لئے ایک لائبریری کا قیام عمل میں آیا جس کا نام مولانا محمد طیبؒ لائبریری رکھا گیا ہے فی الحال ۔۔۔ روپیہ کی کتابیں
خرید کر عوام و خواص کے لئے رکھی گئیں ہیں مزید اسلامی تاریخ و سیرت کی کتابوں کی ضرورت ہے۔ اہل خیر حضرات
توجہ فرمائیں دعا کی درخواست ہے طلبہ و اساتذہ بخیر ہیں سلام تحریر کرواتے ہیں

والسلام عباد احمد نانوتوی۔ معلم مدرسہ مدینۃ العلوم

محترم گرامی قدر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ السلام علیکم

الرشاد کا اگست ۱۹۸۳ء کا شمارہ موصول ہوا۔ بہت بہت شکریہ۔ میں نے اس سے قبل بھی لکھا

تھا" مفت خوانی" میرے ضمیر کے خلاف ہے اس کا حل یہ ہے کہ آپ مجھے رعایتی چندہ سے باخبر کریں تاکہ اتنی ہی رقم ارسال کر کے اپنے ذہن کے بوجھ کو کچھ ہلکا کر سکوں حالانکہ دل یہ چاہتا ہے کہ ایسی رقم بھیجوں کہ رسالہ کا کچھ بھلا ہو بیرنگ پتہ۔ ۲۔ ہم نمبر بھی بڑا ہوتا ہے۔

نیاز فتحپوری کا مضمون قرآن کریم کے انگریزی تراجم پر ایک نظر دیکھا میں جن جن تراجم کا ذکر ہے وہ بفضلہ سب میرے پاس موجود ہیں لیکن اس مجبوری کا تو کچھ حل ہی نہیں ہے۔ کاتب کو انگریزی حوالوں اور عبارتوں کے نام نقل کرنے میں کتنی زحمت ہوتی۔ اگر کبھی انگریزی یا جدید فارسی سے ترجمہ مقصود ہو تو مجھے بھی آپ یاد کر سکتے ہیں، حسب توفیق انشاءاللہ خدمت سے دریغ نہ کروں گا۔ خود آپ کا مضمون سرمد پر بڑا معلومات افزا ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ آپ کو جتنا مواد مل جاتا ہے وہ ہر ایک کے بس کا نہیں، ابوالکلام کی کتاب سے جو غلط فہمی چل رہی ہے اس کی اب تلافی ہوئی مضمون کا کمال یہ ہے کہ نہ سرمد کا استخفاف ہوتا ہے اور نہ ابوالکلام کا،

میری دلی دعا ہے کہ آپ کے جامعہ اور آپ کے رسالہ کو فروغ حاصل ہو ایسے ادارہ کی اشد ضرورت ہے کہ جس سے کٹھ ملا نہ نکلیں بلکہ اسلام کا صحیح تصور لے کر "طلوع" ہوں تاکہ مسلمانوں کی رہنمائی ہو سکے۔

والسلام

سید محمد آفاق ہیڈ ماسٹر ڈپٹی
نفتن سیکنڈ، سیتاپور، یوپی

علماء کی ذمہ داری | علماء کی ذمہ داری کے سلسلہ میں حضرت علیؓ کا قول پھر زجان بنانے کے قابل ہے۔

لا یسأل الجهلاء لِمَ لَمْ يَتَعَلَّمُوا حَتّٰى يُسْأَلَ العلماء لِمَ لَمْ يُعَلِّمُوا ہ

جاہلوں سے ان کی جہالت کے سلسلہ میں سوال کرنے سے پہلے علماء سے پوچھا جائے گا کہ تم نے ان کو تعلیم کیوں نہیں دی؟
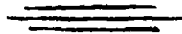
کوائف جامعۃ الرشاد

بحمد اللہ جامعۃ الرشاد کا ہر شعبہ اپنی فطری رفتار سے ترقی پذیر ہے۔ اس سال عربی درجات، درجہ حفظ اور مکتب میں طلبہ کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے درجات کے لئے درسگاہ کی عمارت کے اوپر دو چھپر ڈلوانے پڑے اور دارالاقامہ کے دو نئے کمرے بن جانے کے باوجود جگہ تنگ ہورہی ہے اس لئے اس سال ہمکو بہت سے لڑکوں کو واپس کرنا پڑا۔ جامعۃ الرشاد کی نگرانی میں ایک انگلش میڈیم نرسری اسکول "رشاد نرسری اسکول" کے نام سے کھول دیا گیا ہے۔ جس میں چار استانیاں کام کررہی ہیں۔ پوری کوشش کی جارہی ہے کہ غیر اسلامی ماحول کے نرسری اسکولوں سے مسلمان بچوں کو کاٹ کر پورے اسلامی ماحول میں معیاری بنیادی تعلیم دی جائے۔ بحمد اللہ لائق استانیاں مل گئی ہیں جو انگلش میڈیم میں تعلیم دے رہی ہیں اور ساتھ ہی اردو، قرآن پاک وغیرہ کی تعلیم کے ساتھ عملی طور پر ان کو نماز وغیرہ کا عادی بنایا جارہا ہے۔ ادارہ کے تمام شعبوں میں اس وقت پچیس اساتذہ اور استانیاں کام کررہی ہیں۔ مقیم وغیر مقیم طلبہ کی تعداد پانچ سو سے تجاوز ہے

ایک طرف حکومت کی تعلیمی پالیسی کے اثرات سے ہمیں اپنی نسل کو بچانا ہے۔ دوسری طرف آر ایس ایس اور ان کے ہمنوا افراد نے رضاکارانہ طور پر پورے ہندوستان میں ششو مندر کھولنے کی تحریک چلا رکھی ہے اس سے بھی مسلمانوں کو ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ اس کے ذریعہ مسلمانوں بچوں کو اپنی زبان اور تہذیب سے کاٹنا چاہتے ہیں۔ ہمارے ضلع میں ایک قصبہ دیوگام ہے وہاں ایک ششو مندر چلتا ہے۔ جس میں سو ڈیڑھ سو مسلمان بچے بھی پڑھتے تھے۔ جب کوئی مسلمان بچہ اپنا کھانا لے کر اس میں جاتا تھا تو وہ ان کا ڈبہ دیکھتے تھے کہ وہ انڈا، گوشت یا کباب وغیرہ لے کر تو نہیں آیا ہے۔ اگر کسی لڑکے کے ڈبہ میں یہ چیزیں ملتیں تو اسے پھنکوا دیتے تھے۔ وہ بچوں سے سلام کے بجائے ہری اوم کہلاتے تھے اور کھانے سے پہلے ایک منتر پڑھوا کر پھر کھانا کھانے کی اجازت دیتے وہاں کے مسلمانوں کو اس سے تکلیف ہوئی اور ان کا ایک وفد راقم الحروف کے پاس آیا اور صورت حال بتائی۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ لوگوں کے لئے بڑی بے غیرتی کی بات ہے کہ آپ اسے برداشت کررہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پھر کیا جائے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ اپنا الگ نرسری اسکول کھولیں۔ اتفاق سے برادرم وکیل احمد انصاری

صاحب بھی موجود تھے۔ ہم لوگوں نے عرض کیا کہ آپ کل پورے قصبہ کے لوگوں کو جمع کریں۔ ہم لوگ وہاں آکر اس کا الگ انتظام کرنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق ہم لوگ گئے اور بحمداللہ دوسرے ہی دن اس کا قیام عمل میں آگیا اور کئی مہینے سے وہ چل رہا ہے اور اس میں چار استانیاں کام کر رہی ہیں اور دو سو کے قریب بچے تعلیم پا رہے ہیں۔ اس وقت مکاتب کے دائرہ کو وسیع کرنے کے ساتھ نرسری اسکولوں کے قیام کی طرف توجہ دینے کی سخت ضرورت ہے۔ راقم الحروف اس سے پہلے بھی بار بار لکھ چکا ہے کہ اس وقت سب سے بنیادی کام یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کے نظام کو ہم اپنے ہاتھ میں لے لیں یہی ایک راستہ ہے جس سے ہم اپنی آنے والی نسل کے دین و ایمان اور زبان و تہذیب کو بچا سکیں گے، دوسروں کی دہائی دینے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

مدرسہ کے دو ہمدرد مولانا تقی الدین صاحب ندوی اور مولانا نعیم صاحب صدیقی ندوی سالانہ چھٹیوں میں وطن آئے تھے۔ درمیان قیام مولانا تقی الدین صاحب کئی بار مدرسہ تشریف لائے اور کارکنوں کی ہمت افزائی کی صورتیں پیدا کیں۔ مولانا نعیم صاحب کو مدرسہ سے تعلق ہی نہیں بلکہ عشق ہے۔ وہ مدرسہ کی مالی و اخلاقی مدد ہماری توقعات سے زیادہ کرتے اور کراتے رہتے ہیں۔ یہی نہیں کہ وہ اپنے تعلقات سے کام لیتے ہیں بلکہ بذات خود اپنی جیب سے مدرسہ کے لئے بہت کچھ کرتے رہتے ہیں۔ پچھلے سال انہوں نے مسجد میں تین پنکھے لگوائے تھے اس سال انہوں نے ڈائننگ ہال میں تین پنکھے لگوائے اور تقریباً آٹھ سو روپے بچوں کی لائبریری "ندوۃ الطلبہ" کو دئے اور تیسرے درجے کے تمام ملازمین کو اپنی طرف سے پچاس پچاس روپے انعام دئے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے مولانا تقی الدین صاحب اور مولانا نعیم صاحب کے لئے صمیم قلب سے دعا کرتے ہیں کہ ان حضرات کو صحت و عافیت سے رکھے اور ہر طرح کی عزت و جاہت سے نوازے۔

ان کے علاوہ پاکستان سے آئے ہوئے کئی مہمان بھی راقم الحروف سے ملے اور مدرسہ دیکھنے آئے ان میں مولانا سید محمد متین ہاشمی صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور کے ڈائرکٹر ہیں جس ادارہ نے ایک درجن سے زیادہ علمی و دینی کتابیں شائع کی ہیں اور اس کے تحت ایک سہ ماہی رسالہ "منہاج" کے نام سے نکل رہا ہے۔ موصوف نے ازکرم منہاج کے متعدد شمارے اور کئی کتابیں ادارہ کو عنایت کیں اور انہوں نے یہ بھی پیش کش کی کہ راقم الحروف کی جو کتاب بھی انہیں

مل جائے گی اور وہ بڑے شوق کے ساتھ اسے شائع کریں گے۔ ان حضرات سے پاکستان کے حالات پر بھی گفتگو ہوئی جس سے اندازہ ہوا کہ بھٹو کے دور میں پاکستان کے اندر جو بہت سی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور دینی خرابیاں بلکہ گمراہیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ جنرل ضیاء الحق نے بڑی حکمت سے انہیں دور کر دیا ہے۔ یا وہ کم سے کم دب ضرور گئی ہیں۔ پاکستان میں جو خود غرض سیاسی لوگوں نے تحریک چلا رکھی ہے وہ بالکل بے اثر ہے۔ اس کا شور شرابا زیادہ تر بی بی سی کے ریڈیو اور ہندستان کے اخبارات ہی میں نظر آتا ہے ہندوستان کے اخبارات جمہوریت کی دہائی دے رہے ہیں لیکن موجودہ دور میں جمہوریت سے زیادہ قیمتی چیز ملک کا امن وامان، اسلامی قدروں کی ہمت افزائی اور معاشی خوشحالی ہے۔ وہ چیز جنرل ضیاء الحق کے دور میں زیادہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ان کے ان کی رایوں اور خیالات سے اتفاق کیا جائے مگر عام طور پر وہاں سے آنے والوں کے تاثرات یہی تھے۔

ہم مجمع اللغۃ العربیۃ اردنی کے شکرگذار ہیں کہ اس نے تین سال کے اندر جتنے پرچے اس کی طرف سے شائع ہوئے ہیں سب ادارہ کو بھیج دئے ہیں اور خط لکھا ہے کہ جو چیزیں آئندہ اکیڈمی کی طرف سے شائع ہوں گی۔ وہ سب بھیجی جاتی رہیں گی۔ المجمع العلمی دمشق سے زیادہ تر ادبی قسم کے تحقیقی مضامین اور کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ مگر اس اکیڈمی سے ادبی موضوعات کے علاوہ، علمی اور دینی موضوعات پر مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ کوشش کی جائے گی کہ آئندہ بعض مضامین کے ترجمے ناظرین ارشاد کی خدمت میں پیش کئے جائیں گے۔

احتیاط

ایک عیسائی نے امام اوزاعی کے پاس ایک مٹکا شہد ہدیہ دیا۔ اور کہا کہ آپ ایک خط شہر بعلبک کے والی کو (مالی مدد کے لئے) لکھ دیجئے آپ نے اس سے کہا کہ اگر خط لکھوانا چاہتے ہو تو اس کی شرط یہ ہے کہ یہ شہد واپس لے لو ورنہ میں شہد تو قبول کر لوں گا مگر خط نہیں لکھ سکتا، وہ راضی ہو گیا۔ آپ نے شہد واپس کر دیا اور اس کی امداد کے لئے خط لکھ دیا اور اس کی مدد ہو گئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی مقصد کے حصول یا سفارش کے لئے جو ہدیے پیش کئے جاتے ہیں۔ وہ صحیح نہیں ہے۔

نئی کتابیں

(۱) نظام عشر کی برکات	صفحات ۶۴		مولانا سید محمد متین ہاشمی صاحب
(۲) اسلامی نظام عدل کا نفاذ	" ۴۰		" " "
(۳) بلاسودی بینک کاری	" ۵۶		محمد اکرام خاں صاحب

یہ تینوں کتابیں مرکز تحقیق۔ دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری۔ لاہور نے شائع کی ہیں۔ ان میں سے ہر کتاب علمی و تحقیقی انداز میں لکھی گئی ہے نہ اس میں صحافی سطحیت ہے، اور نہ افسانوی جذباتیت دکھائی دیتی ہے۔ "نظام عشر کی برکات" میں عشر کے ہر پہلو پر گفتگو کی گئی ہے۔ اور پاکستان میں اس کے نفاذ کے سلسلہ میں جو خدشات اور اعتراضات کئے جا رہے ہیں ان سب کا اس میں مدلل جواب دیا گیا ہے اور اس کے نفاذ کی عملی صورتوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

اسلامی نظام عدل میں ابتدا میں مختصر طور پر اسلام کے عدل و انصاف اور مغرب کے عدل و انصاف کے درمیان بنیادی فرق پر گفتگو کی گئی ہے پھر اس کے بعد اسلامی نظام عدل کی بنیادی خصوصیات پر جامع طور پر گفتگو کی گئی ہے۔ پھر آخر میں اسلامی نظام عدل کے نفاذ میں جن مشکلات اور دقتوں کا ذکر کیا جاتا ہے ان کا ذکر کر کے ان کے حل کی صورتیں تجویز کی گئی ہیں۔

بلاسودی بینک کاری میں سود سے بچتے ہوئے بینکنگ سسٹم کیسے نافذ کیا جا سکتا ہے، اس پر محمد اکرام خاں صاحب نے جو مشہور ماہر معاشیات ہیں مدلل گفتگو کی ہے اور پاکستان میں بلاسودی بینکنگ کے موجودہ سسٹم کے بعض پہلوؤں پر اعتراض کر کے اس کی صحیح صورت بھی پیش کی ہے، مضاربت کی بنیاد پر قائم کردہ بینک سسٹم پر حد منافع کی حوالگی کے سلسلہ میں جو خدشات پیدا ہوتے ہیں ان کا اطمینان بخش جواب دیا ہے۔

منہاج سہ ماہی
عشر نمبر اور اجتہاد نمبر

شائع کردہ مرکز تحقیق، دیال سنگھ ٹرسٹ، لاہور یہ مرکز تحقیق لاہور کا سہ ماہی علمی و دینی رسالہ ہے، اس کے دو نمبر پیش نظر ہیں جو دو اہم دینی موضوعات

سے متعلق ہیں، عشر نمبر دو حصوں پر مشتمل ہے جس میں عشر کے ہر پہلو پر مختلف اہل علم نے روشنی ڈالی ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد کوئی ہٹ دھرم ایسا ہوگا جو پاکستان میں اس کے نفاذ کی افادیت سے انکار کر سکے گا، اس سلسلہ کا سب سے اہم مضمون مولانا ریاض الحسن نوری صاحب کا مضمون ہے جو تاریخ عشر سے متعلق ہے جس میں پوری دنیا کے نظام عشر کی تاریخ بیان کرنے کے ساتھ اسلامی تاریخ کے چودہ سو سال کے درمیان کہاں کہاں نظام عشر رائج تھا، اس کی بھی پوری تفصیل مضمون نگار نے کردی ہے، یہ نمبر اپنے پر خاصے کی چیز ہے۔

اجتہاد نمبر میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اجتہاد کے ہر پہلو پر گفتگو کی گئی ہے ائمہ اربعہ امام ابو حنیفہؒ امام مالکؒ، امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ کے نقطۂ نظر کی تفصیل کے ساتھ فقہ جعفری کے نقطہ نظر کی بھی توضیح اس میں ملے گی۔ اس نمبر کے بعض جندرجات عز فنی عنی اور بعض نظر ثانی کے لائق ہیں۔

مرکز تحقیق کے قیام کو بہت زیادہ زمانہ نہیں گزرا مگر اس کے ڈائرکٹر مولانا سید محمد متین صاحب کی کوشش لائق تحسین ہے کہ اس ادارے نے اتنی جلد اتنا قیمتی مواد اہل علم کے لئے فراہم کر دیا ہے۔

پاکستان میں اس وقت اسلامی نظام کے قیام جو جدوجہد صدر ضیاء الحق اور ان کی مجلس شوریٰ کے ذریعہ ہو رہی ہے۔ ان کتابوں سے اس کی اہمیت بھی معلوم ہوتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر اس کو اگر نظر بد نہ لگی تو پاکستان جلد ہی فلاحی اسلامی اسٹیٹ بن جائے گا۔ (Welfare Islamic State)

(بقیہ:- باب الاستفسار والجواب)

لیکن فروخت کرنے کے بعد تو ہبہ بھی جائز نہیں، اس کے لئے صدقہ ضروری ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہبہ درستی کس طرح ہو جاتا ہے انما الاعمال بالنیات کے تحت یہاں شروع ہی سے ہبہ کی نیت نہیں تھی۔ ہبہ میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ موہوب لہٗ کو مالک بنا دیا جائے۔ یہاں اس نے مالک بنانے کی نیت کی ہی نہیں۔ پھر قربانی کرنے والا خود کسی غریب کو نہیں دے رہا ہے اور نہ اسے معلوم ہے کہ کس کو یہ دیا جائے گا۔ پھر مسجد کے لوگ یہ کہہ کر وصول کرتے ہیں کہ ہم اسے مسجد کے لئے لے رہے ہیں تو پھر ہبہ کہاں ہوا؟ مدرسہ اور مسجد میں فرق یہ ہے کہ مدرسہ اس کا محل ہے اس لئے کہ یہ مدرسہ میں غریب طلبہ کے لئے لیا جاتا ہے اور شروع ہی سے یہ نیت ہوتی ہے۔ اور دینے والا بھی یہی سمجھ کر دیتا ہے۔ لیکن مسجد اس کا محل نہیں ہے اس لئے کہ وہاں اس کا کوئی مصرف موجود نہیں ہے۔ اس لئے راقم الحروف کے نزدیک چرم قربانی کی رقم اس طرح کے ہبہ کے ذریعہ لگانا ناجائز ہے اور ایسا کرنے والے گنہگار ہوں گے۔ ایسی مسجد میں نماز پڑھنا بھی کراہت سے خالی نہیں ہے۔

مجیب اللہ ندوی

خاکہ سامنے آجاتا ہے کہ اس کی روشنی میں صحیح اسلامی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دار المصنفین سے شائع ہوا تھا

اہل کتاب صحابہ و تابعین

مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی

اس کتاب میں ان صحابہ اور تابعین کا تذکرہ ہے جو یہودی یا عیسائی تھے اور انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کتاب میں تقریباً سو صفحے کا ایک قیمتی مقدمہ بھی ہے جس سے عرب کے یہود و نصاریٰ کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔

اس پر مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم کا دیباچہ بھی ہے۔ اس موضوع پر کسی زبان میں کوئی مکمل کتاب موجود نہیں ہے۔

خطبۂ نکاح

نکاح کے موقع پر جو خطبہ دیا جاتا ہے وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور یہ ایک اہم معاشرتی ہدایت اور اصلاح معاشرہ کا پیغام ہے۔ مگر عام طور پر اس کے الفاظ دہرا دیئے جاتے ہیں، اس کا پورا مفہوم لوگوں کے ذہن نشین نہیں ہو پاتا ہے۔ اس کتابچہ میں اس کے ایک ایک لفظ کی ایسی موثر تشریح کی گئی ہے کہ یہ ہر نکاح کے موقع پر تقسیم کرنے کے قابل ہے۔ یہ تشریح مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی کے قلم سے ہے۔ صفحات   قیمت ۸/

اہل دل کی باتیں

یہ بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی مدظلہ کے ان ملفوظات کا مجموعہ ہے جو وہ اپنی نجی مجلسوں میں اپنی پر اثر اور پرسوز زبان سے فرماتے رہے ہیں، اسے مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد نے مرتب کیا ہے اس کا بہت سا حصہ ماہنامہ الفرقان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اب یہ جواہر پارے کتابی شکل میں دار التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد کی طرف سے شائع کئے جا رہے ہیں۔

فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل

یہ محترم ناظم جامعۃ الرشاد کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو معارف اعظم گڈھ میں شائع ہو چکے ہیں یا مختلف سیمیناروں میں پڑھے گئے ہیں جن میں جدید مسائل کے حل کیلئے وہ بنیادیں فراہم کی گئی ہیں جن کی روشنی میں جدید سے جدید مسائل حل کئے جاسکتے ہیں۔ یہ کتاب جامعہ ملیہ دہلی سے شائع ہوئی ہے اور اس پر اردو اکیڈمی نے مصنف کو انعام بھی دیا ہے۔ قیمت ۱۴/

ملنے کا پتہ: شکیل احمد منیجر مکتبہ جامعۃ الرشاد۔ رشاد نگر شہر اعظم گڈھ۔ یوپی

Monthly Jameatur Rashad
Azamgarh (U.P.)

شہر اعظم گڈھ کا مشہور ادارہ

جامعۃ الرشاد

ایک نظر میں

ادارے کے شعبے

(۱) عربی درجات (۲) درجہ حفظ و قرأت (۳) ابتدائی تعلیم کے مکاتب و جونیر ہائی اسکول (۴) کتابت و جلسازی (۵) اسلامی نرسری اسکول (۶) الجامعۃ الشرعیہ اس کے ذریعہ نکاح و طلاق کے مسائل کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ (۷) شعبۂ نشر و اشاعت جس کے تحت کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں

ان تمام شعبوں میں کئی سو طلبہ ابتدائی اور اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ڈیڑھ درجن سے زیادہ اساتذہ کام کر رہے ہیں۔

ادارے کا خرچ

ادارے کا سالانہ خرچ دو لاکھ روپئے سے زیادہ ہے۔

ادارہ کی اہمیت اور خصوصیت (۱) جامعۃ الرشاد میں اعلیٰ عربی تعلیم کے ساتھ انگریزی زبان اور جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ (۲) یہاں سے عالمیت پاس کرنے کے بعد بی۔ اے میں براہ راست داخلہ مل جاتا ہے۔ (۳) سعودی عرب کی بعض یونیورسٹیوں نے ہر کلیہ میں اس کا معادلہ منظور کر لیا ہے۔ کئی طلبہ داخل ہو کر فارغ ہو چکے ہیں اور اس سال بھی کئی طالب علموں کی درخواستیں بھیجی جا رہی ہیں۔ (۴) اعلیٰ دینی تعلیم کے ساتھ بچوں کی بہترین دینی اور اخلاقی تربیت بھی کی جاتی ہے۔ جو لوگ بچوں کا داخلہ چاہتے ہوں ان کو رمضان المبارک میں خط و کتابت کرنا چاہئے۔ مکتب کے بچوں کا داخلہ ۲۰ جون کے بعد شروع ہو جاتا ہے۔

مطبوعہ: نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد